....اور ایک بُت شکنؒ پیدا ہوا

(حصّہ اوّل، حصّہ دوم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)

عنایت اللہ

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد اول

(پہلا اور دوسرا حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336 فیکس: 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب ..... اور ایک بت شکن پیدا ہوا
(جلد اوّل، جلد دوم)
مصنف عنایت اللہ
ناشر گلفراز احمد
علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع زاہد نوید پرنٹرز، لاہور
سرورق فضیل کیانی
سن اشاعت جون 2008ء
قیمت -/300 روپے

علم و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7232336-7352332

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز
غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون 7223584۔ موبائل 0300-4125230

فہرست

پیش لفظ

"داستان ایمان فروشوں کی" کے اس سلسلے کا تعلق سلطان محمود غزنوی کے دور کے ساتھ ہے۔ دس کہانیوں کا پہلا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے متعلق کچھ وضاحتیں بہت ضروری ہیں۔

سب سے پہلے اُس بے انصافی، دھاندلی اور تعصب کی تفصیل سُن لیں جس سے سلطان محمود غزنوی کی شخصیت اور جہاد کی تاریخ مسخ کی گئی ہے جن قارئین نے انگریزوں کے دورِ حکومت میں دس جماعتیں پاس کی ہیں، انہیں ہندوستان کی تاریخ میں سلطان محمود غزنوی کے سترہ حملے پڑھائے جاتے تھے۔ نمایاں تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ محمود غزنوی لُوٹ مار کے لیے ہندوستان آتا تھا اور بے انداز زر و جواہرات اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اُس کا مقصد لُوٹ مار نہ ہوتا تو وہ یہاں بیٹھ کر حکومت کرتا جس طرح اس کے بعد آنے والے مسلمانوں نے کی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اُس کے بیشتر حملے ہندوستان کے بڑے بڑے مندروں پر ہوتے تھے جہاں کے وہ بُت توڑ کر واپس چلا جاتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مندروں میں اُس دور میں زر و جواہرات مہاراجوں کے خزانوں کی نسبت زیادہ ہوتے تھے۔ اس لیے تاریخ میں یہ مفروضہ شامل کر لیا گیا کہ سلطان محمود مندروں پر صرف زر و جواہرات کے لیے حملے کرتا تھا۔ اس مفروضے کے ساتھ یہ جھوٹ شامل کر لیا گیا کہ بعض بُت بہت بڑے سائز کے تھے جو اندر سے کھوکھلے تھے۔ ان کے اندر خزانے بھرے ہوتے تھے۔

تھانیسر اور سومنات کے بڑے بُتوں کے متعلق خاص طور پر لکھا گیا ہے کہ ان کے اندر سونا بھرا ہوا تھا اور سونے کے لیے ہی سلطان محمود نے یہ بُت توڑے تھے۔ غیر جانبدار اور غیر متعصب مؤرخوں نے (جن کا تعلق یورپ سے تھا) اصل حقیقت بیان کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تمام بُت ٹھوس تھے۔ ان میں سے جو زیادہ اہم اور مقدس تھے وہ بھی مٹی کے بنے ہوتے تھے اور ان پر کانسی چڑھائی گئی تھی۔ تھانیسر کے بُت کو سلطان اپنے

ساتھ غزنی لے گیا تھا اور اسے توڑ کر اس کے ٹکڑے گھوڑ دوڑ کے میدان میں پھینک دیتے تھے۔

سومنات کے بُت کے متعلق غیر متعصب مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلطان نے اس کے دو ٹکڑے کیے، پھر دو کے چار، چار کے آٹھ، آٹھ کے سولہ اور سولہ کے بتیس ٹکڑے کر کے انہیں باہر پھینکا اور ان پر سے اپنی فوج گزاری تھی۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں نصابی کتابیں ہندو مصنّفوں کی لکھی ہوتی تھیں۔ انگریزوں کا محکمۂ تعلیم ان کتابوں کو منظور کر لیا کرتا تھا کیونکہ خود انگریز کی دلچسپی اس میں تھی کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جائے۔ انگریزوں نے خود بھی ہماری تاریخ کا چہرہ مسخ کیا۔ سید احمد شہید کو ڈاکو کہا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو "ہندوستانی سپاہیوں کا غدر" کہا۔ کلکتہ کا "بلیک ہول" انگریزوں کا من گھڑت اور بے سرو پا قصہ ہے۔ انگریزوں نے اپنے اس خدشے کو چھپا کر بھی نہیں رکھا کہ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے لیے اگر کوئی قوم خطرہ بن سکتی ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ انگریز کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

ہندو سلطان محمود غزنوی کو مردِ مجاہد اور بُت شکن کیوں کہتے؟ ہندو تاریخ دانوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ انہوں نے انگریزی حکومت سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ سلطان محمود کے جہاد کو گھناؤنے طریقے سے نصابی کتابوں میں شامل کیا۔ یہی کتابیں مسلمان بچے بھی پڑھتے رہے۔ سلطان محمود کی تاریخ کو سترہ حملوں تک محدود رکھا گیا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو بھی وہی نصاب رائج رہا اور سلطان محمود غزنوی سترہ حملوں کی وجہ سے ہی جانا پہچانا جاتا رہا۔ اب بھی آپ کو نصابی کتابوں میں وہی کچھ ملے گا جو انگریزوں کے دور میں لکھا گیا تھا۔ پاکستان میں نصابی کتابیں لکھ کر سکولوں کالجوں کے لیے منظور کرانا ایک کاروبار ہے۔ اس میں لین دین کا خیال رکھا جاتا ہے، کھایا پیا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کہاں تک مستند ہے اور بچوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

نصابی کتابوں کے علاوہ (آزادی سے پہلے) جو کتابیں عام مطالعہ کے لیے لکھی گئیں، ان میں بھی سلطان محمود کو لٹیرا ہی ظاہر کیا گیا۔ یہ زہر پاکستان میں بھی پھیلایا گیا۔ مثلاً ۱۹۷۰ء میں

پاکستان میں انگریزی زبان میں ایک کتاب چھپی ہے جو ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں چھپی تھی۔ اس کا مصنّف محمد حبیب بی۔ اے (آکسن) ایم۔ ایل سی ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسیات کا پروفیسر رہ چکا ہے۔ یہ کتاب سلطان محمود غزنوی کی زندگی، اس کے کردار اور اس کے کارناموں کا ایک تجزیہ و مطالعہ ہے۔ پیش لفظ میں اس مسلمان مصنّف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سلطان محمود غزنوی کو برگزیدہ شخصیت سمجھنا شروع کر دیا ہے جس سے مصنّف (محمد حبیب) کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ اس مصنّف نے کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

○ محمود غزنوی اپنے باپ سبکتگین کا بیٹا نہیں تھا اور یہ اُسے خود بھی شک تھا جس سے وہ بہت پریشان رہتا تھا۔

○ محمود غزنوی ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو سلطان کے باپ سبکتگین کی بیوی نہیں تھی۔

○ محمود غزنوی کو فروغ و تبلیغ اسلام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ لادینیت میں یقین رکھتا تھا۔

○ محمود غزنوی ہندوستان میں لوٹ مار کے لیے آیا کرتا تھا۔

○ محمود غزنوی روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

○ محمود غزنوی نے مرتے وقت لوٹی ہوئی تمام دولت کا اپنے سامنے ڈھیر لگوایا اور وہ بہت رویا۔

○ محمود غزنوی عام شہزادوں جیسا شہزادہ تھا اور شراب اور عورت کا شیدائی تھا

○ محمود غزنوی صرف ہندوؤں کے خلاف ہی نہیں لڑا بلکہ وہ مسلمانوں کے خلاف بھی لڑا کیونکہ اُس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع تھا۔

اور ایسے ہی کچھ اور الزامات ہیں جو صرف ایک مصنّف نے نہیں، بہت سے مصنفوں نے محمود غزنوی پر عائد کیے ہیں۔ ہمارے بچے اگر ان الزامات سے واقف نہیں تو پھر بھی سلطان محمود غزنوی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ اُس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔

سلطان محمود غزنوی اگر واقعی بت شکن تھا اور وہ ہندوستان میں اسلام پھیلانا چاہتا تھا

تو اُس نے یہاں بیٹھ کر حکومت کیوں نہ کی؟ — اس سوال کا جواب آپ کو ان کہانیوں میں ملے گا جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ وہ جب ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے مسلمان حکمران غزنی کی سلطنت پر کہیں نہ کہیں حملہ کر دیتے تھے۔ سلطان صلاح الدّین ایوبی کی طرح سلطان محمود کے بھی اپنی قوم میں دشمن موجود تھے جو اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ سلطان اِدھر اُدھر ہو تو غزنی پر قبضہ کر لیا جائے۔ ہندوستان میں ہر فتح کے ساتھ ہی اُسے پیغام ملا کرتا تھا کہ غزنی پر فلاں نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ ایک مسلسل خانہ جنگی تھی جو سلطان محمود کو لڑنی پڑی۔ وہاں ایمان فروشوں کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے سلطان محمود کو کبھی مہلت ہی نہ دی کہ وہ ہندوستان میں باقاعدہ اپنا دارالحکومت قائم کر سکتا۔

یہ تو کہا گیا ہے کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر حملے کیے تھے مگر یہ کم ہی کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ ہندوؤں نے غزنی پر کتنے حملے کیے تھے۔ حملوں میں پہل ہندوؤں نے کی تھی۔ مہاراجہ جے پال نے غزنی پر پہلا حملہ سلطان سبکتگین کے دورِ حکومت میں کیا تھا۔ سلطان سبکتگین کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اُس نے اپنے بیٹے سلطان محمود کو وصیت کی تھی کہ ہندوستان کے مہاراجوں کی جنگی قوت سے اپنی سلطنت کو بچانا چاہتے ہو تو انہیں چین سے نہ بیٹھنے دینا۔ وہ غزنی کو نہیں اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر غزنی ہاتھ سے نکل گیا تو ہندو عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے خانہ کعبہ تک پہنچیں گے۔ یہ خیال رکھنا کہ تمہارے حملے انتقامی جذبے کے تحت نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد بت پرستی کا خاتمہ ہو۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کے وقت سے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنایا جا رہا ہے۔ تم ہندومت کا خاتمہ کر دو۔

البیرونی، فرشتہ، گردیزی، عطبی، بیہقی اور ان جیسے کئی اور مؤرخوں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی اولیا کا معتقد تھا اور وہ اس وقت کے ایک ولی شیخ ابوالحسن خرقانی کا مرید تھا۔ اُس وقت کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان شیخ خرقانی کے ہاں جایا کرتا تھا لیکن اُس نے کبھی بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ خود سلطان محمود ہے۔ وہ خرقانی کے ہاں اپنے آپ کو سلطان محمود کا قاصد یا ایلچی ظاہر کیا کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے پہچان لیا تھا اور یہ کہا تھا — "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ غزنی کا سلطان اپنا قاصد خود بن کر آتا ہے۔ یہ سچے سلطان کی شان ہے۔"

اُس وقت کی تحریروں سے یہ بھی پتہ ملتا ہے کہ سلطان محمود قرآن کا طالب علم اور مذہبی علوم کا شیدائی تھا۔ ایک دو یورپی مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ میدانِ جنگ میں اس کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی تھی اور اکثر یوں ہوا کہ وہ دشمن کے ہاتھوں تنہا رہ گیا اور شکست صاف نظر آنے لگی۔ ایسے وقت اس نے بارہا یوں کیا کہ گھوڑے سے کود کر اُترا اور قبلہ رُو ہو کر دو رکعت نفل پڑھے، دعا مانگی اور گھوڑے پر سوار ہو کر بلند آواز سے اعلان کیا — "مجھے خدا نے اشارہ دے دیا ہے، فتح ہماری ہے" — اور ہر بار فتح اُسی کی ہوئی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی جہاں کہیں حملہ کرتا جمعہ کے مبارک روز کیا کرتا تھا اور وقت وہ مقرر کرتا جب مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ دیا جا رہا ہوتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی ہر حملے سے پہلے میدانِ جنگ میں دو رکعت نفل پڑھا کرتا تھا۔

"داستان ایمان فروشوں کی" کے اس سلسلے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے بعد ہندوستان میں اسلام کی شمع روشن کرنے والے سلطان محمود غزنوی کے صحیح حالاتِ زندگی اور جہاد کی مکمل تفصیلات پیش کی جائیں تاکہ سلطان کے خلاف جو بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، اسے افسانہ نہ سمجھا جائے۔

بعض قارئین نے سلطان محمود کی اس سلسلہ وار داستان کا موازنہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی کہانیوں سے کیا اور دونوں میں ایک فرق کو محسوس کیا ہے۔ جواب میں عرض ہے کہ عزم اور عقیدے کے لحاظ سے دونوں سلطان ایک جیسے تھے۔ سلطان ایوبی صلیبیوں کے خلاف لڑتا رہا اور سلطان محمود کی زندگی اسلام کے دوسرے بڑے دشمن ہندو کے خلاف لڑتے گزر گئی۔ دونوں کو یورپی مورخوں اور موجودہ دور کے جنگی مبصروں نے دنیا کے بہترین جرنیل کہا ہے۔ دونوں کٹر مسلمان تھے اور دونوں قرآن سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔

دونوں میں جو فرق نظر آ رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے جس جس ماحول میں جہاد کیا، وہ مختلف تھے۔ علاقے مختلف تھے۔ جنگوں کے پس منظر مختلف تھے۔ سلطان ایوبی کے دور میں صلیبیوں اور یہودیوں نے اپنی حسین اور تربیت یافتہ لڑکیاں مسلمان علاقوں میں بھیج رکھی تھیں اور ان کے جاسوس بھی موجود اور سرگرم تھے۔ سلطان محمود کی کہانیوں میں آپ کو کوئی ایسا ہندو جاسوس مرد یا عورت نہیں ملے گی جو غزنی کی سلطنت میں گئی ہو۔ ہندو راجے اپنے جاسوس

غزنی نہیں بھیجتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں سلطان محمود کے جاسوس موجود رہتے تھے۔ یہاں کے مسلمان ان کی مدد کرتے تھے۔

دونوں سلطانوں کے جاسوسوں میں ایک فرق تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے جاسوس ایمان، کردار اور فرض کے پکے تھے۔ جانیں قربان کر دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیتے تھے اور دشمن کے حسین جال میں کم ہی آتے تھے۔ اس کے برعکس سلطان محمود کے بعض جاسوس ہندوؤں کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہندوؤں کی شعبدہ بازی تھی جسے آپ مسمریزم کہہ سکتے ہیں۔ اُس زمانے میں ہندوستان کی جادوگری ساری دنیا میں مشہور تھی۔ اس شعبدہ بازی میں لڑکیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ سلطان محمود کے بعض جاسوس شعبدہ بازی اور جادوگری کو ایک آدمی کی کرامات سمجھ بیٹھتے تھے۔

ان کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کچھ مسلمان برائے نام مسلمان تھے۔ وہ ہندو مہاراجوں کے درباری اور مخبر تھے اور اس طرح خاصی دولت کما لیتے تھے۔ یہ لوگ غزنی کے جاسوسوں کو پکڑوا دیتے یا اپنے ساتھ ملا لیتے تھے۔

یہاں کے مندروں کے اندر کی دنیا طلسم ہوشربا سے کم نہیں تھی۔ مذہب کے پردے میں بدکاری اور عیاشی ہوتی تھی۔ پنڈت مہاراجوں اور ان کی فوجوں کے بالائی افسروں پر چھائے رہتے تھے۔ حکم پنڈتوں کا چلتا تھا۔ یہاں انسانی قربانی بھی دی جاتی تھی۔ پنڈت جس کسی لڑکی کی طرف اشارہ کر دیتے، اُس کے ماں باپ کو وہ لڑکی پنڈتوں کے حوالے کرنی پڑتی تھی۔ غزنی کا جو جاسوس اس طلسم میں چلا جاتا، وہ اپنے فرض اور اپنے مذہب کو بھی بھول جاتا تھا۔ اس کے باوجود سلطان محمود غزنوی کا نظامِ جاسوسی بڑا کارآمد تھا۔ گو سلطان صلاح الدین ایوبی جتنا کارآمد نہیں تھا۔

ہم تاریخ کی بہت سی کتابوں سے مدد اور روشنی لے کر یہ داستان سنا رہے ہیں۔ اس میں میدانِ جنگ کے جو احوال و کوائف اور سلطان کی جو جنگی چالیں بیان کی گئی ہیں، وہ ہم نے اُس دور کے وقائع نگاروں اور اس کے بعد کے جنگی مبصروں کی تحریروں سے حاصل کئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی تفصیل من گھڑت نہیں۔ ہمارا مقصد حقیقت کو سامنے لانا ہے اور ہم کہانی پن اس لیے پیدا کرتے ہیں کہ بچے اور نوجوان بھی دلچسپی سے پڑھیں اور غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔

سلطان محمود غزنوی کے خلاف ایک اور الزام بھی ہے جس کا ذکر نصابی کتابوں میں خاص طور پر لایا گیا ہے۔ یہ ہے فردوسی کا شاہنامہ۔ روایت ہے کہ محمود غزنوی نے فردوسی سے شاہنامہ لکھنے کو کہا اور بے دریغ انعام کا وعدہ کیا تھا مگر شاہنامہ لکھا گیا تو سلطان نے انعام کا وعدہ پورا نہ کیا۔ یہ غم فردوسی کو لے بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود شاہنامہ اپنی مدح میں لکھوانا چاہتا تھا۔

غیر جانبدار مؤرخوں نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے۔ سلطان محمود کو اپنی مدح میں شاہنامہ لکھوانے کی فرصت اور ہوش ہی نہیں تھی۔ اس کی عمر ہندوستان میں ہندوؤں کے خلاف اور اپنے ہاں اقتدار پرست غداروں اور ایمان فروشوں کے خلاف لڑتے گزر گئی۔

ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ سلطان محمود چاہتا تھا کہ ایسا شاہنامہ لکھا جائے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہو اور آخر میں سلطان محمود کا ذکر اس طرح آئے کہ اس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کفرستان تک پہنچایا اور سلطان کا ذکر رسولؐ کے غلام کی حیثیت سے آئے لیکن فردوسی نے جو شاہنامہ لکھا، وہ شہنشاہوں اور سلطانوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا چنانچہ سلطان محمود نے اس شاہنامہ کو قبول نہ کیا۔ بہرحال یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فردوسی کے شاہنامہ کا واقعہ سلطان محمود کو رسوا کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔

سلطان محمود کے متعلق مختلف مؤرخوں اور تاریخ دانوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ اختصار سے پیش کیا جاتا ہے:

"سلطان ہٹ کا پکا تھا۔ اپنا ارادہ پورا کر کے رہتا، اور مخالفت کم ہی برداشت کرتا تھا لیکن اپنے افسروں کے مشوروں اور تجاویز پر اور اُن کے ذاتی مسائل اور امور پر غور کرتا اور کام کی کوئی تجویز رد نہیں کرتا تھا۔ اُس کی وفات کے بعد اس کے افسر اُس کا نام ہمیشہ احترام سے لیتے رہے۔" (ابن الاثیر۔ سبط ابن الجوزی۔ بیہقی)

"سلطان خویش پرور نہیں تھا۔ وہ وزارت اور دیگر عہدے صرف اُنہیں دیتا تھا جو ان کے اہل ہوتے تھے۔" (بیہقی)

سلطان کے سات بیٹے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی وہ خصوصی نگرانی کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کی پرائیویٹ زندگی اور مشاغل پر نظر رکھنے کے لیے تربیت یافتہ جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو سلطان کو باقاعدگی سے رپورٹیں دیتے رہتے تھے۔ کوئی بیٹا کہیں بھی کوئی ناروا حرکت کرے، سلطان اُسے بڑی سخت سزا دیتا تھا۔" (بیہقی۔ گردیزی)

"سلطان اپنی پرائیویٹ زندگی میں اسلامی اصولوں کی پابندی کرتا تھا۔" (ابن الاثیر مجمل)

"ترکمان کے خوبصورت غلام ابوالنجم ایاز کے ساتھ سلطان محمود کی محبت کو شاعروں اور قصیدہ گوؤں نے رومانی رنگ دیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایاز بے شک خوبصورت تھا لیکن اس کے ساتھ سلطان کی محبت اُس کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے تھی۔ ایاز کی قابلیت اور فرض شناسی سے متاثر ہو کر سلطان نے اُسے ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا تھا۔"
(چہار مقالہ۔ کلیاتِ اطہر۔ فرخی۔ نظام سمرقندی۔ شیخ فریدالدین اطہر۔ زوالی محمود و ایاز۔)

"سلطان جتنا دانشمند تھا، اتنا ہی بہادر تھا۔ میدانِ جنگ میں جہاں دشمن کا دباؤ زیادہ ہوتا وہاں سلطان خود آگے ہو کر حملہ کرتا تھا۔ اُس کی ذاتی شجاعت کا اثر یہ تھا کہ اس کے سپاہی انتہائی مایوس کن حالات اور دشواریوں میں بھی ایسی بے جگری سے لڑتے تھے کہ متوقع شکست فتح بن جاتی تھی۔" (آدابُ الملوک۔ عطبی)

"سلطان عدل و انصاف کے معاملے میں بڑا سخت تھا۔ کسی کا اُس کے ساتھ خون کا رشتہ ہو یا کسی کا اونچا عہدہ اور رتبہ، سلطان محمود کے عدل و انصاف کو موڑ توڑ نہیں سکتا تھا۔ سلطان محمود کے اپنے بیٹے مسعود نے ایک تاجر سے قرض لیا اور مقررہ مدت گزر جانے پر ادائیگی سے پس و پیش کرنے لگا۔ تاجر نے قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ مسعود اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ سلطان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اُسے عدالت میں نہیں بلایا جائے گا۔ اُس نے طلبی پر قاضی کے سامنے جانے سے انکار کر دیا۔ سلطان کو اطلاع ملی تو اُس نے اپنے بیٹے کو گرفتار کروا کے عدالت میں بھیجا۔ قاضی نے اس سے قرض واپس دلایا اور جرمانہ بھی کیا۔"
(سیاست نامہ۔ عاقی۔ فرخی۔ سبط ابن الجوزی)

"علی تگین فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ اس نے اسلام کے منافی ایک حرکت کی۔ سلطان کے حکم سے اُسے سرعام کوڑے لگائے گئے۔" (سیاست نامہ۔ عاقی۔ سبط ابن الجوزی)

"عامل نیشاپور نے اپنے رتبے اور سرکاری حیثیت کے رعب میں ایک [illegible] مکان

پر قبضہ کر لیا۔ عورت نے سلطان محمود سے شکایت کی۔ سلطان نے عاملِ نیشاپور کے رتبے اور حیثیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے سرِ عام کوڑوں کی سزا دی اور سرکاری حیثیت سے برطرف کر دیا۔" (سیاست نامہ۔ مجموعہ الانساب)

"سلطان محمود نے فقہ پر خود ایک کتاب لکھی تھی اور علما کو دربار میں جمع کر کے ان سے فقہ اور نظامِ شریعت پر کتابیں لکھوائی تھیں۔" (حاجی خلیفہ۔ امام مسعود بن شانبان۔ حکایت السلاطین)

"سلطان مذہب کا پابند تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتا اور ہر صبح کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کیا کرتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں اپنی جائداد کی مالیت اور نقد رقم پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کیا کرتا تھا۔ زکوٰۃ کی رقم اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ کسی علاقے میں زلزلے اور سیلاب وغیرہ سے تباہی آ جائے تو زکوٰۃ کی یہ رقم ہی متاثرہ علاقوں کی امداد اور آبادکاری کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔" (فرخی۔ حاجی خلیفہ۔ امام مسعود)

"ذاتی جیب سے غریبوں اور معذوروں کی مدد کرتا تھا۔ طلبہ کو وظیفے دیتا تھا۔ ہندوستان پر حملوں کے لیے جاتا تو بہت سے لوگ رضاکارانہ طور پر ساتھ چلے جاتے اور لڑائی میں حصہ لیتے تھے۔ سلطان ان رضاکاروں کو فوج کی تنخواہوں کی نسبت زیادہ تنخواہ دیا کرتا تھا۔" (سبط ابن الجوزی)

"لڑائی کیسی ہی خوفناک صورت کیوں نہ اختیار کر لے اور دشمن کا دباؤ کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جاتے، سلطان محمود تیمم کر کے نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ وہ حج کے لیے ترستا رہا لیکن مجبوریاں ایسی تھیں کہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ حاجیوں کے جو قافلے حج کو جاتے اور آتے تھے، ان کی حفاظت کے لیے فوجی دستے بھیجا کرتا تھا۔ بدو قافلوں پر حملے کرتے تھے۔ سلطان نے ڈاکوؤں کے سرداروں کے ساتھ یہ سودا کر لیا تھا کہ حاجیوں کے قافلوں پر وہ حملے نہ کریں، اس کی بجائے غزنی کے خزانے سے رقم لے لیا کریں۔" (ابن الاثیر۔ فرشتہ)

"سنی عقیدے کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا تھا۔ سلطان نے افسر مقرر کر رکھے تھے جو ان لوگوں کو سزا دیتے تھے جو سنی عقیدے کے خلاف کوئی نیا عقیدہ پھیلاتے پکڑے جاتے تھے۔ باطنی اور قرامطی عقیدوں کے پیروکاروں اور مبلغوں کو وہ بڑی سخت سزائیں دیتا تھا۔ پھر بھی باز نہ آتے تو انہیں سرِ عام سزائے موت دی جاتی تھی۔ باطل عقیدوں کے بعض

مبلغوں کو سلطان نے زندہ جلا دیا تھا۔ اس نے باطنی، قرامطی اور بہائی فرقوں کی تمام کتابیں سارے ملک کی تلاشی لے کر جمع کیں اور آگ لگا دی۔" (ابن الاثیر۔ ابن الجوزی۔ مجمل)

"سلطان نے ہندوستان میں ہندوؤں کو کبھی بھی اسلام قبول کرنے کا حکم نہ دیا۔ یہ کام عالم اور مبلغ کرتے تھے جو سلطان کی فوج کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ اس نے ہندوستان میں ویران مسجدیں آباد اور نئی مسجدیں تعمیر کیں اور مبلغوں سے کہا کہ وہ ہندوؤں کو اسلام سے روشناس کرائیں۔" (البیرونی۔ مولوی ذکاء اللہ۔ گردیزی)

"سلطان کی فوج میں جو ہندو دستے تھے، ان کے لیے غزنی میں اس نے مذہبی آزادی کا حکم دے رکھا تھا۔ اس سلوک سے متاثر ہو کر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔" (المعاری۔ رسالۃ الغفران)

سلطان محمود غزنوی کی تاریخ کو مسخ کر کے اسے رسوا کرنے اور زر و جواہرات کا لٹیرا ثابت کرنے میں ہندوؤں کے علاوہ ان مسلمانوں کا بھی ہاتھ ہے جو عہدِ اقتدار، زر و جواہرات اور سلطانی کے خواہش مند تھے۔

ہم دس کہانیوں کا جو مجموعہ پیش کر رہے ہیں ان میں آپ کو وہ تمام لوازمات ملیں گے جو آپ کے اور آپ کی نوجوان نسل کے اس مطالبے کو پورا کرتے ہیں کہ کہانی تفریحی انداز میں لکھی جائے، اس میں سنسنی خیزی اور سسپنس ہو اور یہ جذبات میں ہلچل بپا کر دے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہانیاں اس قومی جذبے کو بھی زندہ و بیدار کریں گی جسے ہمارے ملک میں ذہنی لذت مہیا کرنے والی فحش کہانیوں سے ختم کیا جا رہا ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

...اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا

یکم نومبر ۹۷۱ء بمطابق ۱۰ محرم ۳۵۷ ہجری کے روز اُمّتِ رسول اللہ کا وہ سرو مجاہد پیدا ہُوا جسے تاریخ بُت شکن کے خطاب سے پہچانتی ہے۔ یہ تھا سلطان محمود غزنوی۔

دس صدیاں گزر گئی ہیں محمود غزنوی کا نام زندہ ہے۔ وہ پیغام زندہ ہے جو وہ غزنی سے اُس وقت ہندوستان میں آیا تھا جب یہ کفرستان تھا اور یہاں برہمن اور اُس کے خداؤں کے بُتوں کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ عظیم پیغام تھا جو خدائے ذوالجلال نے اپنے رسولؐ کو غارِ حرا میں دیا تھا۔ یہ پیغام ایک شمع تھی جسے غارِ حرا کی تاریکی نے نور بخشا تھا — اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں — اور یہ بھی کہ کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کر سکتا۔

محمود غزنوی کا نام زندہ ہے، عظیم پیغام زندہ ہے، سومنات زندہ ہے، ہندوستان کے وہ سارے مندر، وہ بُت کدے زندہ ہیں جن کے بُت غزنی کے محمود نے توڑ کر باہر پھینکے اور ان کے پجاریوں سے کہا تھا کہ مٹی اور پتھر کے بُت انسان کے خداوند ہو سکتے۔ ان میں خدائی کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں کہو کہ اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑ کر میرے جسم کے ٹکڑے کر دیں۔

بُتوں کے ٹکڑے جُڑ نہ سکے، محمود کے ٹکڑے ہو نہ سکے۔ محمود نے اِن ٹکڑوں کے اوپر سے اپنی فوج گزاری — پیادہ بھی، سوار بھی — اُس نے تھانیسر میں بھی یہ مظاہرہ کیا، سومنات میں بھی کیا — برہمن کے "خدا" اسلامی فوج کے پاؤں تلے پس کر مٹی کے ذرّے اور پتھر کے ریزے بن گئے۔

پھر محمود غزنی میں مر گیا — ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں اور سنکھ بج اُٹھے۔ برہمن نے ٹوٹے ہوئے بتوں کی جگہ نئے بُت کھڑے کر دیئے۔

پورے ایک ہزار سال بعد، دسمبر ۱۹۷۱ء میں اسی ہندوستان سے، اسی بُت کدے سے یہ آواز اُٹھی — "ہم نے اسلامی شجاعت اور روایات کا بُت توڑ دیا ہے۔"

گزرے ہوئے ماہ و سال میں ہمارے کئی اور بُت ٹوٹ گئے ہیں — ایمان کا بُت، قومی کردار کا بُت، وقار کا بُت، روایات کا بُت، اُمّتِ رسولؐ کی وحدت کا بُت — ہمارا کوئی بُت سلامت نہیں رہا۔ برہمن کے بڑے ہی حسین بُتوں نے ہم پر ایسا طلسم طاری کیا ہے کہ ہم سب بھُربھُری مٹی کے بُت بن گئے ہیں جنہیں خود پیدا کردہ آندھیاں کھاتی اور اُڑاتی چلی جا رہی ہیں۔

وہ مسجدیں جو محمود غزنوی نے یہاں بنائی تھیں وہ ویران ہیں۔

وہ بُت خانے جو اُس نے ویران کیے تھے وہ آباد اور پُر رونق ہیں۔

اور بُت یہ طعنے دے رہے ہیں کہ مُسلم کا خدا کوئی نہیں!

باطل کے بُت توڑنے والے کیسے ہوتے ہیں؟ حق کا بُت کس طرح ٹوٹتا ہے؟ اِن سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ماضی کے اُن تاریک گوشوں کو کھوجنا ضروری ہے جن تک تاریخ کی آنکھ نہیں پہنچی — اور چونکہ اِن گوشوں تک تاریخ کی آنکھ نہیں پہنچی اور سچائی انہی گوشوں میں ہوتی ہے، اس لیے باطل ان گوشوں پر تاریکی کے زیادہ دبیز پردے ڈال دیتا ہے کہ سچائی دبی رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بُت شکنی کی تاریخ کا چہرہ مسخ ہُوا اور آج کے دور کے دو قلمہ گو تاریخ دانوں نے بھی لکھ دیا کہ محمود غزنوی کو زر و جواہرات اور خزانوں سے دلچسپی تھی، اور بُت اس لیے توڑتا تھا کہ ان کے اندر زر و جواہرات اور بیش قیمت ہیرے بھرے ہوئے تھے جو ہندو عقیدت کے طور پر ان میں ڈالتے تھے۔ سومنات کے بُت کے متعلق بھی یہی کہا گیا مگر غیر مسلم مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ بُت اندر سے کھوکھلا نہیں ٹھوس تھا۔ محمود غزنوی نے اسے آٹھ ٹکڑوں میں توڑا اور باہر پھینکا جہاں اس کی فوج نے نفرت کے اظہار

کے لیے ان آٹھ ٹکڑوں کے کئی ٹکڑے کیے، پھر پوری فوج اُن پر چلتی ہوئی گزر گئی۔

باطل دروغ سے فروغ پاتا ہے، اور جب باطل شکنوں کی اولاد دروغ کو حق مان لیتی ہے تو حق کے بت ٹوٹ جاتے ہیں۔

تاریخ کے تاریک گوشوں میں جھانکیے۔ ایک ہزار سال پہلے کے عینی شاہدوں کی تحریریں پڑھیے۔ یہ تحریریں کٹھی بکھی سی ہیں، مگر غور کرو تو کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ بکھری بکھری کڑیاں بھی ملتی ہیں جنہیں ایک دوسری سے ملاؤ تو اُس دور کے کئی واقعات کا پس منظر روزِ روشن کی طرح چمکتا سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا چہرہ بگاڑا نہیں جا سکتا، تاریخ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ جس مٹی میں شہیدوں کا خون اور مظلوموں کا خون رچ بس جاتا ہے، اُس مٹی کے ذرّے بولتے ہیں۔ شہیدوں اور مظلوموں کی روحیں مٹی کو زبان دے دیتی ہیں۔ پاک مٹی کی آواز سننے کے لیے ایمان کی بصیرت درکار ہے۔ اس آواز کو سمجھنے کے لیے دل و دماغ میں اللہ کا نور ضروری ہے۔

ایمان کی بصیرت نہ ہو، دل و دماغ میں اللہ کا نور نہ ہو تو ہم اللہ کے دھتکارے ہوئے اُن لوگوں میں شامل کر دیئے جاتے ہیں جن کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ ہم نے ان کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا اور دماغوں کو سربمہر کر دیا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں آگ کا عذاب اور اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ عذاب کس قدر بھیانک ہے۔

یہ ۹۰ سے دو چار سال پہلے یا دو چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ ایران کے بادشاہ نوشیرواں عادل کا سنہری دور مدت گزری ختم ہو چکا تھا اور اس سرزمین پر اب اُن کی حکمرانی تھی جنہیں انصاف سے نفرت اور آمریت سے محبت تھی۔ وہ بادشاہ تھے اور انسانوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ انسانوں کو غلام بنانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ عدل و انصاف کی بساط لپیٹ کر پھینک دو۔ رعایا کو بھوکا رکھو۔ انہیں بات نہ کرنے دو، حق کا گلا گھونٹ دو۔ انصاف اُس سے کرو جو بادشاہ کے گیت گائے، خوشامدیوں کا ٹولہ پیدا کر دو، مشیر اور وزیر اسی ٹولے سے منتخب کرو۔ انسانوں کو تنگدست رکھو

کہ اس حال تک پہنچا دو جہاں انسان کُتّے کے مُنہ سے ہڈی چھین کر اپنے بھوکے بچے کے مُنہ میں ڈال دیا کرتا ہے۔

ایران کے اس بادشاہ نے عدل و انصاف کو ملک بدر کر دیا اور نوشیرواں عادل کے لگائے ہوئے شجر کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکا اور اس کے خاندان کو مجبور کر دیا کہ وہ ایران سے نکل جائیں چنانچہ یہ لوگ ایران سے نکل کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ عرش سے فرش پر گرے تو جدھر کو منہ آیا اُدھر کا رُخ کر لیا۔ ذریعۂ معاش نے انہیں بکھیر دیا، خانہ بدوش کر دیا۔ انصاف کے علمبردار بے انصافی کا شکار ہوتے، پٹتے مرتے گئے۔ بچے جوان ہوتے گئے اور نسلیں روپوش اور نمودار ہوتی رہیں۔

اسی نسل کا ایک شخص قرار الحکم بن قرار ارسلان، گٹھا ہوا جوان جس پر آباؤ اجداد کی عظمت کے نقوش نمایاں، مگر تنگدست اور روزی کا متلاشی بخارا کے ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ کسی ٹھور ٹھکانے کی تلاش میں جا رہا تھا۔ تھک گیا اور ایک درخت تلے بیٹھ گیا۔ قریب گھنی جھاڑیاں اور گھنے پیڑ تھے۔ ان کی اوٹ سے ننھے بچوں کے ہنسنے کھیلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ الحکم کو معلوم تھا کہ یہ کوئی خانہ بدوش خاندان ہے۔ وہ لیٹ گیا۔

بچے ہنستے کھیلتے دور نکل گئے۔ خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی سے ایک مترنم آواز ابھری۔ آواز جوان تھی اور مقدس بھی۔ کوئی عورت تلاوتِ قرآن کر رہی تھی۔ قرار الحکم پر وجد سا طاری ہو گیا۔ اس کی تھکن دور ہونے لگی۔ سنتے سنتے وہ بدک اٹھا اور اٹھ کر دو بڑا جھاڑیوں سے گھوم کر اُدھر گیا جہاں خانہ بدوشوں نے دو پھٹے پرانے، پیوند لگے خیمے لگا رکھے تھے۔ ایک خیمے کے باہر ایک جوان لڑکی قرآن پڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی آواز کی طرح دلکش اور حسین تھی۔ دو بوڑھے آدمی الگ بیٹھے رسیاں بنا رہے تھے۔ چند عورتیں اور دو چار مرد بھی تھے۔ قرار الحکم کو دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اُن کے درمیان چلا گیا۔

"آپ کی اس بیٹی نے ایک آیت غلط پڑھی ہے"۔ الحکم نے بوڑھوں سے کہا ۔۔ "مجھے اجازت ہو تو اس کی غلطی درست کر دوں؟"

"ضرور کردو"۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔" ہم نے نہیں سنا کہ یہ صحیح پڑھ رہی ہے یا غلط۔"

"آپ کو سننا چاہیئے"۔۔۔ الحکم نے کہا۔" آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"ہم ترک ہیں"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔" ترک مسلمان۔"

"وہ تو میں نے دیکھا ہے کہ آپ سب مسلمان ہیں"۔۔۔ الحکم نے کہا۔۔۔" میں ذرا اس کی غلطی درست کردوں۔"

وہ لڑکی کے پاس زمین پر جا بیٹھا۔

لڑکی نے قرآن سے سر اٹھایا۔ قرار الحکم نے دیکھا کہ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے۔ لڑکی نے قرآن بند کر دیا۔ اور اپنے خاندان کے آدمیوں کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ شخص کون ہے۔

"قرآن کھولو"۔۔۔ الحکم نے لڑکی سے کہا۔" تم نے ایک جگہ سے غلط پڑھا تھا۔"

لڑکی نے پڑھا۔ وہ لفظ اس نے پھر غلط پڑھا۔ قرار الحکم نے اس کی غلطی درست کی۔ لڑکی نے اُسے شکریے کی نظر سے دیکھا۔

"اس کا مطلب جانتی ہو جو پڑھ رہی ہو؟"

"کچھ کچھ سمجھتی ہوں"۔۔۔ لڑکی نے شرمیلے سے لہجے میں جواب دیا۔" ہمارے ساتھ ایک بزرگ ہوا کرتے تھے۔ وہ مجھے قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ مطلب بھی سمجھاتے تھے۔ وہ مر گئے ہیں۔ انہیں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اب پڑھ سکتی ہوں۔ کچھ سمجھتی ہوں کچھ نہیں سمجھتی۔"

"میں تمہیں اس کا مطلب سمجھاتا ہوں"۔۔۔ قرار الحکم نے کہا۔" ابراہیمؑ کو یاد کرو۔ بے شک وہ سچے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ سُن سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا۔ آپ میرے ساتھ ہو جائیں، میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلوں گا"۔۔۔ الحکم نے لڑکی کو اس کا مطلب سمجھا کر کہا۔" اور آگے دیکھو یہاں خداوند فرماتا ہے۔" اور جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور جن بتوں کی وہ پرستش کرتے تھے

اُن سے الگ ہو گئے تو ہم نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے اور سب کو پیغمبر بنایا۔"

۔۔۔ تم سمجھتی ہو یہ کیا قصہ ہے؟ ۔۔۔ وہ بتوں کے آگے سجدے کرتے اور اُن سے مرادیں مانگتے تھے۔ تم نے قرآن میں پڑھا ہے کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہے۔"

قرار الحکم اُسے بتا رہا تھا کہ غیر مسلم کیسے کیسے "خداؤں" کی عبادت کرتے ہیں اور بُت جو سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں، بت پرستوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ مگر لڑکی خاموشی سے کبھی اُس کے چہرے کبھی سراپا کو دیکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انہماک اور چہرے پر مسرت تھی۔ اس خاندان کے مرد بھی ان کے پاس آ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلنے لگا۔ بوڑھوں نے اُسے روک لیا۔ لڑکی سے دور ہٹ کر وہ مردوں میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"ایران کی زمین ہم پر تنگ ہو گئی ہے"۔۔۔ قرار الحکم نے جواب دیا۔۔۔" جس کے آباؤ اجداد نے عدل و انصاف سے انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچایا تھا۔ وہ آج حشرات الارض میں شامل ہو گیا ہے۔ کیا میں کیڑا مکوڑا نہیں ہوں جو دشت و جبل میں پیٹ کی آگ بجھانے اور بے انصافوں اور ظالموں سے بچنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں؟ ہم تین چار پشتوں سے اسی حال میں جی رہے ہیں۔ ایک جگہ سے طبیعت اچاٹ ہوتی ہے۔ تو جدھر منہ آئے ادھر کو چل پڑتا ہوں۔"

"تو یوں کہو تم نوشیرواں عادل کی نسل سے ہو"۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔۔۔" ہمارے باپ دادا اُس کے بہت قصے سنایا کرتے تھے، مگر ہم نوشیرواں عادل کو خیالی بادشاہ سمجھتے ہیں ۔۔۔۔۔ تمہارا کنبہ کہاں ہے؟"

"اکیلا ہوں"۔۔۔ الحکم نے جواب دیا۔" بچپن سے مذہب سے لگاؤ ہے۔ مسجدوں میں زیادہ وقت گزارا ہے۔"

"تم باتیں بہت اچھی کرتے ہو"۔۔۔ دوسرے بوڑھے نے کہا۔" رہنا چاہو تو ہمارے ساتھ رہو۔ جانا چاہو تو ایک رات ہمارے ساتھ گزارو۔"

وہ رات کے لیے رُک گیا۔ وہ کوئی عالم فاضل نہیں تھا لیکن خانہ بدوش چونکہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس لیے اِن میں وہ عالم لگتا تھا۔ باتیں داستان گوئی کے انداز سے کرتا تھا۔ سننے والے مسحور ہوئے جا رہے تھے جُوں جُوں رات گزر رہی جا رہی تھی محفل کی رونق کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے عورتیں اٹھیں پھر مرد ایک ایک کرکے اُٹھنے لگے۔ آخر میں دونوں بوڑھے رہ گئے انہوں نے الحکم سے ذرا زور دے کر کہا کہ وہ اُن کے ساتھ رہے۔ الحکم نے محسوس کیا جیسے وہ اسے کسی ذاتی مقصد کے لیے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ وہ ان کے کس کام آسکتا ہے۔

"ہمارے ہاں مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی ہے"۔۔۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ "مرد جتنے بھی ساتھ ہوں اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں صرف درندوں کا خطرہ نہیں ہوتا، انسان درندوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ لڑکی جس کی آواز پر تم ادھر آئے تھے ہمارے لیے بڑی ہی نازک اور خطرناک ذمہ داری بنی ہوئی ہے۔ تم نے اس کی جوانی اور اس کا حسن دیکھا ہے۔ ہمارے خاندان کے سارے مرد بیویوں والے ہیں۔ باقی سب بچے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے ہمیں خاوند نہیں ملتا۔ تم ہمارے ساتھ رہو اور اس کے ساتھ شادی کر لو"۔

"مجھ سے پہلے تمہیں باہر کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا؟"۔۔۔ الحکم نے پوچھا۔۔۔ "تم نے مجھ جیسے کسی اور کو لڑکی کیوں نہ دے دی؟ باہر کا میں پہلا ہی آدمی یہاں آیا ہوں؟"

"آتے رہتے ہیں"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔۔۔ "مگر وہ خریدار تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر بولیاں دیے گئے ہیں۔ ہم نے ایک بار قیمت لے کر لڑکی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر لڑکی نہیں مانی۔ اس نے خودکشی کی دھمکی دی تو ہم چُپ ہو گئے"۔

اُس دور میں امیر کبیر لوگ لڑکیاں خریدا کرتے تھے۔ ایرانی اور تُرک خانہ بدوشوں کی لڑکیاں زیادہ خوبصورت ہوتی تھیں اس لیے گاہک خانہ بدوشوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ لڑکیاں فروخت ہونے کو معیوب نہیں سمجھتی تھیں کیونکہ یہ رواج تھا۔ خریدار انہیں باقاعدہ منڈی میں بیچتے تھے۔ غلاموں کی بھی منڈی لگا کرتی تھی۔ لڑکیوں اور غلاموں کے سوداگر عام طور پر ڈاکو ہوا کرتے تھے جو قافلوں پر حملہ کرکے مردوں اور عورتوں کو پکڑ لاتے تھے۔ خوبصورت لڑکیاں امیروں اور بادشاہوں کے امراء وزراء کے گھروں میں حرموں کے لیے یا حرموں کی ملازمت کے لیے یا مہمانوں کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ قحبہ خانوں والے بھی ان کے خریدار ہوتے تھے۔

"کبھی سنا نہیں کہ خانہ بدوشوں کی کسی لڑکی نے بکنے سے انکار کیا ہو"۔ الحکم نے کہا۔۔۔ "آپ نے اس کی بات کیوں مانی؟"

"یہ ایسی باتیں کرتی ہے جن سے ہم ڈر جاتے ہیں"۔۔۔ بوڑھے نے جواب دیا۔۔۔ "تم جانتے ہو ہم لوگ مذہب کے اتنے پکے نہیں ہوتے۔ کسی آدمی کو اس کی خوبصورت لڑکی کی قیمت اچھی مل جائے اور وہ اس قیمت پر بیوی کو طلاق دے دے تو اس آدمی کا کیا مذہب ہو سکتا ہے لیکن ہم مسلمان ہیں۔ اسلامی اصولوں کے ہم پابند تو نہیں پھر بھی قرآن اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ یہ لڑکی کبھی ہمیں کوئی خواب سناتی ہے کبھی کہتی ہے کہ اسے جنگل میں ایک سفید ریش، نورانی چہرے والے بزرگ نظر آئے تھے اور کہتے تھے کہ کسی کی زرخرید لونڈی نہ بننا، نکاح پڑھوا کر بیوی بننا کیونکہ تم اُس بچے کو جنم دو گی جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائے گا۔

"ایسے خواب ہر کوئی دیکھتا ہے"۔۔۔ الحکم نے کہا۔۔۔ "میں بھی ایسے خواب دیکھا کرتا ہوں"۔

"دو چاند پہلے کی بات ہے، ہم نے لڑکی کا سودا کر لیا تھا"۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ "خریدار کے پاس رقم کم تھی۔ ہم نے سونے کے دینار مانگے تھے جو اُس کے پاس پورے نہیں تھے۔ لڑکی کو ہم نے خیمے کے اندر بٹھا کر دو آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے کیونکہ لڑکی کہتی تھی کہ بھاگ جاؤں گی۔ ہم نے پہرہ کھڑا کر دیا تو اس نے کہا۔۔۔ 'میری کوکھ سے ناجائز بچہ جنم نہیں لے گا۔ اس سے پہلے تم سب تباہ ہو جاؤ گے'۔۔۔ آدھی رات کو ہم سب گھٹاؤں کی گرج سے جاگ اُٹھے۔ بارش اتنی طوفانی کہ جیسے اژدر گرے بجلی کڑکنے لگی تو دل دہل گئے۔ پھر ایسی کڑک ہوئی کہ

ہم سب کی چیخیں نکل گئیں ساتھ ہی سارا جنگل دن کی طرح روشن ہو کر اندھیرا ہو گیا۔ ایک درخت کا بہت بڑا ٹہن کڑکڑ کرتا گرا۔ پھر بار بار زمین اور آسمان روشن ہوتے اور بجلی کڑکتی تھی۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سب چیختے چلاتے اور بچوں کو ڈھونڈتے اور انہیں سینے سے لگاتے پھر رہے تھے صرف یہ لڑکی تھی جو بے خوف تھی ایک جگہ کھڑی چلا چلا کر کہہ رہی تھی — کوئی آدمی اذان دو جہاں ہو وہیں سجدے میں گر پڑو — تین آدمی اذان دینے لگے۔ باقی سب قیامت کی بارش میں، پانی اور کیچڑ میں سجدے میں گر پڑے ....

"طوفان بہت دیر بعد تھما۔ ہم نے اس سے زیادہ خوفناک طوفان بھی دیکھے ہیں۔ ہماری چھت آسمان ہے۔ آسمان ہی ہمیں نعمتوں سے نوازتا ہے اور یہی آسمان ہم پر کبھی کبھی آفت بھی نازل کرتا ہے مگر ہم کبھی ڈرتے نہیں تھے۔ اس رات ہمارے دلوں پر جو دہشت طاری ہوئی وہ کچھ اور معنی رکھتی تھی۔ صبح ہوئی۔ سب ایک جگہ ٹھٹھرتے ڈرے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لڑکی ہم سب کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی آہستہ آہستہ ہمارے آگے سے گزری۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا اثر تھا کہ ہم سب نے نظریں نیچی کر لیں۔ ہمیں اس کی دھمکی یاد آنے لگی — 'میری کوکھ سے ناجائز بچہ جنم نہیں لے گا۔ اس سے پہلے تم سب تباہ ہو جاؤ گے' — لڑکی کے ہاتھ میں یہی قرآن تھا جو یہ آج پڑھ رہی تھی ....

"ہم نے خیمے سنبھالے۔ سامان اکٹھا کیا اور اسے خشک کرنے لگے۔ بہت دیر بعد دو گھوڑ سوار آئے۔ وہ سونے کے دینار لائے تھے۔ انہوں نے تھیلی ہمارے آگے پھینک کر کہا — 'گن لو اور لڑکی ہمیں دے دو' — میں نے تھیلی اٹھا لی اور گھوڑ سوار کو دے کر کہا — 'ہم لڑکی نہیں دیں گے۔ لے جاؤ اپنا سونا' — دوسرے گھوڑ سوار نے دو دینار اور میرے آگے پھینک کر کہا — 'اور بولو جو قیمت مانگو گے دیں گے' — ہم نے لڑکی نہ دی۔"

"یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"یتیم ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا "میری بھتیجی ہے۔"

"میرے پاس لڑکی کی قیمت دینے کے لیے کچھ بھی نہیں" — قرار الحکم نے خالی ہاتھ دکھا کر کہا۔ "آپ مجھے اللہ کی راہ میں تو یہ لڑکی نہیں دیں گے۔"

"تمہیں ہمارے ساتھ رہنا پڑے گا" — بوڑھے نے کہا۔ "ہمارے خاندان میں ایک مرد کا اضافہ ہو جائے گا۔ ہر رات ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ لڑکی کو ہم چھپائے پھرتے ہیں۔ مرد جتنے زیادہ ہوں گے خطرہ اتنا ہی کم ہو گا۔"

قرار الحکم کی شادی اُس لڑکی کے ساتھ کر دی گئی۔

"تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنی اور اپنی آزادی کی قیمت دی ہے۔" پہلے روز الحکم نے اپنی بیوی سے کہا۔ "میں اپنے آپ کو قید میں رکھنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے دل میں تمہاری اتنی محبت پیدا ہو گئی ہے کہ میں آگے نہیں جا سکتا۔ تمہارے چچا نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں اور یہیں رہوں۔ اگر کسی وقت میرا دل یہاں سے اُچاٹ ہو گیا تو میرے ساتھ چلو گی؟"

"کیا میں نے آپ کو خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنا خاوند قبول نہیں کیا؟" — اُس کی بیوی نے جواب دیا — "میرا جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اب مجھے اپنا قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا تو میرے دل نے کہا تھا کہ یہ آدمی تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہے تو اسے قبول کر لینا۔"

"سنا ہے تم کہتی ہو کہ تمہیں جنگل میں ایک سفید ریش، نورانی صورت بزرگ ملے تھے جنہوں نے تمہیں کہا تھا کہ تم ایک بچے کو جنم دو گی جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائے گا۔"

وہ ہنس پڑی اور بولی — "یہ میری خواہش ہے کہ ایسے ہی بچے کو جنم دوں۔ یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ مجھے آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ تیری نسل کا ایک آدمی جو تیرا بیٹا بھی ہو سکتا ہے، تیرے بیٹے کا بیٹا بھی ہو سکتا ہے، راہِ حق میں اتنا نام پیدا کرے گا کہ دنیا اسے بھول نہیں سکے گی۔"

"تم نہیں جانتی کہ غریبوں کی اولاد باطل شکن نہیں شکم پرور ہُوا کرتی ہے" ___ الحکم نے کہا۔ "یہی کافی ہے کہ خود حق پر رہو اور باطل کی کشش سے بچو۔ ہمارا بیٹا خانہ بدوش ہوگا۔ اُس کا بیٹا بھی خانہ بدوش ہو گا یا کسی امیر کے گھر کسی غلیظ کام پر نوکر ہوگا۔"

"تو کیا مَیں وہم میں مبتلا ہوں؟"

"خواہش جو پوری نہ ہو سکے وہم بن کر انسان کا دِل بہلائے رکھتی ہے" الحکم نے کہا۔

"اُس روز تم میری غلطی دُرست کرنے آئے تھے" بیوی نے کہا ___ "تم نے مجھے ان آیتوں کا ترجمہ سنایا کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ بُتوں کو کیوں پُوجتے ہیں جو نہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ میرے ساتھ ہو جائیں۔ میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلوں گا.... یہ الفاظ میرے دل میں اٹک گئے۔ اس کے بعد میں قرآن نہیں پڑھ سکی۔ یہی ایک آواز سنائی دیتی رہی کہ تو ایک ابراہیم کو جنم دے گی۔ مَیں نے رات خواب میں ایک نُورانی صورت بزرگ کو دیکھا۔ وہ تمہاری طرح میری یہی غلطی درست کرکے مجھے پڑھا رہے تھے جو تم نے دُرست کی ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم خوبصورت بچہ لیکن بغیر عقل کے چاہتی ہو یا بدصُورت بچہ جو عقل والا ہو۔ مَیں نے انہیں کہا کہ مَیں وہ بچہ چاہتی ہوں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرح اتنا حق پرست ہو کہ اُسکا باپ حق پر نہ ہو تو اُس سے بھی الگ ہو جائے۔ مَیں نے اس بزرگ سے کہا کہ خدا مجھے لڑکی دے تو وہ اتنی بدصورت ہو کہ کوئی خریدار اور کوئی ڈاکو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔"

"تم اپنے قبیلے کے رسم و رواج کے خلاف کس طرح ہوگئی ہو؟" ___ قرار الحکم نے کہا ___ "خانہ بدوشوں کی لڑکیاں فروخت ہونے کو ناپسند تو نہیں کرتیں۔"

"معلوم نہیں میرے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ مَیں شادی کرکے ایک آدمی کی بیوی بن کے رہوں گی" بیوی نے جواب دیا۔ "مجھے کسی نے کوئی سبق نہیں دیا۔

میرے دل کی آواز تھی جو مجھے اچھی لگتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"دل سے یہ وہم نکال دو کہ تم ایسے بچے کو جنم دو گی جو بڑا ہو کر نام پیدا کرے گا۔" الحکم نے کہا۔ "ایسی خواہشیں تمہارا دماغ خراب کر دیں گی۔"

اُس رات کا طوفان باد و باراں اور بجلی کا کوندنا محض اتفاق ہو سکتا تھا۔ یہ آسمانی آفت اس کے فوراً بعد آئی جب اس لڑکی کے خریدار آئے تھے اور لڑکی نے اپنے خاندان کو تباہی سے ڈرایا تھا لیکن یہ اتفاق جو خدا کا اشارہ بھی ہو سکتا تھا، کام کر گیا۔ قرار الحکم حقیقت پسند آدمی تھا۔ اس نے اسے کوئی معجزہ نہ سمجھا۔ البتہ اپنی بیوی کے متعلق اسے یقین ہو گیا کہ عقیدے کی پکی ہے اور اس کا حسن جسمانی کم اور رُوحانی زیادہ ہے۔

الحکم خانہ بدوشوں کے ساتھ رہا۔ شادی کے دوسرے سال اُسکا پہلا بچہ پیدا ہُوا۔ اس کا نام انہوں نے سبکتگین رکھا۔ بچے کی ماں کا یہ وہم اور گہرا ہو گیا کہ یہ بچہ نام پیدا کرے گا۔ الحکم بعض اوقات اپنی بیوی کی باتیں سن کر ہنس پڑتا تھا۔

"تمہارا دل ابھی اس خانہ بدوش زندگی سے اچاٹ نہیں ہُوا؟" ___ ایک روز نوجوان بیوی نے قرار الحکم سے پوچھا۔

"میرا دل تو اچاٹ نہیں ہُوا" الحکم نے جواب دیا ___ "یہ سوچ آتی ہے کہ بچے کو میں اس جانوروں جیسی زندگی سے دُور لے جاؤں۔ یہ کیا زندگی ہے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنا اور خطروں سے بھاگتے پھرنا۔"

"مَیں جانتی تھی کہ میری یہ خواہش بھی پوری ہوگی" ___ اس کی بیوی نے کہا ___ "مَیں تمہاری دُنیا سے واقف نہیں۔ کیا کوئی ایسی جگہ مل سکتی ہے جہاں یہ بڑا ہو تو اسے کچھ پڑھایا لکھایا جا سکے؟"

"کسی کے گھر نوکری مل سکتی ہے" الحکم نے کہا ___ "خدا کی زمین تنگ نہیں۔

جس نے کچھ دیا وہ اس کی روزی بھی دے گا۔"

"مگر ہمیں چوری چھپے یہاں سے نکلنا پڑے گا" —— بچے کی ماں نے کہا —— "یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے کیونکہ تم مجھے مفت لے جا رہے ہو۔ تمہیں انہوں نے میری قیمت کے طور پر اپنے ساتھ رکھا تھا...... میں تمہیں طریقہ بتاتی ہوں۔ کل صبح لکڑیاں چننے کے بہانے نکلیں گے پھر واپس نہیں آئیں گے۔"

انہوں نے ایسے ہی کیا۔ اُس دن بچے کی عمر چھ ماہ ہو چکی تھی۔ میاں بیوی بچے کو اٹھا کر سب کو یہ بتا کر گئے کہ لکڑیاں چننے جا رہے ہیں۔ وہ دیر تک واپس نہ آئے تو بوڑھوں کو شک ہُوا۔ انہوں نے دو آدمیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے ان کی تلاش کو روانہ کر دیا۔ ایک شک تو یہ تھا کہ ڈاکوؤں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں۔ لڑکی کا حُسن اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اتفاق سے کسی مسافر نے گھوڑسواروں کو بتا دیا کہ اس نے ایک آدمی اور بڑی خوبصورت جوان لڑکی کو دودھ پیتا بچہ اٹھائے فلاں طرف جاتے دیکھا ہے۔

انہوں نے اس شک پر اُدھر کو گھوڑے دوڑا دیئے کہ الحکم اُن کی لڑکی کو کہیں اور لے جا رہا ہے۔ الحکم اور اس کی بیوی پیدل جا رہے تھے۔ راستہ ناہموار اور دشوار تھا۔ ان کے ایک طرف دریا تھا۔ انہیں گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ گھوم کے دیکھا۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑے آ رہے تھے۔ ذرا اور ...نے انہیں پہچان لیا۔ سواروں نے تلواریں نکال لی تھیں۔ اس ...ے کا پتہ چل گیا۔ الحکم نہتہ تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ ہتھیار ساتھ نہیں لایا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"دریا میں کود جاؤ" —— بیوی نے کہا۔

"پانی گہرا ہے"، الحکم نے کہا —— "تیز بھی ہے۔ وہ گھوڑے دریا میں ڈال دیں گے۔"

"میں کہتی ہوں دریا میں کود جاؤ" —— بیوی نے یوں کہا جیسے اُسے خدا سے اشارہ ملا ہو —— "بچے کو تم پکڑو۔ میں اس کے بغیر تیر سکوں گی۔"

الحکم نے اُس سے بچہ لیا۔ اُسے ایک ہاتھ پر اٹھایا، اور دریا میں اُتر گیا۔ بچے کو پانی سے اُوپر رکھا۔ وہ ایک ہاتھ اور ٹانگوں سے تیرنے لگا۔ اس کی بیوی بھی دریا میں اتری۔ دریا کا رُخ اُدھر ہی تھا جدھر وہ جا رہے تھے۔ سواروں نے گھوڑے کنارے پر روکے اور انہیں للکارا مگر وہ دریا کے وسط میں چلے گئے تھے۔ آگے پانی کم گہرا تھا۔ وہ نکل گئے۔

ایک شہر میں وہ داخل ہوئے تو ہر کسی کی نظریں اُن پر اٹھتی تھیں۔ یہ الحکم کی بیوی کی کشش تھی۔ چونکہ کپڑوں سے دونوں غریب اور پردیسی لگتے تھے اس لیے لڑکی لوگوں کو اور زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ مطلب یہ کہ بیبی کو کوڑیوں کے داموں خریدا بھی جا سکتا ہے اور اُسے بے خوف و خطر اغوا بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ اس لڑکی کی خوبصورتی کا ہی کرشمہ تھا کہ فوراً الحکم کو گھوڑوں کے ایک بہت بڑے سوداگر کے محل جیسے مکان میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے ساتھ اُسے اصطبل کے ساتھ ایک جھونپڑا بھی دے دیا گیا۔ الحکم اصطبل میں کام کرنے لگا۔ اس کی بیوی بچے کی خاطر جھونپڑے میں رہتی لیکن اُسے زیادہ دن فارغ نہ رہنے دیا گیا۔ اُسے محل میں کام کرنے کے لیے بُلا لیا گیا۔

اُسے ایک بڑھیا کے سپرد کیا گیا جس نے اُسے نہلایا اور اسے اپنے پاس سے ایسا لباس پہنایا جس میں اُس کے بازو اور اُوپر سے گردن اور سینے کا بالائی حصہ عُریاں رہتے۔ یہ شہزادیوں کا لباس تھا جو اُسے پسند نہ آیا لیکن بڑھیا نے اُسے کہا کہ آقا گندی خادمہ کو پسند نہیں کرتے۔ اس نے یہ لباس پہن لیا۔ اس میں اُسے خود شک ہونے لگا کہ وہ خانہ بدوشوں کی بیٹی نہیں۔ اس کے بال دُھل کر نکھرے اور اس کے شانوں پر بکھرنے تو اُسے پتہ چلا کہ اُس کے بال ریشم جیسے ملائم اور چمکدار ہیں۔

بُڑھیا اُسی وقت اُسے آقا کے پاس لے گئی۔ اُدھیڑ عمر آقا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس کے اشارے پر بڑھیا باہر نکل گئی۔ آقا نے لڑکی کو قریب بیٹھنے کو کہا۔ لڑکی کھڑی

رہی وہ آقا کی نیت سمجھ گئی۔ آقا نے اٹھ کر اُسے بازو سے پکڑا تو وہ بازو چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم خانہ بدوشوں کی لڑکی ہو۔" آقا نے کہا۔ "مگر اپنے آپ کو تم کسی بادشاہ کی بیٹی سمجھتی ہو۔ میں تم پر حکم نہیں چلا رہا۔ انعام دوں گا۔ شہزادی بنا کر رکھوں گا۔"

لڑکی دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ آقا کے چہرے پر غصہ صاف نظر آنے لگا۔

"میں سونے کے دینار ٹھکرا کر آئی ہوں۔" الحکم کی بیوی نے کہا۔ "اپنے آپ کو نیلام کرنا ہوتا تو شادی نہ کرتی۔ دریا تیر کر پار نہ کرتی۔ تم اپنی دس بیٹیاں میرے خاوند کو دے دو تو بھی تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔"

"خاوند سے ہاتھ دھو بیٹھو گی لڑکی!" آقا نے کہا۔ "بچے کو ترستی رہو گی۔۔۔۔ ادھر آؤ۔"

وہ باہر نکل گئی۔

آقا نے غصے سے گرج کر بڑھیا کو بلایا۔ اس کے خادم بھی بھاگے آئے اور حرم کی دو عورتیں بھی آ گئیں۔ اپنے آقا کا غصہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

"اگر وہ شرمارہی ہوتی تو اور بات تھی۔" آقا نے کہا۔ "وہ میری توہین کر گئی ہے۔"

"ہم اُسے گھسیٹ کر لاتے ہیں۔" ایک خادم نے

"نہیں۔" آقا نے کہا۔ "اس خانہ بدوش بھکارن کو وہ سزا دوں گا جس سے میرے گھر میں سب عبرت حاصل کریں۔" اس نے اپنے دو خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں کہا۔ "وہ جھونپڑہ دیکھ لو جس میں یہ بدبخت لڑکی رہتی ہے۔ آج رات اس کے خاوند کو قتل کر دو اور لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔ اس کے بچے کو تم جہاں چاہو پھینک دینا۔"

حرم کی جو دو عورتیں وہاں موجود تھیں، انہوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ماتھوں پر شکن آ گئے۔ آقا غصے سے پھنکار رہا تھا۔ "کوئی شہزادی ہوتی تو میں برداشت کر لیتا۔ کم بخت خانہ بدوش کی یہ جرأت؟ ... سب چلے جاؤ۔"

الحکم کے قتل اور اس کی بیوی کے اغوا کا وقت رات گہری ہونے کے بعد کا رکھا گیا۔ سورج غروب ہوا تو الحکم اپنے جھونپڑے میں آیا۔ اس کی بیوی اپنے کپڑوں میں تھی۔ وہ بڑھیا کا پہنایا ہوا ریشمی لباس اُسی کے کمرے میں پھینک آئی تھی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اپنے خاوند کو آج کی واردات بتائے یا نہ بتائے مگر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ یہاں ایک اور دن بھی نہیں گزارے گی۔ اسے خاوند کو وجہ بھی بتانی تھی کہ وہ کیوں نہیں رہنا چاہتی۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آج رات اپنے خاوند کو آخری بار زندہ دیکھ رہی ہے اور بچہ بھی اس سے چھن جائے گا۔

اُس نے الحکم کے آگے کھانا رکھا تو جھونپڑے میں ایک عورت داخل ہوئی۔

اُس نے جھونپڑے کا دروازہ بند کر دیا اور الحکم سے کہا۔ "کھانا ختم کرو اور اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ شہر میں نہ ٹھہرنا۔"

یہ عورت اُن دو میں سے ایک تھی جو آقا کی گرج سن کر اُس کے کمرے میں گئی تھیں۔ یہ آقا کی منظورِ نظر تھیں۔ انہوں نے الحکم کی بیوی کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے جب آقا کا یہ حکم سنا کہ الحکم کو قتل اور اس کی بیوی کو اغوا کر لیا جائے تو دونوں نے تنہائی میں میاں بیوی کو بچا لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں کو اپنا اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ انہوں نے شادی کے خواب دیکھے تھے مگر اس شخص کی بے نکاحی بیویاں بنیں۔ یہاں سے وہ بھاگ نہیں سکتی تھیں۔ یہاں دولت اور اثر و رسوخ کی حکومت تھی۔ اثر و رسوخ اُسے حاصل ہوتا تھا جس کے حرم میں رونق زیادہ ہوتی تھی۔ ان دونوں نے اپنی قسمت کو قبول کر لیا تھا۔ گناہوں کی دنیا میں آ کر وہ سراپا فریب بن گئی تھیں۔ انہوں نے آقا کو حاکموں میں مقبول بنانے کے لیے اپنے جادو چلائے تھے۔ حرم کی سازشوں اور سیاست میں وہ پیش پیش تھیں اور اپنی خوبیوں اور فریب کاریوں کی بدولت آقا پر چھا گئی تھیں مگر ان کے اندر وہ عورت مر نہ سکی جو ایک خاوند اور مسرتوں سے معمور ازدواجی زندگی کی متمنی ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کے تقاضے دبائے نہ جا سکے۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک اور معصوم لڑکی جو ایک دودھ پیتے بچے کی ماں بھی ہے، غریب اور پردیسی بھی ہے، ایک انسان کی ہوس کا شکار ہو رہی ہے۔ وہ خود تو لڑکپن

میں معصومیت اور اپنے خوابوں کو بچا نہیں سکی تھیں، انہوں نے اس لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ تو خدائے ذوالجلال کا تھا کہ اس بچے کی ماں گناہ کے پرستاروں سے محفوظ رہے۔ اس کے لیے خدا نے ان دو عورتوں کو سبب بنایا جو گناہوں میں ڈوب چکی تھیں۔ یہ الحکم کی بیوی کے ایمان کا کرشمہ تھا۔

"میں زیادہ دیر یہاں رُک نہیں سکتی۔ اس سے زیادہ کچھ بتا نہیں سکتی" — عورت نے کہا۔ "فوراً نکل جاؤ" — اور وہ چلی گئی۔

الحکم نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے اُسے بتا دیا کہ آج دن اس پر کیا گزری ہے مگر الحکم سوچ میں پڑ گیا۔ بیوی نے اسے کہا کہ اٹھو چلیں۔ الحکم چلنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ یہ عورت اس گھر کی خادمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ کسی اور نیت سے یہاں آئی تھی۔ الحکم نے کہا کہ وہ آقا سے ملے گا۔ بیوی ضد کرنے لگی کہ انہیں یہاں نہیں رکنا چاہیئے۔

وہ دو آدمی جنہیں قتل اور اغوا پر مامور کیا گیا تھا شراب پی رہے تھے۔ ہتھیار ان کے پاس تھے۔ ایک غریب کا قتل اور اس کی بیوی کو اٹھا لانا ان کے لیے کوئی مہم نہیں تھی۔ انہوں نے شام سے پہلے جھونپڑی دیکھ لی تھی۔ انہیں کسی قانون کا ڈر نہیں تھا۔ وہ خوش تھے کہ انہیں انعام ملنے کا ذریعہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اُٹھے اور الحکم کی جھونپڑی کی طرف چل پڑے۔ وہ ہنستے کھیلتے جا رہے تھے۔ جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم لڑکی کو پکڑ لینا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ایک نے گرج کر کہا — "اُٹھو اوئے" — مگر اندھیرے میں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ جواب میں کوئی آواز نہ سنائی دی۔ انہوں نے ایک بار پھر للکارا۔ اب کے بھی خاموشی رہی۔ اندھیرے میں ٹٹولا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شاید غلط جھونپڑے میں آ گئے تھے۔ وہ دوسرے جھونپڑے دیکھنے چلے گئے۔

الحکم اور اس کی بیوی شہر سے نکل گئے تھے۔

"ہم پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی ہے" — الحکم نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"مایوس نہ ہو میرے بچے کے باپ!" — اس کی بیوی نے کہا۔ "تم یہ تو نہیں مانتے کہ مجھے خدا کی طرف سے اشارے ملتے ہیں۔ مجھے خدا کی ذات پر یہ اعتماد ہے کہ ہم گناہگار نہیں تو ہمیں سزا نہیں مل سکتی۔ میرے دل میں کوئی خوف نہیں۔ میں نے اُس بچے کو جنم دینا ہے جس کا اشارہ مجھے قرآن سے ملا ہے۔"

"تم پاگل ہو" — الحکم نے اسے غصے سے کہا۔ "خدا ہم پر اسی لیے ناراض ہے کہ تم دعویٰ کرتی ہو کہ تم نے پیغمبر کو جنم دینا ہے۔ یہ خبط دماغ سے نکال دو۔ قرآن کو تعویذ نہ سمجھو۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ تم سے شادی کر لی ہے۔ بیوی بدصورت ہو تو اچھی رہتی ہے۔ اب میں تمہاری حفاظت کروں یا کہیں کام کر کے تمہارا پیٹ بھروں۔"

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں" — اس کی بیوی نے کہا۔ "تم قرآن کے معنی بھی جانتے ہو اور ایسی باتیں کرتے ہو۔"

الحکم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل پر افسوس اور غصے کا قبضہ تھا۔ اس نے مذہب اور خدا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

"واپس چلے چلیں؟" — الحکم نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"تمہارے قبیلے میں" — الحکم نے جواب دیا — "وہ لوگ وہیں ہوں گے یا کہیں چل جائیں گے؟"

"پھر کیوں نہ گھوڑوں والے آقا کے پاس چلے جائیں" — اس کی بیوی نے کہا — "میں اپنے جسم سے تمہیں بہت دولت کما دوں گی۔ تم آنکھیں بند رکھنا یہی سمجھتے رہنا کہ تمہاری بیوی نیک اور پاک ہے۔۔۔ کیا تم مرد ہو؟ کیسے مرد ہو؟ میں اپنے بچے کو تم جیسا مرد نہیں بننے دوں گی۔"

"پہلے یہ دعا کرو کہ بچہ زندہ رہے" — الحکم نے غصے سے کہا۔

"یہ بچہ زندہ رہے گا، اور ایک روز ابراہیمؑ کی طرح تمہیں کہے گا کہ میرے باپ! جو علم مجھے ملا ہے وہ خدا نے تمہیں نہیں دیا۔ میرے ساتھ آ جاؤ، میں تمہیں سیدھے راستے

پڑے جاؤں گا۔" وہ کچھ نہ کچھ بولتی رہی اور دونوں چلتے گئے۔ اس کی حالت ہذیانی سی ہوتی جا رہی تھی جیسے زبان بے قابو ہو گئی ہو۔ الحکم پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

اُس رات سے ان کی زندگی خانہ بدوشی کی صورت اختیار کر گئی۔ فرق یہ تھا کہ وہ جنگلوں کی بجائے شہروں میں رہتے تھے۔ الحکم کو کہیں نہ کہیں نوکری مل جاتی تھی۔ سال دو سال کچھ کما کر وہ کہیں اور چلے جاتے تھے۔ بچہ چار سال کا ہوا تو اس کی ماں نے الحکم سے کہا کہ اب کہیں مستقل ٹھکانہ کر لیں جہاں بچے کو کسی مسجد یا کسی استاد کے پاس بٹھا دیا جائے ورنہ یہ بھی بڑا ہو کر ہماری طرح دربدر مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایک آدھ سال پہلے ماں باپ نے بچے کو قرآن کے سبق دینے شروع کر دیئے تھے۔ ماں بچے کو بڑی غور سے دیکھتی رہتی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ بچہ اسی عمر میں عقل کی باتیں کرنے لگا تھا۔ سبق میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ ماں اسے صاف ستھرا رکھتی تھی۔

کسی قصبے میں ماں کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ وہاں کی مسجد کے امام نے بچے کو اپنی شاگردی میں بٹھا لیا۔ بچے کی ماں اور اس کا باپ امام کی خدمت اور مسجد کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ امام جب پہلے روز بچے کو پڑھانے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی عام بچے کو سبق نہیں دے رہا۔ الحکم مذہبی تعلیم کے پہلے مرحلے سے بچے کو گزار لایا تھا۔ امام اسے اگلے مرحلے میں لے گیا جہاں پانچ چھ سال کی عمر کے بچے نہیں جا سکتے۔ بچہ جو سوال پوچھتا تھا، ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی پیدائش کے ساتھ خدا سے کچھ علم بھی لایا تھا۔

یہاں بچے نے کم و بیش چار سال تعلیم حاصل کی۔

بچے کی عمر دس گیارہ سال ہو چکی تھی۔ وہ قرآن اور اس کی تفسیر اور حدیث پڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے استاد سے مزید تعلیم لینا چاہی تو استاد نے کہا "یہاں میرا علم ختم ہو گیا ہے" — بچہ ایک سوال پر سر پیٹ رہا تھا — "علم بغیر عمل کے مکمل ہو سکتا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام بزورِ شمشیر جائز ہے؟ میں ساری دنیا میں قرآن کا پیغام کس طرح پہنچا سکتا ہوں؟" — اور ایسے بہت سے سوال تھے جو بچہ پوچھتا تھا اور امام پریشان ہو جاتا تھا۔

"قرار الحکم!" — ایک روز امام نے بچے کے باپ سے کہا — "بچے کو بخارا لے جاؤ —

اس نے کسی عالم کا نام لے کر کہا "اسے ان کی شاگردی میں بٹھا دو۔ اگر بچے کی یہ تشنگی نہ بجھی تو یہ پاگل ہو جائے گا۔ اس میں سپاہیانہ جوہر بھی ہیں۔ علم کے ساتھ اگر اس نے سپہ گری سیکھ لی تو یہ بچہ نام پیدا کرے گا۔ یہ دور جنگ و جدل کا ہے۔ مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور کفار مسلمانوں کو غلام بنانے اور اسلام کو مٹانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔ غریبوں کی قسمت اتنی اچھی تو نہیں ہوتی لیکن اس بچے کو موقع مل جائے تو یہ کسی خطے میں اللہ کی حکمرانی قائم کر دے گا، مگر اسے ایسا موقع مل نہیں سکے گا۔ یہ عدل و انصاف کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسے ایسا سبق کبھی نہیں دیا تھا۔"

"یہ سبق اسے میں نے دیا ہے" — قرار الحکم نے کہا — "میں کم علم انسان ہوں۔ میں ایران کے بادشاہ نوشیرواں عادل کی نسل سے ہوں۔ باپ دادا مجھے اُس دور کی جو باتیں سناتے تھے وہ میں اس بچے کو سناتا رہتا ہوں۔ قرآن میں بھی اس نے یہی پڑھا ہے۔"

"اسے بخارا لے جاؤ" — امام نے کہا — "میں خط لکھ دیتا ہوں۔ وہاں تمہیں بڑا اچھا ذریعہ معاش بھی مل جائے گا.... اور خیال رکھنا۔ اکیلے نہ چل پڑنا۔ ان علاقوں میں ڈاکوؤں اور رہزنوں کا بہت خطرہ ہے۔ تمہارے پاس کوئی دولت نہیں لیکن تمہاری بیوی بہت قیمتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ بچے بھی اغوا ہوتے اور غلاموں کی منڈی میں فروخت ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے دن رک جاؤ۔ کوئی قافلہ تیار ہو جائے تو اس کے ساتھ جانا۔"

اُس زمانے میں لوگ ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے۔ اکیلے دکیلے مسافر رہزنوں کے ہاتھوں لُٹ جاتے تھے۔ کبھی کبھی قافلوں پر بھی حملے ہوتے تھے لیکن قافلے والے مل کر مقابلہ کرتے، باقاعدہ معرکہ لڑا جاتا اور بچ نکلنے کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ خوبصورت عورتوں اور کمسن بچوں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ جن حاکموں اور بادشاہوں کو ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنا چاہیے تھا وہی ان کی اغوا کی ہوئی عورتوں اور بچوں کے خریدار ہوتے تھے۔ امام نے ٹھیک کہا تھا۔ الحکم کی بیوی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کا بچہ کمسنی کی وجہ سے ایک دولت تھی جو اکیلے سفر کرتے لُٹ سکتی تھی۔

کوئی قافلہ تیار نہ ہوا، ایک قافلہ وہاں سے گزرا جس میں دو سو مرد، عورتیں اور بچے تھے۔ ان میں زیادہ تر سوداگر تھے جو اپنے محافظ ساتھ لائے تھے۔ وہ بلخ اور بخارا جا رہے تھے۔ الحکم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ قافلے میں شامل ہو گیا۔

سفر کی پہلی رات آئی۔ قافلے نے ایک وادی میں پڑاؤ کیا۔ کھانا پکا، سب نے کھایا اور دن کی مسافت کے تھکے ماندے مسافر سو گئے۔ تین چار آدمی پہرے پر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ پہرہ دار چٹانوں پر اور خیمہ گاہ کے ارد گرد گھوم پھر رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب انہیں گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیئے جو اُن کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ پہرہ داروں نے کمانوں میں تیر ڈال لیے اور چند ایک ایسے آدمیوں کو جگا لیا جو جوان تھے۔ قریب آنے والی آوازیں کسی قافلے کی نہیں تھیں۔ یہ کسی محاذ کو جاتی ہوئی فوج ہو سکتی تھی یا ڈاکو۔

وادی میں مشعلیں نظر آنے لگیں۔ یہ سواروں کے ہاتھوں میں تھیں۔ سواروں نے قریب آ کر گیدڑوں اور بھیڑیوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ پہرہ داروں نے تیر چلا دیئے۔ ایک دو سوار گرے لیکن ڈاکو طوفان کی طرح آئے۔ بعض مسافروں کو جاگنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ گھوڑوں تلے کچلے گئے۔ قافلے میں جو لڑنے کے قابل تھے، انہوں نے مقابلہ کیا۔ ڈاکوؤں نے مشعلیں پھینک دی تھیں جو زمین پر پڑی جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں ساری وادی نظر آتی تھی۔ ماؤں نے بچوں کو سینوں سے لگایا اور جدھر منہ آیا بھاگ اٹھیں۔ بعض بچے چیختے چلاتے اکیلے اکیلے بھاگ اٹھے۔

الحکم نے اپنی بیوی کو بازو سے پکڑا اور اُسے کسی طرف گھسیٹ کر لے گیا۔ بچہ اُن کے ساتھ چلا تھا لیکن الحکم اپنی بیوی کو بڑی مشکل سے ایک چٹان کے پیچھے لے گیا تو وہاں دیکھا کہ بچہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ماں نے واویلا بپا کیا تو الحکم نے اُسے سختی سے کہا کہ وہ خاموشی سے چھپی رہے ورنہ ڈاکو اسے پکڑ لے جائیں گے۔ اسے جھاڑیوں میں چھپا کر الحکم اپنے بچے کی تلاش میں نکلا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ آگے بڑھنے سے ڈرتا بھی تھا۔ خیمہ گاہ میں قتل و غارت ہو رہی تھی۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ بچے چلا رہے تھے۔ ڈاکو

گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔ اور وہ سامان سمیٹ رہے تھے، اور ان میں سے بعض اپنے کام کی عورتوں اور بچوں کو لے جا رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے گھوڑے چلے گئے، اور ان کے ساتھ قافلے کے گھوڑے اور اونٹ بھی چلے گئے۔ رات گزر گئی۔ صبح بچے کھچے لوگ جو رات اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے، باہر آئے۔ خیمہ گاہ میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ قیمتی سامان اور تمام جانور غائب تھے۔ کچھ بچے مرے ہوئے اور کئی لاپتہ تھے، اور جوان عورتیں صرف وہ موجود تھیں جنہیں بھاگنے اور چھپنے کا موقع مل گیا تھا۔ ان میں الحکم کی بیوی بھی تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اُسے بچہ تو نہ ملا، بچے کا باپ مل گیا مگر وہ زندہ نہیں تھا۔ اُس کے پہلو میں برچھی یا تلوار لگی تھی۔ لاش خون میں لت پت تھی۔ بیوی بالکل ہی پاگل ہو گئی۔ لاشوں کو بکھرے ہوئے سامان اور گرے ہوئے خیموں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ہر کسی سے پوچھنے لگی۔ "تم نے میرا بچہ دیکھا ہے؟ سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔"

وہاں سب کی حالت ایسی تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ چٹانوں پر چڑھی، اتری، جھاڑیوں کو ٹٹولتی پھرتی، وادیوں میں بھاگتی پھری، اس کی دلدوز اور جگر پاش آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی —"سبکتگین ..... سبکتگین ..... آ جاؤ۔ اپنی ماں کے پاس آ جاؤ"—

قافلہ خوف سے کانپتا، آہ و زاری کرتا چل پڑا، چلتا گیا اور ویرانوں میں غائب ہو گیا۔ پیچھے جب گدھوں، بھیڑیوں اور گیدڑوں نے لاشوں اور جاں بلب زخمیوں پر ہلہ بولا، وادیوں میں ایک نسوانی پکار سنائی دے رہی تھی — "سبکتگین ..... سبکتگین!" — اور جب دو چار روز بعد وہاں بکھری ہوئی ہڈیاں رہ گئیں تو بھی یہ نسوانی پکار سنائی دیتی رہی — "اپنی ماں کے پاس آ جاؤ ..... سبکتگین ..... سبکتگین"

اس راستے سے گزرنے والے قافلے، ڈاکو، رہزن اور فوجی بہت مدت تک یہ پکار سنتے رہے۔ انہوں نے کئی کہانیاں گھڑ لیں اور اس آواز کو کسی کی بدروح کہہ کر ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا۔

قراالکم مر گیا تھا۔ زندہ ہوتا تو اپنی بیوی کو وہاں سے گھسیٹ کر لے جاتا اور اسے بتاتا کہ غریبوں کے بیٹے باطل شکن نہیں شکم پرور ہوا کرتے ہیں۔ تم دل میں جس خواہش کو جگر کے خون سے سینچتی رہی ہو وہ پوری ہونے والی تھی ہی نہیں۔ یہ خواہش وہم بن کر تمہیں کبھی سفید ریش اور نورانی چہرے والے بزرگ کی صورت میں نظر آتی رہی، کبھی تم نے خواب دیکھے اور انہیں حقیقت سمجھ لیا۔ جہاں دولت، دھوکے اور گناہ کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں عقل و دانش والوں کی قسمت سو جاتی ہے۔ امام وہ پیدا کرتے ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ میرے بچے کی ماں! قرآن کے اشارے ہم جیسے خانہ بدوشوں کے بچوں کے لیے نہیں ہوتے۔

وہ خواہش تھی یا وہم، خواب تھا یا حقیقت، جو کچھ بھی تھا، قراالکم کی بیوی کے ساتھ چلا گیا تھا، اور اس پکار میں سمٹ آیا تھا — "سبکتگین...... سبکتگین" جسے لوگ کسی کی بدروح کی آواز سمجھتے رہے۔ پھر یہ ماں اور اس کی پکار تاریخ کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

اسلام نے غلاموں کی خرید و فروخت اور کسی کو غلام بنا کر رکھنے کی ممانعت کر دی تھی مگر یہ احکام خلافتِ راشدہ سے آگے نہ چل سکے۔ خلافت تو قائم رہی مگر شہنشاہیت کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر سازشوں کا مرکز بنی۔ سلطنتِ اسلامیہ مملکتوں اور ریاستوں میں بٹ گئی، اور خلافت برائے نام رہ گئی۔ خلیفہ کی کوئی قوت نہیں تھی۔ کسی کا جی چاہتا تو خلافت کا احترام کرتا تھا۔ ورنہ من مانی کا دور دورہ تھا۔ حرم اور غلامی کی بدعتیں پھر سے شروع ہو گئیں۔ دولت والوں کے حرموں میں لڑکیاں اور کام کرنے کے لیے غلام ہوتے تھے۔ جس کے پاس لونڈیاں اور غلاموں کی افراط ہوتی اسے اتنا ہی دولت مند اور قابلِ احترام سمجھا جاتا۔

بخارا کے ایک میدان میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بولیاں دی جا رہی تھیں۔ کچھ نیلام ہو رہا تھا۔ ہجوم کے سامنے چند ایک خیمے کھڑے تھے۔ ان کے آگے لکڑی کا چبوترہ تھا۔ تین چار لڑکیاں اس چبوترے پر کھڑی تھیں۔ ایک آدمی ایک لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے کہتا — "عمر بیس سال۔ سیدھی اپنے گھر سے آئی ہے۔ جسم دیکھو کوئی بیماری نہیں۔ کسی کے پاس نہیں رہی...... بولو...... تازہ مال ہے جی ایک سو دینار...... بہت تھوڑے ہیں...... بولو"

یہ لڑکیاں نیلام ہو رہی تھیں۔ خریداروں میں بردہ فروش بھی تھے، قحبہ خانوں والے، لڑکیوں کو رقص اور گانا سکھانے والے اور ان میں امرا و وزرا اور حاکموں کے حرموں کے کارندے بھی تھے۔

اس سے ذرا پرے ایک اور منڈی لگی ہوئی تھی۔ یہاں آدمی فروخت ہو رہے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے۔ خریدار انہیں یوں دیکھ رہے تھے جس طرح مویشی خریدنے سے پہلے دیکھے جاتے ہیں۔ قیمت بچوں کی زیادہ تھی۔ یہ آٹھ دس بچے تھے۔ سب رو رہے تھے۔ ان کی عمریں آٹھ سے بارہ تیرہ سال تک تھیں۔ صرف ایک بچہ ایسا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ چہرے پر اداسی تھی۔ یہ سب بچے اس قافلے سے اٹھائے گئے تھے جس کے ساتھ قراالکم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ جا رہا تھا۔ عورتیں بھی اسی قافلے کے ساتھ تھیں۔

یہ بچہ جو رو نہیں رہا تھا دوسروں سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تھا لیکن دوسروں کی نسبت اچھا لگتا تھا۔ اس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ خریداروں میں حاجی نصر نام کے ایک بڑے آدمی کے نوکر بھی موجود تھے۔ انہیں کسی وقت حاجی نصر نے کہا تھا کہ وہ پختہ عمر کے غلاموں کی بجائے دو چار بچے خریدنا چاہتا ہے تاکہ انہیں اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکے اور وہ بڑے ہو کر وفادار رہیں۔ اس کے ان خاص آدمیوں نے بچوں کو دیکھا تو فوراً حاجی نصر کو اطلاع دی۔ وہ آیا۔ اس نے ہر ایک بچے کو دیکھا۔ ان کے رونے سے وہ گھبرا گیا۔ اسے یہ بچہ پسند آیا جو اداس تھا، رو نہیں رہا تھا۔

"ان رونے والے بچوں میں خوبصورت بھی ہیں مگر انہیں بہلانا آسان نہیں ہوگا" — حاجی نصر نے اپنے آدمیوں سے کہا — "یہ بچہ لے لیتے ہیں۔"

اس نے بچہ خرید لیا۔ بچہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بچے کو گھر لے گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے بچے؟" — گھر لے جا کر حاجی نصر نے پوچھا۔

"سبکتگین!"

"تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟"

"معلوم نہیں" — سبکتگین نے جواب دیا — "میں سویا ہوا تھا۔ قافلے پر حملہ ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔ گھوڑے ہمارے درمیان سے گزر گئے۔ میں بھاگ اٹھا۔ ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا اور وہاں سے دور لے جا کر میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ دیئے۔ پھر ہمیں یہاں لے آئے۔"

"تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

"امیروں کے گھروں میں نوکری چاکری۔"

"تم روئے کیوں نہیں رہے؟"

"جواب دینے سے پہلے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟"

"میں مسلمان ہوں" — حاجی نصر نے جواب دیا — "میں حاجی ہوں۔"

"پھر مجھے نہیں بلکہ آپ کو رونا چاہیئے۔" بچے نے جواب دیا — "آپ کا حج قبول نہیں ہوا۔ مجھے میرے باپ نے بتایا تھا کہ قرآنِ حکیم کا یہ حکم ہے کہ کوئی انسان کسی انسان کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں رو کیوں نہیں رہا.... مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ روؤں یا ہنسوں یا کیا کروں۔ اگر میری عمر آپ کی طرح پختہ ہوتی تو میرے لیے فیصلہ کرنا آسان ہوتا۔"

حاجی نصر پھڑک اٹھا۔ اُسے قطعاً توقع نہ تھی کہ اس عمر کا بچہ ایسی عقلمندی سے جواب دے گا۔ اُس نے بچے سے پوچھا کہ اسے یہ باتیں کس نے بتائی ہیں۔ بچے نے جواب دیا کہ اس کا استاد ایک امام مسجد ہے۔ اُس نے امام کا نام بتایا اور کہا — "میرے باپ نے مجھے عدل و انصاف کے بہت سبق دیئے ہیں جو کہانیوں کی شکل میں تھے۔ میرا باپ کہا کرتا تھا کہ وہ نوشیرواں عادل کی اولاد سے ہے۔ میری ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ اُسے خوابوں میں ایک نورانی صورت بزرگ نظر آتے ہیں جو اسے بتاتے ہیں کہ وہ ایک بچے کو جنم دے گی جو باطل شکن ہوگا اور حق کی آواز دُور دُور تک پہنچائے گا۔ بزرگ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بچہ میں نہ ہوا تو وہ میری اولاد سے ہوگا۔"

"تم اپنی ماں کے اس عقیدے پر یقین رکھتے ہو؟"

"اپنی ماں کے عقیدے پر میں کس طرح یقین رکھ سکتا ہوں" — سبکتگین نے جواب دیا — "غلام کا کیا عقیدہ ہو سکتا ہے؟ کیا آپ نے مجھے جانور سمجھ کر نہیں خریدا؟ جانوروں کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا۔"

"بیشک تم میرے غلام ہو لیکن میں جانوروں کی سطح سے تمہیں بہت اوپر رکھوں گا" — حاجی نصر نے کہا — "تم کوئی کام کر سکتے ہو؟"

"مجھے ماں باپ بخارا کے کسی عالم کے پاس لے جا رہے تھے" — بچے نے جواب دیا — "میرے استاد نے انہیں کہا تھا کہ مجھے بخارا لے جا کر اس عالم کی شاگردی میں بٹھا دیں۔"

"میں تمہیں اپنے بچوں کے اتالیق کے حوالے کر دیتا ہوں" — حاجی نصر نے بچے سے متاثر ہو کر کہا — "تم اس کے نوکر ہو گے اور تم ان سے تعلیم و تربیت بھی لے سکو گے۔"

سبکتگین کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "پند نامہ" میں مختصر سا ذکر ہے کہ وہ تین سال کشب میں رہا۔ اس دوران حاجی نصر کشب سے باہر رہا۔ کتاب الانساب میں کچھ تفصیل ملتی ہے۔ سبکتگین بیمار ہو گیا تو حاجی نصر نے اسے کشب میں ہی رہنے دیا اور خود غیر حاضر رہا۔ کسی بھی پرانی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حاجی نصر کا منصب یا کاروبار کیا تھا، سوائے اس کے کہ وہ امیر کبیر اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔

سبکتگین جب اتالیق کے پاس گیا تو اتالیق نے اسے ایک نوکر یا غلام سے بڑھ کر کوئی اہمیت نہ دی لیکن پہلے ہی روز بچے نے اپنی اہمیت جتا دی۔ اتالیق بے خبر تھا اور حاجی نصر کے ایک بچے نے قرآن کا کوئی لفظ غلط پڑھا۔ سبکتگین نے خود بچے کی تصحیح کرنے کی بجائے اتالیق کو بتایا۔ اتالیق حیران ہوا کہ یہ بچہ ہے اور نوکر ہے اور یہ قرآن پڑھنے والے کی غلطی درست کر سکتا ہے۔ اس نے سبکتگین سے پوچھا کہ اس نے قرآن کہاں پڑھا ہے۔ سبکتگین نے اسے اپنے متعلق، اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اتالیق نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ حاجی نصر اپنے بچوں کو مذہب کی اتنی زیادہ تعلیم نہیں دلانا چاہتا تھا جتنا انہیں سپاہی بنانے کا ارادہ تھا۔ بچوں کو گھوڑ

صلا۔ تاریخِ کامل، ابن اثیر۔ کتاب الانساب، پند نامہ (مصنفہ سبکتگین)

سواری، تیر اندازی اور تیغ زنی بھی سکھائی جاتی تھی۔ سبکتگین نے بھی سپہ گری کی تربیت لینی شروع کر دی۔

بچے اسے بہت پسند کرتے تھے، کیونکہ وہ ہنس مکھ تھا اور باتیں بہت اچھی کرتا تھا۔ آتالیق نے دیکھا کہ حاجی نصر کے بچے باپ کی دولت کی وجہ سے نہ پڑھنے میں دلچسپی لیتے تھے نہ سپہ گری میں، اور سبکتگین میں عسکری جوہر موجود تھے۔ اتالیق نے اس کی تربیت میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔

چودہ برس کی عمر میں سبکتگین پختہ کار سپاہی بن چکا تھا اور علم بھی اس نے بہت حاصل کر لیا تھا۔ آتالیق نے اسے اسلام کی تاریخ سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

حاجی نصر واپس آیا تو وہ سبکتگین کو پہچان نہ سکا۔ وہ اب بارہ سال کی عمر کا لڑکا نہیں بلکہ قد آور جوان تھا۔ حاجی نصر نے اس کی سپہ گری کی مہارت اور گھوڑسواری دیکھی تو وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اسے حاجی نصر نے کوئی عسکری قسم کا کام دے دیا۔ بعض تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے غلاموں کی تربیت اور نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ تھوڑے سے وقت میں حاجی نصر کا دست راست بن گیا۔

اُس وقت الپتگین بخارا کا گورنر تھا اور حکومت عبدالملک کی تھی۔ الپتگین حاجی نصر کا دوست تھا۔ ۹۵۹ء (۳۴۸ھ) میں حاجی نصر الپتگین سے ملنے گیا تو سبکتگین اس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت سبکتگین کی عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ (بعض مؤرخ عمر زیادہ بتاتے ہیں) یہ پہلا موقعہ تھا کہ خانہ بدوشوں کا بیٹا جسے ڈاکوؤں نے اغوا کیا اور فروخت کر کے غلام بنایا تھا، ایک گورنر سے ملا۔ گورنر الپتگین نے حاجی نصر سے کہا کہ وہ اپنا یہ غلام اسے دے دے۔ حاجی نصر ایسے قیمتی غلام سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ الپتگین نے اسے بہت زیادہ قیمت پیش کی جو حاجی نصر نے قبول کر لی۔

اُس دور میں الپتگین، سبکتگین، بلبتگین قسم کے نام ترکوں کے ہوا کرتے تھے۔ سبکتگین کی چونکہ ماں ترک تھی اس لیے اس کا نام ماں نے ترکوں کے رواج کے مطابق رکھا تھا۔ اُس وقت ترکی میں اسلام پھیلا نہیں تھا۔ کوئی کوئی گھرانہ یا کوئی کوئی

آدمی مسلمان تھا۔ حکومت ایسی ظالم تھی کہ لوگ ترکی سے دوسرے علاقوں کو بھاگے جا رہے تھے۔ ان میں سے بعض خانہ بدوش ہو گئے اور باقی غلاموں کی منڈی میں فروخت ہوئے۔ ترک چونکہ جسمانی لحاظ سے تنومند اور دماغی لحاظ سے مستعد اور عقلمند ہوتے تھے، اس لیے ان کی قیمت زیادہ تھی۔ ان کے رنگ گورے ہونے کی وجہ سے اچھے بھی لگتے تھے۔ غزنی، بلخ، بخارا اور گردو نواح کے علاقوں میں ترک غلام مشہور تھے اور ترکوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ غلام ہی ہوتے ہیں اور یہ بڑے اچھے غلام ہوتے ہیں۔

"تم ان ترک غلاموں میں سے ہو جن کے متعلق ان علاقوں کے لوگ کہتے ہیں کہ بڑے اچھے ہوتے ہیں"۔۔۔ الپتگین نے سبکتگین سے کہا جو اس کے دربار میں غلاموں کی طرح کھڑا تھا۔۔۔ "تم مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم وفادار غلام ہو؟"۔۔۔ وہ چپ ہو گیا۔

سبکتگین نئے آقا کے سامنے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ الپتگین اس کے قریب آ کر گرج کر بولا۔۔۔ "سر اوپر کرو، سینہ پورا کھولو، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ تم ترک ہو، میں بھی ترک ہوں"۔۔۔ سبکتگین اس گرج سے چونک اٹھا۔ الپتگین نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

"حاجی نصر نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے پاس علم بھی ہے عمل بھی"۔۔۔ الپتگین نے اسے کہا۔۔۔ "انسان صرف علم سے مکمل نہیں ہوتا نہ صرف عمل سے مکمل ہوتا ہے۔ اصل وصف عمل ہے مگر علم کے بغیر یا کسی عالم کی راہنمائی کے بغیر عمل ناکام رہتا ہے اور صرف علم انسان کو گوشہ تنہائی میں چھپائے رکھتا ہے۔ تم میں دونوں وصف ہیں"۔

"مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں جس سے اتنے بڑے ملک کا حاکم متاثر ہو"۔۔۔ سبکتگین نے کہا۔

"تم میں یہی خوبی کچھ کم نہیں کہ تم ترک ہو اور تم غلام ہو"۔۔۔ الپتگین نے کہا۔۔۔ "میں بھی ترک ہوں اور میں بھی غلام تھا۔ تم پر جو گزر رہی ہے وہ مجھ پر گزر چکی ہے۔ میرا لڑکپن ویسا ہی گزرا ہے جیسا تمہارا گزرا ہے۔ تم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے ہو، میرے ماں باپ مسلمان نہیں تھے۔ میں غلامی میں مسلمان ہوا کسی نے مجھے پکا مسلمان

نہیں بنایا تھا۔ میں نے ایک عالم سے اسلام کے اصول سنے تھے۔ میرے دل میں تڑپ
تھی، پیاس سی تھی۔ میں نے اس عالم کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اسلام قبول کیا۔ اُس نے
مجھے بتایا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا زر خرید غلام
بنائے اور یہ جو حکمران اور حاکم ہوتے ہیں انہیں خدا نے لوگوں کا اور قوم کا خادم کہا ہے
حکومت صرف اللہ کی ہے ..... اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور اگر میرے دل میں علم اور عمل
کی تڑپ نہ ہوتی تو میں اس منصب تک نہ پہنچ سکتا۔"

"میری ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ تم بڑے ہو کر نام پیدا کرو گے" — سبکتگین نے کہا۔
"وہ کہتی تھی کہ تم حق کی تلوار سے باطل کو کاٹو گے۔ وہ مجھے قرآن کی یہ آیت بار بار سکھاتی
اور سناتی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا کہ تم اپنے بنائے ہوئے
خداؤں کو پوجتے ہو جو سن نہیں سکتے، جو بول نہیں سکتے۔ آؤ میں تمہیں صحیح راستہ دکھاؤں
گا..... ماں مجھے کہا کرتی تھی کہ تم اُن لوگوں کو جو اُن خداؤں کو پوجتے ہیں جو نہ سن سکتے
ہیں نہ بول سکتے ہیں، اُس معبود کی راہ دکھاؤ گے جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں
اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں..... میرا باپ کہا کرتا تھا کہ تمہاری
ماں کا عقیدہ صحیح ہے لیکن اس کی خواہش غلط ہے۔ غریب کا بچہ نام پیدا نہیں کر سکتا اور
اس میں جرأت اور ہمت نہیں ہوتی کہ وہ بادشاہوں سے ٹکر لے اور لوگوں کو اپنے
عقیدے کا قائل کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ ہو سکتا ہے" — الپتگین نے کہا۔ "عرب کے شتربان اور گڈریئے آدھی
دنیا سے اپنا عقیدہ منوا کر اللہ کی حکومت قائم کر سکتے ہیں تو بخارا کا امیر الامراء کیا
نہیں کر سکتا! تم خانہ بدوشوں کے بیٹے اور غلام میری برابری میں کس طرح آ بیٹھے ہو؟
کوئی غلام ایسا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری ماں کے خواب حقیقت بن سکتے ہیں۔ یہاں
تک تمہیں تمہارے ایمان اور کردار نے پہنچایا ہے۔ میں نے تم میں وہ جوہر دیکھ لیے ہیں جو
تمہیں اور اوپر لے جائیں گے۔"

"لیکن مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیے" — سبکتگین نے کہا۔ "میں کسی
منصب کا خواہاں نہیں..... میں کچھ چاہتا ضرور ہوں مگر یہ نہیں جان سکا کہ میں

کیا چاہتا ہوں۔"

الپتگین ہنس پڑا اور بولا۔ "میں اس کیفیت میں سے گزر چکا ہوں۔ میں بھی
نہیں جانتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ پھر میرا ذہن صاف ہو گیا۔ تمہیں جلدی پتہ چل
جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو..... آج سے تم اپنے آپ کو غلام نہ سمجھو۔"

سبکتگین کے سینے میں ایک تڑپ، عقیدے کی اور کچھ سمجھنے اور کچھ کرنے کی تھی۔
اُسے اس کا کوئی غم نہ تھا کہ اس کی ماں نہیں، باپ نہیں اور وہ غلام ہے۔ اُس نے
یہ دیکھ لیا تھا کہ اُس کے اندر ایک عظیم مقصد پرورش پا رہا ہے اور اسے اپنے ذہن میں
واضح کرنا ہے۔ اس تڑپ کے ساتھ جوانی کی تپش تھی۔ وہ اپنے آپ میں جسمانی
قوت کا اُبال بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کی توجہ جوانی کے جذبات کی طرف تو نہیں
آتی تھی لیکن یہ تغیر اور یہ انقلاب اُسے بے چین رکھتا تھا۔

دوسری شام، سورج غروب ہونے سے پہلے وہ اصطبل سے ایک اعلیٰ
نسل کا گھوڑا لے کر سواری کے لیے باہر نکل گیا۔ شہر سے دُور جا کر اُس نے گھوڑا
سرپٹ دوڑا دیا اور اس سے جھاڑیاں پھلانگنے لگا۔ اسے دُور سے کسی عورت کی
چیخ سنائی دی اور گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز بھی۔ اُس نے اُدھر دیکھا۔ ایک
سوار گھوڑے سے گر رہا تھا۔ اور گھوڑا بے لگام ہو گیا تھا۔ سبکتگین سمجھ گیا کہ گھوڑے
کی زین ڈھیلی ہو گئی ہے اور سوار کے دائیں بائیں لڑھکنے اور سنبھلنے کی وجہ سے
گھوڑا ڈر کر بے قابو ہو گیا ہے۔ سبکتگین نے اپنے گھوڑے کا منہ اُدھر کر کے ایڑ لگائی۔

وہ گھوڑا کبھی دائیں کبھی بائیں کو جاتا تھا۔ سبکتگین نے دیکھ لیا کہ سوار مرد نہیں
عورت ہے۔ وہ چیخ چلا رہی تھی۔ سبکتگین کا گھوڑا اُس کے قریب پہنچا تو وہ چلانے
لگا۔ "رکابوں سے پاؤں نکال لو..... لگام کھلی چھوڑ دو۔" — بدکے ہوئے گھوڑے نے
جب اپنے تعاقب میں ایک اور گھوڑے کو دیکھا تو وہ اور زیادہ تیز ہو گیا۔ آگے ریگ
زار نشان تھا۔ گھوڑے کا رُخ اُدھر کو ہو گیا۔ سبکتگین نے اپنے گھوڑے کی رفتار اور
تیز کی اور گھوڑے کو بدکے ہوئے گھوڑے کے پہلو میں لے گیا۔ تب اُس نے دیکھا

کہ یہ کوئی جوان لڑکی ہے اور کسی امیر وزیر کی بیٹی ہو سکتی ہے۔ سبکتگین نے اُس کے گھوڑے کی باگ کو دہاں سے پکڑا جہاں گھوڑے کا منہ تھا اور اُس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس کے گھوڑے پر کود آئے۔

اس کوشش کے دوران گھوڑے دریا میں چلے گئے۔ لڑکی پانی میں گر پڑی کیونکہ گھوڑے ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ دونوں رُک گئے۔ سبکتگین دریا میں کودا۔ لڑکی تیر رہی تھی۔ سبکتگین نے اُسے پکڑ لیا۔ کیونکہ یہ دریا پہاڑی ہونے کی وجہ سے بہت تیز تھا۔ اور پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے اُوپر ڈال کر باہر نکل آیا۔ پھر دونوں گھوڑوں کو پانی سے نکالا۔ لڑکی کو ڈرا ہوا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ ہنس رہی تھی۔

"تم احمق ہو یا دلیر ہو؟" ـــــ سبکتگین نے کہا۔ "تمہاری موت یقینی تھی۔"

"میں اُس باپ کی بیٹی ہوں جو احمق نہیں دلیر ہے" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "میں بخارا کے حاکم الپتگین کی بیٹی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ انعام دلاؤں گی۔"

"میرے لیے یہی انعام بہت ہے کہ میں نے اپنے محسن کی بیٹی کو موت کے منہ سے نکال لیا ہے۔" ـــــ سبکتگین نے کہا ـــــ "میں تمہارے گھوڑے کی زین کس دیتا ہوں۔"

دونوں ہم عمر تھے۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ سبکتگین میں بھی جسمانی کشش تھی۔ دونوں تنہا سوار تھے۔ لڑکی نے سبکتگین کے ساتھ اپنے گھوڑے کی زین کسی اور دونوں گھر کو چل پڑے۔ راستے میں لڑکی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ سبکتگین نے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

"رات ابا آپ کا ذکر کر رہے تھے" ـــــ لڑکی نے کہا۔ "وہ شاید تمہیں اپنی فوج میں کوئی عہدہ دیں گے۔"

"اپنی فوج؟" ـ سبکتگین نے کہا ـــــ "اُن کی اپنی فوج کیسے ہو سکتی ہے؟ فوج تو حکمران کی ہوتی ہے۔"

"ابا نے کچھ اور سوچ رکھا ہے" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "وہ حکومت کو اپنے ہاتھ

میں لینا چاہتے ہیں، اس لیے بخارا میں جو فوج ہے اس میں اپنے حامی سالار وغیرہ متعین کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکمران صرف نام کے مسلمان ہیں عیش و عشرت میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ لوگ مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ ابا کا ارادہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ تمہارے متعلق کہہ رہے تھے کہ کام کا نوجوان ہے۔"

گھر کے قریب پہنچے تو ایک آدمی کھڑا تھا جو رُتبے والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے کپڑوں سے پانی ٹپکتا دیکھا۔ لڑکی کا حلیہ بدلا ہوا اور بال بکھرے ہوئے اور بے ترتیب دیکھے تو اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اس کے قریب جا کر دونوں گھوڑوں سے اُترے۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" ـــــ اس آدمی نے لڑکی سے پوچھا ـــــ "اور یہ کون ہے؟"

"اور تم کون ہو جو حاکموں کی طرح مجھ سے پوچھتے ہو؟" ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ "گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا، اور مجھے دریا میں لے گیا تھا۔ یہ میرے پیچھے آیا اور دریا سے نکال لایا" ـــــ لڑکی نے سبکتگین کو بازو سے پکڑا اور اُسے اپنے گھر لے گئی۔

"کون ہے یہ؟" ـــــ سبکتگین نے پوچھا۔

"میرا منگیتر" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "ابھی سے مجھ پر حکم چلانے لگا ہے.... تم اس سے نہ ڈرنا" ـــــ وہ ایک کمرے میں چلے گئے تھے۔ لڑکی نے بے ساختگی سے سبکتگین کے سامنے آکر اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور پوچھا ـــــ "تمہاری بیوی ہے؟"

"نہیں۔"

"کوئی لڑکی کبھی تمہیں اچھی لگی ہے؟"

"لڑکیوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔"

"میں اچھی نہیں لگتی؟"

سبکتگین چپ چاپ کھڑا رہا اور اُس کی نظریں جھک گئیں

"تم نے کیا سمجھا ہے؟" لڑکی نے پوچھا ـــــ "مجھے بے حیا کہا ہے؟.... بے شرم سمجھا ہے؟.... بولو سبکتگین اگر مجھے یہی کچھ سمجھا ہے تو میں پھر کبھی تمہاری صورت

نہیں دیکھوں گی۔"

"تم کسی اور کی منگیتر ہو؟"

"یہ میرے ابا کا فیصلہ ہے" ـــ لڑکی نے کہا ـــ "یہ آدمی مجھے پسند نہیں۔ یہ مجھے لونڈی بنا کے رکھے گا۔ یہ مجھے کیا کرتا ہے کہ گھوڑسواری چھوڑ دو۔ مجھے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا ہے۔ مجھے نمائش کی ایک خوبصورت چیز سمجھتا ہے۔ مجھے ایسا مرد چاہیے جس نے تمہاری طرح لڑکیوں کی طرف کبھی دھیان نہ دیا ہو اور جو میرے ساتھ گھوڑا دوڑائے، میرے ساتھ دریا میں کود جائے۔ میں حرموں کے بادشاہوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ اسلام کا زوال اس روز شروع ہوا تھا جس روز تم نے عورت کو سنگھار اور زیبائش کی زنجیروں میں باندھ دیا تھا۔ تم عورت کو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا کر خوار ہوئے۔ اپنے اوپر شراب کا نشہ طاری کر کے تم ذلت کو عظمت سمجھ رہے ہو۔ عورت ایک طاقت ہے مگر تم نے عورت کو اپنی کمزوری بنا رکھا ہے ..... سبکتگین! حرم کی عورتوں کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عظمتِ اسلام کے پاسبان نہیں ہوتے ہو سکتے ہی نہیں۔ میں اُس بچے کو جنم دوں گی جو اسلام کو دُور دُور تک پھیلائے گا مگر مبلغ اور عالم بن کر نہیں، مجاہد اور تیغ زن بن کر۔"

"میری ماں بھی ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی" ـــ سبکتگین نے کہا ـــ "مگر اُس کا بیٹا غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا۔"

"اسلام کے پاسبان تم جیسے غلام ہوں گے میرے باپ جیسے غلام ہو سکے" ـــ لڑکی نے کہا ـــ "میرے ابا نے تمہیں بتایا نہیں کہ وہ بھی غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوئے تھے؟ آج اُن کا رتبہ اور منصب دیکھ لو۔ اُن کے ارادے اور اُن کا عقیدہ دیکھ لو۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تم جس عظیم بچے کے جنم کے خواب دیکھ رہی ہو وہ بچہ میرا ہوگا؟" ـــ سبکتگین نے کہا ـــ "یہ جوانی کا جوش ہے، شباب کا خمار ہے۔"

"یہ میرے دل کی آواز ہے" ـــ لڑکی نے جوشیلی سی جھنجھلاہٹ سے کہا ـــ "یہ میری روح کی آواز ہے۔ اپنے دل کو اتنا مردہ نہ کرو سبکتگین! ..... اگر تم میری محبت کو جسمانی یا محض جذباتی سمجھتے ہو تو یہی سمجھو لیکن میری محبت کو ٹھکرا نہ دینا۔ میں اِس شخص کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

سبکتگین وہاں سے نکلا تو وہ اپنے اندر عجیب سی ہلچل محسوس کر رہا تھا۔ ایک تو اس کا علم ادھورا تھا جو اُسے پریشان رکھتا تھا۔ اُس کے دل میں ایک عزم اور ایک مقصد تھا جو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوا تھا۔ اب اس لڑکی نے اُس کے ایسے جذبات کو بیدار اور مشتعل کر دیا جن کے متعلق اُسے علم ہی نہیں تھا کہ اُس میں موجود ہیں۔ اُس پر خمار سا طاری ہو گیا۔ اُسے صرف اپنی ماں کے جسم کا لمس یاد تھا جس کے ساتھ لگ کر وہ سکون کی نیند سویا کرتا تھا۔ نیند نہ آتی تو سکون ایسا ملتا جو اُس کی رُوح میں اتر جاتا تھا۔ دُوسرا جسم اس لڑکی کا تھا جسے اُس نے دریا سے نکالتے اپنے بازوؤں میں لیا اور اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اُس وقت اس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا، سوائے اس کے کہ اس لڑکی کو بچانا اُس کا فرض ہے۔ اب لڑکی نے اُس کے ساتھ جو باتیں کیں ان سے اُس کی ذات میں بھونچال جیسے جھٹکے آنے لگے۔

"یہی وجہ ہے کہ دولت والوں نے حرم آباد کر رکھے ہیں" ـــ اُس نے سوچا ـــ "عورت ایک قرار ہے، سکون کا سرچشمہ ہے، ایک خمار ہے۔ انسان تھوڑے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ قانع نہیں ہوتا۔ وہ دوسری عورت لاتا ہے، تیسری اور چوتھی لانے کے لیے ناجائز طریقوں سے دولت کماتا ہے۔ بادشاہوں کا خوشامدی بنتا اور انعام پاتا ہے۔ پھر بھی تسکین نہیں ہوتی تو ایمان نیلام کر دیتا ہے۔ اپنے مذہب اور قوم کے دشمن کے آگے بھی جا سجدے کرتا اور زر و جواہرات سے جھولیاں بھرتا ہے۔ یہ تباہی عورت سے شروع ہوتی ہے اور شراب تک پہنچاتی ہے ..... کیا میں بھی اسی راہ پر چل پڑوں گا؟"

"عورت زیبائش کی چیز نہیں" ـــ اُسے الپتگین کی بیٹی کے الفاظ یاد آنے لگے ـــ "عورت بہت بڑی طاقت ہے جسے ان لوگوں نے اپنی بہت بڑی کمزوری بنا لیا ہے" ـــ سبکتگین کو اپنی ماں اور اس کی باتیں یاد آنے لگیں اور اس کے اندر

وہ قوت بیدار ہونے لگی جو ماں نے پیدا کی تھی۔ ایک ایسی عورت کی پیدا کی ہوئی قوت جو بہت خوبصورت تھی۔ اسے سوداگروں نے سونے کے درہم و دینار پیش کیے تھے مگر اُس نے بھی الپتگین کی بیٹی کی طرح سوچا تھا کہ وہ زیبائش کی چیز نہیں۔ اسے اُس بچے کو جنم دینا ہے جو ابراہیمؑ کی طرح اپنے باپ سے اور اپنے قبیلے سے کہے گا کہ تم اُن بتوں کی پُوجا کرتے ہو جو سُن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں یہ لڑکی بھی یہی کہتی ہے۔

"کیا ہر عورت ایسی ہی خوش فہمیوں اور وہموں میں مبتلا ہوتی ہے؟"

نوشیرواں عادل کو ایک عورت نے ہی جنم دیا تھا۔" سبکتگین کے اندر سے یہ آواز اُٹھی۔ یہ آواز اس کے اُستاد کی تھی جو چھوٹی سی مسجد کا امام تھا۔ اس میں اُس کی ماں اور اُس کے باپ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ اُس کے بچپن کی آوازیں تھیں۔ یہ تعلیم و تربیت کی آوازیں تھیں ـــ "عورت کو تفریح اور عیاشی کا ذریعہ بناؤ تو طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور نوشیرواں پیدا نہیں ہُوا کرتے ہیں۔"

وہ سر جھکائے ہوئے انہی خیالوں میں گم چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی اور گھوڑے کے آگے آگے پیدل جا رہا تھا۔ لڑکی اُس کے دل پر غالب آتی چلی جا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی بہت اچھی ہے اور وہ اسے پھر بھی ملے گا۔ ضرور ملے گا۔

"اوئے ٹھہرو۔"

علم و فن کی جھیل میں کسی کی بھاری آواز کا پتھر آن گرا۔ اُس نے رُک کر دیکھا۔ لڑکی کا منگیتر بڑی تیزی سے آ رہا تھا۔ سبکتگین کے پاس آ کر رُک گیا۔

"حاجی نصر کے بیچے ہوئے غلام کی آئندہ یہ جرأت نہ ہو کہ شہزادیوں کے گھروں میں جا گھُسے۔" اس شخص نے کہا ـــ "تم ہمارے غلام ہو۔ اگر تم نے حاکم بخارا کی بیٹی کو گھوڑے سے گرنے سے بچایا اور اسے دریا سے نکالا ہے تو یہ تمہارا فرض تھا۔ اس کا تمہیں انعام نہیں مل سکتا۔ اگر تم اسے نہ بچا سکتے تو ہم تمہیں قید خانے میں ڈال کر بھوکا مار دیتے۔"

"میں آزاد ہوں۔" سبکتگین نے بُردباری سے کہا۔ "اور غلام تم ہو۔"

"کیا بکتے ہو۔" اُس نے غصے سے کہا۔ "بھاگو یہاں سے۔ آئندہ اصطبل سے بغیر اجازت گھوڑا نہ کھولنا۔"

"تم اپنے دل کے غلام ہو۔"

"میں تمہارا سر ابھی تن سے جُدا کر دوں گا۔" سبکتگین کو غلام سمجھتے ہُوئے لڑکی کے منگیتر نے جو جوانی کی عمر سے کچھ آگے چلا گیا تھا، تلوار نکال لی۔

سبکتگین کے کمربند میں لمبا خنجر تھا۔ اُس نے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر خنجر نکال لیا اور بولا ـــ "ڈیڑھ ہاتھ لمبی تلوار کو ڈیڑھ بالشت لمبا خنجر میرے قدموں میں نہ گرا دے تو تمہارے آگے جھک جاؤں گا۔ بڑے شوق سے میرا سر تن سے جُدا کر دینا مگر اس سے پہلے اپنی منگیتر سے پوچھ آؤ کہ وہ تمہیں قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔"

اس آدمی نے سبکتگین کے تیور دیکھے۔ ذرا سی دیر کھڑا رہا اور غصے میں تلوار نیام میں ڈال کر بہت تیزی سے چلا گیا۔ سبکتگین نے خنجر کمربند میں ڈالا، اور گھوڑے پر سوار ہو کر اصطبل کی طرف چلا گیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ الپتگین کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ انہی کپڑوں میں جو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے، چلا گیا۔

"ابو اسحاق سے تمہارا کیا جھگڑا ہوا ہے؟" الپتگین نے پُوچھا۔

سبکتگین نے سارا واقعہ سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی بیٹی نے اُسے کیا کہا ہے۔ الپتگین کو یہ صاف گوئی پسند آئی۔

"اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ دیں۔" سبکتگین نے کہا ـــ "میری کوئی حیثیت نہیں مگر اپنی بیٹی کی شادی اس آدمی کے ساتھ کرنے کی غلطی بھی نہ کریں۔"

الپتگین گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر کہا ـــ "تم جاؤ سبکتگین!"

"اگر آپ ناراض ہیں تو مَیں معافی نہیں مانگوں گا۔" سبکتگین نے کہا ـــ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں جھوٹ جیسے گناہ کا بھی مرتکب نہیں ہوا۔"

الپتگین نے مسکرا کر اتنا ہی کہا کہ چلے جاؤ۔

دوسری شام الپتگین کی بیٹی (کسی تاریخ میں اس کا نام نہیں ملتا) حسبِ معمول گھوڑسواری کے لیے نکل گئی۔ سبکتگین بھی اصطبل سے گھوڑا لے کر دریا کی طرف نکل گیا۔ دو گھوڑے دُور دُور تھے، مختلف سمتوں کو جا رہے تھے مگر دُور دریا کے کنارے جا کر اِن کے رُخ ایک دوسرے کی طرف ہو گئے، پھر وہ اکٹھے ہو گئے، رُک گئے۔ سوار اترے اور دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔

"وہ مجھے ملا تھا" — لڑکی نے اپنے منگیتر کے متعلق بتایا — "بہت غصے میں تھا۔ کہنے لگا میں فوج کا کمانڈر ہوں اور تم ایک غلام سے کہتی رہی ہو کہ تم نے مجھے قبول نہیں کیا۔ میں نے اُسے صاف بتا دیا کہ میں نے اپنے باپ کے حکم کا احترام کرتے ہوئے اُسے قبول کیا ہے۔ اس نے کچھ دھمکیاں دیں پھر منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا کہ میرے ابّا سے بات کرو..... رات ابّا نے مجھے الگ بٹھا کر کہا کہ سبکتگین نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ انہوں نے تمہاری صاف گوئی اور بے باکی کی بہت تعریف کی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ یہ منگیتر مجھے پسند نہیں۔ یہ اچھا آدمی ہے۔ معلوم ہُوا ہے کہ آج دن کو کسی وقت اس کی اور ابّا کی باتیں ہوئی ہیں۔"

سبکتگین اس لڑکی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا جو اسی جیسی جوان تھی۔ کل سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو وہ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب ہو گئی کہ اُس کے جسم کی تپش بھی وہ محسوس کرنے لگا، پھر اُس نے اُس کی سانسوں کی بھی تپش محسوس کی۔ اس کا اپنا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اُسے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"میری ماں تمہاری طرح خوبصورت تھی" — سبکتگین نے کہا۔

"تمہارا بیٹا بھی یہی کہا کرے گا" — لڑکی نے کہا اور ہنس پڑی۔

سورج دریا کے دوسرے کنارے کی چٹان کی اوٹ میں چھپ گیا، پھر شام گہری ہونے لگی اور دریا کے اس کنارے بیٹھے ہوئے دو سائے ایک سایہ بن گئے۔ دریا کی لہروں کا جل ترنگ اور زیادہ پُرسوز ہو گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا — سبکتگین الپتگین کے دل میں اتنا اُتر گیا تھا کہ اُس کا معتمدِ خاص اور مشیر بن گیا۔ الپتگین نے اسے اپنا ایک منصوبہ ان الفاظ میں بتا دیا تھا — "مسلم قوم کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ قوم ریاستوں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ کفار انہیں عیاشیوں کا عادی بنا کر انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رہے ہیں۔ خلافت جو قوم کے مرکز کی علامت تھی ایک برائے نام منصب بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارا حکمران عبدالملک ہے۔ اس کی زندگی میں ہی اس کی گدی کے امیدوار اور ان کے حامی آپس میں لڑنے لگے ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ عبدالملک کے مرنے کے بعد اس کے کسی بیٹے کو تخت پر بٹھا دوں مگر اس کا بڑا بیٹا امیر منصور ایسا نہیں ہونے دے گا۔ میں اس صورت میں منصور کا تختہ اُلٹ کر غزنی میں اپنی خودمختار حکومت قائم کر دوں گا۔"

"آپ کی فوج جو یہاں (بخارا میں) ہے آپ کا ساتھ دے گی؟" — سبکتگین نے پوچھا۔

"سالار عبدالملک سے نالاں ہیں" — الپتگین نے جواب دیا — "اس کی نسبت وہ میرا حکم ماننے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ غزنی کو مرکز بنا کر ارد گرد کی مسلمان ریاستوں کو متحد کر لوں اور کفار کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا جائے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو وہ وقت دور نہیں جب اسلام کی حکمرانی جو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے ٹکڑا ٹکڑا غائب ہونے لگے گی۔ معلوم ہُوا ہے کہ ہندوستان کے حکمران جو مہاراجے کہلاتے ہیں لمغان (درۂ خیبر کے راستے) ہم پر حملے کے لیے پر تول رہے ہیں۔"

"غزنی کا تختہ الٹنے کا کام آپ مجھے سونپ دیں" — سبکتگین نے کہا — "اس کے لیے ہمیں بہت بڑی فوج کی ضرورت نہیں۔ منصور اور اس کے حامی حاکموں کو گرفتار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے منصوبے کے عملی پہلوؤں اور خطروں پر غور کر لیں" — اُس نے ذرا سوچ کر کہا — "آپ محتاط نہیں۔ اتنے بڑے منصوبوں کی کامیابی کے لیے رازداری ضروری ہوتی ہے۔ آپ کا یہ منصوبہ مجھے آپ کی بیٹی سنا چکی ہے۔ اسے اس سے بے خبر ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ محتاط ہو جائیں۔ اگر آپ نے اپنے راز چھپائے

رکھے اور دشمن کے راز حاصل کر لیے تو آپ آدھی جنگ جیت جائیں گے۔

الپتگین کو سبکتگین پر اعتماد تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ سبکتگین اتنا ذہین اور دور اندیش ہے۔ دونوں نے کٹہ اٹھنے کے منصوبے پر ہر پہلو سے غور کیا اور ایک کارآمد منصوبہ تیار ہو گیا۔

ادھر غزنی کو اسلامی سلطنت کا مرکز بنانے کا منصوبہ تیار ہوا اُدھر ایک منصوبہ سبکتگین کے قتل کا تیار ہو گیا۔ یہ الپتگین کی بیٹی کے منگیتر ابو اسحاق نے تیار کیا تھا۔ رتھوں کی دوڑ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ فوج کے سواروں کا مقابلہ تھا جس میں سبکتگین کو بھی شامل ہونے کے لیے مدعو کیا گیا تھا اور اس میں ابو اسحاق کو بھی شامل ہونا تھا۔ بہت وسیع میدان میں مقابلے کے لیے رتھیں کھڑی کی گئیں۔ ہر ایک کے آگے ایک ایک گھوڑا جتا ہوا تھا۔ یہ دوڑ میں بیس رتھیں تھیں۔ دوڑ شروع ہوئی تو ابو اسحاق نے اپنی رتھ کچھ آگے لے جا کر سبکتگین کی رتھ کے قریب کر لی اور اس کے پہلو کے ساتھ اپنی رتھ دوڑانے لگا۔ سبکتگین نے دیکھا کہ ابو اسحاق اپنی رتھ ذرا آگے کر کے اس کی رتھ کو ایک طرف ہو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس طرح اُس نے دو تین بار کیا تو سبکتگین نے اپنی رتھ اُس کے گھوڑے کے قریب کر کے اُسے ایک طرف دھکیلنے لگا۔

تماشائیوں نے چیخ و پکار بنا کر رکھی تھی۔ رتھیں ہوا سے باتیں کر رہی تھیں ابو اسحاق نے اپنا ہنٹر جو وہ گھوڑے کو مار رہا تھا وہ سبکتگین کو مار دیا مگر سبکتگین نے اپنی رتھ اُس کے گھوڑے کے ساتھ لگائے رکھی۔ ابو اسحاق نے چلا کر کہا ۔۔۔ "خدا کے لیے ایک طرف ہٹ جاؤ"۔۔۔ سبکتگین نے اپنی رتھ پرے ہٹا لی اور اس کے ساتھ ہی ابو اسحاق کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ رتھ اوپر کو گئی اور گھوڑے سے آگے گری۔ ابو اسحاق ہوا میں اڑا اور اپنی الٹی ہوئی رتھ پر گرا۔ پیچھے آنے والی رتھ کا گھوڑا اتنی جلدی رک نہ سکا۔ وہ ابو اسحاق کی رتھ پر چڑھ گیا اور ابو اسحاق جو گرنے سے بیہوش ہو چکا تھا کچلا گیا۔ سبکتگین نے اپنی رتھ روکی اور واپس آ گیا۔

سب دوڑے گئے۔ دیکھا گیا کہ وہاں گہرا گڑھا تھا جس میں ابو اسحاق کا گھوڑا گرا

تھا۔ اس میدان میں پہلے ایک کوئی گڑھا نہیں تھا۔ وہاں درختوں کی لمبی اور خشک شاخیں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ ابو اسحاق مر چکا تھا۔ اسی وقت تحقیقات شروع ہو گئی۔ الپتگین نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی اس گڑھے کا راز بتائے گا اُسے انعام دیا جائے گا۔

شام تک راز فاش ہو گیا۔ اس دوڑ کا اہتمام ابو اسحاق نے ہی کیا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ہمراز دوست سے کہا تھا کہ وہ سبکتگین کو دوڑ میں شامل ہونے کے لیے کہے۔ دوست نے یہ کام کر دیا۔ ابو اسحاق نے رات کو یہ گڑھا کھدوا دیا۔ اس کے اوپر خشک ٹہنیاں رکھیں اور اوپر مٹی بکھیر دی۔ گڑھے کی باقی مٹی میدان میں پھیلا دی۔ ڈھکے ہوئے گڑھے پر اُس نے کوئی نشانی رکھ دی تھی۔ ابو اسحاق دوڑ کے دوران اسی لیے اپنی رتھ سبکتگین کی رتھ کے قریب لے آیا تھا کہ اُسے گڑھے کی سیدھ میں لے جائے۔ سبکتگین کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُسے موت کے گڑھے میں لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے ابو اسحاق کی رتھ کو اپنی رتھ سے پرے دھکیلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں گڑھا آ گیا۔ یہاں آ کر ابو اسحاق نے چلا کر کہا کہ خدا کے لیے ایک طرف ہٹ جاؤ۔ مگر گڑھا آ گیا۔ ابو اسحاق اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں اپنے گھوڑے اور رتھ کے ساتھ ایسا گرا کہ موت سے بچ نہ سکا۔ اُس نے دوستوں سے کہا تھا کہ سبکتگین کو مار کر وہ الپتگین کی بیٹی کے ساتھ شادی کر سکے گا۔

"خدا نے تمہیں کسی عظیم کام کے لیے زندہ رکھا ہے"۔۔۔ الپتگین نے سبکتگین سے کہا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے منصوبے کی کامیابی کے لیے تم نے وہی کارگزاری کی جو تم نے بتائی تھی تو تم میرے داماد ہو گے اور مجھے اس پر فخر ہو گا"۔

اس واقعہ سے ایک آدھ سال بعد غزنی کا حکمران عبدالملک مر گیا۔ الپتگین نے اپنے اثر و رسوخ سے کوشش کی کہ عبدالملک کا چھوٹا بیٹا تخت نشین ہو لیکن بڑے بھائی منصور کی موجودگی میں الپتگین کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ دو دن بعد سبکتگین تین سو منتخب سواروں کے ساتھ غزنی گیا اور ظاہر یہ کیا وہ بخارا کے لوگوں کی طرف سے مبارک باد پیش کرنے آیا ہے مگر اس نے اندر جا کر منصور کو گرفتار کر لیا اور اس کے سواروں نے ہدایت کے مطابق محافظ دستے کو گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈلوا لیے۔

منصوبے کی اگلی کڑی کے مطابق الپتگین نے جو فوج کے ساتھ غزنی کے قریب آچکا تھا طوفان کی طرح آکر شہر کے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔

گلیوں اور بازاروں میں اعلان ہونے لگے "ظالموں کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ ہم عدل و انصاف لائے ہیں۔ ہم اللہ اور رسولﷺ کی حکمرانی لائے ہیں" پہلے روز سے ہی ایسے احکام جاری کیے جانے لگے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے تھے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے لوگ نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے کہ ظلم و تشدد، بدنظمی اور بے انصافی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ انہوں نے دل و جان سے نئی حکومت کو قبول کر لیا۔

الپتگین کی حکومت ۹۶۲ء (۳۵۱ھ) میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے سبکتگین کو امیر الامرا بنایا اور اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی مگر اگلے ہی سال ۹۶۳ء میں الپتگین مر گیا۔ اس کے بیٹے اسحاق نے باپ کی گدی سنبھال لی مگر خوشامدیوں اور چاپلوس قسم کے مشیروں کے گھیرے میں آگیا۔ وہ اس سے اپنے مطلب اور مفاد کے احکام صادر کرانے لگے جو اس کے باپ کے احکام کے الٹ تھے۔ لوگ ایک بار پھر پریشان ہونے لگے۔

امیر سبکتگین نے ایک بار پھر دانشمندی اور جرأت کا مظاہرہ کیا، اور ایک صبح لوگوں نے یہ خبر سن کر سکون محسوس کیا کہ ان کے حاکم اسحاق کو قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے اور ان کا نیا سلطان سبکتگین ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے کہ سبکتگین نے کس طرح اسحاق کو معزول کیا اور کس طرح قوم کی کایا پلٹ دی۔ اُس نے فوج اور لوگوں کے دل جیت کر کچھ اور علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے اور سب سے پہلے ہندوستان کی طرف توجہ دی۔

اُس نے ایک رات خواب دیکھا کہ اس کے محل کے ایک کمرے میں ایک درخت پیدا ہوا جو بڑھتا گیا، چھت پھاڑ کر اوپر چلا گیا اور یہ اتنا زیادہ پھیلا کہ آدھی دنیا پر سایہ کر لیا۔ اس خواب نے سبکتگین کو پریشان کر دیا۔ اس نے خواب اپنی بیوی کو سنایا۔ وہ چپ رہی۔ اس کے فوراً بعد اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا[ھ] اس سے اس کی پریشانی اپنے آپ ہی دور ہو گئی۔ اس

ھ نگینہ۔

کی بیوی نے اسے کہا۔ "آپ کے خواب کی تعبیر آپ کے سامنے آگئی ہے۔ میں نے اس بچے کو جنم دیا ہے جو باطل شکن ہوگا۔ آج محرم کی دسویں ہے۔" اس اشارے کو سمجھ کر سبکتگین نے بچے کا نام محمود رکھا۔ بچہ خوبصورت نہیں تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا مگر سبکتگین نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ بچپن میں ہی اسے قرآن حفظ کرانا شروع کر دیا۔ اس کے لیے خاص اتالیق رکھے جنہوں نے محمود کو علم بھی دیا اور جنگی تربیت بھی۔ وہ پندرہ سال کا ہوا تو باپ اسے راجہ جے پال کے خلاف جنگ میں لے گیا۔ اسے ہندوؤں کے خلاف لڑا کر کہا۔ "تم بت شکن ہو گئے۔"

اور یوں نوشیرواں عادل کی نسل سے ایک بت شکن پیدا ہوا۔[ھو]

ھو صاحب طبقات ناصری بحوالہ بیہقی

جب مسلمان مسلمان سے ٹکرایا

غزنی کے مضافات میں ایک باغ تھا باغ کے وسط میں چھوٹا سا ایک مکان تھا جس کی ساخت اور تعمیر بتاتی تھی کہ کسی شہزادے یا کسی امیر وزیر کا مکان ہے تھوڑا ہی عرصہ پہلے یہاں باغ تھا نہ مکان۔ ویرانہ تھا۔ اب یہ ویرانہ سبزہ زار بن گیا تھا۔ اس میں رنگ برنگے پھولوں کے تختے تھے۔ راہ جاتے لوگ رک کر دیکھتے اور باغ اور مکان کی دلکشی میں کھو جاتے تھے۔ غزنی کے رہنے والے اس باغ کے ارد گرد گھومتے پھرتے اور اپنے سلطان سبکتگین کے بیٹے محمود کے ذوق کی داد دیتے تھے۔

یہ باغ اور اس میں یہ مکان محمود غزنوی نے اپنے باپ کو بتائے بغیر چند سال پہلے بنوانا شروع کیا تھا۔ اُس نے اپنی ماں سے اجازت لے لی تھی۔ محمود اپنے ماں باپ کا بدصورت اور کوتاہ قد لڑکا تھا۔ اس کے بھائی اچھی شکل وصورت کے تھے لیکن ماں کو سب سے زیادہ پیار محمود سے تھا۔ محمود نے چند سال پہلے جب اُسے کہا تھا کہ وہ ایک باغ اور اس باغ میں ایک بہت ہی خوبصورت مکان بنانا چاہتا ہے تو ماں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”میں نے آپ کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مادر محترم!“ — محمود غزنوی نے ماں سے کہا — ”میں مکان نہیں بنواؤں گا۔“

”نہیں بیٹا!“ — ماں نے کہا — ”میں تمہیں خود مکان بنوا دوں گی جس کے ارد گرد باغ ہو گا۔“

”پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے ہیں؟“

”مجھے وہ وقت یاد آگیا ہے جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے“ — ماں نے کہا

— ”ابھی میں تمہارے باپ کی بیوی نہیں بنی تھی۔ میں ایک شہزادے کی منگیتر تھی لیکن میرے دل اور میری روح میں تمہارا باپ بس گیا تھا۔ مجھے اپنا منگیتر اس لیے پسند نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ مجھے کہا کرتا تھا کہ گھوڑسواری چھوڑ دو میں گھر سے دریاؤں میں کودنے اور تیرنے کی شوقین تھی۔ گھوڑسواری اور تیراکی میرے مشاغل تھے۔ میں خوبصورت تو تھی مگر میں نمائش کی چیز نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا کہ مجھے وہ خاوند چاہیے جو میرے ساتھ گھوڑا دوڑائے اور جو دریا میں کود جائے....

”میرے عزیز بیٹے! میں حرموں کے بادشاہوں اور امرا کو بتانا چاہتی تھی کہ مسلمانوں کا زوال اُسی روز شروع ہو گیا تھا جس روز عورت کو سنگھار اور زیبائش کی زنجیروں میں باندھ کر اُسے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا — ”سبکتگین! حرم کی عورتوں کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ عظمت اسلام کے پاسبان نہیں بن سکتے۔ میں اُس بچے کو جنم دوں گی جو اسلام کو دُور دُور تک پھیلائے گا مگر مبلغ اور عالم بن کر نہیں، مجاہد اور تیغ زن بن کر....

”تمہارے باپ نے ہنس کر کہا — ”میری ماں بھی ایسے ہی خواب دیکھا کرتی تھی، مگر میں غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا“ — میں نے اُسے کہا تھا — ”اسلام کے پاسبان تم جیسے غلام ہوں گے، دولت والے تو اسلام کو ڈبوئیں گے۔ میرا باپ بھی غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا لیکن غزنی کا سلطان بنا“ — میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا کہ میں جس عظیم بچے کے جنم کے خواب دیکھ رہی ہوں وہ بچہ تمہارا ہو گا.... یہ میرے دل کی نہیں میری روح کی آواز تھی۔ سبکتگین کے ساتھ میری محبت جسمانی اور جذباتی نہیں تھی۔ میری روح میں خدا بول رہا تھا....

”خدائے بزرگ و برتر نے اپنی خدائی کا کرشمہ دکھایا۔ میں تمہارے باپ کی بیوی بن گئی۔ تمہارا باپ جو میرے باپ کی طرح غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوا تھا، غزنی کی سلطنت کا سلطان اور میرے باپ کا جانشین ہوا۔ پھر خدائے ذوالجلال نے تمہارے

باپ کو اشارہ دیا۔ تمہاری پیدائش سے ایک رات پہلے باپ نے یہ خواب دیکھا کہ محل کے ایک کمرے میں ایک درخت اُگا جو بڑھتا چلا گیا۔ درخت چھت پھاڑ کر اوپر چلا گیا اور پھیلنے لگا۔ اس نے آدھی دنیا کو اپنے سائے میں لے لیا۔ تمہارا باپ اس خواب سے کچھ پریشان تھا۔ تم پیدا ہوئے تو میں نے تمہارے باپ سے کہا "آپ کے خواب کی تعبیر آپ کے سامنے آ گئی ہے۔ میں نے اُس بچے کو جنم دے دیا ہے جو باطل شکن ہو گا۔ آج محرم کی دسویں ہے۔ اس اشارے کو دیکھیں۔ تم عاشور کی رات پیدا ہوئے تھے۔"

"آپ پہلے بھی مجھے یہ کہانی سنا چکی ہیں" — محمود غزنوی نے کہا۔ "آج آپ نے اتنا زیادہ جذباتی ہو کر وہی بات پھر کیوں سنائی ہے؟"

"اس لیے کہ تمہارا دل باغوں کی رنگینی اور دھنک میں اور مکانوں کی دلکشی میں نہ اُلجھ جائے" — ماں نے جواب دیا۔ "اور میرے آنسو اس لیے نکلے تھے کہ تم شہزادے ہو مگر تمہاری عمر جنگلوں اور صحراؤں میں پہاڑوں اور ویرانوں میں باطل کے خلاف لڑتے گزرے گی۔ میں تمہیں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم محل کے لیے نہیں میدانِ عمل کے لیے پیدا ہوئے ہو..... تم باغ کے لیے جگہ پسند کر لو اور کام شروع کرا دو۔ جب کبھی میدانِ جنگ سے لوٹو تو دو چار دن اپنی پسند کے مکان میں رہ لیا کرنا۔"

محمود غزنوی نے کام شروع کرا دیا۔ مکان کے لیے تجربہ کار کاریگر اکٹھے کر لیے اور جب راجہ جے پال کی فوج غزنی پر حملے کے لیے آئی، باغ سرسبز ہو چکا تھا۔ پھول کھل آئے تھے۔ درختوں کے پودے اُگ آئے تھے اور اس کے وسط میں ایک خوشنما مکان جس کی دلکشی دیکھنے والوں کی نظروں کو گرفتار کر لیتی تھی، تعمیر ہو چکا تھا۔

پنجاب کے راجہ جے پال نے غزنی پر حملہ کیا تھا مگر غزنی سے دور ہی لڑائی ہوئی جس میں فوج پسپا ہوئی اور تباہ زیادہ ہوئی تھی۔ مالِ غنیمت اتنا زیادہ تھا کہ سبکتگین کی فوج کو یہ سامان، اخراجات، گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ سمیٹتے بیس دن لگ گئے تھے۔ فتح کا جشن بڑی دھوم سے منایا گیا۔ سبکتگین جب غزنی واپس گیا تو محمود غزنوی نے اسے بتایا کہ اس کا باغ اور مکان

مکمل ہو چکے ہیں۔

"آپ کو یہ میرا چھوٹا سا مکان بہت پسند آئے گا" — محمود غزنوی نے سلطان سبکتگین سے کہا — "آپ دیکھیں گے؟"

سبکتگین کو محمود کی ماں نے بتا دیا تھا کہ ان کا بیٹا غزنی کے مضافات میں اپنے لیے چھوٹا سا ایک مکان بنا رہا ہے۔ سبکتگین اسے چھوٹا سا ہی سمجھ رہا تھا لیکن محمود کے کہنے پر جب وہ اُس کے مکان کو دیکھنے گیا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ یہ مکان نہیں بلکہ چھوٹا سا محل تھا، اور باغ شاہانہ تھا۔

"محمود!" — سلطان سبکتگین نے بیٹے سے کہا — "خدا تمہیں یہ محل، یہ باغ اور پھول مبارک کرے۔ تمہارا ذوق عمدہ ہے۔ یہ ایک شہزادے کا ذوق ہے لیکن تم صرف شہزادے نہیں، اسلام کے شاہسوار بھی ہو۔ تم ایک سلطان کے نہیں اسلام کے بیٹے ہو، اور تم شاید بھول گئے ہو کہ تم ایک غلام کے بیٹے ہو۔ خدا نے مجھے سلطانی عطا کی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک فرض سونپا ہے۔ یہ فرض میری ماں کو اُس وقت خوابوں میں اور غیب کے اشاروں کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا جب وہ میرے باپ کی ابھی بیوی نہیں بنی تھی۔ مجھے یہ فرض دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے....

"میں اسے خدا کی بہت بڑی نعمت سمجھتا ہوں کہ اس مقدس فرض کی ادائیگی مجھے اور میری نسل کو عطا کی گئی ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں اور تمہاری ماں بھی تمہیں بتا چکی ہے کہ تم نے ایک شہزادے اور ایک عام بچے کے روپ میں جنم نہیں لیا۔ میری ماں کی طرح تمہاری ماں کو بھی اس کی روح نے اشارہ دیا تھا کہ وہ ایک باطل شکن کو جنم دے گی۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے اتنا خوبصورت مکان نہیں بنانا چاہیے تھا؟" — محمود غزنوی نے مایوس ہو کر کہا۔

"ضرور بنانا چاہیے تھا" — سلطان سبکتگین نے کہا — "میں تمہیں بتانا یہ چاہتا

ہوں کہ کوئی بھی آدمی جس کے پاس دولت ہے، ایسا مکان بنا سکتا ہے لیکن جو فرض تمہیں سونپا گیا ہے وہ ہر کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ لوگ اونچے مکان اور شہزادے اور بادشاہ اونچی یادگاریں صرف اس لیے بناتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد بھی لوگ انہیں یاد رکھیں اور ان کا نام لیں مگر ایسے مکانوں اور پتھروں کی عمارتیں مٹ جایا کرتی ہیں۔ یادگار لوگوں کے دلوں میں تعمیر کرو۔ کام وہ کرو جس کی یاد تاریخ کے ہر دور میں تازہ ہو۔ اپنے نام کو ایک مکان کی دیواروں میں قید نہ کرو۔ اسے تاریخ کے چہرے پر کبھی نہ مٹنے والا نقش بنا دو..... اور محمود! دولت، عورت اور خوشنما مکان انسان کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ یہ زنجیریں ہیں جن میں جو بندھ جاتا ہے وہ بنی نوع انسان کے لیے شیطان بن جاتا ہے۔ تم جوان ہو محمود! لڑکپن اور جوانی کا یہ سنگم زندگی کا بڑا ہی خطرناک دوراہا ہوتا ہے۔ انسان اپنے سود و زیاں کو کم ہی دھیان میں رکھتا ہے۔ اگر تم اس عمر میں دنیا کی رنگینی کی راہ پر چل پڑے تو واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔"

"آپ مجھے اس مکان میں نہیں دیکھیں گے" — محمود غزنوی نے کہا — "میں یہ کبھی بھی نہیں بھولا کہ میں مردِ میدان ہوں۔"

"اگر تم میری زندگی میں کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو میں تمہیں اسی مکان میں دفن کروں گا" — سلطان سبکتگین نے کہا — "تمہاری پسند کا یہ مکان تمہاری روح کی پسند کا مقبرہ ہوگا اور یہ باغ ہمیشہ ہرا بھرا رہے گا۔"

سلطان سبکتگین نے ٹھیک کہا تھا۔ آج غزنی کے مضافات میں محمود غزنوی کے اس مکان اور اس باغ کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ہندوستان پر اس کے سترہ حملوں کے سترہ یادگاری مینار بھی ہوتے تو سترہ نہیں رہتے، بیشتر مینار گر کر غائب ہو چکے ہیں لیکن تاریخ میں محمود غزنوی کا نام روشن مینار کی طرح زندہ و تابندہ ہے۔ محمود غزنوی بت شکن کے نام سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

راجہ جے پال تھوڑا ہی عرصہ پہلے غزنی کی طرف جاتے ہوئے پشاور سے گزرا تھا تو

اس کی شان اور اس کی جنگی طاقت کو دیکھ کر پہاڑ لرز رہے تھے، جیسے راستہ دے رہے تھے۔ لوگ ڈر کے مارے دور بھاگ گئے تھے۔ وہی راجہ جے پال شکست کھا کر واپس پشاور میں داخل ہوا تو لوگ دور دور سے دوڑے آئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ ان کا راجہ ہے یا اس کی بدروح ہے۔ اس کی جنگی طاقت لٹے پٹے قافلے کی طرح چلی آ رہی تھی۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے بھی سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چال بتاتی تھی کہ یہ کسی بھی قدم پر گر پڑیں گے۔

پشاور میں راجہ کا جو محل تھا وہاں اس کے استقبال کے لیے نقارے بجے۔ محل کے محافظ تعظیم کے لیے دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ راجہ نے غصے سے پھٹ کر کہا — "بند کرو یہ ڈھول تماشہ" — اس نے اپنے ساتھ کے کسی آدمی سے کہا — "دونوں پنڈتوں کو فوراً حاضر کرو۔"

محل کی فضا میں سناٹا طاری ہو گیا۔ وہاں جو انسان تھے، وہ تو جیسے مر گئے تھے۔ اس سکوت میں دو تین آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں — "پنڈت کہاں ہیں..... پنڈت جی مہاراج کہاں ہیں؟"

راجہ اس کیفیت میں محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ غصے سے اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسہ بنا بنا کر اپنی ران پر بڑے زور سے ہاتھ مارتا تھا۔ اسے پتہ نہ چل سکا کہ دونوں پنڈت کمرے میں داخل ہو کر دست بستہ کھڑے ہیں۔ یہ سب سے بڑے پنڈت تھے جو بٹھنڈہ میں رہتے تھے۔ اب چونکہ راجہ نے لاہور سے پیش قدمی کی تھی اس لیے وہ لاہور آ گئے تھے۔ انہوں نے ہی راجہ کو کوچ کا شبھ دن بتایا اور یقین دلایا تھا کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ دونوں پنڈت اس کے ساتھ پشاور تک گئے تھے، اور جب راجہ اپنی فوج کے ساتھ پشاور سے نکلا تھا تو دونوں پنڈت گھنٹیاں بجاتے راستے میں کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ بارہ کنواریاں تھیں جن کے ہاتھوں میں طشتریاں اور طشتریوں میں اگربتیاں جل رہی تھیں۔ وہ کوئی مذہبی گیت گا رہی تھیں۔ انہوں نے راجہ کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بکھیری تھیں۔

"مہاراج!" ایک پنڈت نے کہا۔ "ہم حاضر ہیں"

راجہ رک گیا۔ اُس نے پنڈتوں کو دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں قہر اُترا ہُوا تھا۔ وہ سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق ہو کے رہ گیا تھا۔

"کیا تم نے جھوٹ بولا تھا یا تمہاری پوتھی نے جسے دیکھ کر تم نے مجھے کوچ کا شبھ دن بتایا تھا؟" ۔۔۔ راجہ جے پال نے ان سے پوچھا۔

"نہ ہم نے جھوٹ بولا تھا نہ ہماری پوتھی نے" ۔۔۔ ایک پنڈت نے جواب دیا ۔۔۔ "ستارے جھوٹ نہیں بولا کرتے، مہاراج! ہم آپ کو پھر حساب جوڑ کر بتا سکتے ہیں"

"تم لاکھ حساب جوڑو، میرے سامنے اس وقت یہ شرمناک حقیقت ہے کہ میں شکست کھا کر آیا ہوں اور میری فوج تباہ ہو گئی ہے" ۔۔۔ راجہ نے کہا ۔۔۔ "اس کی کیا وجہ ہوئی؟ انہوں نے کہا تھا کہ فلاں دن کوچ کرو تو فتح ہو گی۔ تم نے کہا تھا کہ دیوی کی آشیرباد مل گئی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ پنڈتوں کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ مورتیاں اور کشن مراری کے بُت ساتھ لے جائیں گے اور لڑائی سے پہلے سپاہیوں کے سامنے یہ بُت اور مورتیاں رکھ کر پرارتھنا کرانا، پھر یہ سپاہی پہاڑوں کو پیس ڈالیں گے۔ میں نے یہ سارا انتظام کیا۔ وہاں جا کر دیکھو جہاں لڑائی ہُوئی تھی۔ وہاں بتوں کے ٹکڑے اور مورتیوں کے پرخچے بکھرے ہُوئے ہیں۔ پنڈتوں نے سپاہیوں کو ان کے سامنے بٹھایا، گھر گھنٹیاں بجنے لگیں اور پرارتھنا شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ہم پر اس طرح ہلہ بول دیا جس طرح اچانک بگولہ آتا اور راستے میں جو کچھ آئے اڑا کر لے جاتا ہے....

"تم سمجھتے ہو گے کہ وہ لشکر کی صورت میں آئے تھے۔ نہیں، حملہ کرنے والوں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی۔ رات کا وقت تھا جب عموماً لڑائی نہیں ہُوا کرتی۔ ہمارے کشن مراری کے بت اور مورتیاں ہمارے اپنی سپاہیوں کے پاؤں تلے روندی گئیں جو ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر عبادت کر رہے تھے۔ پنڈت بھاگ گئے۔ سپاہی بکھر گئے۔ اس کے بعد میری فوج کسی بھی وقت مسلمانوں کے سامنے ٹھہر

نہ سکی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری فوج کی تعداد تین لاکھ تھی اور مسلمانوں کی فوج کی تعداد ہم سے چار گنا کم تھی۔"

"ہم حساب جوڑ کر بتائیں گے مہاراج!" ۔۔۔ ایک پنڈت نے کہا ۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے ستارے ٹکرا گئے ہیں"

راجہ جے پال کو غصے نے باؤلا کر رکھا تھا۔ ایک طرف پنڈتوں کی پوتھیاں اور ستاروں کا علم تھا۔ دوسری طرف اس کے سامنے یہ انتہائی تلخ حقیقت تھی کہ وہ کس عزم کے ساتھ تین لاکھ کا لشکر لے کر غزنی پر قبضہ کرنے اور اس تمام علاقے یعنی آج کے تمام تر افغانستان کو ہندوستان میں شامل کرنے گیا تھا۔ وہ ہندوستان کو مہابھارت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر وہ اپنی فوج کو سلطان سبکتگین کی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس کیفیت میں بھاگا کہ پشاور تک اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

اُس کے لیے یہ صورت حال بہت ہی تکلیف دہ تھی ۔۔۔ وہ چار پانچ ریاستوں کی فوج اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسے ان مہاراجوں کا سامنا کرنا تھا۔ ایک صورت اور بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جو مہاراجہ دوبار دشمن سے شکست کھائے اُسے حکمرانی سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ جے پال دوبارہ شکست کھا چکا تھا۔ اُسے اپنے بیٹے کے حق میں راج سے دستبردار ہونا تھا۔ اس کا بیٹا انند پال نوجوان تھا۔ جس طرح سلطان سبکتگین نے محمود غزنوی کو عسکری تربیت دی تھی، اسی طرح جے پال نے اپنے بیٹے کو جنگجو بنا دیا تھا مگر انند پال ابھی ریاست کا راج سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ راجہ جے پال کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ دوسرے مہاراجے اسے راج سے ہٹ جانے کو کہیں گے۔ ان مہاراجوں کی بھی فوجیں تباہ ہوئی تھیں۔ ان حالات میں راجہ جے پال کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا جب پنڈت نے اسے کہا کہ وہ حساب جوڑ کر بتائیں گے کہ ان کا پہلا حساب جس میں انہوں نے راجہ کو فتح کی خوشخبری سنائی تھی کیوں غلط نکلا ہے۔ تو غصے سے راجہ

کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مسلمان تمہاری طرح زائچے بنائے بغیر لڑنے آئے تھے"۔

راجہ جے پال نے کہا۔ "انہوں نے ستاروں کے راستے نہیں دیکھے تھے۔ ہمارے ہاتھ مسلمان فوج کے بہت تھوڑے جنگی قیدی آئے ہیں۔ ان میں سپاہیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ اونچے عہدے کے فوجی ہیں۔ میں انہیں تمہارے سامنے کھڑا کر کے پوچھوں گا کہ وہ اپنے مولویوں سے جوتش اور نجوم کے ذریعے فتح کی خوشخبری لے کر آئے تھے؟ ... مجھے شک ہونے لگا ہے کہ مسلمانوں کا یہ کہنا سچ ہے کہ پتھر کے خدا جھوٹے ہیں مسلمان جس خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ مجھے سچا خدا معلوم ہوتا ہے"۔

"چھی، چھی، چھی ... مہاراج!" — ایک پنڈت نے کہا۔ "مسلمان ملیچھ ہیں۔ اپنے دیوتاؤں کو اس لیے جھوٹا نہ کہیں کہ آپ کو شکست ہوئی ہے۔ اس کی کئی اور وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کا مذہب سچا ہے"۔

"کسی کے گھر ڈاکہ پڑتا ہے تو گھر لٹ جاتا ہے" — دوسرے پنڈت نے کہا — "اس سے یہ مطلب ہرگز نہ لیں کہ ڈاکوؤں کا خدا سچا ہے۔ اور لٹنے والوں کا جھوٹا"۔

"میں اپنے مذہب کو سچا سمجھ کر اسے مسلمانوں کے علاقوں میں پھیلانے کے ارادے سے گیا تھا" — راجہ جے پال نے کہا۔ "دیوتاؤں نے میری کیوں مدد نہیں کی؟ مسلمان ہمارے بتوں اور مورتیوں کے ٹکڑے دیکھ کر ہمارے مذہب پر ہنس رہے ہوں گے"۔

"مہاراج! ہمیں زائچہ بنانے کے لیے مہلت دیں"۔

"میں مہلت دیتا ہوں" — راجہ جے پال نے کہا — "لیکن ذرا ٹھہرو۔ میں مسلمان قیدیوں کو بلاتا ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ"۔

راجہ نے کمرے میں لٹکتا ہوا گھڑیال بجایا۔ دربان اندر آیا تو راجہ نے اسے اپنے دو جرنیلوں کے نام لے کر کہا کہ انہیں فوراً بلا لاؤ اور ان دو مسلمان قیدیوں کو بھی لے آؤ جنہیں دوسرے قیدیوں سے الگ رکھا گیا ہے۔

راجہ جے پال اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ دربار کے دستور کے مطابق اس کے دو پنڈت اس کے دائیں بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ دونوں جرنیل۔

دو خوش وضع گٹھے ہوئے جسموں والے اور دراز قد آدمی اندر لائے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ تھے تو قیدی لیکن ان کی چال ڈھال میں وقار اور جلال تھا۔ ان کے چہروں پر خوف نہیں تھا۔ ندامت نہیں تھی۔ وہ سبکتگین کی فاتح فوج کے کماندار تھے۔ انہوں نے آخری معرکے میں شب خون مارا تھا جو اتنا دلیرانہ تھا کہ دشمن کے عقب میں چلے گئے اور پکڑے گئے تھے۔ دونوں کے جیشوں نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا تھا مگر انہیں خاصی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں۔

راجہ جے پال کے ساتھ ایک ترجمان تھا جو غزنی کے خطے کی زبان بولتا اور سمجھتا تھا۔ راجہ نے اس کی وساطت سے دونوں قیدیوں سے باتیں کیں۔

"میں تم دونوں سے کوئی جنگی راز معلوم نہیں کرنا چاہتا" — راجہ جے پال نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ جب تمہاری فوج لڑائی کے لیے جاتی ہے تو تمہارے مولوی یا جوتشی تمہارے بادشاہ کو بتاتے ہیں کہ فلاں دن کوچ کرو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے؟"

"نہیں" — غزنی کے ایک جنگی قیدی نظام اوزبری نے جواب دیا — "ہماری لڑائی ہمارے دین کے دشمن کے خلاف ہوتی ہے۔ دین کے دشمن آپ بھی ہیں عیسائی اور یہودی بھی ہیں، اور ہمارے مسلمان بھائی بھی ہمارے دین کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ ہماری لڑائی جہاد کہلاتی ہے۔ ہم اپنی ریاست کی توسیع کے لیے کسی ملک پر حملہ نہیں کیا کرتے چونکہ ہم خدا کی راہ میں، خدا کے سچے مذہب کی خاطر لڑتے ہیں، اس لیے ہم کوچ، پیشقدمی اور حملے کے لیے ہر دن کو مبارک دن سمجھتے ہیں۔ دن ہو یا رات، بارش ہو یا طوفان، حکم مل جائے تو ہم جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں"۔

"کیا مسجدوں میں تمہارے مولوی اور امام تمہاری کامیابی کے لیے خاص قسم

کی دعائیں مانگتے ہیں؟"

"ہر وہ فرد جو جہاد میں شریک نہیں ہوتا، جہاد پر جانے والوں کے لیے دعا کرتا ہے" ـــــ نظام ادریزی نے جواب دیا ـــــ "ہر وہ شخص، مرد یا عورت، بچہ یا بوڑھا، خدا کے ساتھ براہِ راست ہمکلام ہو سکتا ہے"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے؟" ـــــ راجہ جے پال نے پوچھا ـــــ "کیا تمہیں معلوم تھا کہ میری فوج کی تعداد کیا تھی؟"

"ہمیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ دشمن کی تعداد ہماری نسبت بہت زیادہ ہے" ـــــ نظام ادریزی نے جواب دیا ـــــ "آپ کے لشکر کی صحیح تعداد کا علم سلطان اور اس کے سالاروں کو ہوگا۔ ہماری کامیابی کا راز یہ ہے کہ ہم اپنی جانیں خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم نہیں ہماری روحیں لڑا کرتی ہیں"

"یہ میں جانتا ہوں" ـــــ راجہ جے پال نے کہا ـــــ "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اتنی کم نفری سے اتنے بڑے لشکر پر کس طرح غالب آجاتے ہو۔ میں طریقہ پوچھ رہا ہوں"

"یہ ایک جنگی راز ہے" ـــــ نظام ادریزی نے جواب دیا ـــــ "یہ نہ میں آپ کو بتاؤں گا نہ میرا یہ ساتھی بتائے گا۔ صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ مردِ مومن ستاروں کی گردش کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ جب تک ایمان مضبوط رہتا ہے، اسلام کا مجاہد آسمان سے گرنے والی بجلی بنا رہتا ہے۔ ہماری فوج کے مولویوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ہندو بتوں اور تصویروں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم آپ کو عملی طور پر بتا چکے ہیں کہ پتھر کے خدا ہمارے حقیقی خدا سے ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ کیا آپ کی فوج کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بت نہیں گئے تھے؟ کوئی ایک بھی بت سلامت واپس آیا ہے؟"

"یہ ملیچھ ہمارے مذہب کی توہین کر رہا ہے مہاراج!" ـــــ ایک پنڈت نے غصے سے کہا۔

"اسے ابھی احساس نہیں ہوا کہ یہ ہمارا قیدی ہے" ـــــ راجہ جے پال نے کہا ـــــ "یہ اپنے انجام سے بے خبر ہے۔ اگر اس نے مجھے اپنا طریقۂ جنگ نہ بتایا تو زندہ کی کھال اتاری جائے گی... دونوں کی۔ میں یہ راز معلوم کر کے رہوں گا"

"یہ راز جاننے کے لیے آپ کو اسلام قبول کرنا ہوگا مہاراج!" ـــــ دوسرے قیدی نے کہا ـــــ "ہمیں قتل کر کے آپ اپنی شکست کو فتح میں نہیں بدل سکتے۔ آپ ہم سے کوئی راز نہیں لے سکتے"

"لے جاؤ انہیں" ـــــ راجہ جے پال نے کہا ـــــ "انہیں زنجیروں میں رکھو۔ دوسرے جنگی قیدیوں کو قتل کر دو"

دونوں قیدیوں کو لے گئے، تو راجہ جے پال نے پنڈتوں سے کہا ـــــ "میں اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہتا ہوں۔ مجھے حساب کر کے بتاؤ کہ میں شکست کو کس طرح فتح میں بدل سکتا ہوں"

پنڈتوں کے چلے جانے کے بعد راجہ جے پال نے اپنے دونوں جرنیلوں سے کہا ـــــ "ان دونوں قیدیوں کو لاہور لے چلو۔ ہم کل روانہ ہوں گے۔ یہ دونوں ہمارے ساتھ جائیں گے"

"آپ ان سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟" ـــــ ایک جرنیل نے کہا ـــــ "ہماری شکست کی وجہ صاف ہے۔ سبکتگین کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ ہم حملے کے لیے آ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے گھات لگائی اور پہلے ہی حملے میں ہماری فوج کا حوصلہ توڑ دیا۔ سبکتگین نے پہاڑیوں میں اپنے دستے گھات میں بٹھا رکھے تھے۔ اس نے شب خونوں اور چھاپوں کی جنگ لڑی ہے۔ وہ تیار تھا اور ہمارے لیے اس کے شب خون غیر متوقع تھے۔ آپ یہ معلوم کریں کہ ہمارے کوچ کی اطلاع غزنی تک کس طرح پہنچی۔ ہماری ریاست میں سبکتگین کے جاسوس موجود ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کریں"

راجہ جے پال بوڑھا بھی ہو گیا تھا۔ شکست نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا کہ وہ اس کے سوا کچھ اور سننے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی شکست کا

راز کچھ اور ہے۔ اب نظام الدین نے اسے کہہ دیا کہ وہ جان دے دے گا، یہ راز نہیں بتائے گا تو اس کے دماغ میں یہی گانٹھ پڑ گئی کہ وہ یہ راز معلوم کر کے رہے گا۔

لاہور کے سب سے بڑے مندر میں پنڈت کئی ہاتھوں والی دیوی کے بت کے آگے لوبان اور اگربتیاں جلائے کچھ پڑھ رہے تھے۔ مندر کو صاف کیا گیا تھا۔ اندر اور باہر سے سجایا بھی گیا تھا۔ مندر میں عام لوگوں کا داخلہ بند تھا۔ اندر صرف بیس پچیس نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکریاں اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت تھی۔ وہ مندر کے دروازے کے سامنے دو قطاروں میں کھڑی تھیں۔ وہاں فوج کے چند ایک افسر بھی گھوم پھر رہے تھے۔

باہر سے شور اٹھا ــــ "مہاراج کی سواری آ رہی ہے۔"

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ راجہ جے پال لڑکیوں کی دونوں قطاروں کے قریب پہنچا تو لڑکیوں نے اس کے راستے میں پھول پھینکنے شروع کر دیئے۔ راجہ قطاروں کے درمیان سے گزرا تو لڑکیوں نے اس پر پھولوں کی پتیاں پھینکیں۔ وہ پھولوں کی بارش میں گزرتا مندر میں داخل ہو گیا جہاں پنڈت جنتر منتر پڑھ رہے تھے۔ ایک پنڈت نے اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ ایک پنڈت سنکھ اور دوسرا گھنٹی بجانے لگا۔

راجہ جے پال نے کئی ہاتھوں کی دیوی کے بت کے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنی آنکھوں اور اپنے ماتھے سے لگائے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر قسم کھائی کہ میں شکست کا انتقام لوں گا۔ ہندو مت کو دور دور تک پھیلاؤں گا۔ جس خطے سے اسلام اٹھا تھا اُس خطے کو دیوی دیوتاؤں کے دیس میں شامل کر دوں گا۔ اگر نہ کر سکا تو وہیں اپنی جان دے دوں گا۔

وہ خاموش ہوا تو پنڈتوں کی باری آئی۔ انہوں نے اپنی زبان میں بت سے بہت کچھ کہا۔ گھنٹیاں اور سنکھ بجتے رہے۔ عین اُس وقت بڑی زور کی گرج سنائی دی۔ باہر سورج کی روشنی ماند پڑ گئی۔ گرج ایک بار پھر سنائی دی۔ پنڈتوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا۔ بوڑھے راجہ جے پال نے انہیں دیکھا۔ گرج سنی تو اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ پنڈت اور زیادہ بلند آواز سے بت کے آگے گڑگڑانے لگے۔ باہر دھوپ بالکل ختم ہو گئی۔ مندر کے اندر بھی نیم تاریکی چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی باہر چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"مہاراج!" ــــ بڑے پنڈت نے راجہ جے پال کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور ہاتھ جوڑ کر گھبراہٹ کے لہجے میں کہا ــــ "دیوتا سخت ناراض ہیں۔ غزنی کے میدان جنگ میں بتوں کی جو توہین ہوئی ہے اسے دیوتا بخشیں گے نہیں۔"

آسمان سے اتنی زور کا دھماکہ ہوا کہ مندر لرز گیا۔ بت ڈول گیا۔

"پنڈت جی مہاراج!" ــــ راجہ جے پال نے کانپتی ہوئی آواز میں چلا کر کہا ــــ "دیوتا کیا مانگتے ہیں؟ کتنی قربانی مانگتے ہیں؟ کتنے انسانوں کی جان مانگتے ہیں؟ میں اتنے ہی انسانوں کی قربانی دوں گا۔"

اُس وقت راجہ جے پال، پنڈتوں اور بتوں پر آسمان کی کڑک، گرج اور چیخوں کا خوف طاری تھا۔ مندر سے کچھ دور مسلمان کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارک دے رہے تھے۔ اس طوفانی بارش اور بجلی کی کڑک اور گھٹاؤں کی گرج میں ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ــــ "اللہ نے کرم کر دیا ہے.... اب فصل اٹھے گی.... ڈھول بجاؤ.... ناچو.... نفل پڑھیں گے.... اللہ کا شکر ادا کرو۔"

مسلمانوں کے لیے جو اللہ کا کرم تھا اسے ہندو سرکار اپنے بھگوان کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مسلمان مسجدوں میں شکرانے کے نفل پڑھنے کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ بارش جو آج برسنے لگی تھی ایک ماہ پہلے برسنی چاہیئے تھی۔ اس تاخیر سے خشک سالی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، مگر مسجد اور مندر میں یہ فرق تھا کہ مسجد کا کرم مندر کا قہر تھا۔ مسلمان کسانوں کے بچے بھی باہر نکل آئے اور ناچتے کودتے پھر رہے تھے مگر مندر میں کئی ہاتھوں والی دیوی کے چہرے پر بھی خوف تھا

پنڈت اس بت کے سامنے ہاتھ جوڑے بخشش مانگ رہے تھے۔ باہر جن

لڑکیوں نے راجہ جے پال کے راستے میں پھول بچھا دیے تھے، وہ بادو باراں کے طوفان سے گھبرا کر اندر آگئی تھیں۔

"مہاراج!" بڑے پنڈت نے راجہ جے پال سے کہا۔ "ایک کنواری کی قربانی۔"

"صرف ایک؟"

"جی مہاراج!" پنڈت نے جواب دیا۔ "صرف ایک کنواری لڑکی ہو۔"

"کسی مسلمان کی کنواری بیٹی کو پکڑ لاؤ اور میرے سامنے اسے قربان کرو" — راجہ نے حکم دیا۔

"نہیں مہاراج!" پنڈت نے کہا۔ "بھگوان کسی ملیچھ کی قربانی قبول نہیں کرتے۔ لڑکی ہندو ہونی چاہیئے۔"

راجہ جے پال نے ان لڑکیوں کی طرف دیکھا جنہوں نے اُس کے راستے میں پھول بچھائے تھے۔ انہیں کنواریاں کہا جاتا تھا۔

"ان میں سے ایک کو اپنے پاس رکھ لو" — راجہ جے پال نے کہا۔ "یہ سب کنواری ہیں۔"

لڑکیوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ بعض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، پھر سب نے پنڈتوں کی طرف دیکھا۔ پنڈت جھینپ گئے۔ یہ لڑکیاں آج پہلی بار مندر میں نہیں آئی تھیں۔ یہ آتی ہی رہتی تھیں۔ اکیلی اکیلی بھی آتی تھیں۔ دو دو چار چار بھی آتی تھیں۔ ان کے جاننے والے ان کا احترام کرتے تھے کیونکہ یہ مندر کی کنواریاں تھیں۔ لوگوں کی نگاہوں میں پاک اور قابلِ تعظیم تھیں لیکن پنڈتوں اور لڑکیوں کی نگاہیں کچھ اور کہتی تھیں۔ پنڈت لڑکیوں کی نگاہوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔

راجہ جے پال نے ایک لڑکی کو جو سب سے زیادہ حسین اور نوجوان تھی، بازو سے پکڑا اور پنڈت سے کہا۔ "اس کی قربانی دے دو۔"

"میں آپ کے قدموں میں جان دینے کو تیار ہوں" — لڑکی نے کہا۔

"میں اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ دوں گی لیکن مہاراج! میں کنواری نہیں ہوں۔"

"تمہاری شادی ہو چکی ہے تو مندر میں کیوں آئی ہو؟" — راجہ نے پوچھا۔

"میں کسی کی بیوی نہیں" — لڑکی نے کہا۔ "میں مندر کی داسی ہوں۔ پنڈت جی مہاراج مجھے ....."

"قربانی کے لیے خاص رنگ، عمر اور شکل و صورت کی کنواری کی ضرورت ہے" — بڑے پنڈت نے لڑکی کی بات پوری نہ ہونے دی اور بولا — "ان میں سے کوئی بھی لڑکی قربانی کے قابل نہیں۔ ہم خود تلاش کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم لڑکی کو پورے چاند کی رات سے لے کر اگلے پورے چاند کی رات تک اپنے پاس رکھیں گے۔ اُسے خاص قسم کی غذا دیں گے۔ اُسے خاص پانی سے غسل دیں گے۔ وہ اپنی زبان سے بولے گی کہ مجھے قربان کر دو۔ وہ آپ کو آشیرباد دے گی۔ اُسے اس مندر میں نہیں کسی خاص علاقے میں لے جا کر قربان کیا جائے گا۔"

"یہ کام بہت جلدی ہونا چاہیئے" — راجہ جے پال نے کہا۔

"آپ نے قربانی دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو دیوتاؤں کا قہر اسی سے رک گیا ہے" — بڑے پنڈت نے کہا۔ "آپ سن نہیں رہے کہ آسمان کی گرج دھیمی ہو گئی ہے، طوفان کا زور تھم گیا ہے مہاراج!"

راجہ جے پال مندر سے نکل گیا۔ لڑکیوں کے چہروں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ انہیں ڈر لگ رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو قربان کر دیا جائے گا۔

"آج تم سب سمجھ گئی ہو گی کہ ہم نے تمہیں کنوارہ کیوں نہیں رہنے دیا" — بڑے پنڈت نے لڑکیوں سے کہا۔ "ورنہ آج تم میں سے ایک لڑکی کی گردن کٹ جاتی، یا اُسے زندہ جلا دیا جاتا، پھر باری باری سب کو قربان کر دیا جاتا۔" پنڈت کے لہجے میں سنجیدگی اور متانت تھی جیسے وہ کوئی مذہبی بات کر رہا ہو۔ "تم اپنے اپنے جسم کی قربانی دے چکی ہو۔"

راجہ جے پال کی سواری برستی بارش میں چلی گئی۔ اُس کے فوجی افسر اور محافظ بھی چلے

گئے۔ مندر میں لڑکیاں اور پنڈت رہ گئے۔ پنڈتوں نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ پچھلے کمرے میں چلی جائیں۔ وہ چلی گئیں تو پنڈت بھی اُن کے پیچھے چلے گئے۔

جس وقت راجہ جے پال مندر میں پہنچا تھا، اُس وقت غزنی کے دو قیدی نظام اوریزی اور اُس کا ساتھی قاسم بلخی، ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے راج محل میں لائے گئے تھے۔ انہیں لانے کا حکم راجہ جے پال دے گیا تھا۔ دونوں کو راجہ کے انتظار میں تنگ سے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ راجہ نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ انہیں قید خانے کے گھٹیا کھانے کی بجائے راج محل کا اچھا کھانا دیا جائے۔ راجہ انہیں خوش کر کے اُن سے وہ جنگی راز معلوم کرنا چاہتا تھا جو انہوں نے اس سے چھپایا تھا، حالانکہ اُن کے پاس ایسا کوئی راز نہیں تھا۔ راجہ نے اپنے جرنیلوں سے کہا تھا کہ وہ ان دونوں کو اتنی عیش کرائے گا کہ ان کے دماغ ماؤف ہو جائیں گے، پھر وہ ان کے دلوں کو گرفتار کرے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے راز کی بات نہ بتائی تو انہیں بہت بُری ایذائیں دوں گا۔"

دونوں کے لیے کھانا لایا گیا تو انہوں نے پوچھا کہ کھانا کس نے پکایا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ راج محل کے باورچی خانے کا پکا ہوا ہے۔ انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ انہیں کسی مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دیا جائے خواہ وہ کتنا ہی گھٹیا کیوں نہ ہو اور کھانا کوئی مسلمان لائے ..... چونکہ راجہ نے حکم دیا تھا کہ ان دونوں قیدیوں کی خاطر تواضع کی جائے، اس لیے ہندو باورچی کے ہاتھ کا کھانا واپس کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مسلمان ملازم کھانا اٹھائے ہوئے آیا۔ قیدیوں نے یقین کر لیا کہ یہ ملازم واقعی مسلمان ہے۔

وہ جب کھانا کھانے لگے تو اُن کے ساتھ جو سپاہی آئے تھے وہ کمرے سے نکل گئے۔ قیدی زنجیروں میں تھے، اس لیے اُن کے بھاگنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مسلمان ملازم اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ اُس نے چور نگاہوں سے دیکھا کہ سپاہی باہر چلے گئے ہیں، تو وہ فارسی زبان میں بولا — "خوش نہ ہونا کہ تمہاری خاطر مدارت

ہو رہی ہے۔ یہ سلوک صرف اُس مسلمان قیدی سے کیا جاتا ہے جس کے متعلق شک ہو کہ اس کے پاس کوئی قیمتی راز ہے۔"

دونوں قیدیوں نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"دھیان کھانے میں رکھو" — ملازم نے کہا — "بات سرگوشیوں میں کرنا۔ انہیں شک ہو جائے گا میں تمہارا ہی آدمی ہوں..... اگر تمہارے پاس کوئی راز ہے تو انہیں نہ بتانا لیکن انہیں دھوکے میں رکھنا۔ ورنہ یہ تمہیں ایسے جہنم میں پھینک دیں گے جہاں ہر روز مرو گے اور ہر رات جیو گے۔ انہیں ایسا دھوکہ دیتے رہو کہ تمہاری زنجیریں کھول دیں۔ میں تمہیں فرار کراؤں گا۔ کسی لالچ میں نہ آنا۔"

اُس وقت بارش، بجلی کی کڑک اور تیز جھکڑ کی چیخوں کی وجہ سے اُن کی باتیں کوئی اور نہیں سن سکتا تھا لیکن بارش کا زور ٹوٹتے ہی راجہ جے پال آ گیا۔ اسے بتایا گیا کہ غزنی کے دونوں قیدی آ گئے ہیں۔ راجہ نے انہیں اندر بلا لیا۔

"میں تم سے وہ راز معلوم کرنا چاہتا ہوں" — راجہ نے کہا۔

"ہم ہارنے کے عادی نہیں" — نظام اوریزی نے کہا — "خدا کے سوا ہم کسی کے سامنے نہیں جھکا کرتے اور ہم آپ پر اعتبار نہیں کر سکتے کیونکہ آپ اور آپ کی قوم مسلمان کو دھوکہ دینے اور وعدہ توڑنے کو نیکی سمجھتی ہے۔ اگر ہم زنجیروں میں بندھے ہوئے آپ کو راز کی باتیں بتا دیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم قید کی اذیت سے بچنے کے لیے اپنی قوم کے ساتھ غداری کر رہے ہیں۔ قیدی کی حیثیت سے ہم اپنی زبانیں نہیں کھولیں گے۔"

"تو کیا میں تمہیں اپنا مہمان بنا کے رکھوں؟"

"جو کچھ بھی بنا کر رکھیں، ہم قیدی رہ کر آپ کو اپنا دوست نہیں سمجھ سکتے" قاسم بلخی نے کہا — "آپ ہمارے امراء اور ان کے محافظ دستے کو قید میں مار چکے ہیں۔ آپ نے ہمارے سلطان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ آپ ہم سے اپنے کام کی بات پوچھ کر ہمارا بھی وہی حشر کریں گے جو آپ ہمارے امرا اور ان کے محافظوں کا کر چکے ہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ اس سے زیادہ لشکر لے کر

جائیں، آپ کا انجام وہی ہوگا جو ہو چکا ہے۔ صرف ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ آپ بہت تھوڑی فوج سے ہماری فوج کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں۔"

"میں تمہاری زنجیریں کھلوا دوں گا"۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا۔ "اور تمہیں قیدخانے میں نہیں رکھوں گا۔"

"اور جب ہم آپ کو راز کی بات بتا دیں گے تو آپ ہمیں رہا کر دیں گے؟"۔۔۔ نظام اور زیری نے پوچھا۔ "آپ ہمیں غزنی تک جانے کے لیے سواری دیں گے؟"

"جو مانگو گے دوں گا۔"

"ہم چند دن سوچیں گے، اور آپ کا رویہ دیکھیں گے"۔۔۔ نظام اور زیری نے کہا۔ "قیدخانے کے سوا ہمیں آپ جہاں جی چاہے رکھیں۔ ہم یہاں سے بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھائیں گے۔ آج بھی ہمارے کہنے پر ایک مسلمان ملازم کھانا لایا تھا۔"

شکست کے مارے ہوئے راجہ جے پال نے اُن کی شرط قبول کر لی اور ان کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھلوا دیں اور حکم دیا کہ انہیں وہی مسلمان ملازم دے دیا جائے جس نے آج انہیں کھانا کھلایا تھا۔ انہیں الگ الگ دو کمروں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے لیے ہر قسم کی آسائش اور سہولت مہیا کی گئی لیکن دونوں قیدیوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے کمروں کے اردگرد پہرے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اگلے چند دنوں میں راجہ جے پال کی تمام تر ریاست کے مندروں میں لوگوں کو ایک بار پھر بتایا گیا کہ مسلمان فوج حملہ کرنے آ رہی ہے، اور یہ فوج کوئی مندر سلامت اور کوئی پنڈت زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مختصر یہ کہ ہندوؤں کو مسلمان فوج کی بربریت اور وحشی پن سے خوب ڈرایا گیا۔ اور اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی گئی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے مندروں، اپنے رشیوں، پنڈتوں، اپنی جوان بیٹیوں کی عزت اور اپنی جانیں بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم سرکاری خزانے

میں جمع کرائیں۔ مندروں میں یہی کچھ بتایا جانے لگا۔ ہندوؤں نے پہلے کی طرح اپنے پیٹ باندھ لیے اور آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے مہاراجہ کے خزانے میں جمع کرانے لگے۔

لاہور کے بڑے مندر سے یہ اعلان ہُوا کہ مندر میں آنے والے لوگ اپنی کنواری لڑکیوں کو بھی مندر میں لایا کریں۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ کنواری چونکہ گناہگار نہیں ہوتی، اُس کا جسم پاک ہوتا ہے، اس لیے دیوتا اس کی دعا قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوؤں کو پنڈتوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن کا مہاراجہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور جونہی فوج کی ضروریات کے لیے پیسہ جمع ہو گیا، مہاراجہ مسلمانوں کے ملک غزنی وغیرہ پر حملہ کر دیں گے تاکہ مسلمانوں کو حملے کی مہلت ہی نہ ملے۔ تیاریوں کے ساتھ عبادت اور دعا کی بہت ضرورت ہے۔

اس اعلان کی تعمیل میں لوگوں نے اپنی کنواری بیٹیوں کو بڑے مندر میں بھیجنا شروع کر دیا۔ بڑا پنڈت ان سے دعا کراتا تھا لیکن وہ ہر لڑکی کو غور سے دیکھتا تھا کیونکہ اُسے انسانی قربانی دینے کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔

پھر راجہ جے پال کو اتنی ہوش بھی نہ رہی کہ غزنی کے دونوں قیدیوں کی طرف توجہ دے سکتا کیونکہ اُن ریاستوں کے مہاراجے لاہور آ گئے تھے جنہوں نے راجہ جے پال کو سلطان سبکتگین کی سلطنت پر حملے کے لیے فوجیں دی تھیں۔ ان میں کالنجر، قنوج، گوالیار، دلی اور کالنجر خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ دن رات شکست کے اسباب پر گرماگرم بحث ہوتی رہتی تھی جو ہنگامہ آرائی تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ مگر کوئی ایک بھی مہاراجہ ایسا نہیں تھا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اپنی فوج نہیں جھونکے گا۔ بحث کا موضوع یہ رہا کہ کس طرح سلطان سبکتگین کو اسی کے علاقے میں ختم کر کے اس کی سلطنت پر قبضہ کیا جائے۔

"اگر ہم یہ علاقے فتح کر لیتے ہیں تو وہاں سے عرب کے علاقوں پر حملے کیے جا سکتے ہیں"۔۔۔ کالنجر کے مہاراجہ نے کہا۔ "یہ عزم سب کے دلوں میں اُتر جانا چاہیے کہ ہمیں ہندوستان کو مہابھارت بنانا ہے جس کی سرحدیں دجلہ اور فرات تک ہوں گی۔

اُس منبع کو بند کرنا ہے جہاں سے اسلام اُٹھا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اپنا یہ مقصد حاصل نہ کیا تو عرب پر عیسائی چھا جائیں گے۔ مسلمان ریاستوں کے متعلق مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک دوسری کی دشمن ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اُن میں یہ پھوٹ عیسائی ڈال رہے ہیں۔ وہ بے بہا دولت، شراب اور خوبصورت اور چالاک لڑکیوں کے ذریعے چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے جا رہے ہیں۔"

"ہم بھی یہ طریقہ اختیار کریں گے" —— راجہ جے پال نے کہا۔ "لیکن ہمیں مسلمانوں پر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم جنگی قوت ہیں۔ اس وقت ہماری اور آپ کی ان فوجوں پر جو بچ کر آئی ہیں۔ یہ خوف سوار ہو گیا ہے کہ مسلمان اس قدر دلیر اور زبردست لوگ ہیں کہ انہیں کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا۔ واپس آنے والے سپاہیوں نے لوگوں پر بھی یہی خوف طاری کر دیا ہے۔ ہمیں سلطان سبکتگین کو ایک شکست دے کر اپنی فوجوں اور اپنے لوگوں کے دلوں سے مسلمانوں کی دلیری کا خوف نکالنا ہے۔ اگر ہم غزنی پر قبضہ کر سکیں تو وہاں سے ہم عیسائیوں کے طریقے استعمال کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑا سکتے ہیں۔"

"ہماری لڑکیاں عیسائی اور یہودی لڑکیوں کی نسبت زیادہ ہوشیار اور ذہین ہیں" —— ایک اور راجہ نے کہا —— "اپنے مذہب کو پھیلانے، اپنے ملک کو وسیع کرنے اور اپنے دشمن مذہب کو ختم کرنے کی خاطر ہم ہزاروں لڑکیاں قربان کر سکتے ہیں اور ہماری لڑکیاں جو اپنے خاوندوں کے مرنے کے بعد اپنے آپ کو زندہ جلا دیا کرتی ہیں، وہ ایسی قربانی بڑے شوق سے دیں گی جس میں ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مسلمان کو ختم کرنے کے لیے ہم ایک لڑکی کی عزت قربان کر سکتے ہیں۔"

"میں ایک لڑکی کی قربانی دے رہا ہوں" —— راجہ جے پال نے کہا۔

باقی دن راجے فوجوں کی کمی پوری کرنے، سامان کی فراہمی، جانوروں کی خرید اور نئی فوج کی ٹریننگ کے منصوبے بناتے رہے۔ ان منصوبوں سے پتہ چلتا تھا

کہ اب کے غزنی پر جو حملہ ہوگا اسے سلطان سبکتگین کی فوج نہیں روک سکے گی۔ صرف راجے ہی مصروف نہیں تھے، مندروں میں پنڈت وغیرہ بھی لوگوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنے میں سرگرم تھے۔

ادھر اسلام کی تباہی کے لیے متحدہ محاذ مضبوط ہو رہا تھا، اُدھر سلطان سبکتگین کی سلطنت کے اردگرد چھوٹے بڑے مسلمان حاکم اور حکمران سلطان کی تباہی کے پروگرام بنا رہے تھے۔ اگر تین لاکھ کا ہندو لشکر سلطان سبکتگین کو شکست دے دیتا تو ہندو ان چھوٹے بڑے تمام حکمرانوں کو کچل ڈالتے۔ ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی ذریعۂ نجات نہیں تھا۔ اکیلے سبکتگین نے نہ صرف اپنی اور اپنے مسلمان پڑوسیوں کی سلطنتوں کو بچایا بلکہ اسلام کو بہت بڑے خطرے سے بچا لیا۔ کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کا بیٹا محمود اس کا دستِ راست تھا۔

سلطان سبکتگین نے ہندوستان میں اپنے جاسوس بھیج رکھے تھے جو اسے وہاں کی افواج کی نقل و حرکت اور وہاں کے راجوں مہاراجوں کے عزائم سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ راجہ جے پال ایک اور حملہ ضرور کرے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اتنی زیادہ فوج مروا کر اور اتنے زیادہ جانور ختم کرا کے راجہ جے پال اتنی جلدی حملہ نہیں کر سکے گا مگر اُس کی اپنی فوج کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کا بھی بہت نقصان ہوا تھا۔ اس کے سامنے صرف یہی ایک مسئلہ نہیں تھا کہ راجہ جے پال کے اگلے حملے کے مقابلے کی تیاری کرے۔ کئی اور مسائل درپیش تھے جن میں سب سے بڑا یہ تھا کہ اس کے پڑوسی مسلمان حکمران اُسے برداشت نہیں کر رہے تھے۔

اُس نے دو کارروائیاں کیں۔ ایک یہ کہ تمام پڑوسی حکمرانوں کی طرف ایلچی بھیجے اور انہیں کہا کہ وہ ہندوؤں کے خلاف متحد ہو جائیں لیکن کسی ایک نے بھی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ سلطان نے دوسری کارروائی یہ کی کہ آج کل پشاور کے شمال مغرب کے پہاڑی علاقے میں جتنے چھوٹے بڑے قلعے تھے، ان سب پر قبضہ کر لیا۔ یہ افغانیوں اور خلجیوں کے علاقے تھے۔ انہیں سلطان سبکتگین نے اپنی فوج سے بھی

مرعوب کیا اور صوفی اور عالم قسم کے وفد بھیج کر انہیں اسلام کے نام پر اپنا حامی بنایا۔ افغانیوں اور خلجیوں کی کوئی خاص فوجی طاقت نہیں تھی وہ سبکتگین کے اتحادی بن گئے اور اپنے علاقے کے لوگوں کو اُس کی فوج میں بھرتی کرا دیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ محمود غزنوی کی عمر تئیس برس ہوگئی۔ سلطان سبکتگین نے اُسے خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ بخارا کا بادشاہ ابوالمنصور مر گیا۔ اُس کے بیٹے نوح کو اُس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ فائق نام کے ایک حاکم نے نوح کے خلاف بغاوت کر دی۔ نوح نے سلطان سبکتگین سے مدد مانگی۔ سبکتگین خود اُسے ملنے گیا اور مدد دی۔

سلطان کی اپنی سلطنت کا یہ حال تھا کہ ایک امیر ابوعلی حسن بن سنجار نے خراسان کے تھوڑے سے علاقے پر قبضہ کر لیا اور امیر فائق کو پناہ دے دی۔ سلطان سبکتگین نے صلح سمجھوتے کے پیغام بھیجے لیکن ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ سلطان کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے ان مسلمان بھائیوں پر حملہ کرے۔ ابوعلی حسن وغیرہ کو عیسائیوں نے درپردہ بہت جنگی مدد دے رکھی تھی۔ انہیں اس مدد پر بہت ناز تھا۔ سلطان سبکتگین اپنی فوج کے ساتھ تُرم پہنچا۔ نوح بھی فوج لے آیا اور سلطان سے جا ملا۔

فائق اور ابوعلی حسن نے جرجان نام کی ایک مسلمان ریاست کے حکمران فخرالدولہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ فخرالدولہ کے پاس دارا نام کا ایک سپہ سالار تھا جس کی قیادت اور جنگی فہم و فراست کی دھوم تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لشکر اپنی افواج کے ساتھ ہرات کے مقام پر پہنچ گئے۔ سلطان سبکتگین بھی اپنی فوج کو ہرات کے ایک میدان میں لے گیا جسے وہ لڑائی کے لیے موزوں سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ محمود تھا اور بخارا کا حکمران نوح بھی تھا۔ جو اپنی فوج کے ساتھ سلطان کا اتحادی بن کر آیا تھا۔ نوح ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا۔ اسی لیے امیر فائق نے بغاوت کر دی تھی کہ یہ کمسن لڑکا گھبرا کر تخت سے دستبردار ہو جائے گا۔

اُس وقت کے عینی شاہدوں کی تحریروں سے وہ منظر صاف نظر آنے لگتا

ہے۔ کہ ادھر ہندوستان میں ہندو مہاراجے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر دُنیائے اسلام پر حملے کی تیاری کر رہے تھے، اُدھر دُنیائے اسلام کے ایک خطے میں جہاں بُت شکن پیدا ہوئے تھے، مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسری کا خون بہانے کو تیار تھیں کہتے ہیں، سلطان سبکتگین نے اپنے نوجوان بیٹے محمود کو اور بخارا کے حکمران کمسن نوح کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"یہ آنسو ابا جان؟" — محمود غزنوی نے پوچھا۔

"اسلام کے اتحاد کی لاش پر آنسو نہ بہاؤں تو اور کیا کروں بیٹا!" — سلطان سبکتگین نے جواب دیا — "مسلمان متحد تھے تو یورپ کے کفرستان میں بھی انہوں نے اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ آج اتحاد پارہ پارہ ہوگیا ہے تو نہ یورپ میں اسلامی پرچم نظر آتا ہے نہ ہندوستان میں۔ اسلامی ملکوں میں سے کئی ایک پر عیسائی قابض ہیں۔ وہ آگے بڑھتے آ رہے ہیں۔ ادھر ہندوؤں کے عزائم بھی یہی ہیں ..... تم دونوں کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے یہ خیال آگیا تھا کہ ہم تو آپس میں لڑ جھگڑ کر کل پرسوں اس دُنیا سے اُٹھ جائیں گے، اپنے بچوں کے لیے ہم کیا ورثہ چھوڑ جائیں گے! ہم تمہیں اسلامی سلطنت کے ٹکڑے دے کر جا رہے ہیں، اقتدار کی ہوس، خانہ جنگی اور ایمان فروشی کی طرح ڈال کر جا رہے ہیں۔ ان ایمان فروش اقتدار پرستوں کی اولاد بھی مسلمانی کو ہندکی خاطر اپنا، یا ان اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گی ....

"مجھے کفرستان کے بُت توڑنے تھے تمہیں باطل شکن بننا تھا مگر ہمارے اپنے بھائی جو ہمارے ہی کعبہ کے پجاری ہیں بُت پرستوں کی شہ اور مدد سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کو بھلا بیٹھے ہیں۔ میرے بچو! ہماری قوم کا مستقبل تاریک ہے۔ تخت و تاج کی ہوس اور پورا عالم اسلام کی وحدت کو ریزہ ریزہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ہر مسلم ریاست کے اندر بھی نفاق اور منافقت ہے۔ یہ لوگ جب متحد ہوتے ہیں تو ان کے اتحاد میں بھی منافقت ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوتے

ہیں۔ ہر ایک کے دل میں سلطانی کی مسند ہے۔ خلافت موجود ہے لیکن برائے نام۔"

سلطان سبکتگین بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کہا — "محمود اور نوح! دونوں فوجوں کو میرے سامنے لاؤ۔"

دونوں فوجیں اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے فوجوں کو ایک نظر دیکھا تو اُس نے اپنے آپ میں زلزلے کا سا جھٹکا محسوس کیا۔ اُس کا گھوڑا اور اسی اونچی جگہ کھڑا تھا جہاں سے اُسے امیر فائق، بو علی حسن اور فخر الدولہ کی متحدہ فوج کا کیمپ نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کے سپاہیو!" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "یہاں سے تمہیں تم جیسی تمہارے ہی مذہب کی ایک فوج کے خیمے نظر آ رہے ہیں۔ اگر تم اور وہ کندھے سے کندھا ملا لو تو اسلام کی سلطنت کی سرحدیں ایک بار پھر وہاں تک جا سکتی ہیں جہاں تک طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم لے گئے تھے، مگر تمہارے اور اُس فوج کے درمیان دشمن حائل ہو گیا ہے۔ تم خدا اور رسولؐ کے نام لیوا ہو۔ وہ تخت و تاج کے پجاری ہیں۔ وہ اپنا دین اور اپنا ایمان نیلام کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے بت پرست ہندو ہم پر دو بار حملہ کر چکے ہیں۔ تم نے بہت تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے اتنے بڑے لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہندو ہمارے رسولؐ کے دشمن ہیں۔۔۔۔

"اور۔۔۔ تم ان مسلمانوں کا وہی حشر کرو گے جو تمہارے رسولؐ کے دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم اس فوج کا نعرۂ تکبیر سن کر اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لو اور تلواریں نیاموں میں ڈال لو۔ اگر اس دھوکے میں آ گئے تو اس خطے سے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ سلطان کے ساتھی ہیں۔ اُن کے پرچم پر جو چاند اور ستارہ ہے، وہ بہت بڑا فریب ہے۔ اپنے دشمن کو مارنے سے پہلے اپنے اس بھائی کو مارو جو بھائی ہونے کا دھوکہ دے کر دین کے دشمن کا ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔۔۔۔

"میں نے بہت کوشش کی ہے کہ یہ لوگ خلوص اور محبت کی زبان سمجھ سکیں مگر وہ

نہ سمجھے۔ میں اپنے بیٹوں کو قتل کر سکتا ہوں، اپنے مذہب کو کمزور ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اسلام کا سپاہی اپنی حکومت کرنے کے لیے نہیں لڑتا بلکہ اللہ کی حکومت کو مضبوط کرنے اور گمراہ انسانوں کو اس حکومت تلے لانے کے لیے جہاد کیا کرتا ہے۔ کیا تم قوم کی اُن بیٹیوں کو بھول سکتے ہو جو کفار کے قبضے میں آئے ہوئے علاقوں میں عصمت کے موتی لٹا بیٹھی ہیں؟ کیا تم برداشت کر لو گے کہ کوئی کافر تم میں سے کسی کی بیٹی کو ہوس کاری کے لیے استعمال کرے؟ یہ مسلمان حکمران جو تمہارے ساتھ لڑنے کے لیے اپنی فوجیں لائے ہیں، اپنی بیٹیوں کی عزت و آبرو سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کے وقار کا کیا تحفظ کریں گے۔"

سلطان سبکتگین کی آواز میں جوش اور جذبات کا لرزہ پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا اور اُس کے اثر سے اُس کی اور نوح کی فوج میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ سلطان کا ایک ایک لفظ عسکریوں کے دلوں میں اترتا جا رہا تھا۔ جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا مگر سلطان سبکتگین کو اس سے ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی۔

اُسی روز اُس نے اپنی فوج کو جنگ کی ترتیب میں کھڑا کر دیا۔ خود قلب میں رہا۔ اس نے محمود اور نوح کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔

مخالف کیمپ میں دارا تجربہ کار اور قابل جرنیل تھا۔ اُس نے سلطان سبکتگین کی فوج کو جنگی ترتیب میں تیاری کی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی متحدہ افواج کو جنگی ترتیب میں کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان سبکتگین کو حملہ کرنے کا موقع دیا تو وہ جیت جائے گا۔ وہ سلطان کی چالوں اور جنگی تجربے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان کو مہلت دی تو اُس کے شب خون مارنے والے جیش عقب اور پہلوؤں پر آ جائیں گے اور وہ فوج کو تھکا تھکا کر اور بکھیر کر ماریں گے۔ دارا نے نہایت اچھی چال چلی۔ اُس نے قلب پر حملہ کرنے کی بجائے اپنے منتخب دستے دُور کے چکر سے آگے بڑھا کر سلطان کی فوج کے دونوں پہلوؤں پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ غیر متوقع اور شدید تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان سبکتگین کے لیے دارا کی یہ چال غیر متوقع تھی۔ اُسکے

پہلوؤں کے دستے بے خبری میں دبوچے گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے قدم اکھڑنے لگے۔ دارا نے اپنی فوج کا خاصا بڑا حصہ اپنے پاس اس مقصد کے لیے رکھا ہُوا تھا کہ جب سلطان کے پہلوؤں کے دستے اکھڑنے لگے تو سلطان اپنے دائیں اور بائیں مدد دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُس وقت دارا قلب پر حملہ کر دے گا۔

سلطان سبکتگین کے لیے بالکل یہی صورت حال پیدا ہو گئی۔ شکست صاف نظر آنے لگی۔ اُس نے پہلوؤں کو قائم رکھنے کے لیے اپنے ریزرو ٹروپس سے کمک بھیجی تو قلب کمزور ہو گیا۔ وہ دارا کی چال سمجھ گیا لیکن بے بس ہو گیا۔ اُس کے دونو پہلو کٹ رہے تھے۔ وہ سامنے کے حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے محمود اور نوح سے کہا — "میرے بیٹو! آج ہمیں زندگی کا آخری معرکہ لڑنا ہے۔ میدان دشمن کے ہاتھ آ گیا ہے"۔

اُس دَور کا مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ عین اُس وقت جب سلطان سبکتگین کو اپنی شکست سامنے نظر آ رہی تھی، ایک گھوڑا گرد اڑاتا اور بہت تیز رفتار سے دوڑتا اُس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ سوار دشمن کی صفوں سے آیا تھا۔ وہ گرد سے نکلا تو دیکھا کہ اُس کی تلوار نیام میں تھی۔ اور اُس نے اپنی ڈھال اپنی پیٹھ پر ڈال رکھی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لڑنے کے لیے نہیں دوستی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اُس کے پیچھے دشمن کی فوج کے بہت سے دستے تھے۔

وہ جب سلطان سبکتگین کے سامنے آیا تو سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دشمن کا کوئی عام ایلچی یا قاصد نہیں تھا، وہ دشمن کا قابل جرنیل دارا تھا۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے اپنی تلوار اور ڈھال سبکتگین کے آگے پھینک دی۔

"سلطان! — دارا نے کہا — "میں اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑ سکتا ہوں۔ میں اپنے بھائیوں کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔ میں اپنے محفوظہ کے دستے ساتھ لے آیا ہوں۔ میں جن کا سپہ سالار ہوں وہ بادشاہی کے لالچی ہیں۔ میں نے ساری عمر کے جہاد کا جو ثواب کمایا تھا، وہ میں ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے خدا کے حضور سرخرو ہونے کا موقع دیں"۔

اُس نے اُن دستوں کو جو اُس کے ساتھ آئے تھے حکم دیا کہ پیچھے مڑیں اور امیر فائق وغیرہ کی فوج پر حملہ کر دیں۔ اُس نے اس حملے کی قیادت خود کی۔ سلطان سبکتگین نے اپنے تمام ریزرو ٹروپس (محفوظہ) کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلوؤں کو کمک دے دی۔ ایک کی قیادت محمود کے پاس تھی۔ نوح کو سلطان نے اپنے ساتھ رکھا کیونکہ وہ کمسن اور ناتجربہ کار تھا۔

گنہگار کے حوصلے جلدی پست ہو جایا کرتے ہیں۔ فائق اور بوعلی حسن اپنی فوجوں کو سلطان اور دارا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اُن کی کچھ فوج بھی بھاگ کر اُن کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ انہوں نے جرجان جا دم لیا۔ جہاں کے حکمران فخر الدولہ نے انہیں پناہ دی۔ سپہ سالار دارا کے سینے میں ایمان کا شعلہ کچھ ایسا بھڑکا تھا کہ وہ جرجان تک ان غداروں کا تعاقب کرنے پر زور دے رہا تھا لیکن سلطان سبکتگین نے اُسے یہ کہا کہ وہ خانہ جنگی کو طول نہیں دینا چاہتا۔ اس کی بجائے وہ انہیں دوستی اور اتحاد کا پیغام دینا چاہتا تھا۔ محمود غزنوی دارا کا ہم نوا تھا۔ اس کا نوجوان خون اُسے انتقام لیے بغیر چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

سلطان سبکتگین نے اپنی فوجوں کو سمیٹا اور غزنی کو کوچ کر گیا۔ محمود غزنوی تھوڑی سی فوج کے ساتھ نیشاپور چلا گیا۔ گورنر کی حیثیت سے اُسے وہیں رہنا تھا۔ نوح اپنے ملک بخارا کو روانہ ہو گیا۔ دارا سلطان کے ساتھ تھا۔

محمود غزنوی نیشاپور پہنچا ہی تھا کہ فوجی قاصد گھبراہٹ کے عالم میں دوڑے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ فخر الدولہ نے انہیں تازہ دم فوج دے دی تھی۔ وہ سلطان سبکتگین کی فوج کی نقل و حرکت دیکھتے رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ سلطان سبکتگین اور دارا فوج کا زیادہ تر حصہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور محمود تھوڑی سی فوج کے ساتھ نیشاپور میں اکیلا رہ گیا ہے، تو انہوں نے نیشاپور پر حملہ کر دیا۔

محمود غزنوی نے انہی قاصدوں کو سلطان سبکتگین کے پیچھے دوڑا دیا اور خود فوج

کی کمان سے کر مقابلے کے لیے بڑھا مگر دشمن میدان پر چھا چکا تھا۔ محمود کی پوزیشن اتنی کمزور تھی کہ وہ گھیرے میں آ گیا۔ اس کی فوج بہت تھوڑی بھی تھی اور ہرات کی لڑائی کے فوراً بعد بڑی لمبی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ محمود اسے بروقت لڑائی کی ترتیب اور تنظیم میں لا ہی نہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود کو پسپا ہونا پڑا۔ وہاں تو پسپائی بھی ناممکن نظر آ رہی تھی۔ انجام یہی نظر آتا تھا کہ محمود پکڑا جائے گا اور اس کی فوج بھی جنگی قیدی ہو جائے گی یا ماری جائے گی۔

دونوں قاصدوں کے گھوڑے غزنی کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ محمود غزنوی کی قسمت خدا کے بعد ان قاصدوں کے ہاتھ تھی۔ سفر لمبا تھا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ دوسرے دن جب بوعلی حسن اور امیر فائق نے اپنے عقب میں گرد کے بادل اُٹھتے دیکھے تو وہ بہت خوش ہوئے کہ فخر الدولہ نے کمک بھیجی ہے اور اب وہ نیشاپور کو ترنوالے کی طرح نگل جائیں گے۔ مگر گرد سے جو فوج نکلی وہ سلطان سبکتگین کی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطان اتنی جلدی آ جائے گا۔ سلطان کے ساتھ دارا تھا۔ دونوں نے بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوج کو گھیرے میں لینے کے لیے اپنی فوج پہلوؤں پر پھیلا دی۔ دونوں باغیوں نے دیکھا کہ پسپائی کے راستے بند ہو چکے ہیں تو انہوں نے اپنی فوج کو سمیٹ کر سلطان سبکتگین کی فوج کے وسط میں آمنے سامنے کا حملہ کر دیا۔

محمود غزنوی جو پسپائی کی حالت میں تھا، پیچھے مڑا۔ مشہور مورخ فرشتہ لکھتا ہے ”محمود نے سخت غصے میں آئے ہوئے شیر کی طرح غداروں کی فوج پر ہلہ بول دیا۔ اُس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ بوعلی حسن اور امیر فائق کی فوج کچلی گئی مگر ان دونوں غداروں کا کوئی پتہ نہ چلا کہ کدھر نکل گئے ہیں“ — فتح مکمل تھی۔ سانپ کا سر کچل دیا گیا تھا۔

ادھر لاہور میں ہندو راجے مہاراجے غزنی، بلخ، بخارا اور خراسان وغیرہ پر حملہ اور قبضہ کرنے کے لیے متحدہ فوج تیار کرنے میں دن رات مصروف تھے۔ ان تیاریوں میں پوری ہندو قوم شامل تھی۔ مرد اور عورتیں محنت و مشقت کر کے سرکاری

خزانہ بھرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ راجوں مہاراجوں نے اپنے اختلافات اور عداوتیں ختم کر ڈالی تھیں۔ ہندوؤں میں لوگوں کے دماغوں میں یہ جنون پیدا کیا جا رہا تھا کہ ہندومت کو اسلام سے محفوظ کرنے کے لیے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنا مذہبی فریضہ ہے۔

ادھر اسلامی ملکوں میں دو اسلامی فوجیں ایک دوسری کا خون بہا رہی تھیں۔ اقتدار پرست اپنی ہوس کی خاطر اسلام کی عسکری قوت تباہ کر رہے تھے اور قوم کے بیٹے کٹ رہے تھے۔

پشاور، لاہور اور بھٹنڈہ میں غزنی کے جو جاسوس تھے، وہ غزنی کو صحیح اور بروقت اطلاعیں بھیجنے کے لیے موت کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ان کے جذبۂ ایثار، شجاعت اور فرض شناسی کے مظاہروں کو خدا کے سوا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ گمنام جانباز تھے جنہوں نے اپنے اوپر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اپنے نام بھی بدل ڈالے تھے۔ ہمارے ملک کے دو چار ایمان فروش ان کے جہاد پر مٹی ڈال رہے تھے۔

سلطان سبکتگین ذرا ستانے کے لیے اور فوج کو آرام دینے اور نئی بھرتی کے لیے بلخ چلا گیا اور وہیں قیام کا فیصلہ کیا۔ تب اُسے احساس ہوا کہ جس بیماری کو وہ دبا رہا اور معمولی سمجھتا رہا ہے، وہ جان لیوا روگ ہے۔ جنگ و جدل نے اُسے اپنی صحت کی طرف دھیان دینے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ طبیبوں نے اس کا علاج شروع کیا لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اُس نے غزنی چلے جانے کا ارادہ کیا اور روانہ ہو گیا مگر وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ ترمذ (بلخ سے تھوڑی ہی دور) سے آگے جانے کے قابل نہ رہا۔ وہیں رک گیا۔

”ترجمہ یمینی“ میں لکھا ہے کہ ایک روز نقاہت کی انتہا کے عالم میں سلطان نے شیخ ابوالفتح سے جو اُس کے پاس بیٹھا تھا، کہا ”ہم بیماری سے صحت یاب ہونے کے لیے پرہیز کرتے ہیں۔ صحت یاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ریوڑ سمجھتے ہیں کہ موت نہیں آئے گی۔ مجھے بھیڑ کا خیال آتا ہے۔ اسے قصاب خرید کرلے جاتا ہے۔ کبھی کسی ریوڑ

میں اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی اکیلے کیس باندھ دیتا ہے۔ بھیڑ زندہ رہنے کی آس لگائے رکھتی ہے مگر ایک روز قصاب اُس کی گردن پر چھری پھیر دیتا ہے۔ ایسے ہی ہم کئی بار بسترِ علالت پر لیٹتے اور اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک روز موت اچانک ہماری گردن دبوچ لیتی ہے، اور ہمیں کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

اس سے چالیس روز بعد سلطان سبکتگین نے صرف یہ کہہ کر کہ محمود سے کہنا تجھے بُت شکن بننا ہے، جان اللہ کے حوالے کر دی۔ یہ اگست ۹۹۷ عیسوی (شعبان ۳۸۷ھ) کا مہینہ تھا۔ اُس وقت سلطان کی عمر ۵۵ سال تھی ـــ خانہ بدوشوں کا بیٹا جو غلاموں کی منڈی میں فروخت ہُوا تھا تاریخِ اسلام میں کبھی نہ مٹنے والا نام پیدا کر کے اور اپنے پیچھے تاریخ میں بُت شکن کہلانے والا بیٹا چھوڑ کر اللہ کے حضور چلا گیا۔

محمود غزنوی اپنے باپ کی وفات کی اطلاع پر پہنچا۔ اُس نے باپ کی میت اٹھوائی اور اُسے غزنی لے گیا۔ تجہیز و تکفین کے فوراً بعد اُس نے سلطنت کو سنبھال لیا۔ اُس وقت اُس کی عمر چھبیس سال تھی۔

دو مائیں

سُلطان سبکتگین کی تجہیز و تکفین کے بعد محمود غزنوی نیشاپور چلا گیا۔ چونکہ وہ مردِ میدان تھا اس لیے اُس نے سب سے پہلے فوج کی تنظیم کی طرف توجہ دی۔ اُس نے غزنی جا کر سلطنت کے کاروبار کو دیکھنا ملتوی کر دیا۔ اُسے یقین تھا کہ حکومت کی مشینری چل رہی ہے، اور اگر کوئی گڑبڑ ہُوئی تو اُسے اطلاع مل جائے گی۔ اُس کے دماغ میں سلطانی کا خبط ہوتا تو وہ سب سے پہلے غزنی جاتا اور باپ کی مسندِ سلطانی پر جا بیٹھتا۔

محمود غزنوی علماء، صوفیاء اور اولیاء کا شیدائی تھا۔ ان میں ابوالحسن خرقانی وہ ولی تھے جن کا وہ مرید تھا۔ ایک اور بزرگ ابوسعید عبدالملک صوفیاء میں سے تھے جن کا محمود غزنوی معتقد تھا۔ خرقانی کہیں دور رہتے تھے۔ محمود کبھی کبھی اُن کے ہاں سلام اور پند و نصیحت کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور ابوسعید کبھی کبھی اس کے ہاں آ جایا کرتے تھے۔ بیہقی لکھتا ہے کہ محمود غزنوی اُن کے استقبال کے لیے دربار سے اٹھ کر باہر جا کھڑا ہوتا تھا۔

محمود غزنوی کے ذہن پر راجہ جے پال اور اُس کے بُت سوار تھے۔ اُس کی توجہ فوجی امور پر مرکوز تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی سلطنت کو خوشامدیوں کی دیمک لگ چکی ہے اور خزانہ تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ محمود غزنوی کو یہ اطلاع اُس کی انٹیلی جنس کے ایک آدمی نے دی جو غزنی سے یہی اطلاع دینے آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ سلطنت کی گدی پر اُس کا چھوٹا بھائی اسماعیل بیٹھ چکا ہے۔ اور اس نے

اپنی سلطانی کا فرمان بھی جاری کر دیا ہے۔

اسماعیل سلطان سبکتگین کی دوسری بیوی سے تھا۔ سبکتگین کی وفات کے وقت یہ بیوی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس نے نزع کے عالم میں سبکتگین سے اس وصیت پر دستخط کروا لیے تھے کہ اسماعیل اس کی سلطنت کا جانشین ہوگا۔ بعض غیر مسلم مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سبکتگین نے محمود کو اس لیے جانشین نہیں بنایا تھا کہ وہ اُس ماں کے بطن سے تھا جو غلاموں کی نسل سے تھی اور اسماعیل کی ماں شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس دور کے وقائع نگاروں کی تحریروں کے مطابق یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ سبکتگین کے آخری لمحات اس قدر شدید تکلیف میں گزرے کہ اُس نے نیم غشی کی کیفیت میں اسماعیل کو جانشین مقرر کر دیا۔ اس داستان کی پچھلی اقساط میں تفصیل سے سنایا جا چکا ہے کہ محمود غزنوی کی ماں کون تھی اور کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ اسماعیل نوجوان اور کھلنڈرا تھا۔ اُسے محمود کے مقابلے میں کوئی عسکری تجربہ نہیں تھا۔ جنگوں میں سبکتگین کے ساتھ محمود رہتا تھا۔ سبکتگین نے اسماعیل کو اپنا جانشین مقرر کیا ہی نہیں ہوگا۔ اگر کیا ہی تھا تو اُس کے عالم نزع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسماعیل کی ماں نے اپنے بیٹے کو سلطان بنوایا ہوگا۔

دونوں بھائیوں میں اتنا فرق تھا کہ جب محمود اپنے باپ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر پشاور چلا گیا اور راجہ جے پال کا حملہ روکنے یا ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا، اُس وقت اُس کا چھوٹا بھائی اسماعیل بلخ میں اپنی رسم تاجپوشی میں مگن ہو گیا۔

"سلطان عالی مقام!" — غزنی سے آئے ہوئے آدمی نے محمود غزنوی سے کہا — "اب ہندوستان کے کسی راجہ کو ہماری سلطنت پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے دشمن ہماری سلطنت کی تباہی چاہتے ہیں۔ آپ نے اور آپ کے والد مرحوم نے انہیں ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ وہ جب بھی آئے، اپنے خون میں ڈوب گئے، مگر سلطان سبکتگین مرحوم سلطنت کی تباہی کا انتظام اپنے ہاتھوں کر گئے ہیں۔"

"فوراً وہ خبر سناؤ جو غزنی سے لائے ہو" — محمود نے کہا۔

"میں نے آپ کو سلطان کہا ہے کیونکہ آپ مرحوم سلطان کے بیٹے ہیں" — اس آدمی نے کہا — "مگر سلطان آپ نہیں، آپ کے برادر خورد اسماعیل ہیں۔ میں آپ کا خادم اور ملازم ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ سلطنت کی گدی پر کون بیٹھا ہے۔ میں ایک وفادار اور نمک حلال ملازم کی حیثیت سے یہ بتانے آیا ہوں کہ جس دربار میں سالار اور دیگر عسکری کمانڈر احکام اور ہدایات لینے آیا کرتے تھے، وہاں اب خوشامدیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ آپ کے بھائی کے مشیر کون ہیں۔ وہ جو کوئی بھی ہیں، انہوں نے آپ کے بھائی کو چرب زبانی اور چاپلوسی کی زنجیروں میں گرفتار کر لیا ہے۔ نہایت معمولی حیثیت کے لوگوں کو اعلیٰ رتبے اور درجے دے دیئے گئے ہیں۔ فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے آپ کے اور آپ کے والد مرحوم کے وفادار اہلکاروں نے بتایا ہے کہ خزانہ تیزی سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔"

محمود غزنوی کو جیسے چکر آ گیا ہو۔ اُس نے آدمی کو اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا کہ وہ وہاں کی مزید اطلاعات فراہم کرے۔ وہ خود اپنی ماں کے پاس گیا جو اُس کے ساتھ رہتی تھی۔

"مجھے خود وہاں جانا چاہیئے" — محمود غزنوی نے اپنی ماں سے کہا — "مجھے وہاں سے آنا ہی نہیں چاہیئے تھا مگر میرے دل میں سلطانی کی خواہش نہیں تھی۔ میرے فرض کے تقاضے کچھ اور ہیں۔"

"تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیئے" — ماں نے اُسے کہا — "تمہارا بھائی تمہیں قتل کرا سکتا ہے۔ تخت و تاج کا نشہ انسان کو وحشی اور درندہ بنا دیتا ہے..... اور یہ بھی سوچ لو کہ وہ اپنے باپ کا جانشین بننے کے قابل ہے تو اُسے سلطان بنا رہنے دو اور فوج کی کمان تم اپنے ہاتھ میں رکھو۔"

"اگر وہ اس قابل ہوتا تو میں اتنا پریشان کیوں ہوتا" — محمود نے کہا — "کیا آپ اُسے جانتی نہیں کہ وہ کس قماش کا لڑکا ہے! مجھے میرے پیر و مرشد نے بتایا ہے کہ نااہل اور خود غرض حکمران کے گناہوں کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ میں سلطان نہیں بننا چاہتا۔ مجھے سلطنت کو بچانا ہے۔ اسے ایک مضبوط قلعہ بنا کر مجھے اسلام

کی شمع ہندوستان کے بت خانے تک پہنچائی ہے ....اگر میرا بھائی مخلص ہوتا تو وہ، مجھے اپنی تاجپوشی پر بلاتا۔ اُس نے مجھے اطلاع تک نہ دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نیت صاف نہیں۔ مجھے وہاں جانا چاہیئے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ان دنوں اسماعیل غزنی میں نہیں بلخ میں ہے۔"

"تم اسے پیغام لکھ کر بھیج دو" — ملں نے کہا۔ "اُس سے پوچھو کہ مجھے جو خبریں ملی ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔ اُس کے جواب کا انتظار کرو۔"

اسماعیل اُس وقت بلخ میں ہی تھا جب قاصد نے اُسے محمود کا پیغام دیا۔ اسماعیل نے کاغذ کھولے بغیر اپنے ایک حاکم کی طرف پھینک کر کہا۔ "پڑھ کر سناؤ، میرے بھائی نے کیا لکھا ہے۔"

اس حاکم نے کاغذ سیدھے کیے اور بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ "عزیز بھائی!"

اسماعیل نے غصے سے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اُس نے ہمیں بھائی لکھا ہے! سلطان نہیں لکھا؟"

"نہیں ظل الٰہی!" — حاکم نے جواب دیا۔

"یہ بدصورت مسخرا اس قدر گستاخ ہے؟"

"اسے اس کی سزا ملنی چاہیئے سلطان عالی مقام!" — ایک درباری نے کہا۔ "اگر باپ گستاخی کرے تو اُسے بھی سزا ملنی چاہیئے۔ خدا اور رسول ؐ کے بعد درجہ سلطان کا ہوتا ہے۔ ظل الٰہی کی سواری جس راہ سے گذرتی ہے، اس راہ پر رعایا سجدے کرتی ہے۔ آپ کے دشمن آپ کا نام سن کر کانپتے ہیں۔"

"آگے پڑھو" — اسماعیل نے حکم دیا۔

"محمود نے لکھا ہے" — حاکم پیغام پڑھنے لگا — "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ تم سلطنت کی مسند پر بیٹھ گئے ہو۔ اللہ تمہیں یہ اعزاز مبارک کرے مگر اس سلطنت پر جو خطرے منڈلا رہے ہیں اور اس مسند کے ساتھ جو فرائض اور

ذمہ داریاں وابستہ ہیں، شاید تم ان سے واقف نہیں ہو۔ اگر واقف ہوتے تو اس مسند کو پھولوں کی سیج سمجھ کر آرام سے بیٹھ نہ جاتے۔ سب سے پہلے میرے پاس آتے یا مجھے اپنے پاس بلاتے۔ اگر تم مجھے اس قابل نہ سمجھتے تو مجھے اپنے باپ کا بیٹا سمجھ کر ہی اپنی تاجپوشی میں شریک کر لیتے۔ اس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ تمہاری نیت ٹھیک نہیں رہی۔ درباری چاپلوسوں نے تمہاری ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تمہاری نیت ٹھیک نہیں رہنے دی۔ تم جانتے ہو کہ سلطنت کے اندر بھی دشمن موجود ہیں۔ تمہارے سامنے ان کے ساتھ لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ ہندوستان کے بُت پرست ہم پر دو حملے کر چکے ہیں، اور تیسرے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس وقت ہماری ضرورت یہ نہیں کہ دربار لگا کر درباریوں کے سلام اور قصیدے وصول کیے جائیں۔ اس وقت ہمیں خیموں میں ہونا چاہیئے ....

"اگر تم یہ بہتر سمجھتے ہو کہ تم سلطنت کا کاروبار سنبھال سکتے ہو تو میں جنگی امور سنبھال لیتا ہوں۔ اس وقت جنگی امور کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں صرف اس صورت میں تمہیں سلطانی سونپ سکتا ہوں کہ تم اچھے اور بُرے میں، دوست اور دشمن میں، نیک اور بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاؤ مگر مجھے یقین ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو۔ تم نے نااہل لوگوں کو رُتبے دے دیئے ہیں۔ ان میں یہ خوبی دیکھی ہے کہ وہ خوشامدی اور چرب زبان ہیں۔ تم نے فوج کی تنخواہ بڑھا کر خزانے پر بے جا بوجھ ڈال دیا ہے۔ تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تم ایک اسلامی سلطنت کے سلطان ہو اور تمہارے اوپر ایک خلیفہ بھی ہے ....

"میری ایک تجویز مان لو تاکہ میں وہ فرض ادا کر سکوں جو مرحوم باپ ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔

"اگر آپ حکمرانی کے قابل نہیں تو اور کون ہے؟" ——— ایک اور نے کہا۔

وہاں جتنے درباری موجود تھے، انہوں نے محمود غزنوی کے پیغام کے خلاف باتیں کیں۔ ان سب کو اسماعیل نے رتبے دیئے تھے۔ محمود نے انہی لوگوں سے اسماعیل کو خبردار کیا تھا۔ اسماعیل نے اپنے بڑے بھائی کو اتنی سی بھی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس کا پیغام تنہائی میں پڑھتا۔ درباری عہدیداروں نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ اسماعیل ہوا میں اڑنے لگا۔

"آپ کے بڑے بھائی نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے کہ آپ نے فوج کی تنخواہیں بڑھا دی ہیں" ——— وزیر نے کہا ——— "سلطانِ عالی مقام! آپ کی اس کرم نوازی سے ساری فوج آپ کی مرید ہو گئی ہے۔ آپ کے اشارے پر فوج کٹ مرے گی۔... اور پیغام میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ سلطنت کے اندر بھی ہمارے دشمن موجود ہیں اور ہندوستان کے بت پرست بھی دشمن ہیں... ظلِ الٰہی! جان بخشی کی التجا کرتا ہوں۔ سلطنت کے اندر ہمارا کوئی دشمن نہیں۔ آپ کے والد جن کے خلاف لڑے تھے، انہیں دشمن بنایا گیا تھا اور اس میں آپ کے بڑے بھائی محمود کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ ہندوستان کے بت پرستوں کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ ہمیں جنگ و جدل سے کیا؟"

وزیر کی تائید میں کئی ایک آوازیں سنائی دیں۔ صرف ایک بوڑھا تھا جو خاموش بیٹھا کبھی اسماعیل کو اور کبھی ان لوگوں کو دیکھتا تھا۔ جب وزیر نے کہا کہ ہمیں جنگ و جدل سے کیا، تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خزانے کا مہتمم اعلیٰ فرخ زاد ابراہیم تھا۔

"جو اپنی عزت، اپنا وقار اور اپنا ایمان بیچ ڈالیں، انہیں جنگ و جدل سے کیا" ——— بوڑھے نے غصے اور جذبات کی شدت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ——— "اسماعیل ابن سبکتگین! تو میرے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا، میرے سامنے پل کر جوان ہوا مگر تو تو بچہ ہے اور ان ایمان فروشوں کے ہاتھوں کھیل رہا ہے۔ یہ تجھے اپنا کٹھ پتلی بنا چکے

ہیں۔ یہ دنیا کے لالچ سے اندھے ہو گئے ہیں، اور تجھے بھی اندھا کر رہے ہیں۔ تو نے اپنے آپ کو اس سلطنت پر ٹھونسا ہے۔ تجھے نہ قوم نے سلطانی دی ہے نہ خدا نے۔ اگر تجھ میں عقل ہے، تو اسے استعمال کر اور گریبان میں منہ ڈال کر سوچ کہ تو اس مسند کے قابل ہے؟... تیرے بھائی نے ٹھیک لکھا ہے کہ تو نے ان لوگوں میں صرف یہ خوبی دیکھی ہے کہ یہ خوشامدی ہیں۔ یہ تجھے تباہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔ یہ اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ انہوں نے خزانہ خالی کر دیا ہے۔ یہ تجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ ہندوستان کے بت پرستوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی سے جنگ و جدل نہ ہو اور ایمان فروش من مانی اور عیش و عشرت کرتے رہیں۔"

"سلطانِ عالی مقام!" ——— وزیر نے کہا ——— "یہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ اسے وظیفہ دے کر گھر بھیج دیں جہاں جاتا ہے ایسی ہی واہی تباہی بکتا رہتا ہے۔"

"لے جاؤ اسے" ——— اسماعیل نے حکم دیا۔

درباری اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ اس کی آواز سنائی دیتی رہی ——— "جہاں بھائی سلطنت کی خاطر ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں وہاں سے رحمت کے فرشتے اٹھ جاتے ہیں...... فتح سچ کی ہوتی ہے۔"

محمود غزنوی نیشاپور میں اپنے پیغام کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ جب قاصد پیغام کا جواب لے کر آیا تو محمود کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ اسماعیل کا جواب مختصر تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے باپ نے سلطنت کا جانشین بنایا ہے، اور وہ کسی کے حق میں دستبردار نہیں ہوگا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اس نے محمود کی یہ گستاخی معاف کر دی ہے۔ آئندہ وہ ایسا پیغام بھیجنے کی جرأت نہ کرے۔

محمود غزنوی نے ماں، اپنے ماموں بوغراز اور اپنے چھوٹے بھائی نصیر الدین یوسف کو بلایا اور یہ صورت حال ان کے سامنے رکھ کر کہا۔ "آپ سب اسماعیل کو جانتے ہیں۔ اس نے میرے پیغام کا جو تحریری جواب بھیجا ہے، یہ اس کے اپنے الفاظ نہیں

اُس میں اتنی عقل نہیں۔ مجھے قاصد نے بتایا ہے کہ بلخ میں درباریوں نے میرے پیغام کا کس طرح مذاق اڑایا ہے، اور اسماعیل اُن کے جال میں آچکا ہے۔ ان لوگوں نے فرخ زاد ابراہیم جیسے بزرگ کو جس کا احترام ہمارے والد بزرگوار بھی کرتے تھے، سچ کی پاداش میں گھسیٹ کر باہر نکال دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطنت غزنی سے دین و ایمان اٹھ گیا ہے۔ میں کسی درباری مشیر سے مشورہ نہیں لیا کرتا۔ میرے مشیر آپ ہیں۔ ہم سب کی رگوں میں ایک ہی خون ہے اور ہم سب کا نظریہ ایک ہے۔ مجھے شک ہونے لگا ہے کہ میرے بھائی اسماعیل کے خون میں ملاوٹ ہے۔"

"وہ میری کوکھ سے پیدا ہوا ہوتا تو ہوس کار بندوں کی بجائے براہ راست خدا سے مشورہ لیتا" ـــــ محمود کی ماں نے کہا ـــــ "وہ ہے تو تیرے ہی باپ کا بیٹا لیکن اس کی ماں نے اس کے دل میں سلطنت کی ہوس ڈال دی ہے ..... اور محمود! میں تجھے مُنہ کی دعائیں اُس روز دوں گی جس روز تو ہندوؤں کے حملوں کا انتقام ہندوستان پر حملہ کر کے لے گا اور جس روز ہندوستان کے بُت ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے۔"

"مگر فوج کا سب بڑا حصہ اسماعیل کے قبضے میں ہے" ـــــ محمود نے کہا ـــــ "اُس نے فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے فوج کو اپنا وفادار بنا لیا ہے۔ اُس کا جواب آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اُس نے صلح اور سمجھوتے کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں، جتنی بھی فوج میرے پاس ہے، اس سے بلخ پر حملہ کر دوں؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ـــ" اس کے ماموں بوعزاز نے کہا ـــ "لیکن خطرہ ہے۔ تمہارے پاس فوج تھوڑی ہے۔ پہلے یہ کیوں نہ دیکھ لیا جائے کہ بلخ اور غزنی کی فوج کس حد تک اسماعیل کی وفادار ہے۔"

"میرے پاس وقت نہیں" ـــــ محمود غزنوی نے کہا ـــــ "ہندوستان سے جو اطلاعیں آرہی ہیں، وہ تشویشناک ہیں۔ وہاں صرف فوج نہیں بلکہ پوری ہندو قوم حملے کی تیاری کر رہی ہے۔ مندروں میں پنڈت بھی غزنی پر حملے کے سوا کوئی بات نہیں کرتے۔ میرے پاس باتوں کے تیر چلانے کا وقت نہیں" ـــــ اُس نے آہ لی اور بولا ـــــ "مجھے اس وقت

ہندوستان میں ہونا چاہیے تھا مگر یہ اسلام کی بدنصیبی ہے کہ ہمارا باپ اپنے ایمان فروش بھائیوں کے خلاف لڑتا رہا اور اپنی سرحد سے نکل نہ سکا، اور مجھے بھی خانہ جنگی میں الجھایا جا رہا ہے۔"

"بیٹا!" ـــــ ماں نے کہا ـــــ "شکست ہوس کار کی ہوگی۔"

"اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ اسماعیل سلطنت کو تباہ کر رہا ہے" ... محمود کے ماموں نے کہا ... "ہمیں سلطنت کو بچانا ہے۔ اس کا طریقہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ فوج کو استعمال کیا جائے۔"

اُس وقت اسماعیل بلخ میں ہی تھا جب اُسے اطلاع ملی کہ نیشاپور سے اپنی فوج محمود کی کمان میں غزنی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ بلخ غزنی کے شمال اور مغرب میں واقع ہے اور نیشاپور کی نسبت غزنی کے قریب ہے۔ اسماعیل کو اس وقت اطلاع ملی جب محمود کی فوج آدھا راستہ طے کر چکی تھی۔ اسماعیل نے اپنے سالاروں، مشیروں اور وزیروں کو بلا کر کہا کہ اس کے بھائی محمود نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ غزنی پر قبضہ کرنے آرہا ہے۔

"اُسے میرے خلاف یہ شکایت ہے کہ میں نے فوج کی تنخواہ بڑھا دی ہے" ـــــ اسماعیل نے سالاروں سے کہا ـــــ "وہ غزنی کی فوج کو غلاموں کی فوج بنانا چاہتا ہے۔ تمام فوج کو بتا دو کہ محمود کی نیت کیا ہے، اور فوج کو تیاری کا حکم دو۔"

اسماعیل کے مشیروں نے اسی مقصد کے لیے اسماعیل کو فوج کی تنخواہیں بڑھانے کا مشورہ دیا تھا کہ فوج دشمن کے خلاف لڑنے کی بجائے سلطان اسماعیل کے مخالفین کو کچلنے کے کام آئے۔ وزیر اور دیگر مفاد پرست امراء اور حاکموں نے فوج کو مزید مراعات دلا کر پروپیگنڈا کرایا کہ محمود فوج کو اپنی کمان میں لے کر ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اس حملے کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کے خزانوں اور زر و جواہرات سے اپنا خزانہ بھر لے۔

اسماعیل کی فوج غزنی سے کچھ دور اُس مقام تک پہنچ گئی جہاں محمود غزنوی

کی فوج نے آخری پڑاؤ کر رکھا تھا۔ اسماعیل نے اس کے قریب اپنی فوج کو خیمہ زن کر دیا۔ محمود کی دشواری یہ تھی کہ اُس کے پاس فوج بہت کم تھی۔ ایک تو یہ کمی اس کی کمزوری تھی، دوسرے اس کی نیت یہ تھی کہ آپس کے خون خرابے سے گریز کیا جائے۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ اسماعیل کے پاس بھیجا کہ لڑائی کی بجائے صلح سمجھوتے کے لیے دونوں کی ملاقات ہونی چاہیے۔ خانہ جنگی سے فائدہ دشمن کو پہنچے گا۔ محمود نے پیغام میں یہ بھی لکھا کہ ہندوستان کی فوج نے ہماری آپس کی لڑائی کے دوران حملہ کر دیا تو وہ سلطنت ہی نہیں رہے گی جس کی خاطر ہم دو بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔

"میں اُسے نہیں ملوں گا" ——— اسماعیل نے محمود کے ایلچی سے کہا ——— "وہ باغی ہے۔ میں اسے گرفتار کر کے ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ میری سلطنت میں کسی کو بغاوت کی جرأت نہیں ہو گی۔"

"انہوں نے نیک نیتی سے ملاقات کا اظہار کیا ہے" ایلچی نے کہا ——— "اور مجھے اختیار دیا ہے کہ میں آپ کو ملاقات کے لیے آمادہ کر دوں۔ میں قاصد نہیں، ایلچی ہوں۔ ہم نے پہلی خانہ جنگی میں کیا حاصل کیا ہے؟ اب دیکھ لیں۔ خانہ جنگی ہماری روایت بن گئی ہے۔ آج ایک باپ کے دو بیٹے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تانے کھڑے ہیں۔"

"میں محمود کی نیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں" ——— اسماعیل نے کہا ——— "وہ صلح اور سمجھوتے کی بات صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اُس کے پاس فوج بہت تھوڑی ہے اور اُسے اپنی شکست اور اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ میں اس کی فوج کو کچل ڈالوں گا اور محمود میرا قیدی ہو گا.... جاؤ اُسے کہہ دو کہ میری اور تمہاری فوجوں کی ملاقات ہو گی۔"

ایلچی جب واپس جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہوا تو اُس نے کہا ———
"ہوس اور غرور نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں سے ہتھیار ڈلوائے ہیں" ——— اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

محمود غزنوی نے اپنے باپ کی طرح دو رکعت نفل پڑھے اور خدا کے حضور

سر رگڑا یا ——— "خدائے بزرگ و برتر! اگر میرا فیصلہ غلط ہے تو مجھے ابھی اس دنیا سے اٹھا لے۔ اگر تیرے حضور نیت پر رکھی جاتی ہے تو میری نیت دیکھ۔ مجھے دنیا کے جاہ و جلال کی خواہش نہیں۔ میرے دل میں سلطانی کی ہوس نہیں۔ میں تیرے نام کو ہندوستان کے بُت خانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہاں اسلام کی شمع جو محمد بن قاسم نے جلائی تھی، وہ بجھ رہی ہے۔ میں اس شمع کو اپنے لہو سے روشن کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بھائی میرے راستے کی چٹانیں بن گئے ہیں۔ مجھے ہمت عطا فرما کہ ان چٹانوں کو روند کر اپنی منزل کی طرف نکل جاؤں۔"

اُس نے سالاروں، کمانداروں اور عہدیداروں کو بلا کر کہا ——— "آج دو بھائی دشمن بن کر ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں۔ ہر ایک سپاہی کے ذہن میں ڈال دو کہ تم اپنے بھائیوں کے خلاف نہیں، قوم کے غداروں کے خلاف لڑنے آئے ہو۔ تمہارے چچا، تایا، ماموں یا اُن کے بیٹے اس فوج میں ہوں گے جس کے خلاف تم لڑو گے۔ انہیں بتاؤ کہ بدر کے میدان میں خون کے رشتے ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے اور یہ لڑائی ہمارے رسولِ مقبول صلعم نے لڑائی تھی۔ آپ حق پر تھے اس لیے تین سو تیرہ نے ایک ہزار کو شکست دی تھی۔ تم بھی حق پر ہو۔ ہمیں وہی مذہب کفرستان تک پھیلانا ہے جس کی خاطر ہمارے رسول صلعم نے خون کے رشتوں کی پہلی جنگ لڑائی تھی۔ ہماری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ سپاہیوں کو یقین دلاؤ کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد محمود غزنوی نے سالاروں وغیرہ کو جنگی ہدایات دیں۔ تعداد کی کمی اُسے بہت پریشان کر رہی تھی۔ اُسے اب دھوکے اور چالوں کی جنگ لڑنی تھی۔ اس نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر اپنے بھائی کی خیمہ گاہ کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کیا۔ اسماعیل کی فوج ایک لشکر تھا، اور اس لشکر کے آگے ہاتھی تھے (مؤرخوں نے ہاتھیوں کی تعداد دو اور تین سو کے درمیان لکھی ہے) ہاتھیوں کی پیشانیوں اور سونڈوں پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ یہ وہ ہاتھی تھے جو راجہ جے پال کے دو

حملوں میں اُس کی فوج سے پھینے گئے تھے۔ سلطان سبکتگین نے ہاتھی غزنی بھیج دیئے تھے۔ یہ جنگی ہاتھی تھے۔

راجہ جے پال جب اسماعیل کی فوج سے کئی گنا زیادہ لشکر لے کر حملہ کرنے آیا تھا تو اُس کے ساتھ سینکڑوں ہاتھی تھے۔ محمود غزنوی نہ اس لشکر سے گھبرایا تھا نہ ہاتھیوں سے۔ اُسے اس احساس نے دلیری دی تھی کہ یہ لشکر اس کے مذہب اور اس کی قوم کے دشمن کا ہے۔ اب اسماعیل کے لشکر کو دیکھ کر اُسے جہاں یہ دکھ ہوا کہ یہ اس کی اپنی فوج ہے جو اس کے خلاف لڑنے آئی ہے، وہاں اُسے یہ خطرہ بھی نظر آیا کہ یہ مسلمان جنگجوؤں کی فوج ہے جو لڑنا اور مرنا جانتی ہے اور جو اُس کی چالوں سے واقف ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ فوج صرف اس لیے اس کے خلاف لڑنے آگئی ہے کہ اس کی تنخواہیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اس سے اُسے یہ اطمینان ہوا کہ یہ فوج قومی جذبے کی بجائے تنخواہ کے زور پر لڑنے آئی ہے، اس لیے اسے شکست دی جاسکے گی، مگر محمود کا یہ مسئلہ جوں کا توں موجود تھا کہ اُس کی فوج کی تعداد کم تھی۔

اُس نے اپنی قلیل فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ زیادہ تعداد کا حصہ اپنی کمان میں محفوظ میں رکھا۔ دو حصوں کو پہلوؤں کو پھیلایا اور چوتھے حصے کو دشمن کے سامنے رکھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اُسے چھاپہ مار جنگ لڑنی پڑے گی کیونکہ جم کر لڑنے کے لیے نفری بہت تھوڑی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ ذرا سی دیر کے تصادم کے بعد اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش کریں اور اسماعیل کی فوج کو پھیل جانے پر مجبور کر دیں۔ اس علاقے میں چٹانیں بھی تھیں۔ محمود نے ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے سالاروں اور کمانداروں کو یہ چال بتائی کہ وہ دشمن کو اس طرح بکھیریں کہ اُس کے جیش اور دستے چٹانوں کے درمیان بھی چلے جائیں اور ان کے درمیان چٹانیں آجائیں۔ اس نے جنگ کو طول دینے کی ہدایت بھی دی۔ شبخون مارنے کے لیے حالات سازگار نہیں تھے کیونکہ دونوں طرف کی فوجیں دراصل ایک ہی فوج تھی۔ شبخون مارنے کی مہارت رکھتی تھیں اور اسے شبخون سے بچاؤ کے طریقے بھی آتے تھے۔ مشعلیں رات کو دونوں طرف کی خیمہ گاہوں کے اندر بھی اور باہر دُور دُور تک بڑی مشعلیں جلا کر جگہ جگہ رکھ دی گئی تھیں۔

اُس کے علاوہ تیر انداز گھوڑ سوار خیمہ گاہوں کے اردگرد گھوم پھر رہے تھے۔

محمود غزنوی خیمے سے نکلنے لگا تو اُس کی ماں آگئی۔ محمود دوڑ کر اس کے قدموں میں گر پڑا اور زار و قطار رویا۔ ماں نے اسے اٹھا کر گلے لگا لیا۔

"میری عظیم ماں!" — محمود نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا — "میرے باپ کی روح مجھ پر لعنت تو نہیں بھیجے گی؟ یہ پہلی لڑائی ہے جو میں اُن کے بغیر لڑ رہا ہوں اور وہ بھی اپنے بھائی کے خلاف۔ مجھے بخش دو ماں! میں اب بھی تلوار نیام میں ڈال لوں گا، میں نہیں لڑنا چاہتا۔ آنے والی نسلیں کہیں گی کہ سبکتگین کے بیٹے سلطانی کے تخت پر لڑ مرے تھے۔"

"اب کچھ بھی نہ سوچو" — اس نے کہا — "خون میلے ہو جائیں تو آنکھوں میں بھی میل آجاتی ہے۔ تمہارے بھائی کے خون میں لالچ اور ہوس کی میل آگئی ہے۔ اب کچھ نہ سوچو۔ ذہن سے وہم اور وسوسے نکال دو۔ اب اس فیصلے پر قائم رہو جو ہم کر چکے ہیں۔ میں ساری رات خدا کے حضور سجدے کرتی رہی ہوں..... جا میرے بیٹے! میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وقائع نگاروں کی تحریروں کے مطابق حملے میں پہل اسماعیل نے کی۔ اُس نے تعداد کی افراط کے بل بوتے پر یلغار کے انداز سے آمنے سامنے کا حملہ کیا۔ محمود غزنوی کی ہدایت کے مطابق تیر اندازوں نے ہاتھیوں پر تیر برسائے اور ان پر برچھیاں بھی پھینکیں۔ دشمن کو ہاتھیوں پر بہت بھروسہ تھا لیکن اُس کے سالاروں کو اندازہ نہیں تھا کہ ہاتھی اپنی دہشت، طاقت اور جسامت کے باوجود کچھ کمزوریاں رکھتے ہیں۔ محمود نے اسی لیے ہاتھیوں کو زخمی کرنے کو کہا۔ ان میں سے جو ہاتھی زخمی ہوئے وہ اپنی فوج کے لیے مصیبت بن گئے۔ اُن کی چنگھاڑ سے گھوڑے بھی بدکنے لگے۔

محمود غزنوی بلندی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سپاہیوں نے بیشتر ہاتھیوں کو بیکار کر دیا تھا مگر یہ کافی نہیں تھا۔ اسماعیل کے حملہ آور دستوں نے ہاتھیوں کے نقصان

کی پرواہ نہ کی۔ ان کی یلغار بڑی تیز تھی۔ محمود کی ہدایت کے مطابق اس کے دستے جم کر لڑنے کی بجائے اِدھر اُدھر ہونے لگے مگر دشمن کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ محمود کی چال کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو پسپا دیکھ رہا تھا۔ ایک فرانسیسی مؤرخ ڈی ہیبلوٹ لکھتا ہے کہ محمود غزنوی کو اپنی شکست یقینی نظر آ رہی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے پسپائی بچا سکتی ہے، یا کوئی معجزہ۔

اسماعیل نے حکم دے دیا کہ محمود کو زندہ پکڑو۔ دونوں طرف تکبیر کے نعرے گرج رہے تھے، اور دونوں طرف ایک ہی جیسے پرچم پھڑپھڑا رہے تھے۔ محمود کے دستوں کے نعرے ڈوبتے جا رہے تھے۔ ان کی یہ چال کہ وہ اِدھر اُدھر ہو کر دشمن کو بکھیر دیں گے ناکام ہو گئی تھی۔ وہ اب جم کر لڑ رہے تھے۔ مؤرخوں کے مطابق یہ معرکہ بہت ہی خونریز تھا۔ دونوں فوجیں قہر اور غضب سے لڑ رہی تھیں مگر محمود غزنوی کے دستوں کا بہت جلدی ختم ہو جانا یقینی تھا۔

اپنے اِن دستوں کو بچانے کے لیے محمود نے دشمن کے دونوں پہلوؤں پر حملے کرا دیئے لیکن اس انداز سے کہ دستے حملہ کر کے دائیں اور بائیں کو نکلنے کی کوشش کریں۔ یہ چال اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اسماعیل کی فوج پہلوؤں کی طرف پھیلنے لگی۔ محمود کے دستوں نے یہی طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ گھوم پھر کر حملہ کرتے اور پہلوؤں کی طرف نکل جاتے۔ محمود نے اپنے اُن دستوں کے لیے جو آمنے سامنے کے تصادم میں اُلجھ گئے تھے، یہ حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کریں۔

اس کوشش میں ان کا نقصان ہُوا لیکن جو عسکری نکل سکے، وہ نکل آئے۔

سورج غروب ہونے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ محمود غزنوی نے پہلے تو سوچا تھا کہ وہ جنگ کو طول دے گا لیکن اس نے دیکھا کہ اسماعیل کی فوج اس کی مرضی کے مطابق بکھر رہی ہے تو اس نے شام سے پہلے پہلے معرکے کا فیصلہ کر دینے کا تہیّہ کر لیا۔ اُسے دشمن فوج کے قلب میں اسماعیل کا پرچم دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے تیر اندازوں کو میدانِ جنگ کے ارد گرد کی چٹانوں پر بھیج دیا اور اپنے محفوظہ کو حملے کی تیاری کا حکم دیا۔ جنگی امور کو سمجھنے والوں کی نظر میں یہ خودکش اقدام تھا۔

محمود غزنوی نے اپنی جان اور فوج کا باقی حصہ داؤ پر لگا دیا۔ یہ تازہ دم محفوظہ تھا۔ محمود نے دشمن کے قلب پر برق رفتار حملے کا حکم دیا اور اس حملے کی قیادت خود کی۔ ان دستوں میں زیادہ تر سوار تھے۔ محمود نے اپنے تیر انداز دستوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ دشمن اگر بکھر کر چٹانوں کے قریب جائے تو وہ تیر برسائیں۔ محمود غزنوی کے اس حملے کی ترتیب تیر جیسی ہی تھی۔ اسماعیل کے قلب کے دستے دن بھر کی لڑائی کے تھکے ہوئے تھے۔ محمود کا محفوظہ تازہ دم تھا۔ محمود کے کہنے پر محفوظہ یہ نعرہ لگاتا جا رہا تھا ـــ "بُت پرستوں کے دوستوں کو کچل دو۔"

کچھ تو محمود کا حملہ تیز اور غیر متوقع تھا۔ اور کچھ اس نعرے کا اثر تھا کہ اسماعیل کی صفوں میں بددلی پیدا ہونے لگی۔ محمود کے کمانداروں نے ایک اور نعرہ لگانا شروع کر دیا ـــ "اللہ کے سپاہی تنخواہ کے لیے نہیں لڑا کرتے۔"

اسماعیل کے سالاروں نے قلب کو بچانے کے لیے پہلوؤں سے کمک لینے کی کوشش کی تاکہ محمود کے محفوظہ کو گھیرے میں لیا جا سکے مگر محمود کے پہلوؤں والے دستوں نے "ضرب لگاؤ اور بھاگو" کے انداز کے چھاپہ مار حملوں سے دشمن کے پہلوؤں کو ایسا اُلجھایا کہ وہاں سے کمک نہ جا سکی۔ محمود غزنوی کا قہر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ متعدد مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ جب دشمن پر سامنے سے حملہ کیا کرتا تھا تو اس میں اتنا قہر ہوتا تھا جو دشمن پر دہشت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اسماعیل کے قلب پر حملے میں محمود کا قہر اُس کے اپنے قابو میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

معرکہ یہ بھی شدید اور خونریز تھا۔ محمود کی نظر اسماعیل کے جھنڈے پر تھی۔ یہ جھنڈا غائب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسماعیل زخمی ہو گیا یا مارا گیا ہے۔ جھنڈا فوجوں کے جذبے کو قائم رکھا کرتا تھا۔ جھنڈا غائب ہو گیا تو اسماعیل کی فوج کے پاؤں اُکھڑنے لگے۔ محمود کے کہنے پر اس کے سپاہی اعلان کرنے لگے ـــ "بت پرستوں کے بھائیو! تمہارا پرچم گر پڑا ہے۔"

ابھی سورج غروب نہیں ہُوا تھا کہ معرکے کا پانسہ پلٹ گیا۔ اسماعیل کی فوج کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ دستوں کو جس طرح تقسیم کیا گیا تھا، وہ ترتیب گڈمڈ ہو گئی۔

ان میں سے سپاہی اور کمانڈر چٹانوں کے درمیان پناہ ڈھونڈنے لگے۔ چٹانوں کے اوپر محمود غزنوی نے اپنے تیر انداز پھیلا رکھے تھے۔ ان کے تیروں نے دشمن کے لئے کوئی پناہ نہ چھوڑی سب سے پہلے قلب کے ایک سالار نے ہتھیار ڈالے۔ محمود غزنوی نے کتنی ایک گھوڑ سواروں کو حکم دیا کہ وہ تمام میدانِ جنگ میں گھوم جائیں اور اعلان کریں کہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے کہ اسماعیل کے کسی بھی فوجی کو ہلاک نہ کیا جائے۔ جو کوئی ہتھیار ڈالنے سے انکار کرے اُسے زندہ پکڑا جائے۔ اگر وہ مزاحمت کرے تو اُسے زخمی کر کے پکڑا جائے۔ اس اعلان سے اسماعیل کے سپاہیوں کے حوصلے بالکل ہی ٹوٹ گئے۔

قلب کے جس سالار نے سب سے پہلے ہتھیار ڈالے تھے، اُس سے محمود غزنوی نے اسماعیل کے متعلق پوچھا۔

"وہ مرا بھی نہیں زخمی بھی نہیں ہوا" ــــ سالار نے جواب دیا ــــ "وہ حملے کی شدت سے ایسا گھبرایا کہ کوئی حکم یا اطلاع دیئے بغیر بھاگ گیا" ــــ اُس نے وہ سمت بتائی جس طرف وہ گیا تھا۔

محمود غزنوی نے ایک جیش تیار کر کے حکم دیا کہ اسماعیل کو تلاش کریں اور اُس کے ہاتھ باندھ کر اخلاقی مجرموں کی طرح پیش کریں۔

سورج غروب ہونے تک خانہ جنگی کا یہ انتہائی خونریز معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ اسماعیل کے عسکری ٹولیوں میں بیٹھ گئے تھے۔ محمود کے سپاہی ان پر پہرہ دے رہے تھے۔ بڑی ہی بھیانک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ بعض چیخ رہے تھے۔ زخمی ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ زخمی گھوڑوں کی آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی معرکے کے بعد کی آوازیں اور زیادہ بلند اور ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھیں۔ محمود غزنوی پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ دونوں طرفوں کے زخمیوں کو اٹھا کر ان کی مرہم پٹی کی جائے۔

زخمی اٹھائے جا رہے تھے سینکڑوں مشعلوں کے شعلے گھوم پھر رہے تھے اور

محمود غزنوی گھوڑے سے اُتر کر لاشوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ اُسے ایک نسوانی پکار سنائی دی ــــ "محمود محمود" ــــ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ وہ اس آواز کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ اُس کی ماں کی آواز تھی۔ مشعلوں کے گھومتے پھرتے شعلوں میں اُسے اپنی ماں لاشوں سے پھلانگتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ محمود نے اُس کے قریب جا کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ماں نے اُسے اُٹھا کر اس کا سر اور منہ چوما۔ دونوں پر اتنی رقت طاری تھی کہ وہ بول نہ سکے۔

محمود نے ماں کو رخصت کر دیا۔ محمود کا وہاں کوئی کام نہیں تھا لیکن وہ میدانِ جنگ سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس پر جذبات کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ کسی لاش کے پاس رک جاتا۔ کوئی مشعل بردار قریب سے گزرتا تو محمود اُسے روک لیتا۔ مشعل کی روشنی میں لاش کے چہرے کو غور سے دیکھتا اور آگے چل پڑتا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنی ماں کی طرح کی ایک اور نسوانی آواز سنائی دی ــــ "محمود" وہ رک گیا۔ دو مشعل برداروں کے درمیان ایک خاتون شاہی لباس میں ملبوس آہستہ آہستہ اُس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ شاہی خاندان کی عورت تھی۔ وہ اُس کے باپ کی بیوی تھی مگر اُسے دیکھ کر محمود غزنوی کا خون کھول اٹھا کیونکہ وہ اسماعیل کی ماں تھی۔ محمود اُس کی طرف بڑھنے کی بجائے رک گیا۔ اسماعیل کی ماں اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"یہ دیکھنے آئی ہو کہ تمہارے بیٹے نے غزنی کی فوج کے کتنے ہزار آدمیوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل کرایا ہے؟" ــــ محمود نے پوچھا ــــ "کیا یہ سننے آئی ہو کہ آپس میں لڑ کر مرنے والے سپاہیوں کے کراہنے کی آوازیں کیسی لگتی ہیں؟"

"میں کچھ بھی دیکھنے نہیں آئی" ــــ اسماعیل کی ماں نے روتے ہوئے کہا ــــ "میں کچھ سننے نہیں آئی۔ میں اپنے بیٹے کی جاں بخشی کی التجا لے کر آئی ہوں۔"

"کہاں ہے تمہارا بیٹا؟" ــــ محمود نے کہا ــــ "میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔"

"وہ اپنے خیمے میں ہے" ــــ ماں نے جواب دیا ــــ "بھاگ نکلنے کے رستے بند

ہو چکے ہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ سب اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔"

"کیا وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں جنہیں خوشامد کی بدولت تمہارے بیٹے نے کماندار سے سالار بنایا تھا؟" ـــــ محمود نے پوچھا ـــــ "وہ فقیر بھی اُسے تنہا چھوڑ گئے ہیں جنہیں تمہارے بیٹے نے امیر اور وزیر بنایا تھا؟ ... ظلِ الٰہی اور سلطان عالی مقام کہلانا آسان ہے لیکن ظلِ الٰہی اور سلطان عالی مقام بن کر دکھانا بڑا ہی مشکل ہے۔"

"محمود!" ـــــ اسماعیل کی ماں نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "تمہیں حق پہنچتا ہے کہ جو اُلٹی سیدھی زبان پر آئے کہہ دو۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔"

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا اپنے اسماعیل کو اتنے انسانوں کا خون بخش دیتیں؟" ـــــ محمود نے کہا ـــــ "اپنے پاؤں دیکھو اور اپنے آپ سے پوچھو کہ جن کے خون سے تمہارے پاؤں لتھڑ گئے ہیں اور جن کے خون کے چھینٹے تمہارے ٹخنوں کے اوپر تک جا پڑے ہیں، وہ کون تھے؟ تم ایک سلطان کی بیوہ ہو۔ سلطان کی بیوی ہو یا بیوہ، قوم کا ہر فرد اور سپاہی اُس کا اپنا بچہ ہوتا ہے۔ کیا یہ تمہارے بیٹے نہیں تھے جن کے خون سے تم پھسلتی اور جن کی لاشوں سے ٹھوکریں کھاتی تم مجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہو؟ قوم اور فوج کے خون کے ساتھ کھیلنے والے حکمران اسی انجام کو پہنچتے ہیں جس تک تمہارا بیٹا پہنچ چکا ہے۔ کل کا سلطان آج کا صفِ اوّل کا مجرم ہے۔"

"محمود! میں تمہاری ماں تو نہیں، تمہارے مرحوم باپ کی بیوہ ہوں۔" ـــــ اسماعیل کی ماں نے کہا۔ "اپنے باپ کی روح کی خاطر مجھے میرا بچہ دے دو۔ میں اس سلطنت سے نکل جاؤں گی۔ تمہارے باپ کو میرے ساتھ اتنی ہی محبت تھی جتنی تمہاری ماں سے تھی۔"

"اور تم نے اس محبت سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ اپنے خاوند کو اُس کے نزع کے عالم میں دھوکہ دیا اور اپنے اُس بیٹے کو سلطنت کا بادشاہ بنوا لیا جس نے سلطنت کو ڈبونے کا اہتمام کر دیا۔ تم اُس قوم کی ماں ہو جس کی مائیں میری ماں کی طرح اپنے بیٹوں کو جوان کر کے محاذ کو رخصت کیا کرتی تھیں۔ تم نے اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھا

کر اُس کے سر پہ تاج رکھا۔ تم نے اُسے مجرم بنایا۔"

محمود غزنوی نے اپنے پاس کھڑے دو عہدیداروں سے کہا۔ "اس خاتون کے ساتھ جاؤ اور اس کے بیٹے کو میرے سامنے لے آؤ۔"

اُس وقت اسماعیل اپنے خیمے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے جب خیمے میں دو عہدیداروں کو داخل ہوتے دیکھا تو وہ اٹھا اور سرتاپا کانپنے لگا۔ اُس نے ان عہدیداروں سے کہا کہ وہ اُسے فرار کرا دیں تو وہ انہیں منہ مانگا انعام دے گا۔ عہدیداروں نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ کر سلطان کے پاس لے چلو۔ وہ خود ہی ان کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کی ماں اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

اُسے جب محمود غزنوی کے سامنے کھڑا کیا گیا تو محمود نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔ "تمہاری ماں نے مجھ سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگی ہے۔ میں ایک ماں کی استدعا قبول کرتا ہوں۔ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔"

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے ـــــ "محمود غزنوی نے اسماعیل سے پوچھا ـــــ اگر فتح تمہاری ہوتی اور میں تمہارا قیدی ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ ـــــ اسماعیل نے جواب دیا ـــــ میں تمہیں عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیتا اور آزادی کے سوا تمہیں زندگی کی ہر آسائش دیتا ـــــ محمود غزنوی نے کہا ـــــ اور میں تمہارے ساتھ اس سے بُرا سلوک نہیں کروں گا۔ تم ساری عمر کے لیے جُرجان کے قلعے میں قید رہو گے جہاں آزادی کے سوا تمہیں زندگی کی ہر آسائش اور سہولت مہیا کی جائے گی۔ اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو ـــــ اسماعیل نے باقی عمر اپنی ماں کے ساتھ اس قلعے میں گزاری۔"

ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔

اُس وقت جب سلطنت غزنی میں ایک اور خانہ جنگی لڑی جا چکی تھی، اور غزنی کی بہترین فوج کی خاصی نفری تباہ و برباد ہو گئی تھی، لاہور میں راجہ جے پال تک یہ اطلاع پہنچ کر سلطان سبکتگین مر گیا ہے۔ اُس نے اپنے جرنیلوں کو بُلایا اور انہیں خوشی سے

یہ خبر سنائی کہ اب وہ غزنی کو آسانی سے فتح کر لیں گے کیونکہ سبکتگین مر گیا ہے۔

"کیا ہماری فوج حملے کے لیے تیار ہے؟" — راجہ جے پال نے پوچھا۔

"پہلے دو تجربوں کو سامنے رکھ کر ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے" — ایک جرنیل نے جواب دیا — "ایک آدمی کے مر جانے سے پوری قوم نہیں مر جایا کرتی۔۔۔۔ غزنی کی فوج میں جو جذبہ ہے، وہ اُن کے ایک سلطان کے مر جانے سے نہیں مرے گا۔ ہماری فوج پیش قدمی کے لیے تو تیار ہے لیکن اس میں ابھی لڑنے کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا جو مسلمانوں میں ہے۔ ہم وہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مندروں میں پنڈت بھی لوگوں کو یہی بتاتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ مذہبی جنگ ہے۔"

"سبکتگین کا بیٹا محمود جوان ہو گیا ہے" — دوسرے جرنیل نے کہا — "میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ پوری فوج کی کمان کے قابل ہے یا نہیں۔ میں نے اس کے دو حملے دیکھے ہیں۔ مجھے اس میں قابلیت اور جرأت نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کس حد تک قابل ہے۔"

"یہ میں ہمیں معلوم کروا دوں گا" — راجہ جے پال نے کہا — "تمہیں معلوم ہے کہ میرے پاس غزنی کی فوج کے اونچے درجے کے دو قیدی ہیں۔ میں ان سے معلوم کر لوں گا۔ آپ لوگ فوج کی تربیت اور تیاری تیز کر دیں۔ میں اب بہت جلدی غزنی کی طرف کوچ کروں گا۔ سبکتگین کا کوئی بھی بیٹا اُس جتنا قابل جرنیل نہیں ہو سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم دو شکستوں کا انتقام لے کر سبکتگین کی سلطنت پر قبضہ کر لیں گے۔ میں ایک لڑکی کی جان کی قربانی بھی دے رہا ہوں۔ پنڈتوں نے لڑکی حاصل کر لی ہے۔ اسے خاص عمل کے بعد قربان کیا جائے گا۔"

راجہ جے پال نے غزنی کے جن دو قیدیوں کا ذکر کیا تھا وہ نظام ادریسی اور قاسم بلخی تھے۔ آپ نے اس داستان کی پچھلی قسط میں پڑھا ہے کہ راجہ جے پال ان سے پوچھ رہا تھا کہ غزنی کی فوج کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ان دونوں نے اسے تاثر دے رکھا تھا کہ یہ ایک گہرا راز ہے جو وہ نہیں بتائیں گے۔ راجہ جے پال نے انہیں راج محل

کے ساتھ ایک کمرہ دے رکھا تھا جہاں ایک مسلمان ملازم انہیں کھانا کھلاتا تھا۔ یہ مسلمان غزنی کا جاسوس تھا۔ وہ خوبرو اور ذہنی اور جسمانی لحاظ سے طرار تھا۔ اس کمرے کے اردگرد پہرہ تھا۔ راجہ جے پال کو دوسری شکست نے دیوانہ کر رکھا تھا۔ وہ غزنی پر ایک اور حملے کے لیے فوج کی نئی بھرتی اور تیاری میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ غزنی کے ان دو قیدیوں کی طرف توجہ نہ دے سکا۔

یہ مسلمان ملازم جس کا نام بلاذری تھا انہیں کہہ رہا تھا کہ وہ راجہ کو کوئی جھوٹ موٹ کا راز بتا دیں ورنہ وہ انہیں قید خانے میں ڈال کر اذیتیں دے گا۔ بلاذری کا مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں راجہ پر اپنا اعتماد پیدا کر لیں تو ان کے فرار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ راجہ کو اعتماد میں لینے سے یہ فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا کہ اس سے یہ معلوم کر لیا جاتا کہ وہ کب تک غزنی پر حملہ کر رہا ہے اور اب کس طرف سے حملہ کرے گا۔ پشاور کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا تھا۔

"اب راجہ تمہیں بلائے تو اسے دھوکہ دو" — عمران بلاذری نے ایک روز انہیں کہا — "میں نے تمہیں چھپانے کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہیں یہاں سے جلدی نکالنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے میں یہاں سے غائب ہو جاؤں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"ایک فرض تو سلطنت کی طرف سے مجھ پر عائد ہے جو مجھے پورا کرنا ہے، اور کرتا رہتا ہوں" — بلاذری نے کہا — "مگر میں انسان بھی ہوں۔ میرے جذبات بھی ہیں۔ مجھ پر ایک اور فرض آپڑا ہے۔ میں تم دونوں سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ ہمیں ایک لڑکی کی مدد کرنی ہے۔ پنڈتوں نے راجہ جے پال کو بتایا تھا کہ وہ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے تو اسے فتح ہو گی۔ یہ قوم وحشی ہے اور بربریت پسند۔ کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اس کی بیوہ کو اس کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہیں۔ یہ لوگ انسانی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پنڈتوں کو کسی خاص شکل، رنگ اور عمر کی بڑی خوبصورت کنواری لڑکی مل گئی ہے۔ اسے وہ کسی مندر میں لے گئے ہیں۔ اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔ مجھے اس لڑکی کو بچانا ہے۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟" ــــ نظام ادریزی نے پوچھا ــــ "یہ کافر اپنی تمام لڑکیوں کو اپنے بتوں کے آگے قربان کر دیں ہمیں اس سے کیا؟"

"یہ لڑکی مجھے اس قدر چاہتی ہے کہ میرے ساتھ چلنے کو تیار تھی" ــــ عمران بلاذری نے کہا ــــ "وہ اسلام قبول کرنے کا بھی فیصلہ کر چکی تھی۔ میں اسے کبھی کا لے جاتا لیکن جاسوس کی حیثیت سے میرا فرض مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دے رہا تھا۔ میں یہاں سے کوئی کام کی اطلاع یا راجہ جے پال کے آئندہ عزائم کی صحیح خبر لے کر غزنی کو روانہ ہونا چاہتا تھا۔ لڑکی جب مجھے ملتی یہی کہتی کہ میں اسے غزنی لے چلوں۔ اتنے میں تم دونوں آگئے۔ یہ بھی میرے فرائض میں شامل ہے کہ تمہیں یہاں سے فرار کراؤں۔ میں لڑکی کو ساتھ لے کر تمہارے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ ایک روز لڑکی مندر میں گئی اور واپس نہ آئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ پنڈتوں نے اسے قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ قربانی دینے میں ابھی بہت دن ہیں۔ مجھے کہو کہ جو جی میں آئے کر لو لیکن میں ڈرتا ہوں کہ محبت فرض پر غالب آجائے گی۔ تم راجہ کو اعتماد میں لو اور یہاں سے نکلو۔ میں تمہیں کچھ دن چھپائے رکھوں گا پھر لاہور سے نکال بھی دوں گا۔"

"تم ہم سے جلدی فارغ ہونا چاہتے ہو" ــــ قاسم بلخی نے کہا۔

"ہاں" ــــ بلاذری نے جواب دیا ــــ "بہت جلدی۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

اس سے ایک دو روز بعد انہیں راجہ جے پال نے بلا لیا۔

"کیا تم میرے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو؟" ــــ راجہ نے کہا ــــ "مجھے امید ہے کہ تم اپنے آپ پر رحم کرو گے۔"

"ہاں مہاراج!" ــــ نظام ادریزی نے کہا ــــ "آپ نے ہمارے ساتھ جو اچھا سلوک کیا ہے اس کے عوض ہم آپ کو ہر سوال کا جواب دیں گے۔"

"تمہارا سلطان سبکتگین مر گیا ہے" ــــ راجہ جے پال نے انہیں خبر سنائی۔

دونوں یہ چونک اٹھے لیکن سنبھل گئے۔

"اب غزنی کی سلطنت کو بچانے والا کوئی نہیں رہا" ــــ راجہ نے کہا ــــ "تم اب میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں اپنی فوج میں عہدہ بھی دے سکتا ہوں.... مجھے یہ بتاؤ کہ اس کا بیٹا محمود اپنے باپ کی جگہ فوج کی کمان کر سکتا ہے؟ اس میں جنگی قابلیت کتنی کچھ ہے؟"

"اتنی نہیں جتنی سلطان سبکتگین میں تھی" ــــ ادریزی نے جواب دیا ــــ "میدان جنگ میں وہ اپنی مخصوص چالیں چلتا ہے۔ اگر آپ کو یہ چالیں بتا دی جائیں تو آپ اسے آسانی سے شکست دے سکتے ہیں۔ آپ کو دوسری شکست محمود کی چالوں نے ہی دی ہے۔"

ان دونوں نے راجہ جے پال کو محمود کی چالیں بتانی شروع کر دیں۔ ان کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ راجہ نے اپنے جرنیلوں کو بلا لیا۔ ادریزی اور بلخی انہیں چالیں سمجھانے لگے۔

"ہم آپ کو عملی طور پر بھی یہ چالیں سمجھائیں گے" ــــ قاسم بلخی نے کہا ــــ "لیکن ہم قیدی بن کر آپ کو ان چالوں کی عملی شکل نہیں بتائیں گے۔"

راجہ جے پال نے اسی وقت حکم دے دیا کہ ان کے کمرے سے پہرہ ہٹا دیا جائے۔ پہرہ ہٹا دیا گیا۔ رات آئی اور گزر گئی۔ اگلے روز عمران بلاذری ان کے لیے کھانا لے کر کمرے میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر گزر گئی۔ راج محل سے ادریزی اور بلخی کا بلاوا آیا۔ بلاذری نے قاصد کو بتایا کہ وہ صبح سے کھانا لیے بیٹھا ہے، وہ دونوں کمرے میں نہیں تھے۔ وہ رات کو ہی نکل گئے تھے، اور بلاذری انہیں ایک گھر میں چھپا آیا تھا۔

مذہب، مجرم اور مجاہد

عمران بلاذری پر کسی نے شک نہ کیا کہ غزنی کے دونوں قیدیوں ۔۔۔
نظام ادریزی اور قاسم ملجی ۔۔۔ کو اُس نے راج محل سے فرار کرایا ہے۔ اُس نے یہ فرض تو ادا کر دیا تھا مگر اُسے ابھی ایک اور فرار کرانا تھا۔ یہ وہ ہندو لڑکی تھی جو اُس کی محبت کی خاطر اپنا مذہب، اپنا گھر اور اپنا ملک چھوڑنے کو تیار تھی مگر اسے پنڈت انسانی قربانی کے لیے لے گئے تھے۔

بلاذری خوش وضع، خوش لباس اور خوش گفتار جوان تھا۔ ہر ڈھنگ کھیلنا اور ہر بھیس بدلنا جانتا تھا۔ اُس کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ وہ اُن مردوں میں سے تھا جن کے خدوخال میں، انگ انگ میں، ڈیل ڈول اور سراپا میں ایسی کشش ہوتی ہے جو جنس مخالف کو کچھ دیر رک کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمران بلاذری شہزادہ نہیں تھا۔ راج محل کا ملازم تھا۔ ملازموں جیسے کپڑے پہنتا تھا۔ ملازموں کی طرح بولتا تھا، مگر غزنی کا جاسوس تھا۔ پنجاب کی اُس وقت کی زبان روانی سے بولتا تھا اور کسی کو کبھی شک نہیں ہوا تھا کہ یہ خوش طبع آدمی راجہ جے پال کی ریاست کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔

وہ کچھ عرصے سے لاہور میں تھا۔ شہر میں ایک مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے اڑوس پڑوس میں رہنے والے اس کے متعلق اتنا ہی جانتے تھے کہ راج محل کا ملازم ہے، ملتان کا رہنے والا ہے۔ اچھا آدمی ہے اور راتوں دیر سے گھر آتا ہے۔ اس کی دوستی ایک ہندو جگ موہن کے ساتھ تھی جو اُس کا ہم عمر تھا۔ اُس کا باپ تاجر

تھا۔ جگ موہن اکثر رات کو عمران بلاذری کے گھر آیا کرتا تھا۔ اُن دنوں ہندو اور مسلمان کی دوستی کم ہی دیکھنے میں آیا کرتی تھی۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو ان سے نفرت کرتے تھے۔ راجوں مہاراجوں اور پنڈتوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی، مگر جگ موہن جو ذات کا برہمن تھا عمران بلاذری سے پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر ہوا تھا کہ اسے [illegible] اور ان کی دوستی ہو گئی۔

دوستی کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک رات جگموہن بلاذری سے ملنے اُس کے گھر آیا تو جگ موہن رو رہا تھا۔

" آج میری بہن زندہ جلادی گئی ہے" ۔۔۔ جگ موہن نے بلاذری کو بتایا۔

" کس نے جلائی ہے؟" ۔۔۔ عمران بلاذری نے پوچھا۔

" میرے مذہب نے" ۔۔۔ جگ موہن نے بتایا ۔۔۔ " اُس کی شادی ہوئے ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اُس کا خاوند گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا۔ آج صبح وہ مر گیا ہے۔ اُس کی بیوی کو بھی اُس کے ساتھ ہی مرنا تھا۔ آج میرے بہنوئی کی لاش چتا پر رکھی گئی تو اُس کے بھائیوں نے میری بہن کو بھی چتا پر کھڑا کر دیا اور چتا کو آگ لگا دی۔ تم نے چتا نہیں دیکھی ہو گی۔ لکڑیوں کا بہت بڑا ڈھیر لگایا جاتا ہے جو چوکور اور اوپر سے ہموار ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی انسان کے قد سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور اونچائی کم و بیش ایک گز۔ اس پر لاش رکھ دیتے ہیں۔ لکڑیوں پر تیل یا گھی ڈالتے اور آگ لگا دیتے ہیں۔ میں تو لاش کو بھی جلتے نہیں دیکھ سکتا مگر میں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلتے دیکھا ہے....

کہتے ہیں کہ ہندو عورت اتنی غیرت والی ہوتی ہے کہ اُس کا خاوند مر جائے تو اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے۔ اسے ستی ہونا کہتے ہیں۔ جو عورت ستی نہیں ہوتی وہ ساری عمر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ خطرہ محسوس کرتی ہے کہ انسانی کمزوری اسے گناہگار بنا دے گی۔ اس لیے خاوند کے ساتھ ہی مر جانا بہتر ہے۔... میں ستی کو اچھا سمجھتا تھا مگر جب اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا مذہب کس قدر بے رحم

ہے۔ کوئی عورت زندہ نہیں جلنا چاہتی۔ میری بہن کو گھسیٹ کر چتا تک لے گئے اور
اُسے اٹھا کر چتا پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔
وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ میں اسے بچا نہ سکا۔ وہاں کم و بیش ڈیڑھ سو
آدمی تھے۔ کوئی بھی اسے بچانے کے لیے آگے نہ بڑھا۔ سب مذہب کی زنجیروں
میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے لکڑیوں کے جلنے کی آواز
آئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی بہن کی چیخیں سنائی دیں......

"میں نے گھوم کر دیکھا۔ شعلے بہت اُٹھ چکے تھے۔ ان میں مجھے اپنی بہن نظر آئی۔
وہ چیخ رہی تھی۔ پھر جلتی لکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ نے اس کی چیخیں ختم کر ڈالیں۔ مجھے غشی آنے
لگی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ میں ابھی تک بہن کی چیخیں سن رہا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب
سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"وہ مذہب ہی کیا جس سے انسانوں کو نفرت ہو جائے" ــــ عمران بلاذری نے
کہا۔ "وہ مذہب ہی کیا جو انسان کو جینے کے حق سے محروم کر دے۔ کوئی مذہب بربریت
کی اجازت نہیں دیتا۔ میں تمہیں اپنے مذہب میں لانے کی کوشش نہیں کر رہا، صرف
بتا رہا ہوں کہ میرا مذہب عورت کے لیے بہت نرم ہے۔ اگر کسی عورت کا خاوند مر
جائے تو اُسے اجازت ہوتی ہے کہ تین ماہ بعد شادی کر لے۔ اگر وہ جوان ہو تو کوشش
کی جاتی ہے کہ اُس کی دوسری شادی ہو جائے۔ اسلام عورت کو ذرا سی بھی جسمانی ایذا
دینے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"ہمارے پنڈت دودھ پیتے بچوں کی قربانی بھی دیا کرتے ہیں" ــــ جگ موہن
نے کہا ــــ "ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خشک سالی ہو، قحط کا خطرہ ہو، سیلاب کا ڈر ہو تو کسی
کا معصوم بچہ پکڑ کر اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش جلا دی جاتی ہے۔ اب
ہمارا راجہ غزنی سے شکست کھا کر آیا ہے تو پنڈتوں نے اسے کہا ہے کہ وہ ایک
کنواری لڑکی کی قربانی دے تو اس کی شکست فتح میں بدل جائے گی۔"

"یہ قربانی کب دی جا رہی ہے؟"

"پنڈت خاص قسم کی لڑکی کی تلاش میں ہیں" ــــ جگ موہن نے جواب دیا ــــ

"انہوں نے اعلان کر رکھا ہے کہ لوگ مندروں میں اپنی کنواری بیٹیوں کو بھیجا کریں۔
لڑکیاں مندروں میں جاتی ہیں۔ ابھی پنڈتوں کو خاص قسم کی لڑکی نظر نہیں آئی۔"

"تمہاری کوئی بہن کنواری تو نہیں؟"

"میری چھوٹی بہن کنواری ہے" ــــ جگ موہن نے کہا ــــ "لیکن میں اسے مندر
میں نہیں جانے دیتا۔ میرے باپ نے بھی اسے کہا ہے کہ وہ مندر میں نہ جایا کرے۔
میری بہن بہت خوبصورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پنڈتوں کے سامنے
گئی تو وہ اسے قربانی کے لیے منتخب کر لیں گے۔"

عمران بلاذری کو موقع مل گیا۔ اس نے جگ موہن کو اسلام کے بنیادی اصول
بتائے اور کہا ــــ "ہمارا مذہب بنی نوع انسان کی بہبود اور حقوق دینے کے لیے آیا
تھا۔"

جگ موہن کا دل زخمی تھا۔ عمران بلاذری کی باتوں سے اُسے تسکین ہونے لگی۔

"تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کو پنڈتوں سے چھپا رکھا ہے" ــــ
بلاذری نے کہا ــــ "راجہ جے پال نے شکست کھائی ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔
وہ اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے اور اپنی قوم کو بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ
اسے تمہارے پنڈت فریب دے رہے ہیں۔ ہر کوئی بادشاہ یا مہاراجہ کی خوشنودی
چاہتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے، عیسائیوں
میں بھی۔ پنڈت ہو یا مولوی، اس کے پاس مذہب کی پیشوائی ہوتی ہے، اس لیے
وہ مذہب کو موڑ توڑ کر اپنے بادشاہ کو خوش کر لیتا ہے۔ تمہارے پنڈتوں نے
بھی یہی کیا ہے۔ راجہ جے پال کو یہ کہنے کی بجائے کہ اپنی غلطیاں اور سلطان سبکتگین
کی کامیابیوں کو پرکھے اور اپنی فوج میں ردو بدل کرے، پنڈتوں نے اسے
یہ کہہ کر اس کا دل پرچا دیا کہ دیوتا ناراض ہیں اور وہ ایک کنواری کی قربانی مانگتے
ہیں....

"تم جسے اپنے مذہب کی خرابی کہتے ہو، یہ دراصل تمہارے مذہبی پیشواؤں

کی خرابی ہے۔ انسانوں کی پیدا کردہ خرابیاں ہمارے مذہب میں بھی ہیں ہمارے مولوی اور امام بھی بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی ایسی توجیہیں پیدا کر لیتے ہیں جنہیں انسانی ذہن قبول نہیں کرتا لیکن اس پر وہ مذہب کی چھاپ لگا کر لوگوں کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنے تخت و تاج کی مضبوطی کے لیے مذہب کو استعمال کرے اور مذہب کی آڑ میں بیٹھ جائے تو مذہبی پیشوا اسے مذہب کے ہی اصولوں اور فلسفوں کو توڑ موڑ کر اسے آڑ مہیا کر دیتے ہیں۔ اگر یہی بادشاہ مذہب سے نگاہیں پھیر کر رعایا پر ظلم و تشدد شروع کر دے تو یہی مذہبی پیشوا اس کی دھاندلیوں اور جھوٹ کو مذہبی جواز مہیا کر دیں گے۔ مذہب ہر کسی کے لیے قابل قبول ہوتا ہے، مذہب کو اس کے پیشوا قابل نفرت بنایا کرتے ہیں۔"

"کیا تمہارے مذہب میں انسانوں کی قربانی دی جاتی ہے؟" — جگ موہن نے پوچھا۔

"نہیں" — عمران بلاذری نے جواب دیا — "ہمارا مذہب اسے قتل کہتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی مذہبی پیشوا کسی کو انسانی قربانی کے لیے تیار کرے گا تو وہ قاتل کہلائے گا اور سزائے موت پائے گا۔ مسلمان میدانِ جنگ میں اپنی جانیں دیا کرتے ہیں، اور یہی سلطان سبکتگین کی کامیابی کا راز ہے ...... میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا، حقیقت بیان کرتا ہوں۔ ہم صرف ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ ہمارے کئی ایک خدا نہیں، اور ہمارے خدا پتھر اور مٹی کے بھی نہیں۔ اپنی عقل استعمال کرو۔ یہ بت ایک جگہ دھرے رہتے ہیں۔ تم انہیں صرف مندروں میں دیکھ سکتے ہو۔ یہ اپنے اوپر بیٹھی مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتے۔ ان میں جان نہیں، روح نہیں۔ ہمت کرو اور ایک بت کو توڑ دو، پھر دیکھنا کہ یہ خدا اپنے ٹکڑے جوڑ سکتا ہے یا نہیں اور یہ تمہارا کیا بگاڑے گا۔ ہمارا خدا صرف مسجد میں نہیں رہتا، ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی رہتا ہے۔ وہ کسی انسان کا خون نہیں مانگتا، نہ کسی کنواری کو اپنے سامنے ذبح کرا کر خوش ہوتا ہے۔"

عمران بلاذری کی زبان کا جادو اس جوان سال ہندو کو مسحور کر رہا تھا۔ اس تاثر کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بلاذری کی زبان میں سحر تھا اور دوسری وجہ یہ کہ جگ موہن نے اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا تھا۔ یہ انسانی جذبات تھے جو پنڈتوں اور پتھر کے خداؤں پر غالب آ گئے تھے۔ عمران بلاذری نے اسے اُس کے مذہب سے منحرف کر دیا تھا، یا انحراف اور نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ جگ موہن کے آنسو بہے جا رہے تھے، اور اس کے چہرے پر دہشت کا تاثر بھی تھا۔ اسے جیسے ابھی تک اپنی بہن جلتی نظر آ رہی تھی۔

"تمہارا غم ایسا ہے جو بانٹا نہیں جا سکتا" — عمران بلاذری نے کہا — "میں ہمدردی کے دو چار الفاظ کہہ سکتا ہوں۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے بتانا۔"

غمزدہ حالت میں ہمدردی کے دو چار الفاظ بھی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ جگ موہن عمران بلاذری کا مرید ہو گیا۔ اور اس کی باتوں کو دل میں بٹھانے لگا۔ ایک دن بلاذری کو کام سے چھٹی تھی۔ وہ جگ موہن کو شکار پر لے گیا۔ برہمن [illegible] تھی۔ یہ بھی جگ موہن کے دل بہلاوے کا اہتمام تھا۔ وہ شہر سے دور جنگل میں نکل گئے۔ دونوں نے بہت سے پرندے شکار کیے۔

"عمران!" — جگ موہن نے ہنس کر کہا — "تم نے مجھ سے ان پرندوں کا ناحق خون کرایا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں برہمن ہوں۔ ہمیں گوشت کھانے کی اجازت نہیں۔"

"اگر تم گوشت کھاؤ تو تمہارے خیالات بدل جائیں گے" — بلاذری نے کہا — "میں تمہیں آج گوشت کھلاؤں گا۔ اگر پتھر کے کسی بت نے تمہیں سزا دی تو وہ میں بھگتوں گا۔"

اُس نے پرندوں کے پر اتارے۔ پرندے صاف کیے اور لکڑیاں وغیرہ اکٹھی کر کے آگ پر پرندے بھون لیے۔ وہ نمک ساتھ لے گیا تھا۔ جگ موہن

گوشت کو ہاتھ لگاتے ڈر رہا تھا۔ عمران بلاذری نے زبان کا جادو چلایا تو جگ موہن نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک پرندہ اٹھایا اور دانتوں سے ایک بوٹی منہ میں ڈالی۔ اُس نے گوشت کا ذائقہ پہلی بار چکھا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی پورا پرندہ کھالیا۔

"اور کھاؤں گا" — جگ موہن نے کہا۔

وہ ایک اور پرندہ کھا گیا۔

"میں ایک اور کھلاؤں گا" — عمران بلاذری نے کہا۔

جگ موہن نے ایک اور پرندہ کھالیا۔ پرندوں کی کمی نہیں تھی۔ بلاذری آگ پر پھینکتا، بھونتا اور نمک لگاتا جا رہا تھا۔ جگموہن نے ایک اور پرندہ اٹھایا تو بلاذری نے روک دیا۔

"زیادہ نہیں" — اُس نے جگ موہن سے کہا — "تمہارا پیٹ گوشت کا عادی نہیں۔ شاید زیادہ ہضم نہ کر سکے۔ میرے گھر آتے ہی رہتے ہو۔ میں تمہیں گوشت کا عادی بنادوں گا۔"

جگ موہن نے بلاذری کے منع کرنے کے باوجود ایک اور پرندہ کھالیا اور بولا — "بھاگیں دوڑیں گے تو سب کچھ ہضم ہو جائے گا۔"

اُس روز کے بعد جگ موہن عمران بلاذری کے گھر جاتا تو گوشت کی فرمائش کرتا۔ بلاذری اس کے لیے گوشت تیار رکھتا تھا۔ یہ گوشت کا اثر تھا یا بلاذری کی باتوں کا کہ جگ موہن اپنے مذہب سے متنفر ہو گیا۔

"تم مندر میں جایا کرتے ہو؟" — ایک روز عمران بلاذری نے اس سے پوچھا۔

"کبھی کبھی" — جگ موہن نے جواب دیا — "اب تو ایک رسم پوری کرنے جاتا ہوں۔"

"تم جس بت یا مورتی کے سامنے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے ہو، اُسے ایک روز کہنا کہ گوشت خور ہو گئے ہو" — عمران بلاذری نے کہا — "پھر دیکھنا تمہارا یہ مصنوعی خدا تمہیں کیا کہتا ہے۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں کہے گا کہ تم اتنے دنوں سے گوشت

کھا رہے ہو۔ تمہیں ان بتوں نے کیا سزا دی ہے؟ البتہ تمہارے کسی پنڈت کو پتہ چل گیا تو وہ تمہارے خلاف طوفان بپا کر دے گا۔"

جگ موہن اپنے مذہب کے خلاف دلیر ہو گیا۔

شام کے بعد کا واقعہ ہے۔ عمران بلاذری اپنے گھر میں تھا۔ ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی اُس کے گھر میں آئی۔ لڑکی کا رنگ گورا، آنکھیں شربتی اور بال بھی شربتی رنگ کے تھے۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی لیکن اُس میں جو کشش تھی، وہ اُس کے جسم کی ساخت کی بدولت تھی۔ اس کی چال ڈھال میں انوکھی کشش تھی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔ عمران بلاذری اس لڑکی کو ایسے وقت جب شام گہری ہو گئی تھی، اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"عمران بلاذری تم ہو؟" — لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ میں ہی ہوں۔"

"میں جگ موہن کی بہن ہوں" — لڑکی نے کہا — "میرا نام رشی ہے۔ جگ موہن کو دیکھنے آئی ہوں۔ میرے باپ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں جو کسی سیانے کو بلا لائے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا بھائی تمہارے پاس آیا کرتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ آیا کرتا ہے لیکن دیر بعد" — عمران بلاذری نے کہا — "رات گہری ہو چکی ہوتی ہے تو آتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کسی وید یا کسی سیانے کو بلا لاؤں گا۔"

"تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟" — رشی نے پوچھا۔

"بالکل اکیلا۔"

"بیوی نہیں؟" — رشی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

اس ہندو لڑکی کے چہرے کے تاثرات اور مسکراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس گھر سے جلدی نہیں نکلنا چاہتی۔ عمران بلاذری ایک تاثر بن کر اس پر چھا

گیا تھا۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" ۔۔۔ رشی نے پوچھا۔

"تمہارا باپ بیمار ہے رشی!" ۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا ۔۔۔ "تمہیں جلدی گھر جانا چاہیے۔"

"اتنا زیادہ تو بیمار نہیں" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "ویسے بھی تمہارے پاس رک گئی ہوں۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا تو چلی جاتی ہوں ۔۔۔ میرا بھائی تمہاری بہت تعریفیں کیا کرتا ہے۔ ہمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا ۔۔۔ تم واقعی اچھے آدمی ہو۔ جگ موہن بہت اداس رہتا ہے۔ اس نے کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے۔"

عمران بلاذری کے منہ سے نکل چلا تھا کہ جگ موہن نے کھانا پینا اس لیے کم کر دیا ہے کہ وہ اس سے چوری چھپے گوشت کھاتا ہے لیکن اسے یاد آگیا کہ یہ راز ہے۔ اس نے کہا۔ "جس نے اپنی بہن کو زندہ جلتے دیکھا ہو وہ اداس نہ رہے تو کیا کرے ۔۔۔ تمہیں بھی اپنی بہن کا بہت غم ہوگا؟"

رشی نے آہ لی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی ۔۔۔ "میری قسمت میں بھی شاید زندہ جلنا ہی لکھا ہے۔ کبھی تو جی میں آتی ہے کہ شادی نہ کروں۔"

عمران بلاذری کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں، پھر آہستہ آہستہ نیچے کو پھسلنے لگیں۔ رشی اسے دیکھ رہی تھی۔ بلاذری تصور میں دیکھنے لگا کہ اتنی حسین لڑکی جل رہی ہے ۔۔۔ تصوروں کے شعلے اس کے اپنے سینے کو جلانے لگے۔

"نہیں رشی!" ۔۔۔ بلاذری نے بے تابی سے لپک کر رشی کے کندھے پکڑ لیے اور بولا ۔۔۔ "تم نہیں جلو گی۔ تم مر گئیں تو میں تمہاری لاش کو چتا میں جلنے دوں گا۔ تمہاری لاش اٹھا لے جاؤں گا۔"

رشی گھبرا گئی۔ بلاذری سنبھل گیا اور کھسیانی سی مسکراہٹ سے بولا ۔۔۔ "مجھے معاف کر دینا رشی! مجھے غلط نہ سمجھنا ۔۔۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم جیسی عورتوں کو زندہ کس طرح جلا دیتے ہیں۔ تمہارے پنڈت اور دوسرے لوگ اپنے پتھر دل کس طرح بن جاتے ہیں۔"

"تم میری قسمت نہیں بدل سکتے عمران!"

عمران نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ دونوں پر خاموشی طاری ہوگئی۔ عمران بلاذری اس کے اور قریب ہوگیا۔

"میں تمہاری قسمت بدل سکتا ہوں" ۔۔۔ اس نے زیر لب کہا ۔۔۔ "اگر تم نے ساتھ دیا تو خدا ہماری مدد کرے گا۔"

"کل آؤں؟" ۔۔۔ رشی نے پوچھا

"اسی وقت" ۔۔۔ عمران بلاذری نے کہا ۔۔۔ "لیکن کوئی دیکھ نہ لے۔ ہمارے مذہب ہمارے لیے مشکل پیدا کر دیں گے ۔۔۔ جگ موہن نے بتایا تھا کہ تمہیں مندر میں نہیں جانے دیا جاتا۔ اس نے وجہ بھی بتائی تھی۔"

"میں اپنے کسی دیوتا پر قربان ہونے کے لیے تیار نہیں" ۔۔۔ رشی نے کہا ۔۔۔ "میں دن کو گھر سے باہر نہیں جاتی۔ رات کو نکلتی ہوں۔"

"کل آؤ گی تو باتیں کریں گے" ۔۔۔ بلاذری نے کہا ۔۔۔ "تم گھر چلو، میں کسی حکیم یا سیانے کو لے کر آتا ہوں۔"

وہ رشی کے ساتھ دروازے تک گیا۔ یہ تاریک ڈیوڑھی تھی۔ رشی اس کے قریب ہوگئی۔ عمران بلاذری نے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا۔

"میں کسی غیر مرد کے اتنی قریب کبھی نہیں ہوئی تھی" ۔۔۔ رشی نے کہا ۔۔۔ "تمہارے قریب ہوتے ڈر آتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق ہمیں کبھی کوئی اچھی بات نہیں بتائی گئی۔ جگ موہن مجھے یہ نہ بتاتا کہ تم اچھے آدمی ہو تو میں یہاں کبھی نہ آتی ۔۔۔ تم تو بہت اچھے ہو۔"

رشی دروازے سے نکلی تو بھی اس کے ہاتھ میں عمران کا ہاتھ تھا۔ جیسے وہ اس خوبرو مسلمان کے سہارے اپنے مذہب کے سیلابی دریا میں اتر رہی ہو۔ عمران بلاذری نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ رشی کچھ دیر رکی رہی۔ اس نے

بے دلی سے عمران کا ہاتھ چھوڑا اور چلی گئی۔ وہ کچھ دور چلی گئی تو عمران باہر نکلا اور ایک حکیم کے گھر کو چل پڑا۔

حکیم کو جگ موہن کے گھر میں داخل کر کے عمران بلاذری واپس آ گیا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں آیا تو باہر کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ عورت ہی لگتی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ شاید رتی پھر آ گئی تھی۔ قریب آئی تو بلاذری نے پہچان کر کہا — "فاطمہ! ... تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

"صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ یہ ہندوانی یہاں کیوں آئی تھی؟" — فاطمہ نے پوچھا — "کیا میں اتنی بُری ہوں کہ دُور سے میرے سلام کا جواب دے دیتے ہو؟ ... اور میرے پیغام کا یہ جواب دیتے ہو کہ تمہارے خاوند سے ڈرتا ہوں میرے گھر نہ آنا، ہم نہیں مل سکتے۔"

عمران بلاذری نے جا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور فاطمہ کو اپنے کمرے میں لے گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے رتی آئی تھی۔

"وہ اپنے بھائی کو دیکھنے آئی تھی" — عمران بلاذری نے فاطمہ سے کہا — "میں نے آج پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ... اور میں تمہارے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا فاطمہ! تم مسلمان ہو۔ خاوند والی ہو۔ تمہارے سلام اور تمہارے پیغام جسمانی تعلق کی خاطر ہیں۔ میں گناہگار نہیں کہلاؤں گا۔"

"جسے تم میرا خاوند کہہ رہے ہو، وہ مجھ اکیلی کا خاوند نہیں" — فاطمہ نے کہا — "اس کی تین بیویاں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ میری عمر بیس سال سے کچھ مہینے اوپر ہو گی۔ میرے خاوند کی عمر مجھ سے دگنی سے بھی زیادہ ہو گی۔ اس نے تین بیویاں صرف اس لیے رکھی ہوئی ہیں کہ وہ دولت مند تاجر ہے۔ خدا نے اسے ایسی شکل و صورت بھی نہیں دی کہ کوئی عورت اسے پسند کرے۔ اس کا جسم اس قابل نہیں کہ تین بیویاں اس سے خوش رہیں، مگر دولت کے زور پر اُس

نے مجھ جیسی جوان لڑکی کو تیسری بیوی بنا لیا ہے۔ اگر اس قسم کا مرد تین بیویاں رکھ سکتا ہے تو کیا ایک عورت دو خاوند نہیں رکھ سکتی؟ عورت کو اس حق سے کیوں محروم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے مرد کے پاس جائے؟ مرد کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ تین تین چار چار جوان لڑکیوں کو اپنے عقد میں باندھ لے؟"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں" — عمران بلاذری نے بے رخی سے کہا — "نہ میں نے مرد کو تین اور چار بیویاں رکھنے حق دیا ہے، نہ عورت کو ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کے حق سے محروم کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ تم چلی جاؤ۔ تمہارے خاوند کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں ہو تو میری مصیبت آ جائے گی۔"

"وہ یہاں نہیں ہے" — فاطمہ نے کہا — "پشاور مال لینے چلا گیا ہے۔ وہ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ غائب رہے گا۔ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے ایسی بیماری کا بہانہ بنایا کہ وہ گھبرا گیا۔ وہ دوسری بیوی کو ساتھ لے گیا ہے۔ جو مجھ سے تین سال بڑی ہے۔ اس سے بڑی کہیں اور چلی گئی ہے۔ رات دیر سے آئے گی۔ وہ مجھے کہیں جانے سے نہیں روک سکتی اور میں اس کے راستے میں نہیں آتی ... تم نے مجھے مسلمان کہا ہے۔ میں نام کی مسلمان رہ گئی ہوں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرے باپ کا مذہب اور ایمان سونا چاندی ہے۔ اُس نے مجھے مذہب کے نام پر بیچا ہے۔ میری قیمت نقد وصول کر کے میرا نکاح پڑھوایا ہے۔ مجھے اپنے مذہب کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کو مرد کی تفریح کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ میں ایک مرد کی تفریح کا ذریعہ بن گئی ہوں۔ میں اسے اپنا حق سمجھتی ہوں کہ اپنی تفریح کا کوئی ذریعہ پیدا کروں۔ وہ ذریعہ تم ہو۔ کہو اپنی کتنی قیمت مانگتے ہو۔ کیا میں اس ہندو لڑکی جتنی خوبصورت نہیں ہوں؟"

"میں تمہارے خاوند کے قبیل میں سے نہیں ہوں" — عمران بلاذری نے کہا — "مجھے تمہارے حسن اور تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ اگر میں ایسا

ہوتا کہ میں اس وقت دو نہیں تو ایک شادی ضرور کر چکا ہوتا۔ میری نظر نہ اپنے جسم پر ہے نہ تمہارے جسم پر۔ تم بھی جسم سے توجہ ہٹا لو۔ مسلمان کی دولت اس کی روح ہوتی ہے۔ روح کو پاک رکھو۔"

"تم بچے ہو" — فاطمہ نے کہا — "ڈرتے ہو۔ اپنے آپ کو فریب دیتے ہو۔ میرا جسم روح سے خالی ہے۔ جو عورت نیلام ہو جاتی ہے اس کی روح مر جاتی ہے۔ تم میری روح کو زندہ کر سکتے ہو۔"

"پھر اپنے خاوند سے طلاق لو اور میری بیوی بن جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں" — فاطمہ نے کہا — "میں تمہارے ساتھ گھر سے بھاگ سکتی ہوں۔ نقد بھی ساتھ لاؤں گی، زیورات بھی۔ جہاں کہو گے چلوں گی" — وہ اس کے قریب آ گئی۔ باہیں اس کے گلے میں ڈال کر جذباتی اور مخمور آواز میں بولی — "تم میری زنجیروں سے نکل نہیں سکو گے۔ اپنے خاوند کے سوا میں کسی اور مرد کے جسم سے واقف نہیں۔ تمہیں میرے دل نے چاہا ہے۔ میرا جسم بھی پیاسا ہے، میری روح بھی پیاسی ہے۔"

"تم نفس کی آگ میں نہیں، انتقام کی آگ میں جل رہی ہو" — عمران نے کہا — "اس میں اپنے باپ کو جلاؤ جس نے نقدی لے کر تمہاری جوانی کے خواب اس ہوس کار خاوند کے حوالے کیے تھے۔ پھر اس خاوند کو اس آگ میں جھونکو۔"

"تم میرا ساتھ دو گے؟"

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"اپنے خاوند کو زہر دے دوں تو مجھے یہاں سے کہیں دور لے جاؤ گے؟"

عمران بلاذری گہری سوچ میں کھو گیا۔ فاطمہ نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر ایک بازو اس کے گلے میں ڈالا اور گال اس کے گال سے لگا دیا۔ وہ تڑپ اٹھا جیسے پنجرے میں بند کر لیا گیا ہو۔

"میں تمہارا ساتھ دوں گا" — اس نے فاطمہ کے بازو سے آزاد ہو کر پرے ہٹتے ہوئے کہا — "لیکن اپنے خاوند کو اس روز زہر دینا جس روز میں کہوں گا۔ اس سے پہلے میں کہیں اور ذریعہ معاش کا انتظام کر لوں گا۔"

"دھوکہ تو نہیں دو گے؟"

"نہیں۔"

"مجھے اپنے گھر آنے سے تو نہیں روکو گے؟"

"نہ آؤ تو اچھا ہے" — بلاذری نے کہا — "کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا میرے ساتھ تعلق ہے۔"

فاطمہ مطمئن ہو کر چلی گئی مگر عمران بلاذری کا دم اس طرح گھٹ رہا تھا جیسے اس کی گردن پھانسی کے پھندے میں آ گئی ہو۔ فاطمہ رشی جیسی خوبصورت تھی، اندر وہ جذبات کا آتش فشاں پہاڑ تھی۔ اس کے خاوند کا گھر اسی گلی کے آخر میں تھا جو امیرانہ ٹھاٹھ کی حویلی تھی۔ فاطمہ نے عمران بلاذری کو اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے کئی بار دیکھا تھا۔ اس نے کئی بار اس خوبرو مرد کو سلام کیا، پھر ایک غریب سی عورت کی زبانی ملاقات کے لیے پیغام بھیجے تھے مگر عمران اس سے پہلو بچا رہا تھا۔ آج رات فاطمہ نے ایک ہندو لڑکی کو عمران کے گھر سے نکلتے دیکھا تو رقابت نے اسے اتنا دلیر بنا دیا کہ وہ عمران کے گھر آ گئی۔ عمران کو یوں محسوس ہوا جیسے دہکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ فاطمہ نے اپنے خاوند کو زہر دینے کی تجویز پیش کی تو عمران بلاذری کو فرار کا راستہ نظر آ گیا۔ اسے فاطمہ بتا چکی تھی کہ اس کا خاوند ایک ماہ بعد آئے گا۔ بلاذری نے سوچا کہ ایک ماہ تک فاطمہ دھوکے میں رہے گی۔

حقیقت یہ تھی کہ عمران بلاذری کو رشی اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اسے بار بار ملنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ فاطمہ رشی سے کم خوبصورت نہیں تھی لیکن یہ دل کا معاملہ تھا مگر فاطمہ چلی گئی تو بلاذری کے سامنے اپنا فرض آ گیا۔ وہ جاسوسی کے لیے آیا تھا اور اب تک اس کا بہروپ کامیاب تھا۔ راج محل کی فوجی نوعیت کی سرگرمیوں . . .

اُس کی نظر تھی۔ وہ سلطان سبکتگین تک کئی اطلاعیں اور معلومات پہنچا چکا تھا۔ اُس نے جذباتی لحاظ سے اپنے آپ کو پتھر بنا رکھا تھا مگر رشی اور فاطمہ نے اُسے ایسا دھکّا دیا کہ وہ جذبات کے سیلاب میں غوطے کھانے لگا۔ فرض اُس کے ہاتھ سے چھوٹتا نظر آنے لگا۔ تنہائی میں اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی اور وہ سنبھل گیا مگر اُسے یہ خطرہ بھی نظر آنے لگا کہ یہ دو لڑکیاں آج رات کی طرح اُس کے پاس آتی رہیں تو وہ فرض کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اُس نے اس کا علاج یہ سوچا کہ وہ یہاں سے نقل مکانی کر جائے گا اور ان لڑکیوں کو پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ شہر کے کونسے کونے کھدرے میں رہتا ہے۔ اُسے یہ توقع تھی کہ وہ کسی بھی روز لاہور سے غزنی چلا جائے گا۔

وہ آخر انسان تھا، پتھر نہیں تھا۔ انسانی فطرت کی اس سب سے بڑی کمزوری جسے عورت کہتے ہیں، پر قابو پانا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ چکّی کے دو پتھروں میں آ گیا تھا۔

اگلی شام گہری ہوئی تو رشی آ گئی۔ عمران بلاذری گھر میں اکیلا تھا۔ یہ اُن کی دوسری ملاقات تھی لیکن انہیں یوں لگا جیسے وہ بچپن سے اکٹھے کھیلتے جوان ہوئے ہوں۔

"کل تم نے کہا تھا کہ میری لاش کو بھی نہیں جلنے دو گے" — رشی نے کہا — "تم نے ایسے کیوں کہا تھا؟"

"کل تم یہاں اپنے بھائی کو دیکھنے آئی تھیں" — بلاذری نے رشی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا — "آج کیوں آئی ہو؟"

"تمہیں دیکھنے"

"کیوں؟"

"تم مجھے اچھے لگتے ہو"

"اسی لیے میں تمہاری لاش نہیں جلنے دوں گا" — عمران بلاذری نے کہا — "تم مجھے

اچھی لگتی ہو"

"میں نے کل تمہیں بتایا نہیں تھا" — رشی نے کہا — "میری شادی بھی ایک فوجی کے ساتھ ہو گی"

"جو غزنی پر حملے کے لیے جائے گا" — بلاذری نے کہا — "اور تمہاری زندگی اپنی بہن کی طرح جلتی چتا پر ختم ہو جائے گی"

"یہ لوگ عورت کو انسان کیوں نہیں سمجھتے؟" — رشی نے رنجیدہ لہجے میں پوچھا — "انسانی قربانی لڑکی کی کیوں دی جاتی ہے؟ کسی مرد کو قربان کیوں نہیں کیا جاتا؟"

"تمہارے مذہب میں تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں" — عمران بلاذری نے کہا — "میرے مذہب میں انسانی قربانی کا رواج نہیں"

"میں زندہ نہیں جلنا چاہتی" — رشی نے خوفزدہ لہجے میں کہا — "میرے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں، کوئی پناہ نہیں"

یہاں سے بات چلی تو اتنی دور پہنچ گئی جہاں عمران اور رشی ایک ہو گئے۔ اُن کی محبت رُوحوں تک اُتر گئی۔ انہیں یہ بھی احساس نہ رہا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ وہ اپنے مذہب بھی بھول گئے۔ عمران بلاذری کو اپنے فرض کا بھی احساس نہ رہا۔ رشی کو یقین ہو گیا کہ عمران اُسے پناہ میں لے لے گا۔ وہ جانے کے لیے یُوں اُٹھی جیسے جانا نہ چاہتی ہو لیکن اُسے جانا تھا اور وہ چلی گئی۔

دو تین روز بعد رشی پھر عمران کے گھر گئی۔ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ جگ موہن نے باہر سے عمران بلاذری کو آواز دی۔

"تمہارا بھائی آیا ہے" — عمران نے رشی سے کہا — "تم ساتھ والے کمرے میں چھپ جاؤ"

جب جگ موہن اس کمرے میں آیا، اُس کی بہن دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔

"تم نے مجھے گوشت کا ایسا عادی بنا لیا ہے کہ اپنے گھر کی سبزی ترکاری

کو دیکھ کر بھوک مر ہی جاتی ہے" — جگ موہن نے کہا۔ "گھر میں کچھ ہے؟"

عمران بلاذری نے گھر میں پکا ہوا گوشت رکھا ہوا تھا۔ وہ جگ موہن کے آگے رکھ دیا۔ جگ موہن نے یہ بھی نہ دیکھا کہ عمران نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ وہ سارا گوشت کھا گیا۔

"قربانی کے لیے کوئی لڑکی چن لی گئی ہے یا نہیں؟" — بلاذری نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" — جگ موہن نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں پنڈتوں کو کس قسم کی لڑکی کی تلاش ہے۔"

"تمہاری بہن مندر میں جاتی ہے؟"

"نہیں" — جگ موہن نے کہا۔ "مگر میں سوچتا ہوں کہ اُسے کب تک چھپائے رکھیں گے۔"

عمران بلاذری اس کوشش میں تھا کہ جگ موہن جلدی چلا جائے۔ وہ اُس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ تھکن اور نیند کا بہانہ کام کر گیا، اور جگ موہن چلا گیا۔ رشی [illegible] تو اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔

"کیا میرے بھائی نے گوشت کھایا ہے؟" — رشی نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں یہی راز تمہیں بتانا چاہتا تھا" — عمران نے جواب دیا — "مگر میں اُسے بتا بھی نہیں سکا کہ تم ساتھ والے کمرے میں ساری باتیں سن رہی ہو۔۔۔ وہ جب سے میرا دوست بنا ہے گوشت کھا رہا ہے۔ تمہارے دیوتاؤں نے تمہارے بھائی کو کوئی سزا دی ہے؟ مذہب صرف اُن چیزوں کی مخالفت کرتا ہے جن سے نشہ ہوتا ہے اور انسان کی عقل بیکار ہو جاتی ہے۔ مجھے بتاؤ تم کب آؤ گی، میں تمہیں بھی گوشت کھلاؤں گا۔"

رشی دو روز بعد آئی۔ عمران نے اُس کے لیے مرغی بھون کے رکھی ہوئی تھی۔ رشی نے ڈرتے ڈرتے کھائی۔ پھر بولی — "میں جب بھی آؤں میرے لیے گوشت رکھا کرو۔"

انہی دنوں عمران بلاذری کو حکم ملا کہ راج محل کے ایک کمرے میں غزنی کے دو قیدی لائے گئے ہیں جنہیں کھانا دینا ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مسلمان کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ عمران اُن کے لیے کھانا لے کر گیا اور اُس کی ملاقات نظام اوریزی اور قاسم بلخی سے ہوئی۔ پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں، انہیں کیا ہدایات دیں اور کس طرح اُن کے فرار کی راہ ہموار کرتا رہا۔

اس دوران رشی اُس کے پاس آتی رہی۔ اب اس کی دو ہی فرمائشیں ہوتی تھیں۔ وہ آتے ہی گوشت مانگتی پھر یہ ضد — "مجھے لاہور سے جلدی نکالو۔ گھر والے میری شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

اگر نظام اوریزی اور قاسم بلخی نہ آجاتے تو عمران بلاذری کبھی کا رشی کو ساتھ لے کر نکل گیا ہوتا۔ وہ رشی کے ساتھ ہر بار ایک نیا جھوٹ بولتا تھا۔ اُسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے، اور غزنی کے دو قیدیوں کو فرار کرائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ فرض اور محبت کے درمیان پس رہا تھا۔ رشی کی والہانہ محبت اور اُس کے آنسوؤں نے اُسے کئی بار فرض سے ہٹا لیا لیکن اوریزی اور بلخی کو دیکھ کر اُسے فرض یاد آجاتا تھا۔ ان دونوں کے فرار کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے کمرے کے باہر سنتری موجود رہتے تھے۔

ایک رات رشی عمران کے گھر سے گئی تو فاطمہ آگئی۔ عمران پر رشی کے حسن اور اس کی محبت کا نشہ طاری تھا۔ وہ اُسی کے تصور سے دل بہلا رہا تھا۔ فاطمہ نے اُسے اس حسین تصور سے بیدار کر دیا۔ اُسے غصہ آگیا۔ فاطمہ کسی اور نشے میں آئی تھی، یہ نشہ جسمانی تھا۔

"میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا" — عمران نے غصے سے کہا — "اپنے خاوند کو واپس آنے دو۔"

"تم مجھے ٹال رہے ہو" — فاطمہ نے کہا۔ "مانگو۔ اپنی کتنی قیمت

مانگتے ہو۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے فاطمہ!"

"تمہیں وہ ہندوانی چاہیئے" — فاطمہ نے طنزیہ لہجے میں کہا — "وہ جو تمہارے پاس آتی رہتی ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں پکڑوا سکتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں ہندوؤں کا راج ہے جو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ تمہاری چوری پکڑی گئی تو سیدھے قید خانے میں جاؤ گے۔"

"میں اس سے پہلے لڑکی سمیت غائب ہو جاؤں گا" — عمران بلاذری نے کہا — "تم میرے پاس جو اُمید لے کر آئی ہو وہ پوری نہیں ہو سکے گی۔ رشی کے مقابلے میں میں تم جیسی بیس لڑکیوں کو دھتکار سکتا ہوں۔"

یہ عمران بلاذری کی بڑی خطرناک غلطی تھی۔ اُسے احساس نہیں تھا کہ رقابت عورت کو چڑیل بنا دیا کرتی ہے۔ فاطمہ کے ساتھ جو ظلم ہوا تھا، اس سے وہ باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے شرم و حجاب اتار پھینکا تھا۔ وہ غصے سے چلی گئی۔

فاطمہ کو ہندو عورتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ پنڈت راجہ جے پال کی فتح کی خاطر ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے رہے ہیں لیکن انہیں اپنے مطلب کی لڑکی نہیں مل رہی۔ فاطمہ نے اگلا دن بڑی مشکل سے گزارا۔ رات کو وہ مندر میں چلی گئی۔ اُس نے ہندو عورتوں سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑا پنڈت کہاں رہتا ہے۔ وہ پنڈت کے پاس چلی گئی۔ پنڈت اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"آپ لڑکی کی قربانی کب دیں گے؟" — فاطمہ نے پوچھا۔

"جب ہمیں وہ خاص قسم کی لڑکی مل جائے گی" — پنڈت نے کہا — "تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میں آپ کی مدد کرنے آئی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "آپ کو علم نہیں کہ شہر کی تمام ہندو لڑکیاں مندر میں نہیں آتیں۔ میں آپ کو ایک لڑکی دکھاؤں گی۔ مجھے امید

ہے کہ وہ قربانی کے لیے موزوں ہوگی۔" اُس نے رشی کے باپ کا نام لیا اور پوچھا — "آپ نے اِس کی بیٹی کو کبھی دیکھا ہے؟"

"میں نے تمہیں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا" — پنڈت نے کہا — "تم کس کی بیٹی ہو؟"

"میں مسلمان ہوں" — فاطمہ نے جواب دیا — "اور ایک تاجر کی بیوی ہوں۔"

"تمہیں ہماری قربانی اور ہمارے مذہب کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" — پنڈت نے پوچھا — "تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ بتاؤ۔"

یہ مندر کے ساتھ ملا ہوا ایک کمرہ تھا۔ کسی مسلمان کو مندر کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی مسلمان کسی ہندو کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مسلمانوں کو ناپاک سمجھا جاتا تھا مگر پنڈت کو جب فاطمہ کے متعلق پتہ چلا کہ وہ مسلمان ہے تو اُس نے اُسے گھر سے نکالا نہیں۔ وہ چونکا اور بھڑکا بھی نہیں۔ وہ جان گیا کہ یہ جوان سال اور حسین لڑکی کسی اور مقصد کے لیے آئی ہے۔ پنڈت گھاگ اور خرانٹ آدمی تھا۔ اُس نے فاطمہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ تمہارے دل میں جو کچھ ہے بتا دو۔

فاطمہ تجربہ کار اور خرانٹ نہیں تھی۔ وہ تو رقابت اور اپنی توہین کی آگ میں جل رہی تھی۔ اُس کی عقل پر شیطانی قوتوں کا قبضہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے، اپنے خاوند سے، رشی سے اور عمران بلاذری سے انتقام لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اُس کی تمام تر تخریبی قوتیں بچھو کے ڈنک کی طرح تیار اور مستعد ہوگئی تھیں۔ اُس نے پنڈت کے سوال کے جواب میں اپنے کپڑوں کے اندر سے ایک پوٹلی نکالی اور پنڈت کے آگے رکھ کر کھول دی۔ اس میں سونے کے چند ایک سکے تھے۔ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں نے جس لڑکی کا نام لیا ہے اس کی آپ انسانی قربانی دے دیں" — فاطمہ نے رازداری کے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ لڑکی ہمارے مطلب کی نہ ہوئی تو؟"

"وہ کنواری ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "بہت خوبصورت ہے۔ عمر سولہ سترہ سال ہے تاکہ وہ قربانی کے مطلب کی نہیں تو بھی اس کی قربانی دے دیں۔"

"ہمارے مذہب میں دخل اندازی نہ کرو لڑکی" — پنڈت نے مذہبی پیشواؤں کے رعب سے کہا۔ "ہم ایک خاص قسم کی لڑکی کی تلاش میں ہیں۔"

"پنڈت جی مہاراج!" — فاطمہ نے کہا — "کوئی مذہب انسان کی قربانی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ رسم مذہب کے اُن ٹھیکیداروں نے شروع کی ہے جو اپنے مہاراجہ کو خوش کر کے انعام و اکرام لینا چاہتے ہیں، اور جو لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خداؤں اور دیوتاؤں کے خاص درباری ہیں اور وہ جس کسی کی بھی جان لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ آپ لوگ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت اونچا سمجھتے ہیں۔"

"میرے مذہب کی توہین نہ کرو لڑکی" — پنڈت نے دبے دبے غصے سے کہا — "تم نہیں جانتی کہ اس کی سزا کیا ہے۔"

"میں صرف آپ کے مذہب کی بات نہیں کر رہی مہاراج!" — فاطمہ نے کہا۔ "میرے مذہب میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ صرف انسانی قربانی نہیں دی جاتی۔ جہاں تک ہمارے اماموں اور مولویوں کا تعلق ہے، وہ آپ کی طرح مذہب کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اپنی آواز کو خدا کی آواز کہتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو خدا کا حکم بتلاتے ہیں، اور اپنے آپ کو عام انسانوں سے بہت بلند، خدا کے قریب سمجھتے ہیں۔ اس طرح مذہب کی اصلیت پر پردے پڑتے رہتے اور انسان بھٹکتے پھرتے ہیں... پنڈت جی مہاراج! آپ نے اپنا جو درجہ بنا رکھا ہے اس سے نیچے آئیں۔ مجھے اس مندر کے کچھ ایسے راز معلوم ہیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جسے زخم آتا ہے یا چوٹ لگتی ہے، وہ درد سے کراہتا ہے اور اُس کے کراہنے کو وہ لوگ سن لیتے ہیں جن کے کان ہوتے ہیں۔"

"تم کمسن ہو لڑکی!" — پنڈت کے لہجے میں رعب کی بجائے اپنائیت سی تھی۔ کہنے

لگا — "اس عمر میں تم ایسی باتیں کرتی ہو جو پختہ عمر میں بھی نہیں سوچی جا سکتیں۔"

"میرے دل کے زخموں نے مجھے پختہ کار بنا دیا ہے۔" — فاطمہ نے جواب دیا — "یہ میری عقل کی نہیں میرے دل کی آواز ہے۔ میرا دل کراہ رہا ہے، سسکیاں لے رہا ہے۔"

"وہ کون سے راز ہیں جو تم جانتی ہو؟"

"ایک یہ کہ میں حسین اور نوجوان نہ ہوتی تو آپ اتنا ہی سن کر کہ میں مسلمان ہوں مجھے دھکے دے کر اس کمرے سے نکال دیتے۔ کمرے کو دھلاتے، یہاں لوبان جلاتے، بھجن گاتے، تب یہ کمرہ پاک ہوتا۔ مگر مجھے دیکھ کر آپ بھول گئے کہ مسلمان ناپاک ہوتا ہے۔ آپ نے سونے کے سکوں کو اٹھا باہر نہیں پھینکا۔ آپ کی زبان میں اور آپ کے الفاظ میں پنڈت موجود ہے مگر جن آنکھوں سے آپ مجھے اور سونے کے ان سکوں کو دیکھ رہے ہیں، ان سے پنڈت غائب ہو چکا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں مجھے اپنا خاوند دکھائی دے رہا ہے۔ اُس نے میرے باپ کے ساتھ میرے حسن اور میری جوانی کا سودا کیا تھا۔ میں بکی ہوئی چیز ہوں۔ میں اب سودا کرنے سے نہیں ڈرتی۔ اپنے دل کی مراد کی خاطر میں سودا کرنے آئی ہوں۔"

"تم راز کی بات کر رہی تھیں۔"

"دل پر ہاتھ رکھیں اور سنیں" — فاطمہ نے کہا — "آپ کو انسانی قربانی کے لیے خاص قسم کی لڑکی صرف اس لیے نہیں مل رہی کہ آپ نے دو دولت والوں کی بیٹیوں پر ہاتھ رکھا لیکن زر و جواہرات لے کر آپ نے ان سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا خاوند بہت بڑا تاجر ہے۔ وہ نام کا مسلمان ہے۔ وہ اپنے مذہب کا صرف ایک اصول جانتا ہے کہ ایک مسلمان بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اور اس کا دوستانہ ہندوؤں کے ساتھ ہے۔ اُسے بہت سی باتیں معلوم ہیں... میں اپنے ایمان کو ایک طرف رکھتی ہوں۔ آپ اپنے دھرم کو اس دروازے سے باہر رکھ دیں۔ سونے کے یہ ٹکڑے گن لیں، اور سودا کریں۔ کچھ اور چاہیے تو بتا دیں۔"

پنڈت کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جیسے بھیڑیئے نے کمزور سا

شکار دیکھ لیا ہو۔ یہ خندۂ دنداں نما تھا۔ وہ فرش پر بیٹھا تھا۔ فاطمہ اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھی تھی۔ پنڈت کا ہاتھ فاطمہ کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھ کو دبوچ لیا۔ پنڈت کے دوسرے ہاتھ نے سونے کے سکوں والی پوٹلی اپنی طرف سرکا کر گھٹنے کے نیچے کر لی۔ فاطمہ نے اپنا ہاتھ پنڈت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں کیسے یقین کر سکتی ہوں کہ میرا کام ہو جائے گا اور میرے ساتھ دھوکہ نہیں ہوگا؟"

"تم اس لڑکی کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھیں؟" — پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جو گناہ کے تصور سے شرابی کے قدموں کی طرح ڈگمگا رہا تھا — "ہٹ جائے گی۔"

"اگر اس کے ماں باپ نے آپ کی مٹھی گرم کر دی تو کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔"

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ پنڈت نے ایک ٹانگ لمبی کر کے ایک کواڑ بند کر دیا۔ فاطمہ نے ہاتھ لمبا کر کے دوسرا کواڑ بند کر دیا۔ رات خاموش تھی۔ مندر میں رکھا ہوا اندر کا بت خاموش تھا۔ پنڈت کے کمرے میں رکھی ہوئی مورتیاں خاموش تھیں۔ کرشن مراری کی مرلی خاموش تھی۔ مندر کا سنکھ خاموش اور گھنٹیاں خاموش تھیں۔ رشی اپنے گھر اور عمران بلاذری اپنے گھر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خواب میں دیکھ رہے ہوں گے۔

مندر میں ان کے خوابوں کا سودا طے ہو چکا تھا۔

اگلے دن کا سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ عمران بلاذری کچھ دیر پہلے گھر سے اپنے کام کو جانے کے لیے نکلا تھا۔ وہ فاطمہ کے خاندان کی محل جیسی حویلی کے سامنے سے گزرا تو چلمن کی اوٹ سے اسے فاطمہ کی سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز سنائی دی — "عمران" — وہ رک گیا۔ چلمن سے جھانکتا ہوا فاطمہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے میں اسے کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا" — فاطمہ نے کہا۔

عمران بلاذری کا خون کھولنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا اور چل پڑا۔ راج محل کے احاطے میں جا کر وہ اسی کمرے میں گیا جہاں غزنی کے دو قیدی، نظام ادریسی اور قاسم بلخی کو رکھا گیا تھا جیسا کہ پہلے سنایا جا چکا ہے، ان کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ کمرہ کھلا تھا۔ کمرے کے باہر اور عقب میں دو چار سنتری موجود رہتے تھے۔ چونکہ راجہ جے پال ان سے راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس لیے انہیں قیدیوں کی طرح زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں نہیں رکھا تھا۔ ان کی خاطر و تواضع کا ایسا انتظام تھا جیسے شاہی مہمانوں کا ہوتا ہے۔ ان کے مطالبے پر کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کوئی مسلمان کرے، یہ انتظام عمران بلاذری کے ہاتھ میں تھا۔ عمران بلاذری ان کے فرار کا بندوبست بھی کر رہا تھا۔ دشواری صرف یہ تھی کہ وہاں سنتری موجود رہتے تھے۔ عمران غزنی کے ان دونوں قیدیوں سے کہتا رہتا تھا کہ وہ راجہ کو جھوٹ موٹ راز کی باتیں بتا کر اس کا اتنا اعتماد حاصل کر لیں کہ وہ ان کے کمرے کے پہرے سے سنتریوں کو ہٹا دے۔

نظام ادریسی اور قاسم بلخی نے سوچ لیا تھا کہ وہ راجہ جے پال کو کیا بتائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ راجہ کو پیش کش کریں گے کہ وہ دونوں اسی کی فوج میں رہیں گے، اور پوری مہارت اور وفاداری سے اس کی فوج کو غزنی کی فوجی قیادت کی جنگی چالوں کے مطابق ٹریننگ دیں گے۔ اس طرح فرار کی صورت پیدا ہو سکتی تھی مگر راجہ جے پال لاہور سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ نئی فوج تیار کر رہا تھا اور دوسری ریاستوں سے بھی فوج اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔ اسے غزنی پر حملہ کرنا تھا۔

اس روز عمران بلاذری غزنی کے دونوں قیدیوں کے کمرے میں گیا تو بھی اس نے دونوں پر زور دیا کہ وہ راجہ کو گمراہ کریں اور اس کے منظور نظر بن جائیں۔ وہ جس وقت ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اس وقت اس کی محبت پر موت جھپٹ رہی تھی۔ رات فاطمہ نے پورا انتظام کر دیا تھا۔ رشی اپنے گھر میں تھی۔

گھر میں تمام افراد موجود تھے۔ انہیں سنکھ اور گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ گلی میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی دھمک بھی سنائی دی۔ بچوں کا شور وغل بھی سنائی دیا۔ رشی لڑکی ہی تھی۔ وہ بھی تماشہ دیکھنے باہر کو دوڑی۔ گلی میں ایک جلوس آ رہا تھا جس کے آگے آگے بڑے مندر کا بڑا پنڈت تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ایک گھنٹی تھی جو وہ بجاتا آ رہا تھا۔

اس کے پیچھے چار پانچ پنڈت اور ان کے بالکے تھے۔ وہ سنکھ اور گھنٹیاں بجا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک خوشنما پالکی تھی جو چار آدمیوں نے اٹھا رکھی تھی۔ پنڈت بھجن گنگناتے آ رہے تھے۔ ان کے جلوس کے پیچھے تماشائیوں کا جلوس تھا۔

رشی اپنے دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بڑا پنڈت اس کے قریب آ رکا اور اس کا نام پوچھا تب رشی پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اسے یاد آیا کہ اس کے باپ اور اس کے بھائی نے اسے پنڈتوں کی نظروں سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام نہ بتایا۔

"اس کا نام رشی ہے"۔ جانے یہ کس کی آواز تھی۔

رشی کی ماں، اس کا باپ اور بھائی بھی باہر آ گئے تھے۔ رشی پیچھے ہٹنے لگی۔ پنڈت کے چہرے پر حیرت اور مسرت کا تاثر تھا۔ رشی اس کے تصوروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"اندرا دیوی نے اسی کو مانگا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔

"نہیں مہاراج!" رشی کی ماں چلاتی ہوئی آگے آئی اور پنڈت اور اپنی بیٹی کے درمیان کھڑی ہو کر بولی "یہ وہ لڑکی نہیں ہے جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں"۔

رشی اپنے دروازے کی طرف پیچھے ہٹنے لگی۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ بڑے پنڈت نے پالکی آگے لانے کو کہا۔ پالکی آگے لا کر رکھ دی گئی۔

"یہ حکم دیوی کا بھی ہے، راجہ کا بھی"۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "اندرا دیوی نے جس کنواری کنیا کو مانگا ہے وہ جس گھر میں رہی اس گھر پر تمام دیوی دیوتاؤں کا قہر نازل ہوگا۔ اسے جس ماں نے جنم دیا ہے وہ ماں کوڑھی ہو کر آبادیوں سے دھتکاری

جائے گی۔۔۔۔ یہ بیٹی تمہاری نہیں یہ دیوی کی امانت ہے۔ ہم اسے لے جا رہے ہیں"۔

رشی کو گھسیٹ کر پالکی میں دھکیلا جا رہا تھا اور وہ روتی چلاتی اور آزاد ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ پنڈتوں کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی نے رومال جتنا ایک کپڑا رشی کی ناک اور منہ پر رکھ کر ہاتھ دبایا۔ رشی تڑپی اور فوراً ہی اس کا جسم ساکن ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کا سر ڈولنے لگا۔ اسے پالکی میں ڈال دیا گیا۔ پھر جس طرح یہ جلوس سنکھ اور گھنٹیاں بجاتا آیا تھا۔ اسی طرح واپس چلا گیا۔

محلے کے لوگ رشی کے ماں باپ کو مبارک دینے لگے کہ دیوی نے ان کی بیٹی کی قربانی قبول کی ہے۔ مذہب کے کٹر پیروکار رشی کے ماں باپ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مگر جن کی اتنی پیاری بیٹی کو پنڈت ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے، ان کے دلوں کا حال کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے کانوں میں ابھی اس بیٹی کی چیخیں گونج رہی تھیں جسے چند ہی دن پہلے اس کے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دیا گیا تھا۔

شام کے بعد عمران بلازی گھر آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد جگ موہن آ گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ رشی کو پنڈت لے گئے ہیں۔ بلازی کو تو جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جگ موہن نے بتایا کہ پنڈتوں کو کسی نے بتایا ہوگا کہ رشی مندر میں نہیں جاتی اور یہی لڑکی قربانی کے لیے موزوں ہے۔

"تم معلوم کر سکتے ہو کہ اسے کہاں رکھیں گے؟"۔ عمران بلازی نے پوچھا۔ "اور اس کی جان کی قربانی کب دیں گے؟ ... معلوم کرو جگ موہن! میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا"۔

"اسے بڑے مندر میں ہی لے گئے ہوں گے"۔ جگ موہن نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ انسان کی قربانی فوراً نہیں دی جاتی کہ کسی کو پکڑا اور اسے مار ڈالا۔ اسے بہت دن پنڈت اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اسے پاک کرتے ہیں، تیار کرتے ہیں اور معلوم نہیں اس پر کیا عمل کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے کہنے لگتی ہے کہ مجھے دیوی

کے چرنوں میں قربان کردو۔۔۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا مگر تم اسے بچا نہیں سکو گے۔ اگر بچا لاؤ گے تو ہم اُسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکیں گے۔ اُسے پھر لے جائیں گے، اور ہمارے ساتھ تمہارے لیے بھی مصیبت آ جائے گی" — وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ذرا سنبھلا تو بولا۔ "میں اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب سے گھن آنے لگی ہے۔"

"تمہارے مذہب میں گھن کے سوا ہے ہی کیا؟" — عمران بلاذری نے کہا — "اپنی مذہبی کتابیں پڑھ کر دیکھ لو۔ بھگوت گیتا، رامائن اور مہابھارت پڑھو۔ یہ خبیث اور بربریت سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں عہد شکنی اور دھوکہ دہی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ دیویاں اور دیوتا جنسی اختلاط کرتے دکھائے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک سے ایک شرمناک بات لکھی ہے۔ عورتوں اور بچوں کے قتل کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر تمہاری بہن کو فوراً قتل کردیں تو زیادہ اچھا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ جب تک زندہ رہے گی پنڈت اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

جگت موہن کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُس کا چہرہ لال ہوتا چلا گیا۔

"تم اپنے پتھر کے خداؤں سے ڈرتے ہو" عمران بلاذری نے کہا — "تم ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے ان کا کوئی ڈر نہیں۔ میں تمہاری دیویوں اور دیوتاؤں سے تمہاری بہن چھین لاؤں گا۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو تمہاری بہن بھی اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔"

"کہاں؟"

"یہ اُس وقت بتاؤں گا" عمران بلاذری نے کہا — "لیکن تم دونوں کو میرا مذہب قبول کرنا پڑے گا۔"

"مجھے منظور ہے" — جگت موہن نے کہا — "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم ہم دونوں کو یہاں سے کہیں دور لے جاؤ تو ہم مسلمان ہو جائیں گے، اور رتی تمہاری بیوی ہوگی۔"

"لیکن میں رتی کو اس لالچ پر نہیں بچاؤں گا کہ اسے اپنی بیوی بناؤں گا" —

عمران بلاذری نے کہا — "میں تمہارے دیوتاؤں کو شکست دینا چاہتا ہوں۔ میں بھیڑیوں کے منہ سے شکار چھیننے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ اس کی خاطر میں جان دینے کو تیار ہوں۔ میں تمہارے راجہ کو بتاؤں گا کہ پتھر کے خدا مسلمان کے سچے خدا کے سامنے کے جان پتھر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔۔۔ تم چلے جاؤ جگت موہن! آرام کی نیند سو جاؤ۔"

جگت موہن چلا گیا۔ عمران بلاذری کی جذباتی کیفیت آگ کی مانند تھی جیسے اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی ہو۔ پہلے وہ غزنی کے دو جنگی قیدیوں کو فرار کرانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ ان کے فرار کو وہ صرف اس لیے ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ وہ قید سے نکل جائیں بلکہ اس لیے کہ راجہ جے پال ان کی خاطر و مدارات مہمانوں کی طرح کر رہا تھا۔ بلاذری کو ایک دو دنوں سے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ ادریزی اور ملکی جو ان میں اور راج محل میں ایسی ایسی خوبصورت اور شوخ لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک بھی ان دونوں کے کمرے میں داخل کردی گئی تو دونوں اپنے ملک اور اپنے مذہب کو بھول جائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ راجہ کی فوج کے ہو کے رہ جائیں گے اور غزنی کی فوج کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔

عمران بلاذری ان کے فرار کے لیے پریشان ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی رتی کا فرار بھی اس کے کندھوں پر آ پڑا۔ وہ رتی کو دل میں بسا چکا تھا۔ اس طرح یہ اس کے لیے ذاتی جذبات کا مسئلہ بن گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اسے اُس نے ایک چیلنج بنا لیا جیسے ہندوؤں کے دیوتاؤں نے مسلمان کے خدا کو للکارا ہو۔ اس طرح اسے اُس نے مذہب کا معاملہ بنا لیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا، سوچتا رہا، حتیٰ کہ اس کا دماغ تھک گیا۔

اس نے اُوپر دیکھا اور اس جذباتی کیفیت میں اسے ایسے لگا جیسے چھت میں ایک ستارہ چمکا ہو۔ اس کے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ گئے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس کی زبان اپنے آپ چل پڑی۔

"خدائے ذوالجلال! میں جو کچھ کر رہا ہوں، تیرے نام پر کر رہا ہوں۔ مجھے ہمت اور استقلال عطا فرما کہ میں کفر کی اس دھرتی پر ثابت کر سکوں کہ تیرا نام برحق ہے، اور تیری

ذات کی ہے۔ میں کوئی گناہ نہیں کر رہا۔ میری نیت میں گناہ ہوتا تو فاطمہ مجھ سے ناراض ہو کر نہ جاتی۔ تو دیکھ رہا تھا کہ اس دلکش لڑکی نے مجھے کیسے کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا اور میں کس طرح اس میں پورا اترا تھا۔ مجھے روشنی دکھا میرے پروردگار! میری مدد کر۔ اگر میں اپنی ذات کے لیے کچھ کر رہا ہوں تو میری جان لے لے۔ مجھے گناہ کے لیے زندہ نہ رہنے دے۔ اپنے نام کی لاج رکھ لے خدائے ذوالجلال!"

اُس نے منہ پر ہاتھ پھیرے تو اس کا ذہن خالی ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں بگولا سا اُٹھا۔ وہ بہت تیزی سے کوٹھڑی کے بکس تک گیا۔ بکس کھولا اور اس میں سے خنجر نکال کر اپنے کرتے کے نیچے ناف میں اُڑس لیا۔ وہ اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

اُس کی چال ایسی تھی جیسے اس کے قدم خود بخود اُٹھ رہے ہوں اور اُس کا دماغ کسی اور طرف جا رہا ہو۔ وہ گلیوں کے موڑ مڑتا گیا حتیٰ کہ گلیاں ختم ہو گئیں۔ وہ درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ وہ رُک گیا۔ اُس نے پگڑی کھول کر اس طرح باندھ لی کہ اس کا چہرہ بھی ڈھانپا گیا۔ وہ چل پڑا۔ اندھیرے میں بھی اُسے مندر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جاسوس تھا۔ اُسے شہر کے کونے کھدرے سے واقفیت تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑا پنڈت مندر کے ساتھ رہتا ہے۔ رُشی یہیں ہو سکتی تھی۔

عمران بلاذری رُک گیا اور کچھ سوچا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ رُشی اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ واپس اپنے گھر نہیں جائے گا، سیدھا یہیں سے پشاور کا رُخ کرے گا...... اُس نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ یوں رُک گیا جیسے کسی غیر مرئی انسان نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا ہو۔ اسے نظام اور یزی اور قاسم طبنی کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ سوچ بھی بیدار ہو گئی کہ رُشی کو بھگا لے جانا اس کی اپنی ذات کے لیے ہوگا۔ اُس کا اصل فرض ان دونوں قیدیوں کو رہا کرانا تھا۔

وہ پریشان ہو گیا اور آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے یہ احساس ہو گیا کہ اُسے احتیاط کرنی ہے۔ وہ دبے پاؤں چلتا مندر تک پہنچ گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ وہ گھوم کر اُدھر گیا جدھر پنڈت کا گھر تھا۔ یہ مندر ہی کا حصہ تھا۔ وہ دروازے سے چند قدم

دُور تھا کہ دروازہ کھلا۔ کمرے کی روشنی باہر آئی، اور اس روشنی میں اُسے ایک عورت اندر سے نکلتی دکھائی دی۔ پنڈت بھی باہر آیا۔ بلاذری بیٹھ گیا۔ وہاں درخت اور پودے تھے۔ وہ پاؤں پر سرکتا آگے ہوا اور ایک پودے کی اوٹ میں آ گیا۔ اس نے عورت کو پہچان لیا۔ وہ فاطمہ تھی۔

"اب اطمینان سے جاؤ" پنڈت نے اُسے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کام ہو گیا ہے۔"

"اگر میں اُسے یہاں دیکھ لیتی تو مجھے اطمینان ہو جاتا کہ میرا کام ہو گیا ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "دیکھیں، میں آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو کیسی قیمت دے رہی ہوں۔"

"— تو تم پھر اُسی وہم میں پڑ گئی ہو۔" پنڈت نے کہا۔ "— اُسے میں یہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُسے شیلوں کے مندر میں پہنچا دیا ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ اُسے کل ہی ختم کر دیا جائے تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہمارا ایک خاص طریقہ ہے۔ یہ قربانی پہلی بار نہیں دی جا رہی۔ میں اپنی زندگی میں ایسی چار لڑکیوں اور دو بچوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ اس لڑکی کو ہم کم از کم ایک چاند شیلوں کے مندر میں رکھیں گے۔ اسے اس طرح تیار کریں گے کہ اس کی جوانی ہی بدل جائے گی، پھر یہ اپنی زبان سے کہے گی کہ مجھے قربان کر دو۔ یہ اپنی زبان سے قربانی کا مقصد بیان کرے گی...... میں نے تمہارا مقصد پورا کر دیا ہے۔ وہ

فاطمہ کے پیچھے چلا گیا۔ آگے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ عمران فاطمہ کی دلیری پر حیران ہو رہا تھا۔ اُس کے غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ اُسے قتل کرنے پر تیار ہو گیا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ فاطمہ بہت تیز چلی جا رہی تھی اور عمران بلاذری اسی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ وہ اس کے قریب ہو گیا۔ فاطمہ رک گئی۔

"تمہارا ناپاک مقصد پورا نہیں ہوگا فاطمہ!" — عمران نے اُسے کہا — "تم نے اس لڑکی کو اپنے راستے سے ہٹانے کا جو اوچھا طریقہ استعمال کیا ہے اس کی سزا تم اسی دنیا میں بھگتو گی۔"

"اوہ...!" فاطمہ گھبرا گئی اور بولی — "میں ڈر گئی تھی کہ کوئی اور ہے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"جہاں سے تم آ رہی ہو" — عمران نے کہا — "میں چاہوں تو تمہیں یہیں قتل کر سکتا ہوں۔ تمہیں غائب کر سکتا ہوں۔ تمہارے خاوند کو بتا سکتا ہوں کہ تمہاری کرتوت کیا ہے۔ کیا تم اس طرح مجھ پر قبضہ کر سکو گی؟"

فاطمہ تو جیسے مر ہی گئی تھی۔

"بولو، جواب دو" — عمران بلاذری نے گرج کر کہا۔

"ایک ہندو لڑکی کے لیے تم اتنا پریشان ہو رہے ہو؟" — فاطمہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میری بات غور سے سن لو" — عمران نے کہا — "پھر کبھی تم اس مندر میں آئیں تو زندہ واپس نہیں جا سکو گی۔ میرے گھر میں آؤ گی تو تمہاری لاش جھاڑیوں میں ملے گی۔ میں تمہیں گھر سے باہر نہ دیکھوں۔ اگر تم نے اس پنڈت کو یا کسی اور کو بتا دیا کہ میں تمہیں یہاں ملا تھا تو تمہارا انجام بڑا ہی بھیانک ہوگا۔"

"میں نے جو کچھ کیا ہے تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا ہے" — فاطمہ اس کے پاؤں میں گر پڑی — "میں نے تمہاری ذات میں اپنی نجات دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہندو لڑکی کو تم نے اپنی عشرت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس کے

اتنے دیوانے ہو۔"

"یہاں سے غائب ہو جاؤ۔"

"مجھے بخش دو عمران!" فاطمہ نے روتے ہوئے کہا — "ایک ہندو لڑکی کی خاطر ایک مظلوم مسلمان لڑکی کو نہ دھتکارو۔"

"تم مظلوم نہیں ظالم ہو" — عمران بلاذری نے اُسے اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ پیچھے کو گر پڑی — "میں تمہیں بخش سکتا ہوں، تمہیں خدا نہیں بخشے گا۔ تم تڑپ تڑپ کر مرو گی۔ عمر کا پل پل سزا بھگتو گی۔ راتوں کو چین کی نیند نہیں سو سکو گی۔"

عمران اُسے زمین پر بیٹھا چھوڑ کر چل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اُسے فاطمہ کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فاطمہ نے اُسے پکارا "عمران!"

عمران بلاذری رک گیا۔ فاطمہ دوڑی آ رہی تھی۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ بولی — "مجھے گھر پہنچا دو۔ ڈر آتا ہے۔ میں نے ابھی کچھ دیکھا ہے۔ کوئی چیز تھی۔ روشنی جلی تھی۔ اس میں مجھے کوئی شے نظر آئی اور روشنی کے ساتھ ہی غائب ہو گئی۔ تم نے روشنی دیکھی تھی؟ بجلی چمکی تھی!"

"ایک عورت کو اس تنہائی میں ڈراتے مجھے شرم آتی ہے" — عمران نے کہا — "لیکن یہ جان لو کہ بے گناہ لڑکی کا خون تم پر اسی طرح بجلی کی طرح چمکتا اور کوندتا رہے گا۔"

"مجھے میرے گھر پہنچا دو" — فاطمہ نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں اکیلی نہیں پہنچ سکوں گی۔ مجھ پر رحم کرو عمران!"

عمران اُس کے ساتھ چل پڑا۔ فاطمہ نے اُس کا ایک بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح ادھر اُدھر دیکھتی اور چلتی جا رہی تھی۔ تمام راستہ عمران خاموش رہا۔ فاطمہ ہچکیاں لیتی، چونکتی اور کانپتی رہی۔ اس کا گھر آ گیا تو عمران رک گیا۔

"میں کیا کروں عمران؟" فاطمہ نے اس طرح پوچھا جیسے یخ ٹھنڈ سے اس کے دانت بج رہے ہوں۔

"گناہ کا کفارہ ادا کرو" — عمران نے کہا۔

"کیسے؟"

"جب ارادہ کرو گی تو مجھے بتانا"۔ عمران نے کہا۔ "میں کوئی طریقہ بتا دوں گا۔ اب چلی جاؤ"۔

عمران اپنے گھر کو چل پڑا۔

اگلے روز عمران بلاذری، راج محل میں گیا اور حسب معمول نظام اوریزی اور قاسم لمغی کو ناشتہ دیا۔ اُسے پتہ چلا کہ راجہ جے پال آگیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد راجہ نے دونوں قیدیوں کو بلا لیا۔ پچھلے باب میں سنایا جا چکا ہے کہ راجہ کے ساتھ ان کی کیا باتیں ہوئیں۔ انہوں نے عمران بلاذری کی ہدایت کے مطابق راجہ جے پال کو محمود غزنوی کی جنگی چالوں کے متعلق بے بنیاد باتیں بتائیں اور یہ بھی کہا کہ وہ راجہ کی فوج کو عملی طور پر یہ چالیں اور ان کا توڑ سکھا سکتے ہیں۔ انہوں نے شرط پیش کی کہ انہیں قید سے رہائی نہ دی جائے، صرف سنتری ہٹا دیئے جائیں تاکہ قید کا تصور ختم ہو جائے۔ انہوں نے راجہ پر ایسا اعتماد پیدا کر لیا کہ راجہ نے اُسی وقت ان کے کمرے پر پہرہ دینے والے سنتریوں کو ہٹا دینے کا حکم دے دیا۔

نظام اوریزی اور قاسم لمغی واپس اپنے کمرے میں آئے تو انہوں نے عمران بلاذری کو خبر سنائی کہ راجہ جے پال کو اطلاع ملی ہے کہ سلطان سبکتگین فوت ہو گیا ہے اور اب اس کا بیٹا محمود سلطان ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ راجہ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد غزنی پر حملہ کرے گا اور وہ خوش ہے کہ سبکتگین مر گیا ہے۔ اسے توقع ہے کہ وہ محمود کو آسانی سے شکست دے سکے گا۔

اس خبر نے تینوں کو پریشان کر دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ سبکتگین کی وفات کا غزنی کی فوجی قیادت پر کیا اثر پڑے گا۔ اوریزی اور لمغی نے محمود کو ایک یا دو دستوں کی کمان کرتے اور لڑتے دیکھا تھا۔ اس حد تک وہ مطمئن تھے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ محمود سپہ سالاری کی کتنی کچھ قابلیت رکھتا ہے، اور وہ اپنے باپ کی طرح کم فوج سے اپنے سے زیادہ لشکر کو شکست دے سکے گا یا نہیں۔ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ قید سے فوراً فرار ہو کر غزنی پہنچ جاتے اور سلطان محمود کو راجہ جے پال کے عزائم اور جنگی طاقت سے آگاہ کیا جاتے۔

عمران بلاذری نے انہیں رتی کے متعلق بتا دیا کہ یہ ہندو لڑکی اُسے دل و جان سے چاہتی ہے اور وہ اسلام قبول کرنے کو تیار تھی مگر پنڈتوں نے اُسے انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ بلاذری نے انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ ان دونوں کو لاہور سے نکال دے گا لیکن اس لڑکی کو پنڈتوں کے چنگل سے ضرور آزاد کرائے گا۔ وہ اسے بھی اپنا فرض اور چیلنج سمجھتا تھا۔

کمرے کے سنتری ہٹائے جا چکے تھے۔ عمران بلاذری نے اُسی رات انہیں فرار کرانے کا ارادہ کر لیا۔

عمران ان کے لیے رات کا کھانا معمول سے کچھ دیر بعد لے گیا۔ کچھ وقت ان کے پاس بیٹھا رہا، پھر برتن اٹھائے، راج محل کے محافظوں وغیرہ کے سامنے گزرا۔ کہیں رکا، کہیں گپ شپ لگائی اور سب کے سامنے یوں باہر نکلا جیسے اپنے گھر کو چلا گیا ہو، مگر وہ صرف باہر نکلا تھا، گھر نہیں گیا تھا۔ وہ اُس طرف چلا گیا جدھر باغ تھا۔ وہاں رات کو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ باغ اور راج محل کے احاطے کے درمیان دیوار تھی جو اتنی بلند تھی کہ اکیلا آدمی اس میں پھلانگ سکتا تھا۔ دن کے وقت عمران نے دونوں قیدیوں کو کمرے کی کھڑکی کی یہ دیوار دکھائی تھی۔ اس نے ایک درخت بھی انہیں دکھایا تھا جو دیوار سے باہر تھا۔ اس کی ٹہنیاں دیوار پر آئی ہوئی تھیں۔

مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق نظام اوریزی اور لمغی اپنے کمرے سے نکلے۔ اور چھپتے چھپاتے کمرے سے دور چلے گئے۔ راج محل میں تو جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ ملازم بھاگ دوڑ رہے تھے۔ محل کے اندر رقص ہو رہا تھا۔ سازوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ بگھیاں، گھوڑا گاڑیاں آ رہی تھیں۔ شاید دوسری ریاستوں کے راجے بھی آئے ہوئے تھے۔ جشن کا سا سماں تھا۔ باہر بھی جگہ جگہ بڑے شعلوں والی مشعلیں جل رہی تھیں۔ اوریزی اور لمغی کے لیے یہ مشعلیں مشکل پیدا کر رہی تھیں۔ وہ دیواروں کی اوٹ میں جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ احاطے کی دیوار کی وہ جگہ ابھی دور تھی جہاں انہیں پہنچنا تھا۔ وہ جدھر جاتے کوئی نہ کوئی آدمی سامنے سے گزرتا نظر آجاتا۔

وہ اُس مقام تک پہنچ گئے۔ وہاں تک کسی مشعل کی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ عمران بلاذری کی ہدایت کے مطابق ادریسی نے ایک پتھر اٹھا کر دیوار پر آہستہ آہستہ دو چار مرتبہ مارا۔ اس کے فوراً بعد دیوار سے ایک رسہ آیا۔ دونوں قیدی باری باری رسے سے اوپر چڑھ گئے۔

"رسہ باہر پھینک دو" — انہیں نیچے سے عمران بلاذری کی آواز سنائی دی — "اور اس درخت سے نیچے آجاؤ۔"

دونوں نے باری باری درخت کی ٹہنیاں پکڑیں اور جھولتے ہوئے دیوار سے پرے چلے گئے۔ انہوں نے ٹہنی کو پکڑا اور نیچے اُتر گئے۔ انہوں نے رسہ اٹھا کر پھینکا۔ عمران اُن کے لیے لمبے چغے لے آیا تھا جن میں وہ کندھوں سے ٹخنوں تک ڈھانپے گئے۔ راج محل کے باہر کی دُنیا سو گئی تھی۔ تینوں اطمینان سے خطرے کے علاقے سے دُور چلے گئے اور عمران انہیں اپنے گھر لے گیا۔

"یہاں سے ہمیں جلدی نکل جانا چاہیے" — ادریسی نے کہا — "گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے؟"

"تم یہاں سے اتنی جلدی نہیں جا سکو گے" — عمران نے کہا — "صبح جب راجہ جے پال کو تمہارے فرار کی اطلاع ملے گی تو وہ تمہارے تعاقب کا حکم دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ بھی نہ کرے۔ وہ بہت مصروف ہے۔ میری نظریں اور میرے کان اُسی پر لگے رہتے ہیں۔ غزنی سے یہ جو دوسری شکست کھا کر آیا ہے، اس نے اسے باؤلا کر رکھا ہے۔ ابھی تک یہ فوج کی کمی پوری نہیں کر سکا۔ پوری قوم اس کی مدد کر رہی ہے لیکن یہ صرف مالی مدد ہے۔ دوسرے راجے مہاراجے اسے اپنی فوجیں دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس نے ساز و سامان تو بہت جمع کر لیا ہے لیکن ضرورت فوج کی ہے۔ یہاں کا دستور یہ ہے کہ کوئی راجہ دو بار شکست کھا جائے تو اُسے اپنے جانشین کے حق میں راج سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ راجہ جے پال کے دو حملے ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ہے جس نے اسے تیسرے حملے کی اجازت دے دی ہے لہٰذا اب راجہ جے پال ہر قیمت پر فتح حاصل کرنے کے انتظامات کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس مصروفیت

میں وہ تمہارے فرار کی پرواہ ہی نہ کرے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شہر کی تلاشی اور تمہارے تعاقب کا حکم دے دے۔ مجھے کل اُس کا ردِعمل معلوم کرنا ہے۔ میں تمہیں اس کے مطابق یہاں سے نکالوں گا یا کچھ دن یہیں چھپائے رکھوں گا۔"

نظام اور ادریسی اور قاسم بلخی جاسوس نہیں تھے۔ فوج کے عہدیدار تھے۔ میدان کے مجاہد تھے اور شب خون مارنے کی مہارت رکھتے تھے۔ بلاذری تجربہ کار جاسوس تھا، اس لیے اس کی سوچ ان دونوں سے مختلف تھی۔ اُس نے انہیں کہا — "اگر تمہیں یہاں زیادہ دن رکنا پڑا اور راجہ جے پال نے کوچ میں جلدی کی تو ہم تینوں اس کے کسی نہ کسی ذخیرے کو آگ لگا دیں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟"

"کیا ممکن نہیں ہو سکتا؟" — عمران نے جواب دیا — "یہ کام اس راجہ کے دوسرے حملے سے پہلے ہو سکتا تھا مگر یہاں اپنے جو آدمی تھے وہ آپس میں لڑ مرے۔ ان کی لاشوں کے ساتھ ایک لڑکی کی بھی لاش ملی تھی۔ ان کی آپس کی لڑائی کی وجہ شاید یہی تھی۔ ہم اتنے ناکام ہوئے کہ غزنی بروقت اطلاع نہ بھیج سکے کہ حملہ آ رہا ہے۔"

"تم بھی تو ایک لڑکی کے چکر میں پڑ گئے ہو۔"

"لیکن میں اپنے فرض کو اس چکر میں نہیں ڈالوں گا" — عمران بلاذری نے کہا — "میں ایک لڑکی پر غزنی کی عظمت کو قربان نہیں کروں گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں تم دونوں کو اس لڑکی پر قربان کر دوں لیکن یہ انتظام ضرور کروں گا کہ راجہ جے پال کا لشکر غزنی پر حملے کے لیے جائے تو غزنی سے دُور پشاور کے قریب غزنی کی فوج راجہ کا استقبال کرے۔ میرے پاس خبر بھیجنے کا انتظام موجود ہے۔"

"سوچنے والی بات یہ ہے کہ سلطان محمود پوری فوج کی کمان کر سکے گا یا نہیں؟" — قاسم بلخی نے کہا — "اُسے بہت جلدی خبر مل جانی چاہیے۔ وہ پڑوس کی مسلمان ریاستوں کے جھنجھٹ میں نہ پڑا ہوا ہو۔"

"غزنی کے حالات کا ہمیں کوئی علم نہیں" — عمران بلاذری نے کہا۔

سلطنتِ غزنی کے سامنے محدوش تھے۔ سبکتگین کی وفات نے اُن مسلمان حکمرانوں کو پھر سے بیدار کر دیا تھا جنہیں سبکتگین نے دبا لیا تھا۔ اُن کی نظریں غزنی پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر خانہ جنگی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ محمود میں وہ صلاحیت نہیں جو اُس کے باپ میں تھی، مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ سبکتگین عمل سے پہلے سوچ بچار زیادہ کرتا تھا۔ اپنے پڑوس کے مسلمان حکمرانوں سے وہ لڑائی کی بجائے دوستی چاہتا تھا۔ محمود سوچ بچار میں تیز اور عمل میں تیز تر تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں تھا۔ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔

غزنی کی سلطنت کی کیفیت یہ تھی کہ کاشغر میں ایلخانیوں کی حکومت تھی۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ دوسری طرف بخارا میں سامانی حکمران تھے۔ یہ بھی مسلمان تھے۔ تیسری طرف آل زیار کی ریاست تھی، اور چوتھی طرف غوریوں کی بادشاہی تھی۔ سلطنتِ غزنی ان میں گھری ہوئی تھی۔ ان تمام ریاستوں کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی جیسے ایک مملکت کے صوبے ہوں مگر سب کی نظریں غزنی پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ متحد نہیں تھے۔ وہ اسلام کے رشتے کو بھی بھلا بیٹھے تھے۔

ایک روز اُسے اطلاع ملی کہ بخارا کے بادشاہ نے خراسان کا علاقہ اپنے ایک امیر توزدن بیگ کو دے دیا ہے۔ خراسان سلطنتِ غزنی کا علاقہ تھا۔ سلطان محمود نے شاہِ بخارا کو پیغام بھیجا کہ ہم تو اتحادی تھے، آپ کی اس کارروائی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ہم دوستی ختم کر دیں۔ آپ خراسان سے ہاتھ اُٹھا لیں تاکہ ہمارا اتحاد برقرار رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مہاراجوں کی متحدہ فوج ہم پر حملے کے لیے آ رہی ہے۔

بخارا سے ایسا جواب آیا جیسے سلطان محمود غزنوی کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اُسے لکھا گیا کہ بلخ، ترمذ اور ہرات کے علاقے آپ کے پاس ہیں۔ ہم باقی علاقے اُن امرا میں تقسیم کر رہے ہیں جو ہمارے وفادار ہیں۔ سلطان محمود نے صلح صفائی کی ایک اور کوشش یوں کی کہ اپنے ایک حاکم ابوالحسن جموری کو بیش قیمت تحائف دے کر بخارا بھیجا۔ اس نے ان الفاظ کا پیغام لکھا کہ میں نے یقین نہیں کیا کہ بخارا کے دربار سے مجھے یہ توہین آمیز جواب ملا ہے، نہ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے خاندانِ سامانی کی دوستی

ترک کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

اس پیغام کا کوئی جواب نہ آیا اور سلطان محمود کا ایلچی ابوالحسن جموری بھی واپس نہ آیا۔ تھوڑے عرصے بعد سلطان محمود کے ایک جاسوس نے اُسے بتایا کہ ابوالحسن جموری کو بخارا کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔ سلطان محمود نے یہ خبر سنتے ہی اپنے منتخب دستوں کو خراسان کے مرکزی شہر نیشاپور کی طرف پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ یہ بہت ہی تیز پیشقدمی تھی۔ نیشاپور کے امیر توزدن بیگ کو اُس وقت پتہ چلا جب سلطان محمود کی فوج شہر کے مضافات میں پہنچ چکی تھی۔ توزدن بیگ بغیر مقابلے کے شہر سے نکل گیا اور بخارا جا کر شاہ منصور کو اطلاع دی۔ شاہ منصور سلطان محمود کے مقابلے کے لیے آیا۔

توزدن بیگ نے حکمرانی کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ اُس نے قوم کے ایک غدار امیر فائق کو جال میں پھانس لیا۔ یہ وہی امیر فائق ہے جو سلطان سبکتگین کی زندگی میں بھی خانہ جنگی کا باعث بنا تھا۔ آخر اسے بھاگنا پڑا تھا۔ اب وہ پھر توزدن بیگ کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ توزدن سازشی ذہن کا آدمی تھا۔ اُس نے امیر فائق کو ساتھ ملا کر اپنے محسن شاہِ بخارا کو گرفتار کر لیا اور اُس کی آنکھیں نکال دیں۔ شاہ بخارا کا چھوٹا بھائی عبدالملک ابھی لڑکپن کی عمر میں تھا۔ توزدن اور فائق نے اُسے سامانی گدی پر بٹھا لیا۔

یہ لوگ جو بظاہر سلطان محمود کے خلاف متحد تھے، اندر سے آپس میں بھی پھٹے ہوئے تھے۔ محمود غزنوی نے ان کی فوج کو اپنی پسند کے میدان میں گھسیٹ لیا۔ غداروں نے مقابلہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سلطان محمود کے عتاب کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ توزدن بیگ ایسا بھاگا کہ پھر اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ امیر فائق ایسا بیمار پڑا کہ چند دنوں بعد مر گیا۔

کاشغر کا حکمران ایلخ خان تھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ جنگی اور سیاسی حالات کیا ہیں۔ وہ یہی جان سکا کہ خانہ جنگی ہو رہی ہے جس سے اُسے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ آگے بڑھا اور شاہ بخارا کے چھوٹے بھائی عبدالملک کو قتل کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ عبدالملک کے قتل سے ایلخ خان کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ سلطان محمود قہر اور عتاب سے سب پر چھا گیا تھا۔ اُس نے بلخ اور

خراسان کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا۔

اس خانہ جنگی کی روئیداد اتنی مختصر نہیں جتنی سنائی گئی ہے۔ یہ داستان بڑی ہی طویل اور بڑی ہی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے۔ سلطان محمود کی اُس فوج کو خاصا جانی نقصان پہنچا جو وہ ہندوستان کے مہاراجوں کا حملہ روکنے اور جوابی حملہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اُس کے خلاف جن فوجوں کو لڑایا گیا وہ بھی مسلمان فوجیں تھیں جن میں اتحاد ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی جو غدار اور باغی امرا بھاگ گئے تھے، ان کے گھروں سے یہودی، عیسائی اور ہندو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ وہاں جو لوگ پکڑے گئے، انہوں نے بتایا کہ ان حکمرانوں اور امرا کو غیر مسلموں سے مدد اور شہ ملتی تھی۔ ہندوستان سے ہندو لڑکیاں قرامطی فرقے کے سربراہ بھیجا کرتے تھے۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا تھا مگر اس کے عقیدے غیر اسلامی تھے۔ یہ فرقہ عیسائیوں کی تخلیق تھا۔ یہی عیسائی سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبی کہلانے لگے تھے۔

راجہ جے پال کا جاسوسی نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُسے صرف یہ اطلاع ملی کہ سبکتگین فوت ہو گیا ہے۔ غزنی کے دیگر حالات کا اُسے علم نہیں تھا۔ اگر وہ اُس وقت حملہ کر دیتا جب سلطان محمود خانہ جنگی میں الجھا ہوا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سلطان محمود کے دشمن جے پال کی مدد کرتے۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ اس دشمن کی آنکھیں اور کان بند رہے۔

اس کے مقابلے میں راجہ جے پال کی سب سے بڑی چھاؤنی لاہور میں سلطان محمود غزنوی کے جاسوس بیدار اور سرگرم تھے۔ عمران رات کو غزنی کے دونوں قیدیوں — نظام اور یزی اور قاسم بلخی — کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اگلی صبح وہ حسبِ معمول راج محل کے احاطے کے اُس کمرے میں جہاں یہ دونوں قیدی رہتے تھے، ناشتہ لے کر گیا اور کمرہ خالی دیکھ کر دروازے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے تین چار ملازموں سے پوچھا کہ قیدی کہاں چلے گئے ہیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ دروازے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ کچھ دیر بعد راجہ جے پال کا بلاوا آ گیا۔ عمران بلاذری نے بتایا کہ وہ ناشتہ لے کر آیا تو قیدی یہاں نہیں تھے۔

"مجھے مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے تھا" — راجہ جے پال کو قیدیوں کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی تو اُس نے کہا۔ "میں نے ان کے کمرے سے پہرہ ہٹا کر غلطی کی تھی... وہ شہر میں نہیں ہو سکتے۔ تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دو۔ پشاور کی طرف سوار دوڑا دو۔ پشاور سے غزنی کی طرف نکلنے والے راستوں کی ناکہ بندی کے لیے قاصد روانہ کر دو۔"

"مہاراج!" — اُس کے وزیر نے کہا۔ "دو قیدیوں کے فرار سے کیا نقصان ہو گیا ہے؟ آپ کی توجہ کوچ کی تیاری پر رہنی چاہیئے۔ دو قیدیوں کے لیے اتنی زیادہ نفری کو اِدھر اُدھر دوڑا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

"ان کے فرار کا مجھے کوئی افسوس نہیں" — راجہ نے کہا۔ "میں اُن سے جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ کر لیا ہے۔ میں انہیں سزا دینا چاہتا ہوں۔ انہیں پکڑنے کا بندوبست بہت جلدی کرو۔"

اس کے ساتھ ہی راجہ جے پال کو یہ خبر سنائی گئی کہ انسانی قربانی کے لیے ایک لڑکی منتخب کر لی گئی ہے اور تقریباً پندرہ دنوں بعد اس کی گردن کاٹ کر اس کے خون کا تلک راجہ کے ماتھے پر لگایا جائے گا اور یہ بھی بتایا گیا کہ اب وہ جب چاہے غزنی پر حملے کے لیے کوچ کر سکتا ہے۔ فتح اُسی کی ہو گی۔

"ہم بہت جلد کوچ کریں گے" — راجہ نے کہا۔

شام کو جب عمران اپنے گھر آیا تو وہ مطمئن اور خوش تھا۔ اس پر کسی نے شک نہیں کیا تھا۔ اور یزی اور بلخی اُس کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ انہیں جلدی یہاں سے نکالے۔ عمران نے انہیں بتایا کہ اب وہ کئی دنوں تک اس کمرے سے نہیں نکل سکیں گے کیونکہ شہر کے اردگرد ناکہ بندی ہو گئی ہے۔

دروازے پر مخصوص قسم کی دستک ہوئی۔ عمران بلاذری نے مسکرا کر کہا۔ "دوست آئے ہیں۔ کوئی خبر لائے ہوں گے۔" اس نے جا کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ دو آدمی اندر آئے۔ عمران نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ ان دونوں کو وہ اور یزی اور بلخی کے کمرے میں لے گیا اور تعارف کرایا۔ یہ دونوں آدمی پنجاب کے رہنے والے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ راجہ جے پال بہت جلد کوچ کر رہا ہے۔ اب دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو غزنی روانہ کرنا ہے جو وہاں راجہ جے پال کے کوچ کی قبل از وقت اطلاع پہنچا دے، دوسرا کام یہ ہے کہ شہر سے باہر تمام فوجوں کی رسد، خیمے اور بیل گاڑیاں جمع ہیں۔ آج اس ذخیرے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اسے آگ لگانی ہے۔

"اس کا کیا انتظام ہے؟" — عمران نے پوچھا — "لاہور میں ایسے انتظام کی کبھی بات نہیں ہوئی۔"

"اس سے پہلے لاہور والوں نے کیا کارنامہ کر دکھایا تھا؟" — ایک جاسوس نے کہا — "ایک ہندو لڑکی کے پیچھے آپس میں لڑ مرے تھے ۔۔۔۔ اب بھٹنڈہ والوں نے انتظام کیا ہے۔ یہاں کے آدمیوں کو بتانا ضروری ہے۔"

بھٹنڈہ راجہ جے پال کی راجدھانی تھی اس لیے غزنی کے زیادہ تر جاسوس وہیں رہتے تھے۔ جب سے راجہ جے پال نے غزنی پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس نے لاہور کو فوج کا مرکز اور مستقر بنا لیا تھا۔ غزنی کے جاسوسوں کے ساتھ مقامی آدمی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر جوان سال اور نوجوان تھے۔ یہ ہندو راج کے ستائے ہوئے لوگ تھے، اور غزنی کے حکمرانوں کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ اب لاہور میں راجہ جے پال اپنے لشکر کے لیے اپنی رسد اور دیگر سامان جمع کر رہا تھا۔ بھٹنڈہ کے جاسوسوں نے اس ذخیرے کی تباہی کا یہ انتظام کیا تھا کہ بیس پچیس گھوڑسوار عام مسافروں کے بھیس میں لاہور کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔ وہ اکٹھے نہیں آئے، ایک دوسرے سے دور دور رہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ لاہور کے آدمیوں کو صرف اطلاع دینا ضروری تھا۔

ایک ہی منزل کے مسافر

فوجی ساز و سامان کے اس ذخیرے میں جو راجہ جے پال نے غزنی پر حملے کے لیے لاہور کے مضافات میں ڈھیر کر رکھا تھا، جلدی آگ پکڑنے اور پھیلانے والے ڈھیر خیموں کے تھے۔ یہ ہزارہا خیمے تھے جنہیں لپیٹ کر ڈھیروں کی صورت میں رکھا گیا تھا۔ فوج کے ساتھ رسد لے جانے کے لیے بیل گاڑیاں تھیں یہ ایک دوسری کے ساتھ لگا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بے انداز سامان تھا جو کم و بیش ڈیڑھ میل لمبے اور چار پانچ فرلانگ چوڑے رقبے میں پڑا تھا۔ اس رقبے میں درختوں کی بہتات تھی۔

راجہ جے پال کو جلدی کوچ کرنا تھا۔ اس لیے یہ سامان تیاری کی حالت میں باہر ہی پڑا رہنے دیا گیا تھا۔ اس پر پہرے کا معمولی سا انتظام تھا۔ گشتی سنتری گھوڑوں پر اس کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ فوجی سامان کو کسی نے کوئی نقصان پہنچایا ہو یا کوئی سامان چوری ہو گیا ہو۔ خطرہ صرف مسلمانوں کی طرف سے تھا لیکن مسلمانوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ انہیں ہندو اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ یہ تو راجہ جے پال کو معلوم تھا کہ اس کی ریاست میں غزنی کے جاسوس موجود ہیں لیکن اسے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمان اُس کی جنگی قوت کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اُس نے اتنے بڑے فوجی ذخیرے کی حفاظت کا وہ انتظام نہیں کیا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔

ہندو رعایا کا تو اُسے ڈر ہی نہیں تھا۔ اس نے پنڈتوں کے ذریعے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اتنی نفرت پھیلا رکھی تھی کہ ہر ہندو یہ خواہش لیے ہوئے تھا کہ ان

کا راجہ مسلمانوں کے ملکوں پر حملے کرے اور مسلمانوں کو غلام بنا کر ہندو مت میں لایا جائے۔

اس مقصد کے لیے ہندوؤں نے اپنے راجہ کو مالی مدد دی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر روپیہ پیسہ اور سونا دیا تھا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ ہندو عورتیں سوت کات کر بازاروں میں بیچتی اور آمدنی راجہ کے خزانے میں جمع کرا دیتی تھیں۔ لہٰذا غزنی پر حملے کے لیے یہ جو فوجی سامان کے انبار اکٹھے کیے گئے تھے ان میں ہندو رعایا کا خون پسینہ شامل تھا۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی بھی ہندو اس سامان کو نقصان پہنچائے گا۔

نقصان پہنچانے والے لاہور پہنچ چکے تھے۔ یہ شیطانوں سے لڑ جانے والے مومن تھے، آتش نمرود میں کود جانے والے عاشقانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ اپنے دشمن بادشاہ کا تختہ الٹنے کے لیے بادشاہ ہونا ضروری نہیں ہوتا اور فوج کو نقصان پہنچانے کے لیے فوج کی ہی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایمان مضبوط ہو تو مضبوط قلعے بھی سر کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اس مذہب کے سرفروش تھے جو محمد بن قاسم عرب کی سرزمین سے اس دھرتی میں لایا تھا۔ وہ ہندوستان میں اسلام کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے پروانے تھے جو اسے اپنے خون سے جلتا رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔

وہ آئے گھوڑوں پر تھے۔ ان کے دو ساتھی شام کو عمران بلاذری اور لاہور کے دو تین اور ذمہ دار جاسوسوں کو لاہور میں اپنی موجودگی اور مقصد کی اطلاع دے کر شہر سے نکل گئے تھے۔ وہ غریبانہ سے کپڑوں میں ملبوس ذریعہ معاش کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے مسافر لگتے تھے۔ رات کو جب شہر سو گیا تھا وہ شہر سے دور ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اس مقصد پر جس کی خاطر وہ آئے تھے، جانیں قربان کرنے کا حلف اٹھایا۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ انہیں ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھنے کی امید کم ہی تھی۔ وہ زندہ واپس جانے کے لیے نہیں آئے تھے۔

گھوڑے کچھ دور باندھ کر وہ ڈیڑھ میل لمبے ذخیرے کی مختلف اطراف کو دو دو ہو کر پھیل گئے۔ ان کے پاس چھوٹے مشکیزے تھے جو مسافر اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ پانی کے لیے رکھتے ہیں مگر ان کے مشکیزوں میں پانی نہیں تیل تھا اور ان کے

پاس آگ لگانے والا سامان بھی تھا۔

ایک جگہ سے دو گھوڑ سوار سنتری آگے چلے گئے تو وہ جانباز پیٹ کے بل رینگتے آگے گئے اور خیموں کے دو ڈھیروں کے درمیان جا کر رک گئے۔ انہوں نے مشکیزوں کے منہ کھولے اور تیل خیموں کے ڈھیروں پر چھڑک دیا۔ پیشتر اس کے کہ سنتریوں کو تیل کی بو آتی، اسے آگ لگا دی گئی۔ عین اس وقت ایک اور جگہ سے شعلہ اٹھا۔ سنتریوں نے شعلے دیکھے تو انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ وہ آگ کی دونوں جگہوں تک آئے تو کئی اور جگہوں سے شعلے اٹھے۔ چار جانبازوں نے بیل گاڑیوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ پیشتر اس کے کہ سنتری جان سکتے کہ یہ آگ کیسے لگی ہے، آگ لگانے والے نکل گئے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں تک پہنچے اور شعلوں کی روشنی سے دور رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔

ہوا کی رفتار کافی تھی۔ شعلے تیزی سے پھیلنے لگے۔ سوئے ہوئے سنتری جاگ اٹھے۔ جاگے ہوئے سنتری شعلوں کے نرغے سے نکلنے کے لیے بھاگ اٹھے۔ ان سب کے شور و غوغا اور ہڑبونگ نے شعلوں کی آواز کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا۔ شہر میں جتنی بھی فوج تھی بیدار ہو گئی اور آگ پر ٹوٹ پڑی۔ آگ ڈیڑھ میل لمبے اور اس سے نصف چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ درخت جھلس رہے تھے۔ فوج کے لیے آگ پر قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ شعلے اتنے اونچے جا رہے تھے کہ کوئی فوجی قریب جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ اس سامان کو بچائیں جس تک ابھی آگ نہیں پہنچی تھی۔

شہر کی تمام تر آبادی جاگ اٹھی۔ مسلمان خوش تھے مگر ہندوؤں پر ہول طاری ہو گیا۔ وہ اس آگ کو آگ کے دیوتا کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مندروں کے سنکھ اور گھنٹے بجنے لگے۔ پنڈت بہت سے ہاتھوں والے بتوں اور مورتیوں کے آگے دو زانو ہو کر گڑگڑانے لگے۔ عورتیں مندروں کو دوڑ پڑیں۔ مردوں کو فوجی ہانک کر لے گئے۔ پانی کنوؤں سے نکالا جا رہا تھا۔ گھوڑا گاڑیوں پر بڑے بڑے مشکیزے اور ڈول لا کر دریا سے پانی لایا جا رہا تھا لیکن شعلے اتنے اونچے اور ایسے ہیبت ناک تھے کہ نصف میل دور سے بھی ان کی تپش ناقابل برداشت تھی۔

"تمام سنتریوں کو قتل کر دو۔۔۔۔ انہیں اسی آگ میں زندہ پھینک دو"۔۔۔ یہ راجہ جے پال کی آواز تھی۔ وہ چیختا، چلاتا، حکم دیتا اور گالیاں بکتا پھر رہا تھا جس گھوڑے پر وہ سوار تھا، وہ گھوڑا بھی اسی کی طرح غصے اور بے چینی میں ہنہناتا تھا۔ اس کے درباری، وزیر اور جرنیل اس کے عتاب سے خوفزدہ فوجیوں اور شہریوں کو حکم اور گالیاں دیتے پھر رہے تھے۔

تھوڑا سا سامان بچایا جا سکا۔ راجہ اور اُس کے جرنیل وغیرہ تھک ہار کر پیچھے ہٹ گئے اور بے بسی کے عالم میں آگ کے قہر کو دیکھنے لگے۔

"یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ آگ کس طرح لگی ہے؟"۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا۔۔۔ "یہاں جتنے سنتری تھے، انہیں قید خانے میں لے جا کر اُلٹا لٹکا دو۔ ان میں سے جو بتا دے کہ آگ کس طرح لگی تھی، اسے اتار لینا۔ باقی سب کو اسی حالت میں مر جانے دو۔۔۔ پندرہ دنوں کے اندر اندر یہ سامان پورا کرو۔ میں چند دنوں میں کوچ کرنا چاہتا تھا۔ سبکتگین کے مرنے کی اطلاع ملتے ہی ہمیں کوچ کر جانا چاہیے تھا۔ اب جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، سبکتگین کے جانشین کو تیاری کا موقع ملتا رہے گا۔"

"یہ مسلمانوں کا کام بھی ہو سکتا ہے"۔۔۔ راجہ کے وزیر اودھے شنکر نے کہا۔۔۔ "کیا مہاراج کے ذہن میں نہیں آئی کہ غزنی کے دو قیدی بھاگ گئے ہیں؟ یہ ان کی کارستانی بھی ہو سکتی ہے"۔

"تمام مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لو"۔۔۔ راجہ جے پال نے حکم دیا۔۔۔ "کسی پر ذرا سا بھی شک ہو اُسے میرے سامنے لے آؤ۔۔۔ مسلمانوں کے گھروں سے جتنی نقدی، زیورات اور اناج ملے وہ اپنے قبضے میں لے لو لیکن۔۔۔" راجہ نے ذرا سوچ کر کہا۔۔۔ "میں سوچتا ہوں کہ یہ لوگ اتنی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"یہ ناپاک قوم اس سے زیادہ جرأت بھی کر سکتی ہے"۔۔۔ ایک جرنیل نے کہا۔۔۔ "آپ غزنی کے دو قیدیوں سے ان کی فتح کا جو راز معلوم کرتے رہے ہیں وہ یہی ہے کہ ان کی قوم میں اتنی زیادہ جرأت ہے جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کی یہ جرأت تو ماننی ہی پڑے گی۔ میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ یہ جرأت ہماری فوج میں نہیں اور یہ بھی کہ ہماری فوج کی جو نفری غزنی کے حملے سے بچ کر آئی ہے، اس پر ابھی تک مسلمانوں کی فوج کا خوف سوار ہے۔"

"تو اپنے سپاہیوں کو بتاؤ کہ یہ ہمارے دیوتاؤں اور مسلمانوں کے پیغمبروں کی لڑائی ہے"۔۔۔ راجہ جے پال نے کہا۔۔۔ "انہیں بتاؤ کہ مذہب کی اس لڑائی میں جو ہندو مارا جائے گا وہ دوسرے جنم میں خوبصورت پرندوں کی شکل میں دنیا میں آئے گا اور کھلی فضاؤں اور خوشنما باغوں میں چہچہاتا اور اڑتا پھرے گا"۔۔۔ راجہ جے پال کے دماغ پر پنڈت سوار تھے۔ وہ حقیقت سے دور ہٹ گیا تھا۔ اس نے کہا۔۔۔ "معلوم نہیں کس کے گناہوں سے دیوتا ہم سب سے ناراض ہیں۔ قربانی کے لیے وہ لڑکی مل گئی ہے جسے پنڈت تلاش کر رہے تھے۔ اسے شیلوں والے مندر میں پہنچا دیا گیا ہے۔ پندرھویں روز اسے ذبح کر دیا جائے گا۔"

"مہاراج!"۔۔۔ جرنیل نے کہا۔۔۔ "آپ کو بُرا لگے تو معاف کر دینا۔ فتح حاصل کرنے کے لیے ایک لڑکی کو ذبح کرنا کافی نہیں۔ فوج کے ہر آدمی کو ذبح ہونے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ آپ کو بھی، مجھے بھی۔ جب تک ہماری قوم ایسے بیٹے پیدا نہیں کرے گی جیسے یہ تھے جنہوں نے ہماری فوج کی ایک سال کی رسد جلا دی ہے، اُس وقت تک ہم مسلمانوں پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔"

"آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ آگ مسلمانوں نے لگائی ہے؟"۔۔۔ راجہ جے پال نے پوچھا۔

"جی مہاراج!"۔۔۔ جرنیل نے جواب دیا۔۔۔ "میں سیناپتی ہوں۔ آپ کی ساری فوج کا سربراہ ہوں۔ فوج کی ہر شکست میری شکست ہوتی ہے۔ میں حقائق اور حالات پر نظر رکھتا ہوں۔ میں وہموں اور خوش فہمیوں سے اپنا جی خوش نہیں کر سکتا۔ ایسا کروں گا تو آپ کا راج اور ریاست نابود ہو جائیں گے اور آپ کا راج محل مسجد اور مسلمانوں کا مذہبی مدرسہ بن جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ حقیقت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آگ مسلمانوں نے لگائی ہے۔ میں سنتریوں سے پوچھ چکا ہوں۔ آگ دیکھ بھی چکا ہوں۔ آگ سنتریوں کی غلطی سے لگتی تو کسی ایک جگہ لگتی اور سنتری خود ہی اس پر قابو پا لیتے، مگر یہ آگ بارہ چودہ جگہوں سے شروع ہوئی اور پھیل گئی۔"

"تو کیا غزنی سے آگ لگانے کے لیے فوج آئی تھی؟"۔۔۔ مہاراجہ نے کہا۔۔۔ "کیا شہر

کی ساری مسلمان آبادی نے مل کر بارہ چودہ جگہوں پر آگ لگائی ہے؟"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ آگ نہ غزنی کی فوج نے لگائی ہے نہ شہر کی مسلمان آبادی نے۔" جرنیل نے کہا۔ "یہ کم از کم دس اور زیادہ سے زیادہ بیس آدمیوں کا کام ہے وہ جو کوئی بھی ہیں بے حد دلیر ہیں۔ اس قسم کی آگ لگانے والے آگ میں جلنا بھی جانتے ہیں۔ وہ صرف جلانے کے لیے نہیں بلکہ خود جلنے کے لیے بھی آتے ہیں۔"

"کیا ہم انہیں پکڑ کر زندہ نہیں جلا سکتے؟" — راجہ جے پال نے پوچھا۔

"اگر ہم دس بیس مسلمانوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں گے تو کیا ہوگا؟" — وزیر اُدھے شنکر نے کہا۔ "دس بیس اور آجائیں گے ہمیں ان کی اُس آگ کو سرد کرنا ہے جو اُن کے سینوں میں جل رہی ہے۔ اسے یہ لوگ ایمان کی شمع کہا کرتے ہیں۔ ہمیں ان کا ایمان ختم کرنا ہے۔ درخت کے پتے توڑ توڑ کر مسلتے رہنے سے درخت سوکھ نہیں جایا کرتا۔ اس کی جڑ کاٹنی ہے۔ آگ پر آگ پھینک کر آپ اسے بجھا نہیں سکتے۔ آگ پانی سے بجھا کرتی ہے۔ آپ کو آگ کی طرح گرم ہو کر نہیں بلکہ پانی کی طرح ٹھنڈا ہو کر سوچنا پڑے گا۔۔۔ یہاں کے مسلمانوں پر آگ کی طرح نہ برسیں۔ ان میں جو سرکردہ لوگ ہیں انہیں انعام و اکرام، دربار کے رتبوں اور عورت کے حسن و جوانی کے جال میں پھانسیں میری نظر ماضی میں وہاں تک جاتی ہے جہاں محمد بن قاسم اس دھرتی پر نمودار ہوا تھا۔ اُس نے شمال مغربی ہند میں اسلام پھیلا دیا تھا اور یہ مذہب محمد بن قاسم کے دورِ حکومت میں پھیلتا اور ہمارا مذہب سکڑتا سمٹتا چلا گیا۔ محمد بن قاسم کے جانے کے بعد ہمارے پیشواؤں نے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ تشدد اور دہشت گردی سے بھی اسلام کے فروغ کو روکا گیا اور دلکش طریقوں سے بھی۔ سب سے زیادہ کامیاب طریقہ یہ دوسرا ثابت ہوا۔ زر و جواہرات اور عورت نے مسلمانوں کے معاشرتی سربراہوں کو نہ ہندو رہنے دیا نہ مسلمان۔ اسلام کمزور ہوتے ہوتے چند ایک مسجدوں تک رہ گیا ہے۔ انہیں جسمانی مار نہ دیں۔ انہیں روحانی طور پر مردہ کر دیں۔ انہیں پیار اور محبت کا دھوکہ دے کر ان پر اپنی تہذیب کا رنگ چڑھا دیں۔"

"اگر ہم نے غزنی فتح کر لیا تو ہم یہ طریقے استعمال کریں گے۔" — راجہ جے پال نے کہا۔

وہ ڈیڑھ میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے شعلوں سے دُور کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ جے پال فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔ غزنی پر اس کا حملہ کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو گیا تھا اور غزنی والے فوج کے بغیر حملہ کر گئے تھے۔ اس آگ کا دوسرا اثر یہ ہُوا کہ غزنی کے دو مفرور قیدی — نظام الدین اور قاسم مکی — راجہ کے ذہن سے اُتر گئے۔

ہندو لڑکی رتی کو پنڈت ٹیلوں والے مندر میں لے گئے تھے۔

ٹیلوں والا مندر کوئی عمارت نہیں تھی۔ اُس دور میں دریائے راوی کی گزرگاہ کوئی اور تھی۔ آج اسے بڈھا دریا کہتے ہیں شہر سے تھوڑی دُور دریا سے ذرا سا ہٹ کر ڈیڑھ میل لمبا چوڑا علاقہ ٹیلوں اور گھاٹیوں کا تھا۔ ان کی مٹی کالی اور چکنی تھی۔ وہاں سلوں کی چٹانیں بھی تھیں۔ بعض نیلے سلوں اور کالی مٹی کی آمیزش کے تھے، لمبے بھی، گول اور مخروطی بھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ قدرتی نہیں بلکہ انہیں تراش کر ان شکلوں کا بنایا گیا ہے۔ ان کے ارد گرد درختوں کی بہتات تھی لیکن ان کے اندر کوئی درخت نہیں تھا نہ کوئی سبزہ تھا۔

راجہ جے پال سے پہلے کے کسی دور میں ہندو کاریگروں نے بعض مخروطی ٹیلوں کو تراش کر مندر کے مخروطی اور لمبوترے گنبدوں کی شکل دے دی ہوئی اور ان کے اندر تراش تراش کر وسیع عمارتیں بنا دی تھیں جو بلند اور کشادہ کمروں جیسی تھیں۔ ان کی دیواروں پر دیویوں اور دیوتاؤں کے بُت تراشے ہُوئے تھے۔ ان کمروں کے اندر بھی کمرے تھے، تہ خانے اور بالا خانے بھی تھے۔ اُس دور کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ اندر جا کر انسان بھول جاتا تھا کہ وہ کھودی ہُوئی زمین اور ٹیلوں کے اندر ہے۔ اندر سے یہ خوشنما اور پختہ عمارتیں لگتی تھیں۔

اس جگہ کو ٹیلوں والا مندر کہتے تھے لیکن وہاں پنڈتوں اور سادھوؤں کے سوا کوئی اور پُوجا پاٹھ کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ راہنما کے بغیر مندر تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ٹیلوں کے درمیانی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ چند قدم پر مڑتے اور بیشتر راستے کہیں نہ کہیں جا کر بند ہو جاتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس

جگہ کے متعلق مشہور تھا کہ یہ روحوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن ہے۔ انسانی قربانی اسی مندر میں دی جاتی تھی۔ دُور سے دیکھنے سے یہ علاقہ پُراسرار اور ڈراؤنا لگتا تھا۔ کوئی اس کے قریب سے گذرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

راجہ جے پال کے دَورِ حکومت کے کچھ عرصہ بعد جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا اور بُت شکنی کا سلسلہ شروع کیا تو ٹیلوں کا مندر جس کی فضا انسانی خون اور ہندوؤں کی غیر معمولی طور پر حسین عورتوں کی عصمت کے خون سے متعفن رہتی تھی، اُس کی نظروں سے بچا رہا۔ خدائے ذوالجلال نے محمود غزنوی کے مشن کو یوں مکمل کیا کہ راوی کا رُخ بہاں ڈالا نہ سیلاب جو ہر سال آتا تھا ٹیلوں کے علاقے کو بہانے لگا۔ دیوی دیوتاؤں کے بتوں کو راوی نے کیچڑ میں تبدیل کر کے غائب کر دیا پھر اسی کو راوی نے اپنی گزرگاہ بنا لیا۔ ٹیلوں والا مندر ہندوؤں کے کانمفل میں رہ گیا۔

پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ جس رات راجہ جے پال کی رسد وغیرہ کے ذخیرے کو جانبازوں نے نذرِ آتش کیا، اُس شام ان میں سے دو آدمی عمران بلاذری کے گھر گئے تھے۔ وہ عمران کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے چلے گئے تو دروازے پر پھر دستک ہوئی عمران نے دروازہ کھولا تو فاطمہ تیزی سے اندر آئی۔ عمران نے دروازہ بند کر دیا۔

"میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا" — عمران بلاذری نے فاطمہ کو غصے سے کہا — "پھر کیوں آگئی ہو؟"

فاطمہ جواب دینے کی بجائے اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

"مجھے بچاؤ" — فاطمہ نے سسکتی اور لرزتی آواز میں کہا — "عمران! مجھے اِس چڑیل سے بچاؤ۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتی۔"

ڈیوڑھی تاریک تھی۔ عمران فاطمہ کو اندر نہیں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں نظام اور زینی اور قاسم بھی موجود تھے۔ انہیں وہ یہ تاثر دینے سے ڈرتا تھا کہ وہ یہاں جاسوسی کے بہانے لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ فاطمہ سے وہ منہ لگانے کو تیار نہیں تھا مگر اس لڑکی کی

حالت ایسی ہوئی جا رہی تھی کہ عمران نے اسے دھتکارنا مناسب نہ سمجھا۔

"کیسے چڑیل نظر رہی ہو" — عمران نے کہا — "یہ تمہارا گناہ ہے جو چڑیل بن کر تمہیں ڈرا رہا ہے۔"

"میں رَشی کو دیکھتی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "مجھے اندر لے چلو۔"

"یہیں بات کرو۔"

"مجھے اپنے ساتھ لگا لو" — فاطمہ نے روتے ہوئے التجا کی — "اتنے ظالم نہ بنو عمران! میں خوف سے مر جاؤں گی۔ مجھے پناہ میں لے لو۔"

عمران بلاذری اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ فاطمہ اُس کے ساتھ لگ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"میری آنکھ لگ جاتی ہے تو رَشی مجھے جھنجوڑ کر جگا دیتی ہے میں گھبرا کر اٹھتی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "وہ مجھے اندھیرے میں بھی نظر آ جاتی ہے مگر وہ خوبصورت رَشی نہیں ہوتی۔ اُس کے دانت درندوں کی طرح اور ناخن خنجروں کی نوکوں کی طرح آگے سے مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بولتی نہیں چیختی یا پھنکارتی ہے۔ مجھے چیرنے پھاڑنے کو آتی ہے لیکن قریب آ کر غائب ہو جاتی ہے میں نے کل رات اپنے کمرے میں اس سے بچنے کے لیے بھاگتے دوڑتے گذاری ہے۔ آج دن بھر مجھ پر خوف طاری رہا۔ وہ دن کو مجھے نظر نہیں آئی لیکن تین چار بار مجھے اُس کی سسکیاں سنائی دیں۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی نظر نہ آیا لیکن مجھے ایسے محسوس ہوتا رہا جیسے رَشی کمرے میں موجود ہے۔ عمران! مجھے اس سے بچاؤ۔"

فاطمہ مظلوم لڑکی تھی۔ اسے نوجوانی کی عمر میں باپ نے پیسے لے کر ایسے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا تھا جس کی عمر اُس سے دگنی سے بھی زیادہ تھی اور اُس کی دو بیویاں تھیں۔ فاطمہ صرف جوان ہی نہیں تھی خوبصورت بھی تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اسے عمران اچھا لگا تو اس کے راستے میں رَشی نام کی ہندو لڑکی حائل ہو گئی۔ فاطمہ نے اسے راستے سے یوں ہٹایا کہ پنڈت کو معاوضہ دے کر اس لڑکی کو انسانی قربانی کے لیے منتخب کرا لیا۔ فاطمہ فطرتاً گناہگار نہیں تھی۔ انتقام اور رقابت نے اس سے بڑا ہی بھیانک گناہ کرایا۔ اس

کا ضمیر اس گناہ کو برداشت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو رشی کی قاتل سمجھنے لگی۔ یہ ضمیر کا انتقام تھا۔ بے بس اور مجبور لڑکی اب اس قدر خوفزدہ تھی کہ وہ عمران کے قدموں میں آگری۔

"میں نے کل رات تمہیں کہا تھا کہ گناہ کا کفارہ ادا کرو ورنہ جلتی اور کڑھتی رہو گی۔" عمران نے اسے کہا۔ "رشی ابھی زندہ ہے۔ جس روز پنڈت اسے ذبح کر دیں گے اس روز اس کی بدروح چڑیل بن کر تمہارے پاس آجائے گی۔ تم جب تک زندہ رہو گی وہ تم پر غالب رہے گی۔ تم راتوں کو سو نہیں سکو گی۔ تم خودکشی کر لو گی یا پاگل ہو کر گلیوں اور بازاروں میں چڑیلوں کی طرح چیختی چلاتی پھرو گی اور لوگ تم سے دور بھاگیں گے۔"

فاطمہ اور زیادہ خوفزدہ ہو کر عمران بلاذری کے ساتھ لپٹ گئی۔ "مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اگر ایک رات اور میری یہی حالت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"رشی کو پنڈتوں سے آزاد کراؤ۔" عمران نے کہا۔ اُس نے فاطمہ کو اسی لیے اور خوفزدہ کیا تھا کہ وہ رشی کو آزاد کرانے میں مدد دے۔ اُس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

"میں اُسے کیسے آزاد کرا سکتی ہوں؟"

"یہ کام میں کروں گا۔" عمران نے کہا۔ "تم میری مدد کرو۔ تمہاری نجات اسی میں ہے۔ رشی ذبح ہو گئی تو دنیا کے قید خانے سے آزاد ہو جائے گی مگر تمہارا جو حال ہو گا وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"مجھے جو کہو گے کروں گی۔"

"اٹھو۔" عمران نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اندر چلو۔"

عمران اسے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ وہ اسے اس کمرے میں نہیں لے جانا چاہتا تھا جس میں نظام اوریزری اور قاسم ملجی بیٹھے ہوئے تھے۔ فاطمہ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمران نے فاطمہ کو دوسرے کمرے میں بٹھایا اور دیا جلا کر رکھ دیا۔

"اب بے خوف ہو کر اکیلی بیٹھی رہو۔" عمران نے کہا۔ "یہاں تمہیں رشی نظر نہیں آئے گی۔"

عمران اوریزری اور ملجی کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے انہیں فاطمہ اور رشی کے متعلق

سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ فاطمہ کو رشی کے فرار کے لیے استعمال کرے گا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ہمیں فرار کرایا ہے لیکن ہمیں کسی اور مصیبت میں ڈال دو گے۔" نظام اوریزری نے کہا۔ "تم یہاں عشق و محبت اور عیاشی میں پڑے رہو۔ ہم خود ہی نکل جائیں گے۔"

"میں عشق و محبت اور عیاشی میں نہیں پڑوں گا۔" عمران نے کہا۔ "میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں ان پنڈتوں پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے بُت محض پتھر ہیں اور یہ کسی مسلمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ان سے یہ لڑکی چھین کر ثابت کروں گا کہ کس کا مذہب سچا ہے... میں گھوڑوں کا انتظام کر لوں گا۔ اگر میں نے آج ہی رات اس ہندو لڑکی کو آزاد کرا لیا تو یہاں واپس نہیں آؤں گا۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو گے۔ ہم اُدھر سے ہی نکل جائیں گے۔"

"تم نے سوچا کیا ہے؟" قاسم ملجی نے پوچھا۔ "تم وثوق سے کس طرح کہہ رہے کہ تم لڑکی آزاد کرا لو گے؟"

عمران بلاذری نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس نے تفصیل سے بتا دیا۔ وہ دونوں رضامند ہو گئے اور تینوں نے بحث مباحثے کے بعد ایک سکیم تیار کر لی ۔۔۔ اور عمران فاطمہ کے کمرے میں چلا گیا۔

"یہاں تو رشی کی بدروح نظر نہیں آئی؟" عمران نے فاطمہ سے پوچھا۔

"نہیں" ۔۔۔ فاطمہ نے جواب دیا۔ "مگر ڈر آتا ہے۔"

"تم نے اُسے پنڈتوں سے بچانے کا ارادہ کر لیا ہے اس لیے اب رشی کی بدروح تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔ جب وہ آزاد ہو گئی تو تمہیں روحانی سکون حاصل ہو گا۔"

"مجھے یہ تو بتاؤ کہ مجھے کرنا کیا ہے" ۔۔۔ فاطمہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ تم کامیاب ہو گئیں تو تم اپنے گھر واپس نہیں آؤ گی۔" ۔۔۔ عمران نے کہا۔ "تم میرے ساتھ غزنی چلو گی۔"

"سچ عمران؟"

"میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔" عمران نے کہا۔ "تم پنڈت کے گھر جاؤ۔ ڈرنا نہیں۔

اگر وہ تمہیں مل جائے تو اُسے کہو کہ تم تیلوں والا مندر دیکھنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں سونے کے سکے دے رہا ہوں۔ یہ پنڈت کو دے دینا۔ وہ مان جائے گا۔ میں تمہارے پیچھے آؤں گا۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ پنڈت کو تیلوں والے مندر تک لے جاؤ۔ وہ تمہیں جو شرط بتائے مان لینا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ یہ مندر ٹیلوں کے اندر ہے۔ وہاں تک ان پنڈتوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کسی عام آدمی کو راستہ معلوم نہیں۔"

"اگر وہ نہ مانا تو ہم کیا کریں گے؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"تم اسے کسی طرح کمرے سے باہر لے آنا۔" عمران نے کہا۔ "میں اسے مندر تک لے جاؤں گا۔ اگر نہیں جلے گا تو یہ اُس کی زندگی کی آخری رات ہو گی۔"

"پھر میرا کیا بنے گا؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ تم اب اپنے خاوند کے گھر نہیں جاؤ گی۔" عمران نے جواب دیا۔ "تم اب میری ذمہ داری میں ہو۔ دل سے تمام خوف اور وہم نکال دو۔ ابھی پنڈت کے ہاں چلی جاؤ۔ میں اُس کے کمرے کے دروازے کے قریب چھپا ہوا ہوں گا۔ میں جھینگر کی آواز نکالوں گا۔ تم اُسے باہر لے آنا۔"

عمران نے اُسے بہت سی ہدایات دیں۔ اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس کا دل مضبوط کیا اور اُسے سونے کے چند ایک سکے دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد عمران رتّی کے بھائی جگ موہن سے ملنے چلا گیا۔ جگ موہن گھر ہی تھا اور بہت اُداس۔ وہ پہلے ہی اپنے مذہب سے متنفر تھا۔ اب اس کی نوجوان بہن کو پنڈت دیوی کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے لے گئے تھے۔

"عمران!" اُس نے کہا۔ "یہ لوگ میری بہن کو ذبح کرنے کے لیے لے گئے ہیں۔ میں کسی پنڈت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کسی کو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ ان پنڈتوں کو کون قتل کرتا چلا جا رہا ہے ..... تم کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ کسی پنڈت کو قتل کیے بغیر تمہاری بہن کو اُٹھا لانے اور غائب کر دینے کا بندوبست کیا جائے۔" عمران نے کہا۔ "تم یقیناً میرا ساتھ دو گے۔ جانتے ہو اُسے کہاں لے گئے ہیں؟"

"وہاں تک ہم نہیں پہنچ سکتے۔" جگ موہن نے جواب دیا۔ "اُسے ٹیلوں والے مندر میں لے گئے ہیں۔ ہم وہاں گم ہو سکتے ہیں۔ پنڈت ہمیں ان بھول بھلیوں میں بھٹکتا دیکھیں گے تو ہمیں قتل کر دیں گے اور ہماری لاشیں وہیں کہیں زمین میں دبا دیں گے۔ وہاں جانے کی نہ سوچو۔"

"میں بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔" عمران نے کہا۔ "اگر تمہارے دل میں اپنے مذہب کے خلاف واقعی نفرت ہے تو تمہیں نہ صرف یہ مذہب ترک کر دینا چاہیئے بلکہ اس ملک سے ہی نکل جانا چاہیئے۔ میں تمہیں اور تمہاری بہن کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"میری بہن کہاں ہے؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"تم ایک کام کرو۔" عمران نے کہا۔ "چار گھوڑوں کا انتظام کرو اور دریا کے کشتیوں کے پل سے دُور میرا انتظار کرو۔" عمران نے اسے وہ جگہ بتائی جہاں اُسے انتظار کرنا تھا۔ اُس نے جگ موہن سے کہا۔ "اس وقت مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ وقت نہیں۔ اگر میں صبح تک تمہیں دریا کے کنارے نہ ملا تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں۔"

جگ موہن بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن عمران بلاذری پر اُسے اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ اُس نے اس یقین پر چار گھوڑے لے کر لوی کے کنارے انتظار کا وعدہ کر لیا کہ عمران اس کی بہن کو ساتھ لائے گا اور بہن بھائی عمران کے ساتھ ملک سے نکل جائیں گے۔ اُس نے دل میں یہ وہم پیدا نہ ہونے دیا کہ عمران ہوا میں گھوڑے دوڑا رہا ہے لیکن جگ موہن کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور اس پر جذبات کا غلبہ تھا۔

کچھ دیر رات کے اندھیرے میں بڑے مندر سے کچھ دُور درختوں کے ایک جھنڈ میں عمران بلاذری، نظام الدین زی اور قاسم بھی کھڑے رہے۔ ان کے قریب سے ایک سایہ سا گزر گیا۔

"میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں فاطمہ!" عمران نے کہا۔ "ڈر نہ جانا۔"

سایہ رک گیا۔ عمران اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے فاطمہ کو یہ نہ بتایا کہ وہ اکیلا نہیں

اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ عمران کو آنے والے حالات کے متعلق یقین نہیں تھا کہ اس کے لیے حالات کیسے ہو جائیں گے، اس لیے وہ اور یزدی اور بلمی کو فاطمہ سے چھپائے رکھنا بہتر سمجھتا تھا۔ اُس نے فاطمہ کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ آگے چل پڑی۔ کچھ دور گئی تو تینوں اس کے پیچھے چل پڑے۔

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم اس مہم میں کس طرح کامیاب ہو گے"۔۔۔ بلمی نے کہا۔

"میں جو کچھ کر رہا ہوں، اللہ کے نام پر کر رہا ہوں"۔ عمران نے کہا۔۔۔ "میں نے خدا سے مدد مانگی تھی۔ مجھے جو بھی خیال آتا ہے، وہ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اگر میں سچا ہوا تو خدا مجھے کامیابی عطا کرے گا"۔

فاطمہ سیاہ سائے کی طرح چلتی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد عمران بلا ذری زور سے کھانس دیتا تھا۔ یہ فاطمہ کے لیے اشارہ تھا کہ وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے ... مندر بہت بڑے بھوت کی طرح کھڑا نظر آنے لگا۔ عمران نے دُور سے روشنی دیکھی۔ یہ پنڈت کے کمرے کے دروازے سے باہر آئی تھی۔ پنڈت نے فاطمہ کی دستک پر دروازہ کھولا تھا۔ عمران کو فاطمہ کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ روشنی غائب ہو گئی۔

عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے چلا گیا۔ دونوں ساتھیوں کو ذرا دُور درختوں کے پیچھے کھڑا کر دیا اور خود دبے پاؤں دروازے کے قریب چلا گیا۔ دروازے کی درزوں میں سے روشنی آ رہی تھی۔ دروازے تک تین چار سیڑھیاں جاتی تھیں۔ عمران سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تم بچوں کی سی ضد کیوں کر رہی ہو"۔۔۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔۔۔ "وہاں کوئی ہندو بھی نہیں جا سکتا، تم تو مسلمان ہو"۔

"میں اُس چڑیل کو آخری بار اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں"۔۔۔ فاطمہ نے کہا۔۔۔ "دُور سے دکھا دینا"۔

"مجھے آج رات اُدھر جانا ہی تھا لیکن آدھی رات کے بعد جاؤں گا جب چاند اوپر آ جاتا ہے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "تم اُس وقت تک یہاں رک سکو گی؟"

"ابھی چلیں"۔۔۔ فاطمہ نے کہا۔۔۔ "آپ کی اُجرت آپ کے سامنے پڑی ہے۔ میں آپ کو منہ مانگی قیمت دے رہی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ انسانی قربانی محض فریب ہے۔ میں آپ کا بھانڈہ پھوڑ سکتی ہوں۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے جال میں نہیں بلکہ آپ میرے جال میں آئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ میری یہ ذرا سی خواہش پوری نہیں کر سکتے تو میں واپس چلی جاتی ہوں لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ آپ کا انجام کیا ہو گا"۔

فاطمہ بجائے خود ایک سحر تھا جو پنڈت پر غالب آ گیا۔ اس کے ساتھ سونے کے ٹکڑے تھے۔ فاطمہ کی دھمکی بھی کام کر گئی۔ کچھ وقت اور گزرا۔ عمران کو اندر سے کھسر پھسر سنائی دینے لگی۔

"میں تمہیں دُور سے دکھا کر واپس لے آؤں گا۔۔۔ چلو"۔۔۔ یہ پنڈت کی آواز تھی۔

عمران دروازے سے ہٹ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔ پنڈت اور فاطمہ باہر نکلے۔ دروازہ بند ہوا اور وہ ایک طرف چل پڑے۔ خاصا فاصلہ رکھ کر عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے پیچھے چل پڑا۔ آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔ جنگل تھا۔ عمران کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ پنڈت کو اپنے پیچھے آہٹ سنائی دے گی اور وہ پیچھے کو آئے گا لیکن اُسے آگے پیچھے کا خیال نہیں تھا۔ وہ فاطمہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا جا رہا تھا۔

ٹیلوں کا علاقہ آ گیا۔ پنڈت اور فاطمہ دو ٹیلوں کے درمیان چلے گئے۔ عمران اور اس کے ساتھی بھی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے۔ مگر انہیں ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ راستہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جا کر مڑ جاتا تھا۔ اور اندھیرا تھا۔ وہ پنڈت اور فاطمہ کی باتوں کی آواز پر چلے جا رہے تھے۔ تین چار جگہیں ایسی آئیں کہ وہ غلط راستے پر ہو چلے تھے۔ انہیں ایک سرنگ میں سے بھی گزرنا پڑا۔ آگے گئے تو انہیں دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی جیسے عورتیں مل کر گا رہی ہوں۔ اگر عمران اور اس کے ساتھی یہاں اکیلے آتے اور یہ آواز سن لیتے تو وہ اسے بدروحوں کا گانا سمجھ کر واپس چلے

جاتے۔ عمران کو پنڈت کی اصلیت معلوم ہو چکی تھی، اس لیے اُسے ڈر محسوس نہ ہوا۔

آگے جا کر راستے اس طرح اُلجھ گئے کہ عمران اور اس کے ساتھیوں کے لیے پنڈت اور فاطمہ کو دیکھ کر چلنا ممکن نہ رہا۔ انہیں نظر آنے لگا تھا کہ وہ بھٹک جائیں گے لہٰذا انہیں فاصلہ کم کرنا پڑا اور انہوں نے اپنی رفتار بھی تیز کر دی۔ پنڈت رُک گیا۔

"کون ہو؟" — پنڈت نے پیچھے کو آتے ہوئے کہا۔

عمران اور اس کے ساتھی ایک طرف ہٹ گئے۔ بھاگنا مناسب نہیں تھا۔ وہ راستے سے اِدھر اُدھر ہو کر ٹیلوں کے دامن میں بیٹھ گئے۔ پنڈت ان کے درمیان آگیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ عمران نے خنجر نکالا اور اُٹھ کر خنجر کی نوک پنڈت کے دل پر رکھ دی۔

"یہیں رُکے رہو" — عمران نے کہا — "قتل ہونا پسند کرو گے یا ہمیں رشی تک لے چلو گے؟ اس مسلمان لڑکی سے جو اُجرت تم نے وصول کی ہے وہ میں جانتا ہوں۔ آج سونے کے جو سکے تم نے اس سے لیے ہیں وہ اپنے پاس رہنے دو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہمیں رشی تک لے چلو۔"

"فاطمہ!" — پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں فاطمہ سے کہا جو اُن کے قریب آگئی تھی — "تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔"

"تم نے میرا جو بھی کام کیا ہے اس کی تم نے پوری قیمت وصول کی ہے" — فاطمہ نے کہا — "میں نے تمہیں سونے کی شکل میں بھی قیمت دی ہے، جسم کی شکل میں بھی۔ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آئی ہوں، تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔"

دو اور خنجروں کی نوکیں پنڈت کے جسم کے ساتھ لگ گئیں۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ دور سے عورتوں کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ ٹیلوں کے جھرمٹ میں یہ آواز مترنم گونج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"اس آواز پر ہم خود بھی رشی تک پہنچ سکتے ہیں" — عمران نے پنڈت سے کہا — "ہم صرف تین آدمی نہیں۔ ہمارے ساتھ بہت آدمی ہیں۔ ہم نہ تمہیں زندہ

چھوڑیں گے نہ تمہارے کسی اور پنڈت کو۔ ہم ان گانے والیوں کو بھی اُٹھا لے جائیں گے۔ خون خرابے سے بچو اور چل کر وہ ہندو لڑکی ہمارے حوالے کر دو جسے قربانی کے لیے لائے ہو۔ اپنے پتھر کے خداؤں اور مورتیوں کو پکارو۔ تمہاری دیویاں اور دیوتا تمہاری مدد کو نہیں آئیں گے.... چلو۔"

پنڈت خاموشی سے آگے آگے چل پڑا۔ اُس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اُس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ عمران اور اس کے ساتھیوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ آگے کیا ہے۔ انہیں صرف عورتوں کا گیت سنائی دے رہا تھا۔ راستہ مڑتا، کئی راستوں میں اُلجھتا اور ٹیلوں کے گرد گھومتا جا رہا تھا۔ عمران چوکنا تو تھا ہی، وہ اور زیادہ ہوشیار ہو گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پنڈت انہیں کسی غلط راستے پر ڈال کر غائب ہو جائے اور انہیں پنڈت کے آدمی گھیر کر ختم کر دیں گے۔

راستہ ایک میدان میں داخل ہو گیا۔ یہ کوئی وسیع میدان نہیں تھا۔ چالیس پچاس گز چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ یہ گولائی میں تھا۔ اس کے گرد مندر اور کمرے تھے جو پختہ ٹیلوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ چبوترے بنے ہوئے تھے جن میں بعض پر سادھو قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے پاس ایک لڑکی بیٹھی تھی اور وہ ہنس کھیل رہے تھے۔ میدان میں دس بارہ جوان لڑکیاں دائرے میں رقص کی اداؤں سے گھومتی اور گا رہی تھیں۔ بہت سی مشعلیں زمین میں گاڑی ہوئی تھیں۔ گانے والی لڑکیوں کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سب نیم عریاں تھیں.... پنڈت رک گیا۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں تینوں مسلمانوں کی طرف دیکھا۔

"لڑکی ہمارے حوالے کر دو" — عمران نے پنڈت کے پہلو میں خنجر کی نوک چبھو کر کہا۔

پنڈت نے بلند آواز سے حکم دیا — "رک جاؤ"

گانے والیاں خاموش ہو کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ پنڈت اور سادھو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رشی جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ عمران اور اس کے ساتھیوں نے منہ اور سر پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے۔ انہوں نے خنجر بند کر کے تلواریں نکال لیں اور پنڈت کو آگے لے گئے۔ تمام پنڈتوں، سادھوؤں اور لڑکیوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ بڑا پنڈت

دو تلواروں کے درمیان کھڑا تھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر رشی کو اٹھایا۔ رشی اُسے آنکھیں کھولے دیکھتی رہی جیسے عمران کو پہچان نہ سکی ہو۔ عمران نے بلایا اسے جھنجھوڑا مگر وہ اسے دیکھتی ہی رہی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے کچھ پلایا گیا ہے جس کے اثر سے اس کا دماغ حاضر نہیں۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور چل پڑا۔ رشی اس کے ساتھ چلتی آئی۔ عمران نے سب کی طرف دیکھا اور کہا ـ "اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو وہ مارا جائے گا۔ تم سب بہت سے آدمیوں کے گھیرے میں ہو۔"

"اس پر یہ اثر کب تک رہے گا؟" ـ عمران نے پنڈت سے پوچھا۔
"صبح تک اتر جائے گا" ـ پنڈت نے جواب دیا ـ "جاؤ۔ اسے لے جاؤ۔"
"تم ہمارے ساتھ چلو گے" ـ عمران نے کہا ـ "ہمیں راستہ یاد نہیں رہا۔ ہمارے آگے آگے چلو" ـ عمران نے تلوار کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

پنڈت سدھائے ہُوئے جانور کی طرح آگے آگے چل پڑا۔ اس پر دہشت کا غلبہ تھا۔ وہ جب ایک بار پیچ دار گلیوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہُوئے اُس وقت رسد کے ذخیرے کو آگ لگانے والے ذخیرے میں داخل ہو چکے تھے اور تیل چھڑک کر آگ لگا رہے تھے۔ پنڈت آگے آگے چلا آ رہا تھا۔ عمران، نظام اور یزی اور قاسم علی کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ فاطمہ بھی ان کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ رشی دماغی غیر حاضری کی کیفیت میں ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔

آخر وہ اس علاقے سے نکل آئے۔ تب اُنہوں نے دیکھا کہ شہر کی طرف سے آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ پھر بلند ہوتے ہُوئے شعلے بھی نظر آنے لگے۔ عمران نے گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا ... "اللہ اکبر" ـ اور اپنے ساتھیوں سے ان کی زبان میں کہا ـ "وہ دیکھو۔ اللہ کے شیروں نے کفار کی کمر توڑ ڈالی ہے۔ غزنی پر حملہ کرنے والوں کو ہمارے خدا نے سیس خاکستر کر دیا ہے۔"

"یہ کیا ہُوا ہے" ـ پنڈت کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی ـ "شہر جل رہا ہے۔"
"یہ ہمارے خدا کا قہر ہے جو تم پر گرا ہے" ـ عمران نے کہا ـ "اپنی عبادت گاہ بول

میں بھی تم سنگلی یا شی سے گریز نہیں کرتے اس ہندو لڑکی کی آہ نے تمہارے شہر کو آگ لگا دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ انسانی قربانی فریب ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے اس لڑکی کو قربانی کے لیے کس طرح منتخب کیا تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دیں گے۔ ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم رشی کو لے گئے ہیں۔ تمہارے راجہ نے اس لڑکی کو ابھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی اور لڑکی لے آؤ اور اس کی قربانی دے دینا۔ ہم تمہاری فریب کاری پر پردہ ڈالے رکھیں گے۔ اتنی زیادہ رعایت اور جان بخشی کے باوجود تم نے کوئی گڑبڑ کی تو اُن شعلوں کو دیکھ لو۔ جو اس شہر کو آگ لگا سکتے ہیں وہ تم جیسے ایک سو پنڈتوں کو زندہ جلا سکتے ہیں۔"

پنڈت شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر جیسے غشی طاری ہُوئی جا رہی تھی۔ شعلے بہت اوپر چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ شہریوں اور فوج کا شور و غوغا بھی سنائی دینے لگا تھا۔ پنڈت یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ اس نے سر ہاتھوں میں لے لیا۔ عمران اور اس کے ساتھی تیزی سے چل پڑے۔ ہر کام خوش اسلوبی سے ہوتا جا رہا تھا۔ یہ خدائی مدد تھی۔

وہ دریا کے کنارے اُس جگہ پہنچے جہاں جگ موہن کو انتظار کے لیے کہا گیا تھا۔ جگ موہن چار گھوڑوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں سے کوئی پون میل دُور گھوڑوں اور گاڑیوں کی آوازیں اور انسانوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ آگ بجھانے کے لیے پانی لے جا رہے تھے۔

"شہر جل رہا ہے" ـ جگ موہن نے گھبرا کر کہا ـ "یہ آگ کیسے لگی؟ میرا گھر بھی جل رہا ہو گا۔"

"جل جانے دو" ـ عمران نے کہا ـ "تم اب اس گھر میں نہیں جا رہے۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ اب اپنے آپ کو ہندو کہنا چھوڑ دو۔ ہمارے مذہب کا کرشمہ دیکھ لو۔ تمہاری معصوم بہن کو پنڈت قربانی کے لیے لے گیا تھا۔ میں نے اپنے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ہمت اور جرأت دے کہ میں اس لڑکی کو بچا کر ثابت کر سکوں کہ سچا خدا مسلمانوں کا ہے ... دیکھ لو۔ سارے شہر کو آگ لگ گئی ہے اور تمہاری بہن تمہارے سامنے کھڑی

ہے۔ اسے ہم دیوتاؤں سے چھین لائے ہیں۔"

"اوہ۔ میری بہن"۔ جگ موہن کے منہ سے نکلا اور وہ دوڑ کر اپنی بہن سے لپٹ گیا مگر بہن لاش کی طرح کھڑی رہی۔ جگموہن کے بلانے اور جھنجھوڑنے کے باوجود اُس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔

"اسے تمہارے پنڈتوں نے اس اثر والی کوئی دوائی پلا رکھی ہے"۔ عمران نے کہا۔ "صبح تک اسی حالت میں رہے گی۔۔۔ ہمارا سفر بڑا لمبا ہے۔ بہن کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھاؤ اور چلو"۔

جگ موہن نے رشی کو اپنے آگے سوار کر لیا اور فاطمہ کو عمران نے اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور یزی اور بمی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ وہ کشتیوں کے پُل سے نہیں گزر سکتے تھے۔ وہاں سنتریوں کا خطرہ تھا۔ انہوں نے ایک جگہ دیکھ لی جہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا اور گہرائی کم تھی۔ وہ دریا پار کر گئے۔ انہوں نے پیچھے دیکھا۔ اب شعلے درختوں کو بھی جلا کر آسمان تک پہنچ رہے تھے۔

"یہ آگ ہمیں یہ فائدہ دے گی کہ کسی کو ادھر ادھر کی ہوش نہیں رہے گی"۔ — عمران نے کہا۔ "راجہ جے پال کی اپنی بیٹیاں اغوا ہو گئیں تو وہ انہیں بھی نہیں ڈھونڈے گا"۔

صبح طلوع ہوئی تو جہاں ڈیڑھ میل کے علاقے میں راجہ جے پال کی فوج کی رسد اور جنگی سامان کے انبار لگے ہوئے تھے وہاں راکھ کے ڈھیر پڑے تھے۔ درخت بھی جل گئے تھے۔ ان میں سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لوگ ابھی تک سامان کو برباد پھینک رہے تھے کیونکہ یہ راجہ کا حکم تھا۔ مسلمانوں کے گھر لوٹے جا رہے تھے۔ راجہ نے رات کو ہی حکم دے دیا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لو اور وہاں سے جتنی نقدی اور زیور اور دولت ہاتھ آئے سرکاری خزانے میں جمع کرا دو اور فوج کے کام کا جو سامان

ملے اُٹھا لاؤ۔

رات کو جب عمران اور اس کے ساتھی بڑے پنڈت سے رشی کو چھین کر لے گئے تو پنڈت شہر کی طرف چل پڑا۔ وہ آگ سے بے نیاز اپنے مندر میں گیا اور اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آگ کی طرف چلا گیا۔ شہر کی ساری آبادی باہر آ گئی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں ہر انسان نظر آ رہا تھا۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ پنڈت اور اس کے آدمی عورتوں کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ پنڈت ایک جگہ رک گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ایک نوجوان لڑکی دکھائی اور خود پرے ہٹ گیا۔

کچھ دیر بعد کسی طرف سے گھوڑا گاڑیاں دوڑتی آئیں۔ عورتیں راستے سے ہٹنے کے لیے ادھر اُدھر ہٹیں۔ پنڈت کے ایک آدمی نے اس لڑکی کو پکڑ لیا جو پنڈت نے انہیں دکھائی تھی۔ دوسرے آدمی نے لڑکی کی ناک پر کپڑا رکھ دیا اور اسے دھکیلتے گھسیٹتے ہوئے اندھیرے میں لے گئے۔ انہیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ وہاں سے اٹھا کر مندر میں لے گئے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے اُسے بتوں والے مندر میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ رشی کی طرح سب کچھ دیکھتی تھی مگر اس کا دماغ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہندومت نہ کبھی مذہب کہلا سکا ہے نہ یہ آج مذہب ہے۔ یہ توہمات، رسومات اور تعصبات کا مرکب ہے، جسے اس کے پیشواؤں نے مذہب کہہ دیا تھا۔ اس نام نہاد مذہب میں خدا کا تصور پیدا نہ ہو سکا۔ بت پرستی، کمزوروں، بچوں اور عورتوں کی قتل و غارت، جنسی جذبات پرستی، دھوکہ فریب اور دیدہ دلیری اس مذہب کے اصول ہیں۔ اس کے پیشواؤں نے اپنی عیاشی کے لیے ایسے ایسے توہمات پیدا کیے جو ان کے پیروکاروں کے ذہن اور دل پر غالب آ گئے اور خدا کی بہت سی شکلیں گھڑ لی گئیں۔ لہٰذا چاند، سورج، گرہن، سیلاب، آگ، سانپ، ہنسا اور آسمانی بجلیوں وغیرہ کو انہوں نے مختلف دیوتاؤں سے منسوب کر کے ان کی پوجا شروع کر دی۔ آج تک یہ قوم سانپ کی پوجا کرتی ہے۔

راجہ جے پال اس آگ کو جو بٹھنڈہ کے جانبازوں نے لگائی تھی، اپنے دیوتاؤں کا قہر سمجھتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ یہ غزنی کے ہاتھوں [illegible] کی ہار کا نتیجہ ہے [illegible]

کی باتیں کرتا تھا کبھی کہتا "پنڈت کو بلاؤ۔ دیوتا سخت ناراض ہیں۔ ایک کی بجائے دو لڑکیوں کی قربانی دو۔ فوراً... جلدی" ــــ اور اس کے ساتھ ہی چلا چلا کر کہتا ــــ "مسلمانوں کے گھر جلا دو۔ ان کے گھر لوٹ کر فوج کو دے دو۔ ان کی عورتوں کو میرے سامنے لے آؤ۔"

دیوتاؤں پر اس کا حکم نہیں چل سکتا تھا۔ وہ جانباز جو رسد کے ذخیرے اور اس کے دل کو آگ لگا گئے تھے، وہ اس کی دسترس سے دور چلے گئے تھے۔ اس کے سامنے پانچ چھ مسلمان لڑکیاں کھڑی تھیں جو اُس کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ یہ شریف گھرانوں کی بیٹیاں تھیں جو مسلمانوں کو سزا دینے کے طور پر گھروں سے زبردستی راجہ کے پاس لے جائی گئی تھیں۔ راجہ تخت پر بیٹھا لڑکیوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن میں طنز بھی تھی اور ہوس بھی۔

"تم خوش قسمت ہو کہ خوبصورت ہو" ــــ راجہ جے پال نے لڑکیوں سے کہا "ورنہ میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرتا جس سے تمہاری قوم عبرت حاصل کرتی۔ میں تم پر رحم کرتا ہوں۔ تمہیں راج محل میں رکھا جائے گا۔ اپنے مذہب کو بھول جاؤ۔ جس روز تمہارے گھر والے ہمیں آ کر بتا دیں گے کہ آگ کس نے لگائی تھی، اُس روز تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ اُس وقت تک تم"... راجہ طنزیہ ہنسی ہنس پڑا۔

"ہمارا مذہب تمہارے مذہب کی طرح اتنا گھٹیا نہیں کہ ہم اسے تمہارے حکم سے بھول جائیں" ــــ ایک لڑکی نے کہا۔

"بکواس بند کرو لڑکی" ــــ ایک درباری نے گرج کر کہا "تم مہاراج کے دربار میں کھڑی ہو۔"

"مہاراج ہمارا خدا نہیں" ــــ ایک اور لڑکی نے کہا ــــ "کمزوروں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والا مہاراجہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کی بیٹیاں اس کی عزت کریں.... یاد رکھ مہاراجے! ہم ہنسی خوشی تمہارا ظلم و ستم سہہ لیں گی مگر تیرا انجام بہت بُرا ہوگا۔ تو زندہ جلے گا۔ تیرا کوئی دیوتا تجھے بچا نہیں سکے گا۔ تو دو بار شکست کھا چکا ہے۔ ایک نہیں ایک ہزار لڑکیاں اندر دیوی کے قدموں میں ذبح کر دے، شکست تیرے مقدر میں لکھ دی گئی۔ تو ہمیں سزا دے رہا ہے۔ ہمارا خدا تجھے سزا دے گا۔"

"لے جاؤ انہیں" ــــ راجہ جے پال نے حکم دیا۔

سپاہی لڑکیوں کو دھکیلتے گھسیٹتے لے گئے۔

سُلطان محمود غزنوی خراسان اور بخارا کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر چکا تھا مگر خانہ جنگی ابھی رکی نہیں تھی۔ اُس وقت خلافتِ بغداد کی گدی پر القادر باللہ عباسی بیٹھا تھا۔ اسلامی نظام کے مطابق تمام مسلمان سلطنتیں اور چھوٹی بڑی ریاستیں خلافت کے تحت آتی تھیں اور خلیفہ کے حکم کی تعمیل ان کے فرائض میں شامل تھی مگر اقتدار کی ہوس اور توسیع پسندی نے مسلمان حکمرانوں کے دلوں سے خلافت کا احترام نکال دیا اور آپس میں عداوت پیدا کر دی تھی۔ خلافت برائے نام مرکز بن کے رہ گیا تھا۔ سبکتگین نے خلافت سے رشتہ نہیں توڑا تھا۔ محمود نے بھی خلافت کی عظمت کو برقرار رکھا۔ خراسان اور بخارا کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر کے سلطان محمود نے خلیفہ کو ان الفاظ کا پیغام بھیجا:

"قوم نے پہلی خانہ جنگی میں جو زخم کھائے ہیں، وہ ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ مجھے پڑوس کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ایک اور جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے تھے اور خود ہی حکمران بن بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں صلح و صفائی کے پیغام بھیجے۔ انہیں غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کھیلنے سے روکا مگر میری امن پسندی کو انہوں نے میری بزدلی سمجھا۔ انہوں نے حالات اتنی جلدی خراب کر دیئے کہ میں آپ سے حکم نہ لے سکا۔ مجھے فوری طور پر جنگی کارروائی کرنی پڑی۔ یہ بظاہر خوش خبری ہے کہ میں نے خراسان اور بخارا کو ان باغیوں اور غداروں سے چھین کر سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا ہے مگر میں اسے خوشخبری نہیں سمجھتا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ہم آپس میں لڑے اور دونوں طرف وہ فوج ضائع ہوئی ہے جس سے ہمیں سلطنتِ اسلامیہ کا تحفظ کرنا تھا اور اسلام کے فروغ کے لیے کفرستان کو اسلام کے پرچم تلے لانا تھا....

"میں مردِ میدان ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ میری عمر میدانِ جنگ میں گزر جائے گی اور میری لاش کسی محاذ سے اٹھائی جائے گی۔ خدشہ یہ کہ میں اپنے بھائیوں کے خلاف

لڑتا ہوا مارا گیا تو میرا جہاد رائیگاں جائے گا اور میں خدا کے حضور سرخرو نہیں ہو سکوں گا۔ میں اپنی سلطنت کی توسیع نہیں اسلام کا فروغ چاہتا ہوں۔ مجھے تاج سر پر رکھ کر تخت پر بیٹھنے کی سلطنت ہی کب ملے گی۔ مجھے ہندوستان کے بت للکار رہے ہیں۔ راجہ جے پال ہندوستان کی تمام ریاستوں کی فوجوں سے غزنی پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں اُس کی طرف بڑھتا ہوں تو میرے مسلمان بھائی میری پیٹھ پیچھے وار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک ہو گئے ہیں....

"کیا آپ سلامانیوں، طبرستانیوں، غوریوں، اور ایلمانیوں کو بتا سکتے ہیں کہ ہم سب ایک اُمت ہیں؟ کیا وہ آپ کی بات ذہن نشین کر لیں گے کہ مرکز سے ٹوٹ کر کوئی ایک بھی مسلمان ریاست باقی نہیں رہ سکے گی؟.... خانہ جنگی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ مجھے آپ کی حوصلہ افزائی اور دعا کی ضرورت ہے۔ سلطنت غزنی کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ آپ میری مالی مدد نہیں کر سکتے۔ نہ میں آپ سے مالی مدد مانگوں گا۔ میرے لیے دعا کریں۔ میں اللہ سے مدد مانگتا ہوں۔"

بغداد سے خلیفہ القادر باللہ عباسی کا جواب آیا:

"آپ کا پیغام پڑھ کر مجھے افسوس ہوا ہے، حیرت نہیں ہوئی۔ ہماری یہ روایت نئی نہیں کہ اپنے اوپر حکمرانی کا نشہ طاری کر کے اپنے مذہب اور ملی اتحاد کو قربان کر دو۔ یہ لوگ جو آپس کے خون خرابے کا باعث بنے ہوئے ہیں، اسلام کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اپنے بھائیوں کا خون بہانے کے لیے عیسائیوں اور یہودیوں تک سے مدد لیتے ہیں۔ اُمتِ رسول اللہ کو اپنی رعایا بنانے کے لیے جھوٹ بول بول کر لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے، اکساتے اور خانہ جنگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہ ملعونی روایت بن گئی ہے اور یہی ہماری تاریخ بنے گی۔ قوم مسلم کے اُمرا تخت و تاج کے حصول کی خاطر قوم کو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنائے رکھیں گے۔ سلطنت اسلامیہ ریاستوں میں بٹتی چلی جائے گی۔ کفار انہیں مدد دیتے رہیں گے، جلتی پر تیل ڈالتے رہیں گے اور سلطنت کو ٹکڑوں میں کاٹتے چلے جائیں گے....

"یہ اُمرا اور حکمران سمجھ نہیں سکتے کہ مرکز سے کٹ کر ان کی حالت ویسی ہی ہو رہی ہے جیسی درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخوں کی ہوتی ہے۔ انہیں پتا پتا ہو کر بکھر جانا اور سوکھ جانا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاخیں اسی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہیں تو اسلام کا درخت سوکھ جائے گا....

"خانہ جنگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اگر آپ کو ایک فیصلہ کن خانہ جنگی لڑنی پڑے تو میں آپ کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کی نیت میں فتور نہ ہو۔ آپ قوم کو متحد کریں۔ آپ کا مقصد اسلام کا فروغ ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمان ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہندوؤں کے ڈر سے اور ان کی فریب کاریوں سے بھی اسلام سے دستبردار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ فرض سونپتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ ان کے وقار کا تحفظ کریں۔ ہندوستان کے بت توڑ کر وہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھیں.... اگر آپ کی نیت صاف ہوئی اور آپ کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ہوا تو اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ سلطانی کے لیے لڑنے والوں کو اگر کامیابی حاصل ہوتی بھی ہے تو وہ عارضی ہوتی ہے۔ دائمی فتح ان کی ہوتی ہے جو حق پر ہوتے ہیں۔"

اس پیغام کے ساتھ خلیفہ نے سلطان محمود کو افغانستان، سیستان اور خراسان کی سلطانی کی سند دے کر اسے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابات عطا کیے۔

مشہور مورخ اور وقائع نگار محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ راجہ جے پال کے دوسرے حملے کو روکنے میں اور اس کے فوراً بعد خانہ جنگی میں سلطان محمود کی فوج کا جہاں جانی نقصان ہوا وہاں مالی نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔ "فتح البلاد" "سفر نامہ ابونصر مشکی" اور ابوالفضل کی تحریریں شاہد ہیں کہ محمود کے دربار میں مختلف علوم کے جتنے عالم تھے، اور جتنی عمدہ فوج محمود کی تھی اور جتنی عمدہ انتظامیہ تھی، اس کی مثال اُس وقت تک کوئی اور مسلمان حکمران پیش نہیں کر سکا تھا، مگر فوج اور سول انتظامیہ کے اس اونچے معیار کو برقرار رکھنے پر بہت خرچ اٹھتا تھا۔ ہندوستان میں اور دور دراز پڑوس کے دیگر ممالک میں جو جاسوسی

نظام قائم کیا گیا تھا، اس کے اخراجات بھی خاصے زیادہ تھے یہی وجہ ہے کہ سلطان محمود کو مالی پریشانیوں نے گھیر لیا۔

انہی دنوں جب سلطان محمود غزنوی ایک طرف خانہ جنگی میں الجھا ہُوا تھا، دوسری طرف ہندوستان کا لشکر غزنی پر حملہ کرنے آ رہا تھا تیسری طرف مالی پریشانی اور چوتھی طرف یہ عالم کہ جن سے مالی اور فوجی مدد ملنی چاہیے تھی وہ اس کے دشمن ہو گئے تھے، ایک روز اس کے غزنی کے دربار میں دو اجنبی آئے۔ یہ سیستان کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے گاؤں کو پانی دُور سے ملتا تھا۔ انہوں نے گاؤں سے دُور ایک ویرانے میں کنواں کھودنا شروع کیا۔ زمین کی سطح کی حالت بتاتی تھی کہ پانی زیادہ گہرائی میں نہیں ہوگا اور زمین نرم ہوگی مگر تین ہاتھ نیچے تک کھدائی کی تو آگے زمین پتھر دل کی سخت ہوگئی۔

"سلطان خراسان و سیستان!" ۔۔۔ ایک مسافر نے کہا ۔۔۔ "اگر زمین صرف سخت ہوتی اور پتھر کی سلیں ہوتیں تو ہم کھدائی ترک کر دیتے۔ ہم حیران اس پر ہوئے کہ جس نے ہماری کدالوں کو روک لیا ہے وہ چمکتی ہوئی کوئی چیز ہے۔ یہ پتھر نہیں ہو سکتے۔ پتھروں میں ایسی چمک نہیں ہوتی۔ یہ کوئی دھات ہے اور یہ کسی پرانے بادشاہ کا مدفون خزانہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں مدفون خزانہ ہوتا ہے وہاں جنات اور خزانہ دفن کرنے والوں کی بدروحیں موجود رہتی ہیں۔ ہم یہ عرض لے کر آئے ہیں کہ اگر یہ خزانہ ہی ہے تو یہ بے نقاب ہو چکا ہے۔ گاؤں والوں پر خوف طاری ہے۔ کوئی بھی خزانے کے قریب نہیں جاتا۔ ہمیں ایک بزرگ نے کہا ہے کہ سلطان کو اطلاع دے دی جائے۔"

سلطان محمود نے اُسی وقت ان آدمیوں کے ساتھ اپنے دربار کے دو عالموں اور فوج کے دو چار حاکموں کو اس حکم کے ساتھ بھیج دیا کہ جنات اور بدروحوں سے ڈرنے کی بجائے مزید کھدائی کریں اور معلوم کریں کہ یہ کیا ہے۔

کچھ دنوں بعد سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ یہ مدفون خزانہ نہیں بلکہ سونے کی کان ہے جو سطح زمین سے صرف چار پانچ ہاتھ نیچے ہے۔ اس کی کھدائی کی گئی تو محمد قاسم فرشتہ اور گردیزی کے مطابق خاصے وسیع علاقے میں سونا برآمد ہُوا۔ اس کان کی شکل درخت

کی سی تھی جیسے درخت گرا کر زمین میں دفن کیا گیا ہو۔ کان درخت کے ٹہنوں اور ٹہنیوں کی طرح پھیلی ہُوئی تھی۔ یہ خالص سونا تھا جو کسی بادشاہ کا مدفون خزانہ نہیں بلکہ زمین کا معدنی خزانہ تھا۔

مذکورہ مؤرخ لکھتے ہیں کہ محمود کے دورِ حکومت میں اس کان سے سونا نکلتا رہا۔ اُس کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہُوا تو وہ اپنے باپ کے اُلٹ ثابت ہُوا۔ اس نے اپنے آپ کو روایتی بادشاہ بنا لیا۔ سلطان محمود نے سلطنت غزنی کو خدا کے جس راستے پر ڈالا تھا، وہ راستہ اس کے بیٹے کے دور میں عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ سونے کی اس کان کی دولت رقص و سرود اور جام و مینا میں اڑنے لگی۔ ایک رات شدید زلزلہ آیا۔ زلزلے کا مرکز یہی مقام تھا جہاں سے سونا برآمد ہو رہا تھا۔ وہاں سے زمین پھٹ گئی۔ پھر زمین بیٹھ گئی، اور کان کا پورا علاقہ زمین کے پیٹ میں چلا گیا۔ مسعود نے دور گہرائی تک زمین کھدوا ڈالی لیکن اُسے مٹی اور پتھروں کے سوا کچھ نہ ملا۔

یہ کان جب برآمد ہُوئی تھی اور سلطان محمود غزنوی کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ خالص سونا ہے تو وہ اپنے پیر و مرشد ابوالحسن خرقانی کے ہاں حاضری دینے گیا اور انہیں بتایا کہ اُس کے باپ نے اس کی پیدائش سے پہلے خواب میں ایک درخت دیکھا تھا جو گھر کے ایک کمرے سے اُگا۔ اٹھا، چھت پھاڑ کر اوپر گیا اور اس نے آدھی دنیا پر اپنے ٹہنوں اور ٹہنیوں کا چھاتہ پھیلا دیا تھا۔

"۔۔۔ اور اس کے بعد میں پیدا ہُوا" ۔۔۔ محمود نے کہا ۔۔۔ "اس خواب کی تعبیر یہ بتائی گئی تھی کہ میں دُور دُور تک اسلام کی روشنی پھیلاؤں گا۔ اب سونے کی جو کان برآمد ہُوئی ہے اس کی شکل بھی درخت کی سی ہے۔ کان گہرائی میں نہیں گئی۔ سطح زمین کے ساتھ ساتھ درخت کی شاخوں کی طرح پھیلی ہُوئی ہے۔ پیر و مرشد مجھے بتائیے کہ یہ خدائے ذوالجلال کا کوئی اشارہ ہے؟ کیا ہے؟"

"جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں"

—— ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "اور جو تمہارے دل میں ہے خدا کو اس کا بھی علم ہے۔ خدا تمہارے متعلق وہ بھی جانتا ہے جو تم خود بھی نہیں جانتے۔ درخت ایک اشارہ ہے جو تم نہیں، ہر سلطان اور بادشاہ کو سمجھنا چاہیے۔ خدا ایسے اشارے صرف انہیں دیا کرتا ہے جو اس کے رسولؐ کی اُمت سے ہیں۔ تم نے اگر دل میں خدا اور اُس کے رسولؐ کو جگہ دے رکھی ہے تو اُس کے اشارے کو سمجھو۔ تم نے خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ تم نے انہیں بھی شکست دی جو مسلمان ہوتے ہوئے دینِ مسلم سے منحرف ہوئے اور تخت و تاج کی خاطر حزب اللہ کا خون حزب اللہ کے ہاتھوں بہایا۔ تم نے فتح پائی مگر اتنے بدحال ہوئے کہ درہم و دینار کے محتاج ہوئے۔ تم نے کہا کہ صرف اللہ سے مدد مانگوں گا۔ پس اللہ نے تمہاری مدد کی۔ اپنی زمین کا سینہ چیر کر تیری جھولی بھر دی اور سونا درخت کی شکل میں دیا.....

" ہر سلطان کو درخت کی مانند ہونا چاہیے۔ ایسے درخت کی مانند جو دُھوپ کے جھلسے ہوئے انسانوں کو ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتا ہے۔ زندگی کے کٹھن سفر کے تھکے ہوئے لوگ درخت کے نیچے آ گرتے اور ستاتے ہیں۔ تھکن سے چُور جسم تروتازہ ہو جاتے ہیں تو مسافر پہلے سے زیادہ کٹھن سفر کے قابل ہو جاتے ہیں۔ درخت اپنی روزی زمین سے حاصل کرتا ہے۔ انسان کا خون نہیں چوستا۔ زمین سے نمی لیتا اور لوگوں کو چھاؤں دیتا ہے۔ لوگوں سے لیتا کچھ نہیں ..... محمود! ٹھنڈی چھاؤں والے گھنے درخت کو تصور میں لاؤ۔ اس کی خوبیاں تمہارے سامنے نکھر آئیں گی۔ خدا کا یہ اشارہ نہیں حکم ہے کہ اپنے آپ میں یہ خوبیاں پیدا کرو۔ یہ ذہن میں رکھو کہ انسان بُرا بھی ہے اور اچھا بھی۔ درخت کو کاٹ لیتا ہے۔ درخت انسان کو نہیں کاٹتا۔ درخت کٹ جائے تو انسان کے کام آتا ہے۔ اس کا پلنگ بنتا ہے۔ اندھے اور لنگڑے کی لاٹھی بنتا ہے۔ سلطان کا تخت بنتا ہے .....

" مگر یاد رکھو محمود! جب سلطان اپنے آپ کو انسانوں کا حاکم اور روزی رساں بنا کر اپنے آپ کو درخت کی صفات سے محروم کر لیتا ہے تو تخت الٹتے دیر نہیں لگتی۔ انسان کو دو چیزیں شیطان بناتی ہیں۔ سونا اور سلطانی۔ وہ انسان بھی شیطان بن جاتا ہے جسے یہ دونوں چیزیں تو حاصل نہ ہوں لیکن وہ اپنے دل میں ان کی ہوس پیدا کر لے۔ جس سر پہ

سلطانی کی دستار رکھ دی جائے وہ سر جتنا خدا کے آگے جھکے اتنا ہی بندوں کے آگے جھکے۔ اگر نہیں تو ایسے سلطان کے رکوع و سجود رائیگاں جاتے ہیں کیونکہ یہ دکھاوے کے ہوتے ہیں، اللہ کے بندوں کو فریب دینے کے لیے ہوتے ہیں جس نے اللہ کے بندوں کو جسمانی اور روحانی بھوک دی وہ اللہ کے حضور جا کر دوزخ کو روانہ ہوا جہاں اس کی رعایا کی آہیں اور فریادیں اور رنج و آلام جو سلطان نے دیئے، وہ سب انگارے بن کر اسے جلاتے رہیں گے، بچھو بن کر اُسے ڈستے رہیں گے .....

" تُو نے خدا سے مدد مانگی۔ خدا نے تجھے مدد دی مگر دیکھ اور سوچ کہ تُو خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر نہیں، آسمان سے اتارا ہوا فرشتہ نہیں، پھر خدا نے اپنی زمین کا سینہ چاک کر کے تیری سلطنت کو سونے میں کیوں نہلا دیا؟ یہ سونا تیرا نہیں، تیری سلطنت کا ہے۔ یہ سونا تیری سلطنت کی توسیع کے لیے ہے۔ اگر تُو تخت و تاج کے نشے میں بھول جائے گا کہ تیرے فرائض کیا ہیں اور بندوں کے کتنے حقوق تیرے سر ہیں تو زمین اپنی دولت نگل لے گی۔ جو خدا دیتا ہے وہ لے بھی لیتا ہے۔ اس اشارے کو سمجھو محمود!"

اپنے پیر و مرشد ولی ابوالحسن خرقانی سے روحانی فیض حاصل کر کے سلطان محمود نے اپنی توجہ سلطنت کی انتظامیہ اور فوج پر مرکوز کر دی۔ اس نے قوم کو اتنا خوشحال کر دیا کہ لوگ اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیجنے لگے۔ سلطان محمود نے حقوق العباد پر سب سے زیادہ توجہ دی۔

سلطان محمود کو ہندوستان کی اطلاع کا انتظار تھا۔

" اُدھر سے کوئی اطلاع نہ آنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ راجہ جے پال شکست تسلیم کر کے بیٹھ گیا ہے"۔۔۔ سپہ سالار نے کہا۔ "اس صورت میں ہمیں ہندوستان پر حملے کی تیاری کرنی چاہیے۔"

" وہ حملہ ضرور کرے گا"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میں اُس کے ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ ایسے حملے سے

دُور ہمارے میدان میں آکر لڑے۔ اگر مجھے اس کی پیشقدمی کی اطلاع قبل از وقت مل گئی تو میں اسے اپنی پسند کے میدان میں لڑاؤں گا۔"

"اب تک لاہور سے کسی نہ کسی کو آجانا چاہیے تھا" ___ سپہ سالار نے کہا ___ "ہمارے آدمی پکڑے نہ گئے ہوں۔"

"چند دن اور انتظار کرلو" ___ سلطان محمود نے کہا ___ "اگر کوئی اطلاع نہ آئی تو میں یہاں سے آدمی بھیج دوں گا۔"

لاہور سے اطلاع جا رہی تھی۔ عمران بلاذری، نظام اوریزی، قاسم بلخی اُس رات جگ موہن، اس کی بہن رشی اور فاطمہ کو ساتھ لے کر لاہور سے نکلے تھے جس رات بھٹنڈہ کے جاسوس جانبازوں نے لاہور میں راجہ جے پال کی رسد کو نذرِ آتش کیا تھا۔ بڑے پنڈت نے رشی کی جگہ اسی رات ایک اور لڑکی اغوا کروالی تھی اور اسے ٹیلوں والے مندر میں پہنچا دیا تھا۔ یہ لڑکی ہوش میں تھی۔ سب کو دیکھتی تھی۔ اسے جو کہتے تھے وہ کرتی تھی۔ ایک پنڈت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا رہتا تھا ___ "مجھے اندرا دیوی کے چرنوں میں قربان کردو ... مہاراج جے پال کے ماتھے پر میرے خون کا تلک لگا دو ... میرے خون کی چمک دشمن کو اندھا کر دے گی۔"

یہ ایک پُراسرار سا عمل تھا جس میں سے لڑکی کو گزارا جا رہا تھا۔ اُس کے گرد اُسی کی عمر کی لڑکیاں ناچتی اور گاتی رہتی تھیں۔ لڑکی کو خاص قسم کی غذا دی جاتی تھی اور اسے کوئی ایسی چیز کھلائی جاتی تھی جس کے اثر سے اُس کا ذہن اپنے قبضے میں نہیں رہا تھا۔ تین چار دنوں بعد اُس نے وہی کہنا شروع کر دیا جو اس کے ذہن میں ڈالا جاتا رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر ہپناٹائز ہو چکی تھی۔

ایک روز راجہ جے پال کو پنڈت ٹیلوں والے مندر میں لے گئے۔ اُسے پنڈتوں اور سادھوؤں کے جلوس میں مندر کے اندر کئی ہاتھوں والی دیوی کے بُت کے آگے لے جا کر دوزانو بٹھا دیا گیا۔ مندر کی کنواریوں نے اُس پر پھول نچھاور کیے۔ پنڈتوں نے بھجن گائے۔ لڑکی کو ایسے لباس میں راجہ کے سامنے لایا گیا جس میں وہ پری لگتی تھی۔ لڑکی نے بازو پھیلا کر کہا ___ "مجھے اندرا دیوی کے چرنوں میں قربان کر دو۔ مہاراج جے پال کے ماتھے پر میرے

خون کا تلک لگا دو۔"

لڑکی نے اس عمل کے زیرِ اثر جو اس پر کیا جا رہا تھا، سر جھکا دیا۔ ایک پنڈت نے راجہ جے پال کی نیام سے تلوار نکالی۔ اسے راجہ کے سر پر پھیرا اور ایک ہی وار سے لڑکی کا سر اُس کے تن سے جُدا کر دیا۔ مندر کے گھڑیال اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔ تمام پنڈت، سادھو اور لڑکیاں ہاتھ جوڑ کر دیوی کے بت کے آگے جھک گئیں۔ بڑے پنڈت نے لڑکی کے خون میں انگلی ڈبو کر راجہ جے پال کے ماتھے پر خون کا تلک لگا دیا۔

راجہ جب ان پُراسرار اور ڈراؤنے ٹیلوں سے باہر آیا تو اُس کی گردن تنی ہوئی تھی اور چہرے پر ایسی رونق جیسے اس نے غزنی کی سلطنت فتح کر لی ہو اور محمود غزنوی نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ اس نے اُسی روز جلے ہوئے سامان کی کمی پوری کرنے کے احکام جاری کر دیئے جو اتنے سخت تھے کہ اس کی ریاست کے گھر خالی ہو گئے۔ کسانوں کے ہاں اتنا ہی اناج رہنے دیا گیا کہ وہ صرف زندہ رہ سکیں۔ ہندو رعایا کو پہلے ہی راجہ کا خزانہ بھر رہی تھی۔ مندروں میں پنڈتوں نے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف ایسی نفرت بھر دی تھی کہ اسے مذہب کا فریضہ اور جنون بنا دیا گیا۔ ہندو عورتوں نے زیورات تک راجہ کو دے دیئے۔ راجہ خود ہندو ریاستوں کے مہاراجوں سے ملنے اور فوجی مدد لینے کو نکل کھڑا ہوا۔ اُس نے جیسے قسم کھائی تھی کہ اب کے وہ شکست کھا کر نہیں آئے گا اور غزنی کو ہر قیمت پر اپنی راجدھانی بنائے گا۔

عمران کا قافلہ جس میں نظام اوریزی، قاسم بلخی، جگ موہن، رشی اور فاطمہ شامل تھے، راوی پار کر کے رات بھر چلتا رہا اور وہ لاہور سے بہت دور نکل گئے۔ عمران جاسوس تھا۔ راستوں سے واقف تھا۔ اپنے قافلے کو عام راستے سے دور ہٹ کر لے جا رہا تھا۔ ایک گھنے جنگل میں صبح طلوع ہوئی۔ رشی گھوڑے پر ہی سو گئی تھی۔ عمران نے سب کو وہیں آرام کے لیے روک لیا۔ سب رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کو بھی آرام، چارے اور پانی کی ضرورت تھی۔ ان کا سفر بہت لمبا تھا اور یہ مسافت چوری چھپے طے کرنی تھی۔ رشی کو گھوڑے سے اتارا گیا تو بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ اسے

لٹا دیا گیا۔ سب لیٹ گئے اور فوراً ہی گہری نیند سو گئے۔

کچھ دیر بعد فاطمہ نے عمران بلاذری کو جگایا اور اُسے پرے لے گئی۔

"تم اس ہندو لڑکی کو بھی ساتھ لے جا رہے ہو اور مجھے بھی" — فاطمہ نے کہا — "میرا مستقبل کیا ہوگا؟"

"اس وقت میرے سامنے سلطنت غزنی کا مستقبل ہے" — عمران نے جواب دیا — "اپنے ملک میں پہنچ کر تمہارے مستقبل کے لیے سوچوں گا۔ میرے فرض کے راستے میں نہ آؤ"۔

"میرے دل میں وہم بھر گیا ہے اور یہ مجھے ڈرا رہا ہے" — فاطمہ نے کہا "تم اپنے ملک کا فرض ادا کر رہے ہو۔ میں نے تمہاری جو مدد کی ہے وہ تمہاری خاطر کی ہے۔ میں نے جو گناہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، اس کا کفارہ اسی طرح ادا کیا ہے جس طرح تم نے کہا تھا۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں رشی مل گئی ہے مگر تم مجھے نہیں مل سکو گے۔ اسے تم اپنے لیے لے جا رہے ہو"۔

"کیا تمہاری روح کو چین نہیں آیا؟" — عمران بلاذری نے پوچھا — "یہی رشی تمہیں عزازیل بن کر ڈرا رہی ہے۔ اب یہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہیں اس سے ڈر تو نہیں آتا؟ تمہاری روح پر اب گناہ کا کوئی بوجھ نہیں رہا"۔

"میرے ساتھ روح کی باتیں نہ کرو عمران!" — فاطمہ نے نیند اور تذبذب سے بوجھل آواز میں کہا — "میرا جسم بیچا گیا تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ جو کچھ ہے جسم ہے"۔

"سنو فاطمہ!" — عمران نے جھنجھلا کر کہا "معلوم ہوتا ہے ہماری راہیں جدا ہیں۔ ہماری منزلیں جدا ہیں۔ میں تمہیں اپنا بھید بتا دیتا ہوں۔ میں خدا کی راہ میں لڑنے والا سپاہی ہوں۔ میں تمہارے ملک کا رہنے والا نہیں، میں غزنی کے علاقے کا باشندہ ہوں اور میں غزنی کا جاسوس ہوں۔ یہ دونوں مسلمان اُسی فوج کے عہدیدار ہیں جس نے راجہ جے پال کو دو بار شکست دی ہے۔ یہ دونوں پکڑے گئے تھے اور

وہ یہیں راجہ کی قید میں تھے۔ میں نے انہیں فرار کرایا ہے۔ تم جسم کے حسن اور جسم کی خواہشات پر قربان ہوئی جا رہی ہو۔ ہم جسمانی خواہشات قربان کر چکے ہیں۔ یہ بہن بھائی ہندو ہیں اور اپنے مذہب سے منحرف ہو چکے ہیں۔ یہ فرض بھی میں نے اپنے اوپر لیا تھا کہ انہیں کفر سے نکالوں۔ اب تمہیں ثابت کرنا ہے کہ اسلام ایک عظیم مذہب ہے۔ اب جسم کی باتیں چھوڑ دو۔ ہم دشمن کے ملک سے گذر رہے ہیں۔ موت ہمارے تعاقب میں ہے۔ تمہیں اپنے مذہب کی عظمت پر قربان ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے"۔

عمران جذباتی انداز سے حقیقت کی باتیں کر رہا تھا مگر فاطمہ کے چہرے پر اکتاہٹ سی تھی جیسے عمران کی بات اس کی سمجھ سے بالا ہو، یا وہ سمجھنا ہی نہ چاہتی ہو۔ اُس کے خیالوں میں اپنا ماضی تھا جس میں وہ عمران کے حال اور غزنی کے مستقبل کو فنا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی بات کی تو دیکھا کہ عمران اُس کی طرف متوجہ نہیں۔ اس کی نظریں اپنے سامنے کہیں اور جمی ہوئی تھیں۔ عمران کے منہ سے سرگوشی نکلی — "رشی" — اور وہ اٹھ کر چل پڑا۔ فاطمہ نے دیکھا۔ رشی آہستہ آہستہ اس طرح چلی آ رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔

عمران آہستہ آہستہ چلتا اُس کی طرف گیا۔ رشی نے قریب آ کر باہیں عمران کے گلے میں ڈال دیں، پھر چہرہ اس کے سینے سے لگا کر بچے کی طرح گال اس کے سینے سے رگڑنے لگی۔ عمران نے اُس کا سر اٹھایا۔ فاطمہ قریب بیٹھی دیکھ رہی تھی اور اُس کا خون کھول رہا تھا۔

"میں کہاں تھی؟" — رشی نے حیرت زدہ سرگوشی کی — "تم کہاں تھے؟ ہم کہاں ہیں؟ میرا بھائی اور دو آدمی وہاں پڑے ہیں۔ وہ زندہ ہیں؟" — اُس نے فاطمہ کو دیکھا تو عمران سے الگ ہو کر بولی — "یہ کون ہے؟ تمہاری بہن تو نہیں ہو سکتی۔ اسے کہاں سے لائے ہو؟"

"ہوش ٹھکانے کرو رشی! سب کچھ بتا دوں گا" — عمران نے کہا اور اسے بٹھا لیا — "ہم تمہیں پنڈتوں سے چھین لائے ہیں"۔

"یاد آ گیا ہے" — رشی نے کہا — "مجھے پنڈت دیوی پر قربان کرنے کے

لئے لینے آ رہے تھے، پھر معلوم نہیں کیا ہوا تھا ... وہ کہاں ہیں؟ میں شاید خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"اس لڑکی کا نام فاطمہ ہے" ــ عمران نے کہا ــ "یہ ہماری مدد نہ کرتی تو ہم وہاں تک کبھی بھی نہ پہنچ سکتے جہاں تمہیں دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔"

عمران بلاذری نے اُسے تفصیل سے بتا دیا کہ اسے پنڈت کس طرح اور کہاں لے گئے تھے اور اسے وہاں سے آزاد کرانے کے لیے کس طرح فاطمہ کو استعمال کیا گیا تھا۔ عمران نے یہ بھی اسے بتا دیا کہ فاطمہ ایسے بوڑھے خاوند سے بھاگی ہے جس کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں۔ رشی کو فاطمہ اس لحاظ سے تو اچھی لگی کہ اُس نے اُسے موت کے منہ سے بچایا ہے مگر اس کی عمر، اس کی شکل و صورت اور جسم کا حسن دیکھ کر رشی کے دل میں عمران کے متعلق وسوسے پیدا ہو گئے۔ وہ فاطمہ کو شکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اتنے میں نظام اوریزی اور جگ موہن آ گئے۔ وہ رشی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ رشی کے دماغ سے اُس دوائی کا اثر اُتر چکا تھا جو اسے بتوں والے مندر میں پلائی جاتی رہی تھی۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا وہ کہاں رہی ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے۔

"دوستو!" ــ عمران نے کہا ــ "ہمارے سامنے بڑی ہی لمبی اور بڑی خطرناک مسافت ہے۔ میرے پاس سونے کے کچھ سکے ہیں جو راستے میں کام آئیں گے لیکن ہم جنگل سے ہی پانی اور خوراک حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ رشی مل گئی تو ہم واپس نہیں آئیں گے" ــ جگ موہن نے کہا ــ "اس لیے میں گھر سے بہت کچھ چرا لایا ہوں" ــ اُس نے کپڑوں کے نیچے کمربند کے ساتھ بندھی ہوئی ایک تھیلی کھولی۔ اس میں نقدی کے علاوہ رشی کے زیورات تھے۔

فاطمہ کو بھی عمران نے کہا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا اس لیے وہ بھی نقدی اور زیورات اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ نظام اوریزی نے مسلمانوں کے دستور کے مطابق عمران کو میر کارواں قرار دے دیا اور کہا کہ یہ تمام زرِ زادِ راہ عمران کے حوالے کر دیا جائے

اور اب منزل تک اسی کا حکم چلے گا۔ سب نے یہ فیصلہ منظور کر کے نقدی اور زیورات عمران کے حوالے کر دیئے۔ یہ اچھا خاصا خزانہ تھا۔ اس میں چاندی کے سکے بھی تھے۔ وزن اتنا تھا جو کمربند کے ساتھ باندھ کر نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ چمڑے کی ایک تھیلی میں ڈال دیا گیا اور تھیلی عمران نے اپنی تحویل میں لے لی۔ اس نے سب کو خبردار کر دیا کہ راستے میں ڈاکوؤں کا خطرہ ہے۔ اس تھیلی کے علاوہ ڈاکوؤں کے لیے دوسری کشش دو لڑکیوں کی تھی جو عمر اور حسن کے لحاظ سے ہر کسی کی نظروں کو گرفتار کر لیتی تھیں۔ ڈاکوؤں، رہزنوں اور راجہ کے مخبروں سے بچنے کا طریقہ یہ تھا کہ رات کو سفر کیا جائے۔ چونکہ غزنی جلدی پہنچنا تھا اس لیے کم سے کم آرام اور قیام کرنا تھا۔

سورج غروب ہو گیا تو وہ چل پڑے۔ فاطمہ عمران کے پیچھے سوار ہوئی اور رشی جگ موہن کے پیچھے۔ چلتے چلتے قاسم بلخی نے اپنا گھوڑا پیچھے کر لیا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ نظام اوریزی کی بھی یہی مشکل تھی۔ صرف عمران تھا جو ان کی زبان سمجھتا اور بولتا تھا اور وہ ہندوستان کی زبان بھی اپنی مادری زبان کی طرح روانی سے بول سکتا تھا۔ بلخی کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر نظام اوریزی نے بھی گپ شپ لگانے کے لیے اپنا گھوڑا پیچھے کر کے قاسم بلخی کے ساتھ کر لیا۔ بلخی نے گھوڑا اور آہستہ کر کے عمران وغیرہ سے زیادہ فاصلے پر کر لیا۔

"کیا تم اس عمران پر اعتماد کر سکتے ہو جو دو جوان لڑکیاں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟" ــ قاسم بلخی نے اوریزی سے پوچھا ــ "تم نے اتنا زیادہ خزانہ بھی اس کے حوالے کر دیا ہے۔ یہی دو چیزیں انسان کا ایمان برباد کیا کرتی ہیں ... سونا اور حسین عورت۔"

"اگر عمران قابلِ اعتماد نہ ہوتا تو ہمیں فرار کرانے کی بجائے اس ہندو لڑکی کو پنڈتوں کے قبضے میں جلنے سے پہلے ہی اپنے ساتھ لے کر لاہور سے غائب ہو گیا ہوتا" ــ نظام اوریزی نے کہا ــ "فاطمہ کو اس نے غیر معمولی دانشمندی سے استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ لڑکی اپنے خاوند سے بھاگنا چاہتی تھی، اس لیے عمران نے سلطنت کے فائدے کے پیشِ نظر فاطمہ کو خاوند سے نجات دلائی ہے۔"

"ان دونوں لڑکیوں کا غزنی کی سلطنت کے نفع و نقصان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" — قاسم بلخی نے کہا — "یہ اس شخص کی عیاشی کا ذاتی انتظام ہے اور اس کے اخراجات یہ سلطنت کے خزانے سے پورے کر رہا ہے۔ مجھے اس پر اعتماد نہیں۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ فاطمہ خاوند والی عورت ہے۔ جب تک طلاق نہ لے، اس کی شادی کسی اور کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ تم دیکھ لینا عمران اسے اپنی داشتہ بنا لے گا اور اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کرے گا۔"

"مجھے تمہاری باتوں سے بد اعتمادی کی نہیں حسد کی بو آ رہی ہے" — نظام اورویزی نے کہا — "تم اپنا دھیان ان لڑکیوں سے ہٹا لو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ قید سے ہماری رہائی ہماری کتنی بڑی خوش نصیبی ہے۔ ہمیں اس کافر راجے کے قید خانے میں تڑپ تڑپ کر مرنا تھا۔ مجاہد میدانِ جنگ میں مرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں غزنی پہنچ کر اپنی فوج میں شامل ہونا اور ہندوستان کے کفار کے خلاف لڑنا ہے۔ عمران کسی کو داشتہ رکھتا ہے، کسی کے ساتھ شادی کرتا ہے، ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔"

"ہم فوج کے عہدیدار ہیں" — قاسم بلخی نے کہا — "عمران کا رتبہ ہم سے کم ہے۔ میں اس کے ذاتی کردار کی اصلاح کر سکتا ہوں۔"

"ہم اسے اس سفر میں اپنا امیر مقرر کر چکے ہیں" — نظام اورویزی نے کہا — "اس نے کوئی غلط حرکت کی تو ہم اسے روکیں گے مگر اس کی ذاتی سطح پر ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہمیں صحیح سلامت اور بہت جلد غزنی پہنچنا اور سلطان کو خبردار کرنا ہے کہ وہ راجہ جے پال کا حملہ روکنے کی تیاری کر لے۔"

"تم سادہ لوح انسان ہو" — قاسم بلخی نے کہا — "یہ شخص ہمیں دھوکہ دے گا۔"

اُدھر فاطمہ عمران بلاذری کے پیچھے سوار اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ اُس کا جسم گھوڑے کی چال کے ساتھ عمران کے جسم سے مس کرتا جا رہا تھا۔ عمران محسوس کر رہا تھا کہ فاطمہ کی باتوں میں نشے کی کیفیت ہے۔

"تمہیں یہ ہندو لڑکی کیسی آتی اچھی لگتی ہے؟" — فاطمہ نے پوچھا — "وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت تو نہیں۔"

"فاطمہ!" — عمران نے کہا — "میں جو باتیں تمہیں کر چکا ہوں انہیں دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمان عورت کو غیر مسلم عورت سے مختلف اور بلند ہونا چاہیئے۔ میں اس وقت جسم سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ تم بہت حسین ہو۔ تمہارا جسم آگ کی مانند ہے جو مجھ جیسے جوان آدمی کے دین و ایمان کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے اور تم کوشش کر رہی ہو کہ میں تمہاری آگ کی لپیٹ میں آ جاؤں لیکن میں دنیادی لذتوں سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ میرے ساتھیوں نے مجھے اپنا امیر منتخب کیا ہے۔ میں نے اپنی خواہشات اور اپنے جذبات قافلے پر قربان کر دیئے ہیں۔ امیر مختصر قافلے کا ہو یا پوری قوم کا، اسے اپنی ذات، اپنی خواہشات اور اپنی تمناؤں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اُس کے ذہن میں دوستی اور دشمنی کا تصور بھی بدل جاتا ہے۔ اُسے قافلے اور قوم کے مفادات دیکھنے پڑتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ قوم کا مجرم ہے، غدار ہے۔"

"تم پتھر کے بُت ہو" — فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا — "بے جان بُت جن کی پوجا اتنی خوبصورت ہندو عورتیں کرتی ہیں مگر تراشے ہوئے ان پتھروں کے اندر نہ کوئی احساس پیدا ہوتا ہے نہ کوئی جذبہ۔"

اور عمران یوں ہنس پڑا جیسے اُس نے حسین پجاریوں اور پتھر کے بتوں کا مذاق اڑایا ہو۔

اُسی روز کا ذکر ہے کہ ایک پڑاؤ میں فاطمہ عمران کے سامنے اپنے اُبلتے کھولتے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی مگر عمران کا رویہ وہی تھا جو پہلے روز تھا۔

"تم پتھر ہو" ــ فاطمہ نے دیوانگی کی کیفیت میں عمران کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا ــ "تم مٹی کی ڈھیری ہو" ــ اور وہ اٹھ کر پرے چلی گئی۔

قافلہ پشاور سے ہٹ کر گزرتا اُن پہاڑیوں میں داخل ہو چکا تھا جہاں آج کا درہ خیبر ہے۔ عمران اس راستے سے واقف تھا۔ اس سلسلۂ کوہستان میں پانی کی قلت تھی۔ عمران اس میں داخل ہونے سے پہلے ایک گاؤں میں جا کر قافلے کے کھانے کی چیزیں لے آیا تھا۔ اُس نے سب کو خوشخبری سنائی تھی کہ اب وہ محفوظ علاقے میں آ گئے ہیں جہاں پکڑے جانے کا خطرہ نہیں رہا۔

اسی علاقے میں انہوں نے قیام کیا۔ موسم گرمیوں کا تھا اور یہ پہاڑ بے آب و گیاہ تھے۔ دن کے وقت ان سے شعلے نکلنے لگتے تھے۔ پتھر دہکتے انگاروں کی طرح گرم رہتے تھے۔ آدھی رات تک قافلہ چلتا رہا، پھر آرام کے لیے رک گیا۔ گھوڑے الگ باندھ دیئے گئے۔ سب ادھر اُدھر لیٹ گئے۔ عمران ہر رات کی طرح سب سے ہٹ کر لیٹا۔ تھکن نے سب کو فوراً سلا دیا۔ چاند جو آدھی رات کے بعد اوپر آیا کرتا تھا، پہاڑیوں کے عقب میں اُبھر رہا تھا۔

قاسم بلخی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اپنے قریب سے ایک سایہ گزرتے دیکھا۔ بلخی اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے ہم سفر اُس سے دور دور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ قاسم بلخی نے سرگوشی کی ــ فاطمہ! ــ سایہ رک گیا۔ وہ فاطمہ ہی تھی مگر قاسم بلخی فاطمہ کے علاوہ اور کوئی ایسا لفظ نہیں بول سکتا تھا جو فاطمہ سمجھ سکتی۔ اس نے اشاروں میں اپنا مدعا فاطمہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس طرف اشارہ کیا جدھر عمران سویا ہوا تھا، پھر نفرت کا اظہار کیا۔ اُس نے اشارے کیے جو فاطمہ سمجھ گئی۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ عمران اچھا آدمی نہیں اور وہ اسے (فاطمہ کو) دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ رشی کے ساتھ شادی کرے گا۔ یہ فاطمہ نے اپنے اتنے قیمتی زیورات عمران کو دے کر غلطی کی ہے۔

قاسم بلخی نے اُسکے ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیے، پھر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ فاطمہ کے دہکتے ہوئے جذبات نے اس کے جسم کو تنور بنا رکھا تھا جس میں اس کی روح جل گئی تھی۔ فاطمہ ان اشاروں کو سمجھ گئی۔ بلخی نے اُسے اس طرح اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا جس طرح وہ عمران کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لینے کو بیتاب رہتی تھی۔ قاسم بلخی کے بازوؤں کا گھیرا اور تنگ ہوا تو فاطمہ کے ذہن میں عمران کی تصویر دھندلی ہونے لگی۔

قاسم بلخی اُسے ذرا اور پرے لے گیا اور ایک جگہ بٹھا کر دبے پاؤں عمران کے قریب چلا گیا۔ عمران تھکن اور جوانی کی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ چمڑے کی وہ تھیلی جس میں سونے کے سکوں اور زیورات کی شکل میں زادِ راہ بند تھا، عمران کے سر کے قریب پڑی تھی۔

بلخی نے نہایت آہستہ آہستہ تھیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھیلی اٹھا لی۔ عمران کی آنکھ نہ کھلی۔ بلخی جس طرح دبے پاؤں آیا تھا اسی طرح دبے پاؤں چلا گیا۔ اُس نے فاطمہ کو تھیلی دی اور اُسے اپنے ساتھ گھوڑوں تک لے گیا۔ گھوڑے کچھ دور بندھے تھے۔ بلخی نے دو گھوڑوں پر زینیں ڈالیں۔ ایک گھوڑے کی لگام فاطمہ کے ہاتھوں میں دی، دوسرے کی خود پکڑی اور نہایت آہستہ آہستہ دونوں چل پڑے۔

کچھ دور پیدل چلے۔ قاسم بلخی نے فاطمہ کو گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ گھوڑسواری نہیں کر سکتی۔ بلخی نے اس کے گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ لی اور فاطمہ کو اپنے گھوڑے پر اپنے آگے سوار کر لیا۔ تھیلی فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ بلخی نے ایک بازو فاطمہ کے گرد لپیٹ کر اُس کی پیٹھ اپنے ساتھ لگا لی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اُسے اب بھاگنا تھا۔ دو گھوڑے سرپٹ دوڑے تو ان کے ٹاپوؤں کی آواز بے آب و گیاہ وادیوں میں گونجی۔

سب سے پہلے عمران کی آنکھ کھلی۔ رات کے سناٹے میں دو گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اتنی بلند سنائی دے رہی تھی جیسے بالکل قریب ہوں۔ عمران نے سب سے پہلے تھیلی دیکھی۔ وہاں تھیلی نہیں تھی۔ نظام اور یزی اور جگ موہن بھی جو جبار بن چکا تھا، جاگ اُٹھے۔ انہوں نے جا کر اپنے گھوڑے دیکھے۔ دو گھوڑے غائب تھے۔ قاسم بلخی اور فاطمہ بھی نہیں تھے۔

"وہ دُور نہیں گئے ہوں گے"۔۔۔ نظام ادریزی نے عمران سے اپنی زبان میں کہا ۔۔۔ "چلو ہم دونوں ان کا پیچھا کرتے ہیں میں اس شخص کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گا"۔

"نہیں"۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "وہ جس لڑکی کو لے گیا ہے وہ ہماری ملکیت نہیں تھی اور وہ جو رقم اور زیورات لے گیا ہے، وہ سلطنتِ غزنی کا خزانہ نہیں تھا۔ انہیں پکڑنا ہمارے فرائض میں شامل نہیں بلکہ فرض سے انحراف ہے ... نظام بھائی! میں تم دونوں کو لاہور کی قید سے اسی لیے جلدی فرار کرانا چاہتا تھا کہ راجہ کا اگلا حربہ یہ ہوتا کہ تم دونوں کے درمیان ایک بڑی ہی حسین ہندو لڑکی بٹھا دی جاتی، پھر تم دونوں بھول ہی جاتے کہ تمہارا وطن کون سا اور تمہارا مذہب کیا ہے۔ تم ہندو راج کے آلۂ کار بن کر اپنی سلطنت کے لیے خطرہ بن جاتے۔ یہ نسوانی حُسن اور سونے کا جادو ہے جو پتھر دل کو موم کر دیا کرتا ہے۔ یہ دین و ایمان کا بڑا ہی سخت امتحان ہوتا ہے"۔

گھوڑوں کی آواز بہت دور چلی گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد رات کے سناٹے میں تحلیل ہوگئی۔

"میری تو نیند اڑ گئی ہے"۔۔۔ نظام ادریزی نے کہا ۔۔۔ "چلو چل پڑیں"۔

ایک گھوڑے پر رشی کو اور دوسرے پر جگ موہن کو سوار کیا گیا۔ عمران اور ادریزی پیدل چل پڑے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ باری باری گھوڑے پر سوار ہوں گے۔ رشی کے گھوڑے کی باگ عمران نے پکڑ لی اور وہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"وہ فاطمہ کو زبردستی لے گیا ہوگا"۔۔۔ رشی نے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ عمران نے کہا ۔۔۔ "مجھے یقین ہے وہ خود گئی ہے، بلکہ وہ قاسم کو ساتھ لے گئی ہے۔ اچھا ہُوا کہ وہ چلی گئی ہے"۔

صبح طلوع ہوئی تو قاسم بلخی اور فاطمہ بہت دور نکل گئے تھے۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتے رہے تھے۔ دوسرا گھوڑا ساتھ ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ بلخی کے گھوڑے کے ساتھ بندھا ہُوا تھا۔ قاسم بلخی اُس راستے پر جا رہا تھا جو اُن فوجوں نے بنایا تھا جو ہندوستان پر حملہ آور ہوتی رہی تھیں۔ بلخی اسی راستے سے قیدی کی حیثیت سے راجہ جے پال کی پکی کچی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ یہ واحد راستہ تھا جس پر بھٹکنے کا خطرہ نہیں تھا، مگر سورج پہاڑوں کے عقب سے اُبھرا تو قاسم بلخی کو پہاڑوں کا ایک ایک پتھر نظر آنے لگا۔ تب اُسے خیال آیا کہ وہ مجرم ہے، چور ہے اور وہ دُور سے نظر آسکتا ہے۔ یہ خطرہ تو تھا ہی کہ عمران اور نظام ادریزی اس کے تعاقب میں آئیں گے، اسی لیے وہ گھوڑا دوڑا تا رہا تھا۔ وہ پرانا سپاہی اور تجربہ کار سوار تھا مگر ذہن پر جرم کا جو بوجھ تھا، اس نے اُسے سوچنے ہی نہ دیا کہ گھوڑے تھک جائیں گے۔ علاقہ میدانی نہیں، پہاڑی تھا۔ راستہ گھومتا اور اوپر ہی اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

اس گھوڑے کی حالت تو بہت بُری ہو چکی تھی جس پر وہ فاطمہ کے ساتھ سوار تھا۔ اس کا پسینہ اتنا پھوٹ رہا تھا کہ جسم سے ٹپک رہا تھا۔ سانسیں پھول گئی تھیں۔ دوسرے گھوڑے کی حالت اس لیے کچھ بہتر تھی کہ اس کی پیٹھ پر وزن نہیں تھا۔ قاسم بلخی نے گھوڑا روک لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گھاس کی کہیں ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی نہ کہیں پانی کا نام و نشان تھا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کہ اس کے ساتھی اس کے تعاقب میں آرہے ہوں گے، وہ راستے سے اُتر گیا اور ایک عمودی چٹان کے سائے میں جا رُکا۔ ذرا سی دیر گھوڑوں کو آرام دیا پھر وہ دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اوپر آکر راستے پر چل پڑے۔ بلخی نے فاطمہ کو رات کی طرح اپنے آگے بٹھا رکھا تھا۔ رقم والی تھیلی فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ بلخی نے اس گھوڑے کو بھی دوڑانا شروع کر دیا۔

اُس کے تعاقب میں کوئی بھی نہیں آرہا تھا۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ انسان کے پیدل چلنے کی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ وہ باری باری گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ رشی کو سوار ہی رہنے دیا گیا۔ سورج اوپر آگیا تو بھی وہ چلتے گئے۔ پہاڑوں کا سایہ انہیں فائدہ دے رہا تھا۔ گرمی بڑھ رہی تھی، پہاڑ جھلسنے لگے۔ انہوں نے راستے سے اتر کر ایک جگہ دیکھ لی جہاں شام تک سایہ رہ سکتا تھا۔ عمران نے اپنے قافلے کو شام تک کے لیے وہاں روک لیا۔

قاسم بلمی کہیں رکنے سے ڈر رہا تھا جس جسم کی لذت کی خاطر وہ غزلانے کی تھیلی اور ایک حسین لڑکی کو ساتھ لے آیا تھا، وہ جسم توانائی اور نمی سے خالی ہوتا جا رہا تھا فاطمہ نے اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر اور چہرے پر درد کا تاثر پیدا کر کے قاسم بلمی کو اشاروں میں سمجھایا کہ مسلسل سواری اور گھوڑے کے دوڑنے سے اُس کی پسلیوں اور پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ بلمی نے مسکرا کر اپنا ایک بازو اس کے سینے کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ فاطمہ نے سر آہستہ پیچھے کر دیا کہ بلمی کا گال فاطمہ کے رخسار کے ساتھ لگ گیا مگر اُس نے محسوس کیا کہ فاطمہ اب اتنی حسین اور دل کش نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ وہ اپنے اوپر فاطمہ کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ اُس نے فاطمہ کو آگے کر کے اپنے جسم سے الگ کر دیا۔ پسینے سے دونوں کے کپڑے اُن کے جسموں کے ساتھ چپک گئے تھے۔

قاسم بلمی کو کوفت سی بھی محسوس ہوئی پھر اسے غصہ بھی آنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ گھوڑا بھی تھک گیا تھا مسلسل چڑھائی چڑھتے چڑھتے گھوڑے کا دم خم ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا گھوڑا پہلے ہی تھکا ہوا تھا۔ یہ دونوں گھوڑے فوج کے نہیں بلکہ سرائے کے اصطبل میں بندھے رہنے والے کرائے کے گھوڑے تھے جو لوگ تھوڑے سے فاصلے تک جانے کے لیے کرائے پر لے جایا کرتے تھے جنگ موسن بھی یہ گھوڑے پکڑ کر لایا تھا کہ مہمانوں کو ساتھ والے گاؤں تک لے جانا اور لانا ہے۔ یہ گھوڑے پہاڑی علاقے میں زیادہ دیر تک بھوک اور پیاس بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

قاسم بلمی کے پاس اس کا یہ علاج تھا کہ تعاقب کو ناکام کرنے کے لیے راستے سے ہٹ کر چلے اور وادیوں کے اندر اندر سے چھوٹا راستہ تلاش کرے۔ وہ گھوڑوں کو نیچے لے گیا سورج سر پر آ گیا تھا پہاڑوں نے ایسی تپش اگلنی شروع کر دی جو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ دونوں گھوڑے سے اتر کر چلنے لگے۔ فاطمہ چند قدم چل کر ہار گئی۔ اُسے بار بار ڈرانے لگے بلمی نے اشاروں میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور مسکرایا بھی، مگر بلمی کا اپنا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ گھوڑے اب وزن کے بغیر بھی قدم گھسیٹ کر چل رہے تھے۔ بلمی نے ایک چٹان کا سایہ دیکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔ فاطمہ اُس کے قریب ڈھیر ہونے کے انداز سے بیٹھ گئی۔ رقم اور زیورات کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے قاسم بلمی کے آگے یوں

پھینک دیا جیسے اس کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ گھوڑے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

فاطمہ نے ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بتایا کہ وہ پیاس سے مری جا رہی ہے۔ قاسم بلمی نے سر ہلا کر بتایا کہ یہاں پانی ملنا مشکل ہے۔ فاطمہ نے اشارہ کیا کہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ بلمی اٹھا اور پانی کی تلاش میں چلا گیا۔ بہت دیر بعد مایوس واپس آیا اور فاطمہ کے پاس بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد عمران کے قافلے نے وہ خشک میوے کھائے جو وہ پشاور کے قریب کے ایک گاؤں سے خرید لایا تھا۔ پانی کا ایک چھوٹا مشکیزہ ابھی باقی تھا تینوں نے پانی پیا اور چل پڑے۔ وہ قاسم بلمی اور فاطمہ سے بہت دُور تھے۔

"ہمارا سفر تھوڑا رہ گیا ہے" عمران نے کہا "مگر سفر کا یہی حصہ دشوار اور صبر آزما ہے۔ گھوڑے پیاسے ہیں۔ انہیں ہم دوڑا نہیں سکتے۔ یہ پیاسے نہ ہوں تو بھی پہاڑی علاقے میں دوڑنے کے قابل نہیں ہمیں غزنی پہنچنا ہے۔ ہمیں اچھی قسم کا ایک گھوڑا مل گیا تو ہم میں سے ایک آدمی تیزی سے جا سکتا ہے۔ اگر کوئی سوار مل گیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ ہمیں گھوڑا چاہیے۔"

"عمران!" رتی نے ہنس کر کہا "تم اسلام کو خدا کا مذہب کہتے ہو۔ اپنے خدا سے کہو نا، گھوڑوں کو پانی دے دے۔"

"کہنے کی ضرورت نہیں" عمران نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا "یہ گھوڑے پیاس سے نہیں مریں گے۔ ہم خدا کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ ہم نے یہ سارا سفر خدا کی عافیت میں طے کیا ہے۔ راجہ جے پال نے نظام اور یزی اور قاسم بلمی کو پکڑنے کے لیے پشاور سے آگے تک راستے روک رکھے ہیں مگر ہم نکل آئے ہیں میں تمہیں اب اپنے متعلق ایک راز بتاتا ہوں۔ میں ملتان کا نہیں غزنی کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ میں غزنی کا جاسوس ہوں اور میرے دونوں ساتھی غزنی کی فوج کے عہدیدار ہیں جو راجہ کے قیدی تھے۔ میں نے انہیں فرار کرایا ہے۔ میں نے تمہیں بھی موت کے منہ سے نکالا ہے۔ چونکہ یہ دونوں کام خدا کی خوشنودی کے لیے کیے ہیں اس لیے خدا نے میری مدد کی ہے

اور وہ دونوں گناہگار ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھیانک ہوگا۔ ہمارے دلوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پھر بچ نہیں پائیں گے۔"

اور پھر ان سے انہیں پانی دیا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال چلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آملتی تھی۔ وہاں جاکر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگامیں جھٹکنے پر بھی نہ چلے۔ عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھے۔ دونوں گھوڑے نتھنے پھلا رہے تھے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنہناتے اور وادی کی طرف چل پڑے۔

"اتر آؤ رشی" — عمران نے گھوڑے کے پہلو میں جاکر رشی کو اپنی باہوں میں لے کر اتارا اور کہا — "انہوں نے پانی کی مشک لے لی ہے۔ پانی قریب ہی ہوگا۔"

دوسرے گھوڑے پر نظام اور یزی سوار تھا۔ وہ بھی اتر آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو یہ وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی بو دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پہاڑی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور اندر جاکر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پہاڑ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کٹا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں شاید چشمہ تھا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے تاکہ گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اس وقت قاسم بلمی اور فاطمہ غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کہیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ بلمی غزنی کے عام راستے پر جاتے ڈرتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ پہاڑیوں کے اندر اندر سے وہ ملتان میں نکل جائے گا مگر یہ وادیاں ایسی تھیں

سرگھوم پھر کر ایک دوسری میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔ گھوڑے بھی رہ گئے تھے اور یہ دونوں انسان بھی تھک ہار گئے تھے۔ بلمی نے گھوڑا روک لیا اور دونوں اتر آئے۔

قاسم بلمی لیٹ گیا۔ اُسے بھوک اور پیاس کے ساتھ نیند بھی پریشان کر رہی تھی۔ فاطمہ اس کے پہلو میں اس طرح لیٹی کہ آدھی اُس کے سینے پر گری۔ بلمی نے اُسے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ فاطمہ نے اپنا آپ اُس کے سپرد کر دیا۔ اس کے جسم نے بلمی پر نشہ طاری کر دیا۔ وہ راستے سے تو بھٹک گئے تھے مگر راہِ فرار موجود تھی جو دونوں نے ایک دوسرے میں دیکھ لی۔ وہ تھکن اور اپنے انجام کو بھول گئے۔ قاسم بلمی نے اُسے نشے کی سی کیفیت میں اشاروں اشاروں میں سبز باغ دکھائے اور وہ خواب و خیال کے باغوں میں پہنچ گئے — پھر دونوں گہری نیند سو گئے۔

قاسم بلمی گھبرا کر اُٹھا۔ رات گزر گئی تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کل وہ اسی جگہ سے گزرے تھے۔ اُس نے فاطمہ کو جگایا۔ وہ ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ وہ روانہ ہونے کے لیے اُٹھے تو دیکھا کہ گھوڑے غائب تھے۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ گھوڑے کہیں بھی نظر نہ آئے۔ بلمی کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ اُس کے ساتھی آکر ان کے گھوڑے لے گئے اور ان دونوں کو بھٹک بھٹک کر پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ گئے ہیں لیکن گھوڑے پانی اور چارے کی تلاش میں دور نکل گئے تھے۔ بلمی گھبرا کر گھوڑوں کی تلاش میں دوڑا اور مایوس اور خوفزدہ واپس آگیا۔ اُس نے فاطمہ کا بازو پکڑا اور پاگلوں کی طرح ایک طرف دوڑ پڑا۔

فاطمہ دوڑتے دوڑتے گر پڑی۔ اُس میں تو چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بلمی نے اُسے اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ رقم اور سونے کی تھیلی ہاتھ میں لی اور چل پڑا۔ اس کے دل میں یہی ڈر تھا کہ عمران اور اور یزی قریب ہی کہیں موجود ہیں اور وہ جب بے حال ہو چکا ہوگا تو وہ آکر اُس سے تھیلی چھین لیں گے اور فاطمہ کو بھی لے جائیں گے۔ چوری کا گناہ، گزشتہ رات کا گناہ مل کر چڑیلوں اور بھوتوں کی طرح اُس کے اردگرد ناچنے لگے۔ وہ بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو کندھوں سے اتار کر اس طرح اپنے سینے سے لگا لیا اور بازوؤں میں دبوچ لیا جس طرح بچہ شریر بچوں سے اپنا کھلونا چھپا لیا کرتا ہے۔ اُس نے تھیلی اپنے نیچے رکھ لی۔ وہ مقتل وحوش

کھو بیٹھا تھا۔

"قاسم!" — اُسے فاطمہ کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ ہوش میں آگئی تھی — "ہاں" — فاطمہ کا منہ کھل گیا تھا۔ زبان ہونٹوں پر آگئی تھی۔

فاطمہ کو ہوش میں آتا دیکھ کر بلمی کی ذہنی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اُس نے فاطمہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑے۔

"تم میری بات نہیں سمجھ سکو گی فاطمہ!" — قاسم بلمی نے اپنی زبان میں بولنا شروع کر دیا — "ہم فتح کے راستے سے نہیں، خدا کے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اس راستے سے ہٹ جانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ میں مرد میدان تھا۔ میدان جنگ میں، ایسی ہی پہاڑیوں میں برفباری میں، ریگستانوں میں لڑا ہُوں۔ میں زخمی بھی ہُوا تھا۔ میرے ساتھی بھی زخمی ہوئے تھے۔ بعض کے بازو کٹ گئے تھے، ٹانگیں بھی کٹ گئی تھیں۔ ہم بھوکے بھی رہتے، پیاسے بھی رہے۔ ہمارے زخموں سے خون بہ گیا مگر ہم میں سے کوئی بھی اس طرح بے بس اور لاچار نہیں ہُوا کرتا تھا۔ میرا خون اور پسینہ نکل جانے سے میرے جسم کی توانائی اس طرح ختم نہیں ہُوا کرتی تھی۔ جانتی ہو کیوں!"... اُس نے فاطمہ کو جھنجھوڑا مگر وہ اُس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ منہ اور آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ جس خوبرو جوان کو اُس نے جذبات کی پیاس بجھانے والا چشمہ سمجھا تھا وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ چشمہ سوکھ گیا ہے۔

"میدان جنگ میں میرا جسم نہیں، میری روح لڑا کرتی تھی" — بلمی نے کہا — "میں چور نہیں تھا۔ میں جسمانی لذت کے لیے نہیں روحانی کیف کے لیے لڑا کرتا تھا۔ اب ہم دونوں کو جسمانی پیاس اور سونے کی ہوس نے گمراہ کیا ہے۔ صرف دو تین دن پیدل چلنے سے میرے جسم میں جان نہیں رہی۔ مجھے اپنے جسم سے بدبو آتی ہے۔ تمہارے جسم سے بھی بدبو آتی ہے۔ ہم گناہگار ہیں فاطمہ! گناہگاروں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ گناہگاروں کا انجام ہُوا کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں عیش کرتے اور اگلی دنیا میں جلتے ہیں یا ہم جیسے اسی دنیا میں جل جل کر مرتے ہیں۔ منزل میرے دوستوں کو ملے گی جو سیدھے راستے

پر جا رہے ہیں۔ منزل اُس ہندو لڑکی اور اُس کے ہندو بھائی کو ملے گی جنہوں نے یہ راز پا لیا ہے کہ خدا پتھر اور مٹی کے نہیں ہُوا کرتے۔ عمران نے انہیں خدائے وحدہٗ لاشریک دکھا دیا ہے۔ ہمیں مرنا ہے۔"

اُس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اور لب و لہجہ اکھڑتا جا رہا تھا۔ فاطمہ نے گھبرا کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"ہوش میں آؤ قاسم!" — فاطمہ نے روتے ہوئے کہا — "میں تمہارے سہارے آئی ہُوں۔"

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہی ہو" — قاسم بلمی نے اپنی زبان میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کہنے لگا — "آؤ، شاید مرنے کیلیے اس سے کوئی بہتر جگہ مل جائے۔"

عمران، نظام اور ریزی اور رشی چلے جا رہے تھے۔ سفر کے ڈیڑھ دو دن باقی تھے۔ اب راستہ نیچے اُتر رہا تھا۔ ان کے گھوڑوں کو راستے میں ایک اور جگہ سے بھی پانی مل گیا تھا مگر گھوڑوں کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ دو آدمیوں کو ساتھ پیدل چلنا پڑتا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ گھوڑے پہاڑی علاقے میں زیادہ دُور تک دوڑنے کے قابل نہیں تھے۔ نظام اور ریزی کو بائیں طرف دُور نیچے وادی میں دو گھوڑے کھڑے نظر آئے۔ وہاں کچھ گھاس تھی جو یہ گھوڑے کھا رہے تھے۔ گھوڑوں پر زینیں کسی ہوئی تھیں کوئی سوار نظر نہیں آ رہا تھا۔

"عمران!" — نظام اور ریزی نے عمران سے کہا — "تم نے کہا تھا کہ کوئی گھوڑا مل جائے تو تم اس کے سوار کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرو گے۔ وہ دیکھو۔ دو گھوڑے۔"

"اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا تو یہ گھوڑے اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں" — عمران نے کہا۔

نیچے اترنے کا راستہ دیکھ کر وہ نیچے اُتر گئے۔ قریب جا کر دیکھا۔ گھوڑے وہی تھے جو قاسم بلمی لے کر بھاگا تھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران اور نظام اور ریزی نے تلواریں نکال لیں۔ خطرہ تھا کہ بلمی مقابلہ کرے گا۔ جگہ ایسی تھی کہ وہ گھات سے اٹھ کر اچانک حملہ کر سکتا تھا۔ تلاش کے باوجود بلمی اور فاطمہ نظر نہ آئے۔ عمران اور نظام نے بلمی کو پکارنا شروع کر

دیا — "سامنے آجاؤ قاسم! ہم بھول جائیں گے کہ تم نے کیا کیا ہے... دوستوں کی طرح آجاؤ قاسم!" — مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"عمران!" — نظام اوریزی نے کہا — "اُدھر دیکھو، گدھ اُتر رہے ہیں۔"

وہ فوجی تھا اور کئی جنگیں لڑ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ جہاں جنگ ختم ہوتی ہے وہاں گدھوں کے غول جمع ہو جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ کے اردگرد کہیں بھی گدھ اُتر رہے ہوں تو یہ ثبوت ہوتا تھا کہ وہاں کسی کی لاش پڑی ہے۔ عمران نے بھی گدھ اُترتے دیکھے۔ وہ اور نظام اوریزی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ جگ موہن اور رشی پہلے ہی گھوڑوں پر سوار تھے۔ سب اُدھر کو گئے جہاں گدھ اُتر رہے تھے۔ وہ جگہ کم و بیش ایک میل دور تھی۔

قریب جا کر انہوں نے گدھوں کو پتھر مارے تاکہ دیکھ سکیں کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ وہ لاشیں تھیں — ایک قاسم بلخی کی دوسری فاطمہ کی۔ گدھوں نے ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے۔ انہیں مرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ رقم اور سونے کی تھیلی قاسم بلخی کے ہاتھ میں تھی اور ہاتھ کی گرفت اکڑ گئی تھی۔ عمران اس کی انگلیاں کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر اکڑی ہوئی انگلیاں کھلتی نہیں تھیں۔

"رہنے دو عمران!" — نظام اوریزی نے کہا — "یہ خزانہ اسی کے پاس رہنے دو۔ اسی نے اس کی جان لی ہے۔ شاید ان دونوں کی روحیں اس خزانے کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں۔"

"مجھے یقین ہے، یہ پیاس، بھوک اور تھکن سے مرے ہیں۔ اگر یہ رہزنوں کے ہاتھ چڑھ گئے ہوتے تو یہ تھیلی اور فاطمہ یہاں نہ ہوتیں۔ اکیلا قاسم قتل ہوتا" — عمران نے کہا — "یہ بدنصیب تھوڑا اور آگے تک جا سکتے جہاں ان کے گھوڑے کھڑے تھے تو انہیں پانی مل جاتا... عبرت حاصل کرو دوستو! اتنی رقم اور اتنا زیادہ سونا انہیں موت سے بچا نہیں سکا۔ سونا کھایا نہیں جا سکتا، پیا نہیں جا سکتا، بلکہ یہ اُن انسانوں کو کھا جاتا ہے جو اس کی ہوس میں دیوانے ہو جاتے ہیں" — اُس نے رشی سے کہا — "دیکھ لو رضیہ! حُسن کا انجام دیکھ لو۔ فاطمہ اس جوانی اور اس حسن کے جال میں مجھے پھانسنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ قاسم پھنس گیا۔ فاطمہ کو اپنے حُسن پر بڑا ناز تھا۔"

رشی کے، جو اب رضیہ بن چکی تھی، آنسو نکل آئے۔

اب وہ چار تھے اور اُن کے پاس چار ہی گھوڑے تھے۔ وہ روانہ ہو گئے اور شام کو اُس خطے میں داخل ہو گئے جسے اُس دور میں ملتان کہتے تھے۔ یہ سرسبز خطہ تھا۔

سلطان محمود غزنوی کو جب اطلاع دی گئی کہ لاہور کے تین آدمی ایک لڑکی کے ساتھ آئے ہیں تو وہ جس کام میں مصروف تھا اسے الگ رکھ کر لاہور سے آنے والوں کو بلا لیا۔ اندر عمران اور نظام اوریزی گئے۔ جبار اور رضیہ کا سلطان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ عمران نے سلطان کو اپنی پوری کارگزاری سنائی۔ بھٹنڈہ کے جاسوسوں کا کارنامہ بھی سنایا اور یہ بھی سنایا کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو کس طرح انسانی قربانی سے بچا لایا اور اسے اور اس کے بھائی کو مسلمان کر لایا ہے۔ قاسم بلخی کی واردات اور انجام سن کر سلطان محمود کا چہرہ بجھ گیا۔

"قوم میں زر اور زن کی جو ہوس پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے، یہ قوم کو تاریخ سے ناپید کر دے گی" — سلطان محمود نے کہا — "انہی دو چیزوں نے ہمیں خانہ جنگی میں اُلجھا رکھا ہے... کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ راجہ جے پال غزنی پر ضرور حملہ کرے گا؟"

"پورے یقین کے ساتھ" — عمران نے جواب دیا — "اُس کی رسد تباہ ہو گئی لیکن وہاں رسد اور سامان کی کمی نہیں۔ راجہ جے پال اب تک یہ کمی پوری کر چکا ہو گا۔"

"تمہارے دوسرے ساتھی وہاں کیا کر رہے ہیں؟" — سلطان محمود نے پوچھا — "مجھے صحیح اطلاع ملنی چاہیے کہ وہ کتنی فوج لا رہا ہے اور کب آ رہا ہے۔"

"بھٹنڈہ کے آدمیوں کا کارنامہ آپ کو سنا چکا ہوں" — عمران نے کہا — "وہ وہیں کے رہنے والے جوشیلے نوجوان ہیں اور اولیس الحبیب کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ اولیس اِدھر کا رہنے والا ہے اور بھٹنڈہ کی ایک مسجد میں امام بنا ہوا ہے۔ راجہ جے پال نے جونہی کوچ کیا، اولیس اطلاع بھیج دے گا۔"

"سلطان صد احترام!" — نظام اوریزی نے کہا — "آپ کسی کے انتظار میں نہ بیٹھے

میں۔ تیاری اور پیش بندی ابھی سے کریں۔ راجہ جے پال کی باتیں میرے ساتھ بھی ہوئی ہیں اور میری موجودگی میں وہ اپنے سالاروں اور سپہ سالار کے ساتھ جو باتیں کرتا رہا ہے وہ بھی میں نے غور سے سنی ہیں۔ اب کہ یہ راجہ شکست کھانے نہیں آئے گا۔ ہم اتنی فوج کبھی اکٹھی نہیں کر سکتے جتنی وہ لائے گا۔ مقابلہ چھ اور ایک کا ہوگا۔ ہمیں یہ جنگ بھی گھات اور شب خون کے طریقے سے لڑنی پڑے گی۔ جے پال اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ سلطان سبکتگین کی وفات کے بعد غزنی میں کوئی قابل فوجی قائد نہیں رہا؟"

"میرے پاس فوج کی کمی نہیں ہونی چاہیے تھی۔" سلطان محمود نے کہا۔ "لیکن فوج ہماری فوج ریاستوں میں بٹ گئی ہے۔ اسلامی فوج کے سالاروں میں بھی حکمران بننے کی ہوس پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اب اسلام کا تحفظ کرنے کے قابل نہیں رہے۔ جب سالار سلطان کے خواب دیکھنے لگتے ہیں تو ملک و قوم اپنی موت خود ہی مرنے لگتی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی غزنی، بلخ اور خراسان کی سلطنت کے انتظامی امور سلجھانے اور انہیں بہتر طریقے سے چلانے میں مصروف تھا۔ اس کی توجہ فوج کی بھرتی اور ٹریننگ پر بھی مرکوز تھی۔ اُس نے اُسی وقت اپنے سپہ سالار اور دیگر سالاروں کو بلایا۔ فوج کی بالائی کمان اس کے اپنے ہاتھ تھی۔

"یہ یقین ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی مشترکہ فوج تیسرے حملے کے لیے آ رہی ہے۔" سلطان نے کہا۔ "کمان پہلے کی طرح راجہ جے پال کی ہوگی۔ اس کی نفری کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ ہماری تعداد بہرحال کم ہوگی۔ لاہور میں ہمارے آدمیوں نے اس کی رسد اور سامان کا ذخیرہ جلایا ہے۔ اس سے اُس کے کوچ میں تاخیر ہو گئی ہے۔ آپ اپنی بدنصیبی کو سمجھتے ہیں۔ آپ اپنی پوری فوج جنگ میں نہیں جھونک سکتے۔ آپ کو کچھ دستے غزنی اور دیگر شہروں پر رکھنے ہوں گے کیونکہ ہم جب دشمن کے خلاف لڑ رہے ہوں گے، آپ کے بھائی آپ کی پیٹھ پر وار کریں گے ...

"یہ ہمارے قومی جذبے کا بڑا ہی سخت امتحان ہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں کا حملہ کامیاب ہو گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آپ سلطنت غزنی کے نہیں خانہ کعبہ کے پاسبان ہیں۔ مجھے میرے عالموں نے بتایا ہے کہ ہندو دعوے کرتے ہیں کہ ہندوستان کی سرحد دجلہ اور فرات سے بھی آگے ہے اور اس پر مسلمان قابض ہیں۔ ہندوؤں کو صرف علاقہ اور قوم نہ سمجھنا۔ وہ اپنے ساتھ جغرافیائی دعوے اور باطل مذہب لا رہے ہیں۔ وہ اسلام کے فروغ کو روکنے کے لیے اسلام کے اعصابی مرکز پر وار کرنے آ رہے ہیں۔ آپ اپنی سلطنت یا اپنے گھروں کے تحفظ کے لیے نہیں، خدا کے گھر کے تحفظ کے لیے لڑیں گے ...

"آپ کو ایک فائدہ یہ حاصل ہے کہ ہندوؤں کی فوج پر تمہاری دہشت طاری ہے۔ لاہور سے جو دو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ ہندوؤں کے پچھلے حملے سے جو فوج بچ کر واپس گئی تھی اُس نے اپنے ملک جا کر خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس کا اثر نئی بھرتی پر بھی ہے۔ میں آپ کو دوسرا فائدہ یہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی سلطنت سے دور دشمن کی ریاست کے قریب لڑیں اور میدان آپ کی مرضی اور آپ کی سہولت کا ہو۔ یہ میدان پشاور کے قریب ہوگا۔ ہم جیش گھات میں بٹھائیں گے۔ آپ کے پاس لمغان کے چند ایک ٹلے ہیں۔ ہم انہیں دھوکے کے لیے استعمال کریں گے ...

"راجہ جے پال ہاتھی بھی لائے گا۔ آپ جان چکے ہیں کہ ہاتھی جتنا خوفناک لگتا ہے، اس میں اتنی ہی خوفناک کمزوریاں ہیں۔ ہم بھی ہاتھیوں کا دستہ استعمال کریں گے لیکن یہ جوابی حملے میں استعمال ہوں گے جو ہم دشمن کے عقب سے کریں گے۔ یہ آخری اور فیصلہ کن حملہ ہوگا۔ طریقہ وہی اختیار کریں کہ آمنے سامنے کے تصادم سے بچیں۔ دشمن کے پہلوؤں پر حملے کریں اور پہلوؤں کو ہی نکل جائیں۔ دشمن کے دستوں کو اپنے پیچھے گھسیٹ گھسیٹ کر گھات تک لائیں ...

"دشمن کو کمزور نہ سمجھیں اور اب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ خدا نے اگر آپ کو فتح دی اور دشمن پسپا ہوا تو پشاور تک اس کا تعاقب کیا جائے گا اور پشاور کو اپنے قبضے میں لیا جائے گا۔ میں آپ کو ابھی اس زمین کا نقشہ دکھاؤں گا، اس سے پہلے آپ دل میں یہ حقیقت اور یہ جذبہ نقش کر لیں کہ آپ خدا کے عظیم مذہب کی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ یہ حق اور باطل کی جنگ ہے۔ ہمارے رسولؐ نے ان جنگوں کی ابتدا کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے رسول مقبول صلعم کی روایت مقدسہ کو ختم کر ڈالیں اور ہماری روحیں آنے

والی نسلوں کے آگے سرنگوں ہوتی رہیں۔ ہمارا نعرہ ہو گا — فتح یا موت!"

اس کے بعد سلطان محمود نے سب کے آگے نقشہ پھیلا کر جنگ کی تکنیکی ہدایات دینی شروع کر دیں۔ انہیں گھاٹ اور شب خون کی جگہیں بتائیں۔ آخر میں حکم دیا کہ کل صبح صادق کے وقت فوج کوچ کر جائے گی اور پشاور کی قریبی پہاڑیوں میں جا ٹھہرے گی۔ دستوں کو ہر وقت تیاری کی حالت میں رکھنا ہو گا۔

محمد قاسم فرشتہ، گردیزی اور عطبی کی تحریروں کے مطابق سلطان محمود غزنوی نے اگست ۱۰۰۱ عیسوی (شوال ۳۹۱ ہجری) میں غزنی سے کوچ کیا۔ اس کی فوج دس ہزار منتخب سواروں کی تھی۔ پچاس کے لگ بھگ جنگی ہاتھی تھے جو راجہ جے پال کی فوج سے اُس کے پہلے حملوں میں چھینے گئے تھے۔ پیادہ نفری بہت ہی کم تھی۔ سلطان کی مجبوری تھی کہ اُسے پیادہ فوج اپنی سلطنت میں چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ داں سلطانی کے ہوس کاروں کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ سلطان چونکہ گھوم پھر کر لڑنا چاہتا تھا اس لیے وہ سوار دستے ہی ساتھ لایا تھا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ اکثر تاریخوں میں لکھا گیا ہے کہ محمود غزنوی نے پشاور پر حملہ کیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ یہ ہندوستان میں لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں حقائق اور واقعات کو مسخ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ تمام نامور مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حملہ راجہ جے پال نے کیا تھا۔ اور محمود غزنوی یہ حملہ روکنے کے لیے پہلے ہی اپنی سلطنت سے نکل آیا اور پشاور کے قریب جنگی پوزیشن میں خیمہ زن ہو گیا تھا۔

راجہ جے پال نے رسد اور سامان کی کمی چند دنوں میں پوری کر لی تھی۔ وہ بہت جلد حملہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے جرنیلوں سے یہی کہتا پھر رہا تھا کہ وہ سبکتگین مر گیا ہے جس نے میرے حملے روک لیے تھے۔ اب میری راجدھانی غزنی ہو گی۔ اب اُس نے ایک کنواری لڑکی کی قربانی بھی دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اب دیوتا اُس کے ساتھ جا رہے ہیں۔

اس کے باوجود اب دوسرے راجاؤں نے اُسے اتنی فوج نہیں دی تھی جو پہلے دی تھی۔ سلطان سبکتگین (؟) دے دیا تھا۔ راجہ جے پال نے لاہور سے کوچ کیا تو اُس کی فوج کی تفصیل یہ تھی۔ بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیادہ اور تین سو جنگی ہاتھی۔ رسد اور سامان والی بیل گاڑیوں کی قطار میلوں لمبی تھی۔ جے پال فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے سال بھر کی رسد ساتھ لے جا رہا تھا۔ اُسے فتح کا اتنا یقین تھا کہ (مورخوں کے مطابق) وہ بے انداز خزانہ، سونے اور ہیروں کے ہار اور جواہرات ساتھ لے گیا۔ اس خزانے کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ غزنی کے راستے میں افغان سرداروں کو زر و جواہرات دے کر اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اُس نے کوچ بہت تیز کرایا۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ غزنی والوں کو بے خبری میں جا لے گا۔ اس نے پشاور صرف ایک رات قیام کیا تاکہ بیل گاڑیاں پہنچ جائیں۔

اُس نے پشاور سے کوچ کیا تو غزنی کے جاسوسوں نے اُس کی ساری فوج اور کوچ کی ترتیب دیکھ لی۔ انہوں نے قبل از وقت سلطان کو بتا دیا کہ راجہ کی نفری کتنی اور کیسی ہے۔

راجہ جے پال کو پشاور سے نکلتے ہی پتہ چل گیا کہ سلطان محمود پہاڑیوں میں خیمہ زن ہے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ چوکس ہو گیا۔ اُس نے پشاور اور پہاڑی سلسلے کے درمیان پڑاؤ کا حکم دے دیا تاکہ آگے کی کوئی اطلاع حاصل کر سکے۔ رات کو اُس نے دیکھ بھال کے لیے ایک جیش بھیجا مگر وہ واپس نہ آ سکا۔ غزنی والوں نے راجہ جے پال کے ساتھ حساب کتاب کھول لیا تھا۔

صبح ابھی تاریک تھی جب جے پال کی فوج کی خیمہ گاہ کے ایک کونے پر غزنی کے سواروں نے شب خون مارا اور افراتفری پیدا کر گئے۔ ہندوؤں کا جانی نقصان بھی ہوا۔ جے پال نے تیاری کا حکم دے دیا۔ صبح طلوع ہوئی تو اُسے غزنی کی فوج کے دو چار دستے نظر آئے جو سامنے کھڑے تھے۔ جے پال نے حملے کا حکم دے دیا۔ غزنی کے یہ سوار دستے آگے آ کر پھیل گئے۔ ہندوؤں نے ہاتھیوں کو آگے کر رکھا تھا۔ سلطان کے سوار ہاتھیوں سے لڑ گئے اور پیچھے ہٹنے اور پھیلنے لگے۔ اُس وقت سلطان محمود چند ایک دستوں کے ساتھ نشیبی علاقے سے بڑھتا ہوا دشمن کے عقب میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہندوؤں

نے اُسے دیکھ لیا اور پیچھے کو مڑے۔

سلطان محمود نے حملے کا حکم دے دیا۔ سوار آگے بڑھے۔ گھمسان کا رن پڑا لیکن مسلمان معرکہ سے ہٹنے لگے۔ ہندو اُن کے تعاقب میں آ گئے۔ اس طرح جے پال کی فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ پہاڑیوں کی طرف منہ کیے بڑھ رہا تھا، دوسرا جیسے پشاور کی طرف۔ اُس وقت سلطان کے کچھ سوار دستے دونوں حصوں کے درمیان آ گئے۔ انہوں نے دونوں حصوں کے عقب پر حملہ کر دیا۔ راجہ جے پال کا ہیڈکوارٹر درمیان میں تھا۔ اُس کا جھنڈا ایک سوار نے اٹھا رکھا تھا۔ چند ایک مسلمان سواروں نے جھنڈے پر حملہ کر دیا مگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہا۔ جھنڈا نہ گر سکا۔

دوپہر تک میدانِ جنگ کی صورت یہ ہو گئی کہ راجہ جے پال کی فوج جو دو حصوں میں کٹ چکی تھی بکھر گئی۔ راجہ جے پال آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ چونکہ سلطان محمود یہیں ہے اس لیے وہ آگے بڑھ جائے اور غزنی پر جا دھمکے۔ اس کوشش میں راجہ کے جیش مسلمانوں کی گھات میں آنے لگے۔ ان پر تیروں کی بوچھاڑیں پڑیں اور وہ مرتے چلے گئے۔ سلطان محمود کے سوار گھوم پھر کر لڑنے لگے۔ دس ہزار سواروں کا مقابلہ بارہ ہزار سواروں اور تیس ہزار پیادوں سے تھا۔ مسلمانوں کا جانی نقصان خاصا ہو رہا تھا مگر شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جا رہا تھا۔

راجہ جے پال کی یہ کوشش بُری طرح ناکام ہو رہی تھی کہ مسلمان کہیں جم کر لڑیں۔ وہ جم کر لڑنے کے لیے آیا تھا۔ اس کی فوج کی ٹریننگ اسی طور پر ہوئی تھی۔ سلطان محمود نے لڑنے کے لیے جس زمین کا انتخاب کیا تھا، وہ اُس کے طریقہ جنگ کے لیے موزوں تھی۔ جے پال تو کچھ اور سوچ کر آیا تھا۔ وہ یہاں لڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تاہم اُس نے جنگی اہلیت کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اُس کی جنگی قوت زیادہ بھی تھی مگر میدان مسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ جے پال تعداد کی برتری کے سہارے لڑ رہا تھا۔ اُس نے یہ کوشش بھی کی کہ جنگ ملتوی ہو جائے تاکہ اسے طول دیا جا سکے لیکن مسلمان سواروں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ انہوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

یہ معرکہ بڑا ہی خونریز تھا۔ شام سے پہلے سلطان محمود غزنوی نے پچاس ہاتھیوں اور دو ہزار گھوڑ سواروں سے جے پال کے عقب پر شدید حملہ کر دیا۔ سوار جے پال کے ہیڈکوارٹر کو گھیرے میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں بڑا سخت معرکہ لڑا گیا مگر جے پال نکل نہ سکا۔ وہ پندرہ حکام کے ساتھ زندہ پکڑا گیا۔ اس کی فوج جو بکھر گئی تھی، پسپا ہونے لگی۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور وہ پشاور تک جا پہنچے۔ پشاور کے قریبی مضافات میں بھی معرکے لڑے گئے جن کی صورت یہ تھی کہ ہندو جانیں بچانے اور جنگی قید سے نکلنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ راجہ جے پال کا جھنڈا گرنے اور اس کی مرکزی کمان ختم ہو جانے سے جنگ کا پانسہ ایسا پلٹا کہ مسلمان سوار جو تعداد میں بہت تھوڑے رہ گئے تھے، ہندو فوج کو ٹولیوں میں بکھیر کر اُن کی وہی حالت کر رہے تھے جو بھیڑیے بھیڑوں کے ریوڑ کی کیا کرتے ہیں۔

شام تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ راجہ جے پال کو صحیح معنوں میں شرمناک شکست ہوئی تھی مگر غزنی کے غازیوں نے خون اور جان کے جو نذرانے دیے اس کی مثال خود غزنی والے بھی کبھی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ مشہور مورخ گردیزی اور عتبی لکھتے ہیں کہ مسلمان سواروں نے اس احساس کے تحت کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے، تھوڑی تھوڑی نفری کے جیشوں کی صورت میں اس قدر شدید اور برق رفتار حملے کیے کہ ہندوؤں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ دوپہر تک پانچ ہزار ہندو سوار اور پیادے مارے جا چکے تھے، اور جنگ کا فیصلہ اُسی وقت ہو گیا تھا۔

جنگی مبصرین نے مسلمانوں کی کامیابی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندو فوج پر مسلمانوں کی دہشت پہلے ہی طاری تھی اس لیے ان کا لڑنے کا جذبہ بہت جلدی مجروح ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو جو ہدایات دی تھیں، ان میں زور اسی پر دیا تھا کہ دشمن کا جذبہ توڑنے کی کوشش کرنا۔ اُس نے اس کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ پہلوؤں پر کم تعداد میں حملہ کرو اور نکل جاؤ، پھر گھوم کر آؤ اور یہ سلسلہ جاری رکھو۔ دشمن کو پتہ نہ چلنے دو کہ اب مسلمان سوار کدھر سے آئیں گے اور کتنے آئیں گے۔ سلطان محمود کی کامیابی کی دوسری وجہ اس کا جاسوسی کا نظام تھا جس کے ذریعے اُسے قبل از وقت دشمن کی آمد اور نفری وغیرہ کی اطلاع مل گئی۔ اُس سے اُس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنے

ملک سے دُور آکر اپنی پسند کی زمین کا انتخاب کر لیا۔ یہ کیفیت جو سلطان محمود نے پیدا کر لی تھی، راجہ جے پال کے لیے غیر متوقع تھی۔ کوشش کے باوجود جے پال اس کیفیت کو اپنے حق میں نہ کر سکا۔ آخر گھیرے میں آکر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پشاور سے کچھ دُور میرا نام کا ایک گاؤں ہُوا کرتا تھا، وہاں راجہ جے پال اور اُس کے اعلیٰ حکام کو سلطان محمود غزنوی کے سامنے لے جایا گیا۔ ایک ترجمان کے ذریعے سلطان اور راجہ کی باتیں ہوئیں۔

"یہ فتح و شکست میری اور آپ کی نہیں" ___ سلطان محمود نے راجہ جے پال سے کہا۔ "یہ اسلام کی فتح ہے۔ اس عظیم مذہب نے ثابت کر دیا ہے کہ تراشے ہوئے پتھر اور خیالی مورتیاں انسان کا نہ کچھ بگاڑ سکتی ہیں نہ اُسے کچھ دے سکتی ہیں۔ انسان کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ زندگی اور موت، فتح و شکست اُسی کے اختیار میں ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ آپ کا تیسرا حملہ ناکام ہو چکا ہے۔ اب آپ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دے کر آئے تھے۔ دیوتاؤں نے آپ کو اُس ناحق قتل کی سزا دی ہے۔ قربانی ہم بھی دیا کرتے ہیں لیکن کسی کو خدا کے آگے ذبح نہیں کیا کرتے۔ میدانِ جنگ میں لاشیں دیکھ لو۔ ہم یہ قربانی دیا کرتے ہیں اور خدا اسے قبول کر لیا کرتا ہے۔ کیا آپ ہمارے ایمان کو برحق تسلیم نہیں کرتے جنہوں نے دس ہزار کی تعداد میں آپ کے پچاس ہزار کے لشکر کو میدان سے بھگا دیا ہے؟"

"میں مذہبوں کی بحث میں نہیں اُلجھوں گا" ___ راجہ جے پال نے کہا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہار گیا ہوں۔ میں جان بخشی کی درخواست کرتا ہوں اور یہ معاہدہ کروں گا کہ آئندہ آپ پر فوج کشی نہیں کروں گا۔"

"پھر آپ اپنے مذہب کا فریضہ سمجھ کر معاہدہ توڑ دیں گے" سلطان محمود نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کروں گا" ___ راجہ جے پال نے کہا ___ "آپ قیمت بتائیں۔"

"میں اس قیمت میں آپ کا یہ خزانہ شامل نہیں کروں گا جو میرے ہاتھ لگا ہے۔"

سلطان محمود نے کہا۔ "یہ مالِ غنیمت ہے۔"

خزانے کا مالِ غنیمت کم نہیں تھا۔ راجہ جے پال افغانیوں کو ساتھ ملانے کے لیے بے اندازہ خزانہ ساتھ لایا تھا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ دیگر زر و جواہرات اور نقدی کے علاوہ ہیروں کے پندرہ ہار تھے جن میں ایک کی قیمت اسی ہزار دینار تھی۔ معاہدے کی رُو سے طے پایا کہ راجہ جے پال کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے عوض وہ اڑھائی لاکھ دینار اور پچاس ہاتھی تاوان کے طور پر ادا کرے گا۔ اُس کے نہایت اہم حکام کو یرغمال کے طور پر قید میں رکھا گیا اور راجہ جے پال کو رہا کر دیا گیا۔ سلطان محمود نے پشاور تک کو اپنی عملداری میں لے لیا اور آج کے درۂ خیبر اور تمام تر سلسلۂ کوہ پر قبضہ کر لیا۔

یہ جنگ بروز جمعرات ۸ محرم ۳۹۲ ہجری (۲۷ نومبر ۱۰۰۱ عیسوی) کے روز لڑی گئی اور اسی روز فتح اور شکست کا فیصلہ ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی اس مقبوضہ علاقے کے انتظامی امور کے لیے کچھ عرصہ پشاور میں رہا۔ اُسے یہاں زیادہ عرصہ رہنا تھا مگر اُس کی اپنی سلطنت کے اردگرد مسلمان حکمران پھر سر اٹھانے لگے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے ۱۰۰۲ عیسوی کے موسم بہار میں غزنی چلا گیا۔

اسی موسم میں راجہ جے پال اپنی قوم کے ہزار ہا جوان بیٹے اور قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی پشاور کے مضافات میں تباہ و برباد کر کے لاہور میں واپس آیا۔ وہ بوڑھا تو تھا ہی، اس شکست نے اُسے اور زیادہ بوڑھا کر دیا۔ آتے ہی اس نے دربار منعقد کیا اور یہ اعلان کیا کہ آج سے اس کا بیٹا انند پال اس کا جانشین ہو گا۔ اس اعلان کے ساتھ وہ راج سے دستبردار ہو گیا۔

اُس نے سب کو راج محل کے پچھواڑے کے باغ میں چلنے کو کہا۔ خود اپنے بیٹے کے ساتھ چل پڑا۔

"تم جیسے بہتر سمجھو گے ویسے راج کرنا" اُس نے اپنے بیٹے انند پال سے کہا ___ "لیکن یہ میری وصیت ہے کہ غزنی پر حملے کے لیے نہ جانا۔ ہماری فوج مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑ سکتی۔ اُن کی فوج کی چالیں نہایت اچھی ہیں لیکن ان کی اصل قوت ان

کا جذبہ ہے اور جوش و خروش ہے جو ہماری فوج میں کوشش کے باوجود پیدا نہیں ہو سکا۔ محمود کو اڑھائی لاکھ دینار کی مالیت کا سونا بھیج دینا، ورنہ وہ تم پر حملہ کرے گا اور تمہاری فوج کا بھی حشر ہوگا جو تم پشاور میں دیکھ آئے ہو۔"

وہ جب پچھواڑے کے باغ میں پہنچے تو سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں چتا بنی ہوئی تھی۔ لکڑیوں کا یہ چوکور انبار کسی مرے ہوئے کی لاش کو جلانے کے لیے رکھا گیا تھا مگر راج محل میں کوئی بھی نہیں مرا تھا۔ چتا پر تیل انڈیل دیا گیا تھا اور ایک آدمی جلتی مشعل اٹھائے کھڑا تھا۔

راجہ جے پال کسی سے کوئی اور بات کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا اور چتا پر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مشعل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جو بہارنے مشعل اُسے دے دی۔ راجہ نے تیل میں بھیگی ہوئی لکڑیوں پر مشعل کا شعلہ رکھ کر آگ لگا دی۔ اُس کا بیٹا اُس کی طرف دوڑا لیکن شعلے اتنے اونچے اور اتنے ہیبت ناک ہو گئے تھے کہ کوئی قریب نہ جا سکا۔ راجہ جے پال نے اپنے آپ کو نہایت خاموشی سے جلا ڈالا۔

تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ راجہ جے پال نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو تاوان ادا کر دے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کو دل سے اتار دے لیکن انند پال نے جو سلطان محمود کا ہم عمر تھا، اپنے باپ کی جلتی چتا کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کیا "میں غزنی والوں کو ایک پیسہ تاوان ادا نہیں کروں گا۔۔۔۔ میں باپ کے خون کا انتقام لوں گا۔"

بہشت ایک رات کی

ملتان برِ صغیر کا واحد مقام ہے جو محمد بن قاسم کے دور سے لے کر اُس وقت تک مسلمان ریاست رہا ہے جب مغلوں کا سورج غروب ہو گیا تھا۔ گیارہویں صدی میں بھی ملتان اسلامی ریاست تھا اور اس کے ارد گرد ہندو ریاستیں تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب محمد بن قاسم کے بعد دوسرا مجاہد، سلطان محمود غزنوی ہندوؤں سے نبرد آزما تھا۔ اُس نے ہندوستان کے سب سے طاقتور راجہ جے پال کا غزنی پر تیسرا حملہ اس بُری طرح پسپا کیا تھا کہ اس راجہ نے اپنی راجدھانی میں واپس آ کر خودکشی کر لی تھی۔ محمود غزنوی نے پشاور کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر کے پشاور کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ اس طرح اُس نے غزنی اور اپنی تمام تر سلطنت کو محفوظ کر لیا تھا۔

اُس نے راجہ جے پال کو اس شرط پر رہا کیا تھا کہ وہ واپس جا کر اڑھائی لاکھ دینار تاوان ادا کرے گا اور کبھی اس طرف کبھی نہیں دیکھے گا۔ راجہ جے پال نے لاہور پہنچ کر اپنے بیٹے انند پال سے کہا کہ وہ محمود غزنوی کو تاوان ادا کر دے۔ اس کے فوراً بعد اُس نے اپنے آپ کو چتا میں جلا لیا۔ انند پال نے وہیں اعلان کر دیا کہ وہ تاوان ادا نہیں کرے گا اور اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا۔

یہ واقعہ ۱۰۰۱ عیسوی کا ہے۔

دو سال اور گزر گئے۔ تاوان کی بجائے سلطان محمود غزنوی کو جاسوسوں نے یہ اطلاع دی کہ انند پال اپنے باپ کی شکست کا انتقام لینے کی تیاری کر رہا ہے۔

"۔۔۔۔ اور یہ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں" ۔۔۔ محمود غزنوی نے کہا۔ "میں ذہنی طور پر ایسی

اسی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ میں نے جے پال کے علاقے پر اسی لیے قبضہ کیا ہے کہ اس کے ساتھی راجوں کو اور اسے مشورے دینے والوں کو سلطنت غزنی آسمان کے ستارے کی طرح دور نظر آئے۔ میں نے اپنی سلطنت کو نہیں، خانہ کعبہ کو اور خلافت کی گدی کو محفوظ کر لیا ہے۔"

"راجہ جے پال مر گیا ہے" — ایک سالار نے کہا — "اس کے بیٹے کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔"

"ذرا اور گہرائی میں سوچو میرے دوستو!" — محمود غزنوی نے کہا — "راجہ جے پال کے مر جانے سے بت پرست ہندوؤں کا عقیدہ نہیں مر گیا۔ یہ دو عقیدوں کی جنگ ہے جو ہندو کے راجے نہیں لڑ پائیں گے تو ان کے مذہبی پیشوا اور دانشور لڑائیں گے۔ دشمن کو حقیر نہ جانو۔ اب یہ سوچو کہ ہم اس دشمن کو کس طرح گھٹنوں بٹھا سکتے ہیں۔"

"اگر آپ ہم سے مشورہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں لاہور کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے" — ایک سالار نے کہا — "لیکن ہمیں ہندوستان میں اپنا ایک اڈہ قائم کرنا پڑے گا تاکہ ہم اور آگے بڑھ سکیں اور محمد بن قاسم کی سلطنت کو بحال کریں۔"

"اڈہ موجود ہے" — محمود غزنوی نے کہا — "کیا ملتان ہمارا اڈہ نہیں بن سکتا؟ ملتان کا حکمران ابوالفتح داؤد بن نصر مسلمان بھی ہے اور ہمارا دوست بھی۔"

"سلطان عالی مقام!" — محمود غزنوی کے وزیر نے کہا — "داؤد بن نصر مسلمان تو ہے، یہ نہ بھولیں کہ وہ قرامطی ہے۔ آپ قرامطیوں کی تاریخ سے واقف ہیں۔"

"اس نے سلطان سبکتگین مرحوم کے ساتھ دوستی اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کا معاہدہ کر رکھا تھا" — محمود غزنوی نے کہا — "وہ ہمیں دھوکہ نہیں دے گا۔"

"عالی جاہ!" — وزیر نے کہا — "دشمن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اپنی قوم کے غدار پر کبھی اعتبار نہ کریں۔"

"ایک ایلچی ملتان روانہ کر دو" — محمود غزنوی نے کہا — "مجھے امید ہے کہ محمد بن قاسم کی سلطنت کی اس آخری ریاست سے ہمیں پورا تعاون ملے گا۔ داؤد بن نصر ہندوؤں میں رہتا ہے۔ وہ ان کی نیت اور عزائم کو ہم سے زیادہ اچھی طرح سمجھتا

ہوگا۔ وہ ان میں گھرا ہوا ہے۔ وہ خوش ہوگا کہ ہم اپنی فوجیں ملتان لا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی اور اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے..... میں کوئی فوجی ایلچی بھیجوں گا۔"

"عاصم عمر بہتر رہے گا" — ایک سالار نے کہا — "ابھی جوانی کی عمر میں ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے اور خوش طبع بھی ہے۔"

"عاصم عمر!" — محمود غزنوی نے کہا — "اس کے متعلق مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ خوش طبع ہے۔"

"عاصم جنگی امور کو سمجھتا ہے" — ایک سالار نے کہا — "اور سمجھا بھی سکتا ہے۔ وہ جب میدان جنگ میں دشمن کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو اور زیادہ خوش طبع ہو جاتا ہے۔ یہ کمزوری نہیں خوبی ہے۔"

"اگر تمہیں یقین ہے کہ وہی بہتر رہے گا تو اسی کو بلا لو" — محمود غزنوی نے کہا — "میں اسے زبانی پیغام دوں گا کیونکہ اسے دشمن کے علاقے میں سے گزر کر جانا ہے۔ تحریری پیغام پکڑا جا سکتا ہے۔"

عاصم عمر جب ملتان کے حکمران ابوالفتح داؤد بن نصر کے دربار میں گیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اس دربار کی شان و شوکت دیکھ کر اسے شک ہوا جیسے داؤد بن نصر سارے ہندوستان کا بادشاہ ہو۔ وہ سلطان سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی کے دربار کا عادی تھا جہاں وہ ان کے برابر بیٹھا کرتا تھا اور مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ ملتان کے دربار میں وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھنے لگا۔ داؤد بن نصر تخت پر بیٹھا تھا۔ دو بڑی ہی حسین لڑکیاں اس کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ درباری یوں بیٹھے تھے جیسے بت دھرے ہوئے ہوں۔

"رعایا کے ان داتا!" — ایک آواز بلند ہوئی — "سلطان محمود بن سبکتگین کا ایلچی حاضر ہے۔"

عاصم عمر نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ جان نہ سکا کہ یہ صدا کس کی تھی۔

"غزنی کے ایلچی کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں" — داؤد بن نصر نے بادشاہوں کی

طرح کہا۔ "کیا پیغام لائے ہو؟"

"کچھ تحفے لایا ہوں"۔ عاصم عمر نے بوکھلا کر کہا۔ "پہلے یہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا سلطان محمود نے تمہیں دربار کے آداب نہیں سکھائے؟"۔۔۔ داؤد بن نصر نے مسکرا کر کہا۔

"ہمارے ہاں ایسا دربار نہیں ہوتا عالی جاہ!"۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔ "سلطان کا دربار کسی خیمے میں ہوتا ہے یا کسی وادی میں جس پر چٹانوں کا سایہ ہوتا ہے۔ ہم وہاں اکٹھے بیٹھتے ہیں۔"

"یہ میدانِ جنگ نہیں ہمارے معزز مہمان!"۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "یہاں کوئی درباری ہماری اجازت کے بغیر کھانس بھی نہیں سکتا۔"

"پھر سلطان نے مجھے غلط جگہ بھیج دیا ہے"۔ عاصم عمر نے جرأت مندی سے کہا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ میں محمد بن قاسم کی سلطنت کی آخری ریاست کے حکمران کے پاس جا رہا ہوں۔ میں اس امید پر آیا تھا کہ ریگزاروں اور چٹانوں کو روند کر اس سرزمین پر آنے اور اسلام کا پرچم لہرانے والے محمد بن قاسم کے جانشین بھی عرب کے مجاہدوں کی طرح بوریا نشین ہوں گے۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ہم محمد بن قاسم کے جانشین ہیں؟"۔ داؤد بن نصر نے گرج کر کہا۔ "ہم اس خطے کے فاتح ہیں۔ تم تاریخ سے بے خبر ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے دادا احمد خان لودھی قرامطی نے یہاں آکر ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ پھر بھی ہم تمہیں اجازت دے دیتے ہیں کہ اسے محمد بن قاسم کی فتوحات کی آخری نشانی کہو۔ ہم مسلمان ہیں، ہمیں غیر نہ سمجھو، مگر ہمارے دربار کے کچھ آداب ہیں۔"

"اگر ان آداب کا پابند نہ رہ سکنا گناہ ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں"۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔ "میں ان آداب سے واقف نہیں۔۔۔ کیا میں تحفے پیش کروں؟"

"اجازت ہے۔"

دربار کے باہر عاصم عمر کے ساتھ آئے ہوئے چار محافظ کھڑے تھے۔ تحفے

ان کے پاس تھے۔ عاصم عمر نے باہر جا کر اپنے محافظوں سے کہا کہ وہ تحفے اندر لے چلیں۔۔۔۔ ان میں بیش قیمت ہیرے بھی تھے اور غزنی کے علاقے کی دلکش اور قیمتی اشیا بھی تھیں۔ ایک تلوار بھی تھی جس کے متعلق عاصم عمر نے داؤد بن نصر کو بتایا کہ یہ راجہ جے پال کی تلوار ہے جو اس نے آخری حملے کی ناکامی کے بعد سلطان محمود غزنوی کے قدموں میں رکھی اور التجا کی تھی کہ اسے بخش دیا جائے، وہ آئندہ غزنی پر حملے کی جرأت نہیں کرے گا۔

عاصم عمر نے آگے بڑھ کر یہ تلوار داؤد بن نصر کے قدموں میں رکھ دی۔

"پیغام کیا ہے؟"۔۔۔ داؤد بن نصر نے پوچھا۔

"کیا مجھے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی؟"۔۔۔ عاصم عمر نے پوچھا۔

داؤد بن نصر نے درباریوں پر نگاہ دوڑائی تو تمام درباری اٹھ کر باہر چلے گئے۔ صرف دو لڑکیاں رہ گئیں جو داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ داؤد کے اشارے پر عاصم عمر اس کے قریب چلا گیا اور اس کے اشارے پر وہ تخت کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہمیں دربار کی اس شان و شوکت کو برقرار رکھنا پڑتا ہے"۔۔۔ داؤد بن نصر نے عام انسانوں کے لہجے میں کہا۔ "یہ ہماری مجبوری ہے اور آپ ایسے درباروں سے واقف نہیں۔ یہ آپ کی مجبوری ہے۔۔۔۔ کیا آپ کوئی تحریری پیغام لائے ہیں؟"

"راستے میں دشمن کے خطرے کی وجہ سے سلطان نے تحریری پیغام نہیں دیا"۔۔۔ عاصم عمر نے کہا۔ "میں سالار ہوں۔ پیغام چونکہ عسکری نوعیت کا ہے اس لئے سلطان نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ راجہ جے پال ہماری سلطنت پر تین حملے کر چکا ہے۔ ہر بار اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس نے تاوان اور اپنی جان بخشی کے عوض وعدہ کیا کہ وہ آئندہ حملہ نہیں کرے گا۔ اس نے ہر بار وعدہ توڑا۔ آخر اسے خودکشی کرنی پڑی۔ اس کا بیٹا انند پال اس کا جانشین ہے۔ اس نے تاوان ادا کرنے

سے انکار کر دیا اور اب سلطان کو اطلاعیں مل رہی ہیں کہ وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔"

دونوں لڑکیاں داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں اور وہ عاصم عمر کی باتیں غور سے سُن رہی تھیں۔

"آپ کو یہ علم ہے کہ اپنی سلطنت کو محفوظ کرنے کے لیے ہم نے لغمان اور پشاور پر قبضہ کر لیا ہے۔ معاہدے کے مطابق پنجاب ہماری سلطنت کا حصہ بن چکا ہے اور انند پال اور بھاٹنہ (بھیرہ) کا راجہ بجے رائے ہمارے باجگزار بھی ہیں اور ہمارے مقرر کیے ہوئے حاکم بھی۔ اُن کا کوئی حکم اور فرمان سُلطان محمود غزنوی کی مہر کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتا، مگر دونوں اس معاہدے سے منحرف ہو گئے ہیں۔ سُلطان نے فیصلہ کیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ یہ دونوں دوسرے راجاؤں کے ساتھ اتحاد کر کے ہم پر فوج کشی کریں، سُلطان ان پر فوج کشی کریں جس کے دو مقاصد ہوں گے۔ ایک یہ کہ انہیں شکست دے کر اقتدار سے محروم کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ ہند میں محمد بن قاسم کا دورِ حکومت واپس لایا جائے یا کم از کم شمال مغربی ہند سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہو جائے۔ یہ کارروائی اسلام کے فروغ کے لیے ہوگی۔ ایک اسلامی سلطنت بُت خانہ بن چکی ہے۔"

"اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا ہے" — داؤد بن نصر نے پوچھا۔

"میں چونکہ سالار ہوں، اس لیے عسکری رنگ میں بات کروں گا" — عاصم عمر نے کہا۔ "ہمیں انند پال اور بجے رائے کے علاقوں کے درمیان ایک مقام کی ضرورت ہے جسے ہم اپنا عسکری مستقر بنائیں گے۔ رسد ہمارے قریب ہونی چاہیے۔ آپ کی ریاست چونکہ اسلامی ہے اس لیے یہاں سے عسکری بھرتی بھی کر سکیں گے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری فوج میں آجانے سے ہندو آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں آپ سے اور آپ کو ہم سے مدد ملے گی۔ سلطان کو آپ کی طرف سے یقین دہانی کی ضرورت ہے۔ آپ ہمیں یقین دلا دیں کہ جب ہم پشاور سے ان کی طرف کوچ کریں گے تو آپ اپنی فوج کو اس مقصد کے لیے تیار

رکھیں گے کہ اگر انند پال یا بجے رائے نے ہم پر راستے میں حملہ کیا تو آپ عقب یا پہلوؤں سے ان پر حملہ کر کے اُلجھا لیں گے۔ ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر سلطان محمود فوج کشی کرنا چاہتے ہیں تو کریں، ہم انہیں روک تو نہیں سکتے" — داؤد بن نصر نے کہا۔ "میرے پاس اتنی فوج نہیں کہ میں دو راجاؤں کی فوج کا مقابلہ کر سکوں۔"

"اگر میں آپ کا یہ جواب لے کر سلطان کے پاس گیا تو وہ مطمئن نہیں ہوں گے" — عاصم عمر نے کہا۔ "میں خود بھی آپ کے جواب سے مطمئن نہیں ہُوا۔ فوج میری اور مجھ جیسے سالاروں کی قیادت میں پیش قدمی کرے گی۔ خطروں اور مشکلات کا جائزہ ہمیں لینا ہے۔ میں ادھر آتے ہوئے راستہ اور ارد گرد کی زمین دیکھتا آیا ہوں۔ میں کھیوڑا کے شمالی علاقے سے گزر کر آیا ہوں۔ میرے لیے یہی راستہ محفوظ تھا۔ فوج کو اس راستے سے نہیں گزارا جائے گا کیونکہ فوج کو روکنے کے لیے یہ علاقہ تیر اندازوں کے لیے نہایت اچھا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے تیر انداز پہلے ہی اس علاقے میں بھیج دیں۔ یہ ہماری فوج کی پیش قدمی کی حفاظت کریں گے۔"

"اگر ہم نے یہ اقدام کیا تو ہمیں اپنے تیر انداز اپنی ریاست سے نکال کر ہندو راجاؤں کے علاقوں میں بھیجنے پڑیں گے۔"

"لغمان اور غزنی راجہ جے پال کے علاقے نہیں تھے" — عاصم عمر نے کہا — "اور لغمان اور ہند ہمارے علاقے نہیں ہیں کہ جے پال نے ہمارے علاقے پر فوج کشی کی اور ہم ان کے علاقوں پر فوج کشی کر رہے ہیں۔ یہ نہ بھولیں کہ جن علاقوں پر یہ راجے قابض ہیں یہ سلطنتِ اسلامیہ کے علاقے ہیں۔ اگر نہ ہوں تو بھی ہمیں ان علاقوں کو اسلام کے پرچم تلے لانا ہے۔"

داؤد بن نصر گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد بولا — "آپ کے سلطان کا مطالبہ ایسا نہیں کہ اسے فوراً تسلیم کر لیا جائے۔ ہمیں جنگی نوعیت کا اقدام کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں گہری سوچ بچار کرنی پڑے گی اور اپنے مشیروں سے مشورہ لینا ہو

گا۔ آپ کو تین چار دن رکنا پڑے گا۔"

"کیا میں امید رکھوں کہ مجھے اطمینان بخش جواب ملے گا؟"

"امید رکھنے میں کوئی حرج نہیں"۔۔۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "آپ ملتان کی سیر کریں، شہر کی دیواریں دیکھیں۔ اس کے برج دیکھیں۔ شاید آپ شہر کے دفاع کے لیے کوئی بہتر مشورہ دے سکیں گے ..... آپ ہمارے شاہی مہمان ہیں۔ آج رات آپ کے اعزاز میں جشن منایا جائے گا اور بہت بڑی ضیافت ہو گی۔"

ضیافت اتنی بڑی تھی جو عاصم عمر دیکھ کر بھی تصور میں نہیں لا سکتا تھا۔ محل کے باغ میں جشن اور ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اوپر جو شامیانے اور ارد گرد جو قناتیں لگائی گئی تھیں، وہ یوں لگتا تھا جیسے سونے اور چاندی کے تاروں سے تیار کی گئی ہوں۔ شامیانوں کے ساتھ جو فانوس لٹک رہے تھے، ان کی روشنیوں کے کئی رنگ تھے۔ یہ روشن رنگ شامیانوں اور قناتوں کے چمکتے تاروں سے منعکس ہو کر ماحول کو طلسماتی بنا رہے تھے۔ کالے رنگ کے چہرے بھی گورے لگتے تھے۔

عاصم عمر پر ایسی پُرکیف کیفیت طاری ہونے لگی جیسے وہ قوس و قزح پر خراماں خراماں چلا جا رہا ہو۔ طاؤس اور طبلے کی ہلکی ہلکی سُر تال پر ایک نوجوان لڑکی یوں رقص کر رہی تھی جیسے کوئی حسین ناگن بین کی لَے پر بل کھا رہی ہو۔ اُس کے کندھے اور بازو عریاں، ڈھکے ہوئے سینے کے نیچے پیٹ کا خاصہ حصہ عریاں تھا۔ ناف کے نیچے سے ٹخنوں تک اسکا جو لباس تھا، وہ ریشم کی رنگ برنگی رسیاں تھیں جو لٹک رہی تھیں۔ سر کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جب رقص کی اداؤں سے بل کھاتی تھی تو اُس کی کبھی ایک کبھی دوسری ٹانگ ریشم کی رسیوں میں سے ٹخنے سے لے کر کولہے تک عریاں ہو جاتی تھی۔ اس کے جسم کا قدرتی رنگ گورا ہو گا لیکن روشنیوں کے رنگوں نے جل جل کر اُسے ایسا رنگ دے رکھا تھا جو دیکھنے والوں کو مسحور کر رہا تھا۔

یہ رقاصہ تماشائیوں پر سحر طاری کرتی ہوئی یوں نظروں سے اوجھل ہو گئی جیسے جل پری نیلے شفاف سمندر میں تیرتے تیرتے لہر اٹھا کے جل ترنگ میں تحلیل ہو گئی

ہو۔ ایسی ہی ایک اور جل پری موسیقی کی لہروں پر سے ترتی آئی اور پہلی سے زیادہ کیف پیدا کرنے لگی۔ عاصم عمر داؤد بن نصر سے دور بیٹھا تھا۔ وہاں سینکڑوں مہمان تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ ضیافت سلطان محمود غزنوی کے ایلچی کے اعزاز میں دی گئی ہے لیکن کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ سب کی نظریں ان نوجوان لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں جن کے جسم سُر تال پر تھرک رہے تھے۔

عاصم عمر نے تو جیسے میدانِ جنگ میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں بائیس سال سے وہ تھرکتے اور تڑپتے جسم دیکھ رہا تھا لیکن وہ جسم نوجوان رقاصہ لڑکیوں کے نہیں، زخموں سے کٹے ہوئے سپاہیوں اور کمانداروں کے تھے جو پتی ہوئی زمین پر، پتھروں پر اور ریت پر تھرکتے، تڑپتے اور ہمیشہ کے لیے بے حس ہو جاتے تھے۔ یہ سپاہی اُس کے اپنے بھی تھے، اُس کے دشمن کے بھی۔ اُس نے گھوڑوں، ہاتھیوں اور رتھوں تلے آ کر مرنے والے سپاہیوں کو بھی تڑپتے اور مرتے دیکھا تھا۔ اِن جسموں کا رنگ ایک ہی ہوتا تھا ۔۔۔ لال سرخ ۔۔۔ مرتے وقت دوست اور دشمن اسی ایک رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ اس ماحول پر روشنیوں کے رنگ نہیں، ایک ہی رنگ کی گرد چھائی رہتی تھی۔

عاصم عمر کو خاک و خون کے اسی ایک رنگ اور اس میں رنگے ہوئے ایک ہی جیسے ماحول سے پیار ہو گیا تھا۔ اُسے میدانِ جنگ کی ہولناکی اور ہیبت سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے سلطان کا جو دربار دیکھا تھا وہ بھی اسی رنگ کا تھا۔ دربار میں اُس کے چہرے پر جو گرد کی تہہ جمی ہوتی تھی، ویسی ہی تہہ اُس کے سلطان پر جمی ہوتی تھی۔ اُس دربار میں موت کے سائے رقص کرتے تھے۔

داؤد بن نصر کے جشن میں روشنیوں کے رنگوں اور ان رنگوں سے زیادہ حسین جسموں کو موسیقی کی لہروں پر بل کھاتے اور تیرتے دیکھا تو اُس کے سینے کا سپاہی مدہوش ہونے لگا۔ اُسے میدانِ جنگ کے تصور سے گھن آنے لگی ۔۔۔ اُسے خون کی بدبو سے نفرت ہونے لگی۔ داؤد بن نصر کے طلسم ہوشربا میں اُسے محسوس ہوا جیسے وہ پے در پے معرکوں سے تھک کر شل ہو چکا تھا اور اب وہ رکاب میں پاؤں جمانے اور گھوڑے پر سوار ہونے کے بھی قابل نہ رہا ہو۔ اُس کی جو قوت تھی وہ کمزوری بن گئی۔ اُس کا جو عزم تھا وہ

جوانی کا جبلی جذبہ بن گیا۔

دو لڑکیاں رقص کر کے جا چکی تھیں اور اب تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے جو لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھے، جذبات میں ہلچل بپا کرنے والا رقص کر رہے تھے۔ ہر لڑکے کے صرف کولہے رنگدار اور چمکدار ریشمی کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ موسیقی میں عربی رنگ بھی تھا۔ عاصم عمران لڑکوں میں کھویا ہوا تھا کہ عطر اور حسن کا ایک گولہ اس کے سامنے آ رکا۔ اُس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں جیسی ایک لڑکی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ عاصم عمر نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی نے چاندی کی طشتری اُٹھا رکھی تھی۔ اُس پر ایک صراحی اور پیالہ تھا۔

"یہ شاید شراب ہے؟" — عاصم عمر نے گھبرا کر کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔ مسلمان ہوں۔"

"شراب نہیں" — لڑکی نے کہا۔ "شربت ہے" — لڑکی نے عاصم کے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر طشتری رکھ کر صراحی سے پیالہ بھر دیا۔

عاصم عمر نے ڈرتے ڈرتے پیالہ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک ہی گھونٹ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اُس سے پوچھنا چاہتا ہو کہ یہ جنت کی نہر کا پانی تو نہیں؟ — لڑکی کے ہونٹوں کے تبسم نے ایک طاقتور سالار کی قوتِ گویائی جیسے سلب کر لی ہو۔ اتنے میں ایک نوعمر لڑکا جو اس لڑکی کی طرح دلنشیں تھا، ایک بڑی طشتری اٹھائے ہوئے آیا۔ اس میں چھوٹے بڑے سالم پرندے رکھے تھے جو روسٹ کئے ہوئے تھے۔ اُن سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا مہمانوں کے آگے ایسے ہی پرندے اور پیالے رکھے جا رہے تھے۔

لڑکی اور لڑکا چلے گئے۔ عاصم نے پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر اُس نے ایک پرندہ اٹھایا — اور پھر اُسے یوں کیف آنے لگا جیسے وہ پرندوں کی طرح اُڑ رہا ہو جیسے آ کر پھولوں کا رس چوس رہا ہو۔ لڑکی کئی بار آئی۔ لڑکا بھی آیا۔ وہ اُس کے آگے کچھ رکھ بھی دیتے تھے اور کچھ اُٹھا بھی لیتے تھے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کچھ اور کتنا کچھ کھا چکا ہے اور کتنا شربت پی گیا ہے۔

یہی لڑکی اُسے اُس کمرے میں لے گئی جو اُس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ خوشبو، سجاوٹ اور مسہری نے جیسے اُسے دھکیل کر پیچھے کر دیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو اس کمرے اور اس مسہری کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اُس کے قدم رکنے لگے۔ لڑکی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ پھر اُس کی پگڑی اتار کر پرے رکھ دی۔

"یہ شربت نہیں شراب تھی" — عاصم عمر نے کہا۔

"ہم سب مسلمان ہیں" — لڑکی نے کہا۔ "یہاں وہ شراب نہیں آ سکتی جو کافر پیا کرتے ہیں۔ ہم محمد بن قاسم کے جانشین ہیں۔ ہم اسلام کے پیروکار ہیں۔"

لڑکی نے صراحی میں سے پیالہ بھرا اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پینے لگا۔ جب اُس نے پیالہ رکھ دیا تو لڑکی نے اُس کے دونوں گال اپنے ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"یہی زندگی ہے" — لڑکی نے خوابناک آواز میں کہا۔ "یہی اسلام ہے۔ کوئی سزا نہیں، کوئی جزا نہیں۔"

عاصم عمر کی آنکھوں کے آگے اس لڑکی کی آنکھیں اور مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ دھندلا گیا۔ عاصم عمر کا ذہن اُس کے قابو سے نکل گیا تھا۔ اُس کے ذہن نے قبول کر لیا تھا کہ یہی زندگی اور یہی اسلام ہے۔ وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا تھا۔ ایک نیم عریاں اور حسین لڑکی کی گرم سانسوں نے ایمان کی شمع گل کر دی۔

شام کو جب مہمان جشن اور ضیافت کے لئے آ رہے تھے محل کے ایک کمرے میں ان دو میں سے ایک لڑکی جو ان کو داؤد بن نصر کے پیچھے کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں، ایک آدمی کو بتا رہی تھی کہ عاصم کا ایلچی [illegible] نصر کے لیے کیا پیغام لایا ہے، اور جب رقص کے دوران ایک لڑکی نے عاصم عمر کو شربت پیش کیا تھا، اُس وقت وہ آدمی داؤد بن نصر کے پاس بیٹھا تھا جسے لڑکی نے عاصم عمر کا پیغام سنایا تھا۔

"آپ کو سلطان محمود سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" — اس آدمی نے کہا۔ "کیا آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ مہاراجہ انند پال اور مہاراجہ بجے رائے آپ کی ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری لے چکے ہیں؟ ہم اس [illegible]

لیے آپ کے ہاں مقیم ہوں۔ سلطان محمود کو آپ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنی سلطنت کی توسیع کر رہا ہے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔"

"کیا آپ کو میری وفاداری پر شک ہے؟" — داؤد بن نصر نے پوچھا — "آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں نے اسلام کی روح مار دی ہے اور مسلمانوں کے دلوں سے سزا اور جزا کا تصور ختم کر دیا ہے؟ آپ سے کس نے کہا ہے کہ میں سلطان محمود کا مطالبہ پورا کر رہا ہوں؟ وہ دیکھیں، میں نے اُس کے لیے کیا انتظام کر رکھا ہے۔ اس لڑکی کو ہم نے انسانوں کو مسحور کرنے اور انہیں اپنا مذہب اور اپنا نام بھی فراموش کرا دینے کے لیے تیار کر رکھا ہے۔"

"یہ کافی نہیں" — اس آدمی نے کہا — "جس طرح یہ ایلچی سالار ہے، اسی طرح میں بھی اپنے ملک کا فوجی ہوں۔ میں آپ کو جنگی مشورہ دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سلطان محمود کو پسند نہیں کرتے۔ آپ یہی چاہتے ہیں کہ سلطان محمود کو جلد ہی دور تباہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے آپ اس آدمی کو تیار کر سکتے ہیں۔ ایسے کہیں کہ سلطان محمود اپنی فوج ملتان لے آئے اور آپ راستے میں اس کی حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ میں آپ کو وہ راستہ بتا دوں گا جس سے وہ فوج لائے۔ میں انتظام کر دوں گا کہ آنند پال کی فوج اُسے راستے میں بے خبری میں تباہ کر دے۔"

"میں نے ایلچی کا ذہن صاف کرنے کا بندوبست کر دیا ہے۔" داؤد بن نصر نے کہا — "وہ دیکھو۔ اُس نے ایک پیالہ خالی کر لیا ہے۔ وہ شربت سمجھ کر پی گیا ہے۔ کوئی کسر رہ گئی تو یہ لڑکی پوری کر دے گی۔"

عاصم عمر کے چاروں محافظ داؤد بن نصر کے محافظوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اُن کا سالار جیتے جی بہشت میں داخل ہو گیا ہے، اور اُسے معلوم نہیں کہ یہ ایک رات کی بہشت ہے۔

صبح طلوع ہوئی تو علی الصبح جاگ اٹھنے والا عاصم عمر ابھی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ سورج اوپر اٹھ آیا تو اس کی آنکھ کھلی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا دماغ واپس آ رہا تھا۔ رات والی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں طشتری تھی۔

"تم نے رات مجھے گناہگار کر دیا ہے؟" — عاصم عمر نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا — "میں یہاں کسی اور کام کے لیے آیا تھا۔"

لڑکی نے طشتری اُس کے آگے رکھ کر ایک پیالہ اُس کے ہاتھ میں دیا جس میں دودھ تھا۔ اُس نے پیالہ رکھ دیا اور بولا — "میں تمہارے ہاتھ سے کچھ بھی قبول نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ رات مجھے کیا ہوا تھا؟"

"تم جہنم سے جنت میں آ گئے ہو۔" اُسے ایک آواز سنائی دی۔

اُس نے اُدھر دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا سفید ریش بزرگ کھڑا تھا۔ اُس کے سپیدی مائل چہرے پر بڑھاپے کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید لبادے میں ملبوس تھا۔ اُس کی داڑھی دودھ کی طرح سفید اور لمبی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"تمہیں گناہوں سے ڈرانے والے خود گناہگار ہیں۔" سفید ریش نے کہا — "یہ تمہارے بادشاہ اور تمہارے سلطان ہیں۔ تم میدانِ جنگ کے خون خرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہو کہ یہ آسائش تمہیں گناہ کی طرح بُری لگتی ہے۔ یہ آسائشیں تمہارا حق ہے جو تم سے چھین لیا گیا ہے۔ تم سے جنگیں لڑائی جاتی ہیں اور تمہیں یقین دلایا جاتا ہے کہ تم لڑتے ہوئے مارے گئے تو سیدھے بہشت میں جاؤ گے، مگر تمہیں یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ بہشت اسی دنیا میں ہے۔ تمہارے بادشاہ اور سلطان تمہیں اس لیے مرواتے ہیں کہ وہ زندگی کے بہشت میں محفوظ رہ سکیں۔ تمہیں کس نے بتلایا ہے کہ اسلام نے عیش و عشرت کو گناہ کہا ہے؟"

سفید ریش کے بولنے کے انداز اور لب و لہجے میں ایسا تاثر تھا کہ عاصم عمر پر خود سپردگی کی وہی کیفیت طاری ہو گئی جو رات لڑکی کو دیکھ کر طاری ہوئی تھی۔ یہ دراصل انسانی فطرت کی کمزوریاں تھیں جو مجسم گناہ کو دیکھ کر اُس کے اندر بیدار ہو گئی تھیں۔ سفید ریش بزرگ اُسے جو کچھ کہہ رہا تھا وہ وہی کچھ سننا چاہتا تھا۔ اُسے گناہ کے لیے جواز کی ضرورت تھی جو یہ بوڑھا پورا کر رہا تھا۔ یہ اُسی انتظام کے تحت ہو رہا تھا جس کا ذکر داؤد بن نصر

نے اپنے ایک ہندو مہمان کے ساتھ کیا تھا۔ عاصم عمر سالاری کے رتبے کا آدمی تھا۔ اس ایک آدمی کے ذہن اور دل پر قبضہ کر لینے سے سلطان محمود غزنوی کی فوج کے چوتھائی حصے سے آسانی سے ہتھیار ڈلوائے جا سکتے تھے۔

عاصم عمر اس جال میں آچکا تھا۔ اُسے داؤد بن نصر کا پیغام ملا کر آج اُسے ملتان کی سیر کرائی جائے گی۔ اُس کے لیے داؤد کی ذاتی بگھی آگئی جس کے آگے اعلیٰ نسل کے چار گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ساتھ زرق برق لباس میں داؤد کے اپنے محافظ تھے۔ جہاں اُسے سیر کے لیے جایا گیا وہ دریا کے کنارے بڑی خوشنما جگہ تھی۔

عاصم عمر اپنے آپ کو بادشاہوں کے درجے کا آدمی سمجھنے لگا۔

اس کے اپنے جو چار محافظ آئے تھے، اُن کے متعلق اُس نے پوچھا ہی نہیں کہ کہاں ہیں۔ انہیں بھی دربار سے اطلاع دی گئی تھی کہ آج اُن کا سیر کا دن ہے۔ وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں چنانچہ وہ شہر میں چلے گئے تھے۔

وہ ایک درویش صورت انسان تھا۔ لباس سے بھی درویش ہی لگتا تھا۔ سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی اور چہرے کے نور سے عالم فاضل لگتا تھا۔ ایک چھوٹے مکان کے دروازے میں داخل ہوتے ہوتے رُک گیا۔ اُسے چار لمبے تڑنگے غزنوی آتے نظر آئے جن کا لباس بتا رہا تھا کہ مسلمان ہیں اور اجنبی۔ وہ ملتان کے تو لگتے ہی نہ تھے، وہ ہندوستان کے کسی خطے کے بھی نہیں تھے۔ درویش ان کے راستے میں رُک گیا۔

"غزنی؟" — درویش نے مسکرا کر کہا۔

چاروں رُک گئے اور مسکرانے لگے۔

"کیا آپ لوگ تھوڑی سی دیر کے لیے میرے گھر میں آنا پسند کریں گے؟" — درویش نے فارسی زبان میں کہا — "مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔"

اپنی زبان سن کر چاروں درویش کے ساتھ اندر چلے گئے۔ خاطر تواضع کے دوران محافظوں نے درویش کو بتایا کہ وہ سالار عاصم عمر کے ساتھ آئے ہیں جو داؤد بن نصر کے لیے سلطان محمود کا پیغام لایا ہے۔

"عاصم عمر اس وقت کہاں ہے؟" درویش نے پوچھا۔

"ہم نے انہیں شاہی بگھی پر سیر کو جاتے دیکھا تھا" — ایک محافظ نے جواب دیا۔

"میں عاصم عمر سے ملنا چاہتا تھا" — درویش نے کہا — "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ شاید اپنے محافظوں سے بھی نہیں مل سکے گا۔"

"کیوں؟" — ایک محافظ نے حیران ہو کر پوچھا — "یہاں ایسا خطرہ تو نہیں کہ اُسے قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ راجہ بجے پال نے ایک بار ہمارے دو سلامیوں اور اُن کے محافظوں کو لاہور میں قید میں ڈال دیا تھا۔ وہ قید میں ہی بھوک کے پیاسے مر گئے تھے۔"

"وہ قید اچھی ہے جس میں انسان اذیت، بھوک اور پیاس سے مر جاتا ہے" — درویش نے کہا — "مگر جن زنجیروں میں آپ کے سالار عاصم عمر کو باندھا گیا ہے وہ بہت بُری ہیں۔ اس قید میں انسان تو زندہ رہتا ہے، اُس کا ایمان اور اُس کا مذہب مر جاتا ہے۔ وہ سپاہی نہیں رہتا۔ یہ اُن حسین اور بے حجاب لڑکیوں کے گیسو اور اُن کے نازک اور کھلتے جسموں کی زنجیریں ہیں جنہیں محل میں اسی مقصد کے لیے پالا جاتا ہے۔ وہ جب رات ضیافت میں گیا تھا تو آپ نے اُسے وہاں دیکھا تھا؟"

"نہیں، الگ کھانا دیا گیا تھا" — ایک محافظ نے کہا۔

"اُسے رات شراب پلائی گئی تھی" — درویش نے کہا — "اور باقی رات وہ ایک ایسی لڑکی کے تعیش میں رہے ہیں جو جادوگریاں کیا کرتی ہیں۔"

"کیا آپ بھی رات کے جشن میں گئے تھے؟"

"نہیں" — درویش نے جواب دیا — "شاہی دربار کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں لیکن میری آنکھیں اور میرے کان دربار میں رہتے ہیں۔ عاصم عمر جو پیغام لایا ہے، میں وہ بھی جانتا ہوں۔"

"خطرہ کیا ہے؟"

"خطرہ یہ ہے کہ عاصم عمر داؤد بن نصر کا مرید اور ہندو راجوں کا نمائندہ بن کر

واپس جائے گا اور سلطان کے لیے ایک دھوکہ دے کر جائے گا" ___ درویش نے کہا ___ "میں سوچ رہا تھا کہ میں ملتان تک یا آپ لوگوں تک کس طرح پہنچوں۔ ارادہ نیک ہو تو خدائے ذوالجلال سبب پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ شہر کی سیر کے لیے آئے تھے اور خدا نے مجھے آپ کے راستے میں کھڑا کر دیا۔"

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ ملتان اسلامی ریاست ہے۔" ایک محافظ نے کہا ___ "اور داؤد بن نصر مسلمان ہونے کی وجہ سے سلطان سبکتگین کے دور سے ہمارا دوست چلا آ رہا ہے۔"

"میں حیران ہوں کہ سلطان محمود نے سب کچھ جانتے ہوئے آپ کو یہاں کی حقیقت کیوں نہیں بتائی۔" درویش نے کہا۔ "یہ مجھ سے سن لو تا کہ تم بھی انہی زنجیروں میں نہ بندھ جاؤ جن میں تمہارا سالار گرفتار ہو چکا ہے ... ملتان پر قرامطی فرقہ حکمران ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں لیکن ان کے عقیدے اسلام کے منافی ہیں، مثلاً یہ کہ نیکی اور بدی، جزا اور سزا محض ڈھکوسلے ہیں۔ انسان کو خدا نے عیش و عشرت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں حرام اور حلال میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے باوجود یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے۔ اس فرقے کے دو بانی تھے۔ ایک عبداللہ اور دوسرا میمون ... انہوں نے تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں کہیں عرب میں اس کی بنیاد رکھی تھی مگر اس فتنے کے اصل بانی عیسائی مبلغ تھے، اور انہیں یہودیوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ بعض مؤرخوں نے اسے ایرانی فرقہ کہا ہے ....

"اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ فرقہ کیوں پیدا کیا گیا تھا ... اسلام کی روح کو مسخ کرنے کے لیے ___ اسلام آدھی دنیا میں پھیل چکا تھا۔ لوگ سچے مذہب کی تلاش میں تھے۔ اسلام قبول کر رہے تھے۔ اسلام کا نور بحیرۂ روم کے دوسرے کنارے سے بھی دور آگے کفرستان میں چلا گیا تھا۔ عیسائی مبلغوں اور یہودی فتنہ پردازوں نے اس اصول پر عمل کیا کہ کسی مذہبی نظریئے کو تلوار سے نہیں کاٹا جا سکتا۔ اس نظریئے کے پیروکاروں کے قتل عام سے نظریہ ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر نظریہ برحق ہو تو یہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مذہبی نظریئے کو تباہ کرنے کے لیے اس میں ملاوٹ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے قائدین اور پیروکاروں کے ذہنوں پر قبضہ کیا جائے۔ اس کا ایک طریقہ ہے کہ ان میں ذہنی عیاشی اور لذت پرستی پیدا کی جائے ....

"انسان کی سب سے بڑی کمزوری جنسی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ خدا کی نگاہ میں مقدس ہے کیونکہ اسی سے انسان پیدا ہوتا ہے مگر یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے کیونکہ اس کے ساتھ لذت اور فرار وابستہ ہیں۔ ہمارے دشمنوں نے اسلام کو جب بھی نقصان پہنچایا ہے، ہماری قوم کے اسی جذبے کو مشتعل کرنے کے سامان مہیا کیے ہیں جن میں دولت اور عورت سرفہرست ہیں ....

"عیسائیوں اور یہودیوں نے عبداللہ اور میمون کو زر و جواہرات اور اپنی دلکش بیٹیوں کے ذریعے اپنا غلام بنا لیا اور ان کے ہاتھوں قرامطی فرقے کی بنیاد رکھوائی اور اسے سچا اسلام کہا۔ بظاہر مذہب پر حملہ نہ کیا، مذہب کے اصولوں میں رد و بدل کر کے کہا گیا کہ اصل اصول یہ تھے جنہیں دوسرے فرقے بدلتے رہے تھے۔ اس فرقے نے مسلمان عورتوں کو بے حجابی کی اجازت دی اور مردوں سے کہا کہ کوئی بھی حرکت گناہ نہیں ہے۔ جہنم اور جنت عالموں کے ذہن کی تخلیق ہیں۔ انسان کا حق ہے کہ وہ اسی دنیا کو اپنے لیے جنت بنا لے ....

"انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ نیکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا اور کبھی پیچھے بھی ہٹ آتا ہے لیکن بدی کی طرف لپکتا ہے۔ قرامطی فرقہ پھلنے پھولنے لگا۔ تھوڑی سی مدت میں اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے ۲۹۰ ہجری میں شام کے مسلمانوں کو پہلے ذہنی پھر جسمانی طور پر تباہ کیا۔ پھر باقاعدہ حملہ کر کے ان کے گھر تباہ کر دیئے اور قتل عام بھی کیا۔ ۳۱۱ ہجری میں انہوں نے دو شہروں کوفہ اور بصرہ کو لوٹا اور یہ شہر اجاڑ دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے ابو طاہر نام کے ایک آدمی کو جو مشہور بدکردار تھا خلافت کی گدی پر بٹھا دیا اور مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا ....

"قرامطیوں نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ خانہ کعبہ سے حجر اسود (سیاہ پتھر) بصرہ کو اٹھا لے گئے۔ یہ تاریخی پتھر بیس سال تک ان کے قبضے میں رہا۔ خلفاء نے انہیں جو ڈھیل دے

رکھی تھی، وہ روک لی اور اُن پر ٹڈی دَل کی شکل میں ایسا عذابِ الٰہی نازل ہُوا کہ ان کی زیادہ تر تعداد ماری گئی اور اس فرقے کے جو لوگ بچ نکلے، وہ ایران چلے گئے۔ وہاں اُن پر خدا نے زمین تنگ کر دی تو وہ ہندوستان کے ان علاقوں میں آگئے جہاں آج آپ انہیں دیکھ رہے ہیں ....

"داؤد بن نصر کے دادا حمید خان قرامطی نے ملتان کو تباہ کر دیا تھا۔ اسے پھر سے آباد کیا اور اس طرح اپنی دہشت پھیلا کر اپنے فرقے کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اپنے ساتھ اصل اسلام لائے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ ریاست جو مسلمانوں کی ریاست تھی اور محمد بن قاسم کی آخری یادگار، قرامطیوں کا مرکز اور اڈہ بن گئی۔ انہوں نے یہاں بدی اور عیش و عشرت رائج کی اور اسے اسلام کہا۔ موجودہ حکمران داؤد بن نصر کے باپ نے ہندو راجاؤں اور مہاراجوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ پہلے اس فرقے کو عیسائی اور یہودی مدد دیتے تھے۔ اب ہندو ان کی پشت پناہی کرنے لگے ہیں ....

"میں نے آپ کو قرامطیوں کی تاریخ اس لیے سُنائی ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ ایک زہریلے سانپ سے مدد مانگنے آئے ہیں۔ اگر اس نے مدد کا وعدہ کیا تو یہ دھوکا ہو گا۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ سالار عاصم عمر کیا پیغام لائے ہیں؟" — ایک محافظ نے پوچھا — "اور آپ کو یہ کس طرح معلوم ہُوا ہے کہ انہیں رات شراب پلائی گئی ہے؟ .... کیا آپ غزنی کے جاسوس ہیں؟"

"نہیں" — درویش نے جواب دیا — "میں سلطان محمود کا نہیں، محمد بن قاسم کا جاسوس ہوں۔ ہم اُس اسلام کے پاسبان ہیں جو محمد بن قاسم یہاں لایا تھا۔ ہم نے زمین دوز جماعت بنا رکھی ہے جو اصل اسلام کا پرچار اور قرامطیوں کے اسلام کے خلاف کام کر رہی ہے۔ ہمارے بعض آدمی شاہی محل میں بھی ملازم ہیں۔ وہ اندر کے بھید معلوم کرتے رہتے ہیں۔ داؤد کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ اُس کے خلاف ایک جماعت سرگرم ہے۔ اُس کے مخبر ابھی تک اس جماعت کا سراغ نہیں لگا سکے۔ ہمیں قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے کہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی ہونے

والی ہے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ کو سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ داؤد آپ کا نہیں ہندوؤں کا دوست ہے" — درویش نے جواب دیا — "دوسرے یہ کہ آپ کو اپنے اس سالار پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اگر واپس جا کر سلطان کو کوئی جواب دے تو آپ سلطان کو یہ بتائیں کہ وہ داؤد پر بھروسہ نہ کرے، اور اگر آپ کا سلطان ہندو ریاستوں پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کرے تو سب سے پہلے ملتان آئے اور ان قرامطیوں کو ختم کرے .... میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مسلمان ہو کر اسلام کے ساتھ کھیلنے والی قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس فرقے کو بھی تباہ ہونا ہے۔ داؤد بن نصر اسلام کا جھانسہ دے کر مسلمانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ تباہی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ سالار عاصم عمر کیا کرتے ہیں" — ایک محافظ نے کہا — "ہو سکتا ہے وہ داؤد بن نصر کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اگر وہ اُس کے جال میں پھنس گئے تو ہم واپس جا کر سلطان کو یہ باتیں بتا دیں گے جو آپ نے ہمیں بتائی ہیں۔"

عاصم عمر داؤد بن نصر کے پاس بیٹھا تھا۔ اُن کے سامنے ایک نقشہ رکھا تھا جو کسی نے ہاتھ سے بنایا تھا۔

"آپ یہ نقشہ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں" — داؤد بن نصر نے کہا — "میں نے آپ کو راستہ بتا دیا ہے۔ سلطان کی فوج اس رستے سے آئے۔ میں نے آپ کو وہ جگہ بھی بتا دی ہے جہاں سے آپ کی فوج دریائے چناب پار کرے گی۔"

"راستے میں انند پال یا کسی راجے کی فوج ہمارا راستہ ضرور روکے گی" — عاصم عمر نے کہا — "آپ نے جو راستہ دکھایا ہے اسے میں محفوظ نہیں سمجھتا .... آپ کی فوج کس طرح ہماری فوج کی حفاظت کرے گی؟"

داؤد نے جواب دیا جس سے عاصم عمر مطمئن نہ ہُوا۔ وہ داؤد کی باتوں اور اُس کے وعدوں کو فنِ حرب و ضرب کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا۔ اُسے کچھ شک سا ہونے لگا۔ اُس نے

داؤد کے ساتھ اتنی بحث کی کہ داؤد پریشان ہو گیا۔

"کیا آپ یہاں کچھ دن اور رہنا پسند نہیں کریں گے؟" داؤد نے اُس سے پوچھا۔

"میں اپنے فرض کی خاطر جا رہا ہوں" — عاصم عمر نے کہا — "ورنہ میں تو جانا ہی نہیں چاہتا۔"

"پھر آپ اپنا فرض اس طرح پورا کریں جس طرح میں بتاتا ہوں" — داؤد بن نصر نے کہا — "آپ سلطان کو اسی راستے سے لائیں اور آپ ہمارے پاس آ جائیں۔ آپ ہماری فوج کے سالار ہوں گے اور آپ کو یہی عیش و عشرت ملے گی جو آپ کو مل رہی ہے۔ اگر آپ سلطان محمود کو کامیابی سے ہمارے پھندے میں لے آئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنی ریاست کا کچھ علاقہ دلا کر خود مختار حاکم بنا دوں گا۔ اتنی تنگیاں اٹھا کر آپ کا حق ہے کہ آپ اس دنیا کو اپنے لیے جنت نظیر بنائیں۔"

داؤد بن نصر نے وہی باتیں شروع کر دیں جو ایک سفید ریش بزرگ اُس کے دل میں اتار چکا تھا۔ داؤد نے یہ بھی کہا کہ ہندوؤں سے بڑھ کر کوئی اچھا دوست آپ کو نہیں ملے گا۔ ان کے ساتھ رہ کر دیکھو۔ اپنے سلطان کی خواہشات اور اُس کے عزائم پر اپنی جانیں قربان نہ کرو۔ کل صبح روانہ ہو جاؤ اور سلطان سے کہو کہ داؤد بن نصر آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔

اسی شام کا ذکر ہے۔ عاصم عمر اپنے کمرے میں تھا۔ اُس نے اپنے چاروں محافظوں کو بلا رکھا تھا۔ وہ اُن سے کہہ رہا تھا کہ کل صبح واپسی ہو گی۔ انہیں روانگی کے احکام دے کر اُس نے محافظوں کو فارغ کر دیا۔ چاروں محل کی ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چاروں نے پیچھے دیکھا۔ ایک عورت آ رہی تھی۔ اُس نے ان کے قریب سے گزرتے دھیمی آواز میں کہا — "تم میں سے ایک اسی وقت اُس عالم کے پاس چلا جائے جس نے چاروں کو اپنے گھر میں بٹھایا تھا" — یہ کہہ کر وہ آگے نکل گئی۔

ان میں سے ایک محافظ محل میں سے نکل گیا اور درویش کے دروازے پر جا دستک دی۔ دروازہ درویش نے کھولا اور وہ محافظ کو اندر لے گیا۔

"عاصم عمر قرامطیوں کے خوبصورت پھندے میں آ گیا ہے" — درویش نے کہا — "اُس نے داؤد کے ساتھ سودا طے کر لیا ہے۔ نقشہ اس کے پاس ہے۔ آپ لوگ کل صبح روانہ ہو رہے ہیں۔ عاصم عمر یہ نقشہ سلطان محمود کو دکھائے گا اور اُس پر اُسے ایک راستہ دکھائے گا۔ تم سلطان سے کہنا کہ وہ اس راستے سے نہ آئے۔ اُسے یہ کہنا کہ جنہیں آپ اپنا مسلمان بھائی سمجھتے ہیں وہ ہندوؤں سے زیادہ خطرناک ہیں ... جاؤ، زیادہ دیر یہاں نہ رکو۔"

"وہ کون تھی جس نے ہمیں پیغام دیا تھا کہ ہم میں سے کوئی آپ سے ملے؟" — محافظ نے پوچھا۔

"وہ ایک مظلوم عورت ہے" — درویش نے جواب دیا — "آپ نے اس کی خوبصورتی دیکھی ہو گی۔ اس کے ماں باپ نے منہ مانگی رقم اور کچھ زمین لے کر اس کی شادی ایک بڑے ہی امیر آدمی کے ساتھ کر دی تھی۔ اس آدمی نے ایک سال بعد اسے تحفے کے طور پر داؤد بن نصر کو دے دیا۔ اس کے پاس ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اس نے ڈیڑھ دو سال حرم میں رکھ کر اسے شاہی دربار کی ملازمت دے دی۔ یہ میری بیٹی کی سہیلی تھی۔ کبھی کبھی گھر آیا کرتی ہے اور میری بیٹی سے ملتی ہے۔ پہلے پہل بہت روتی تھی۔ میرے کہنے پر میری بیٹی نے اسے کہا کہ وہ اس خوبصورت جہنم میں رہ کر اسلام کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ مجھے محل کے اندر کی خبریں دیتی رہتی ہے ....

"آج جب داؤد بن نصر آپ کے سالار عاصم عمر کو اپنے پھندے میں پھانس رہا تھا اور اُسے تیار کر رہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو فلاں راستے سے لائے، اُس وقت یہ عورت ان دونوں کو شراب اور شربت پیش کر رہی تھی۔ اس نے دونوں کی باتیں سنیں۔ اسے جونہی وہاں سے چھٹی ملی وہ میرے گھر آ گئی اور ساری بات سنا گئی۔ اب یہ ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ سلطان سے منوا لو کہ عاصم عمر اُسے دھوکہ دے رہا ہے اور آپ جو کر رہے ہیں یہ صحیح ہے۔"

"یہ عورت آپ کے پاس آتی رہتی ہے؟" محافظ نے کہا — "اسے محل سے نکلنے کی اجازت مل جاتی ہے؟ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اسے آپ کہیں غائب کر دیں؟"

کوئی مسلمان اسے ساتھ لے کر کہیں اور چلا جائے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔"

"کئی بار سوچا ہے" — درویش نے جواب دیا "لیکن ایسا مسلمان نہیں ملتا جو اسے لے کر کہیں چلا جائے۔ آج اُس نے مجھے کہا تھا کہ اگر آپ لوگ پسند کریں اور ہمت کریں تو اُسے اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ اگر اس کے ساتھ کسی نے شادی نہ کی تو وہ باقی عمر کسی مزار پر گزار دے گی یا کسی عالم یا ولی کی خدمت کرے گی۔"

"ہم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں" — محافظ نے کہا "لیکن اسے سب کے سامنے لے جانا ناممکن ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ اسے کوئی شہر سے دور ہمارے راستے میں کہیں تک پہنچا دے۔ ہمارے لیے دوسری مشکل یہ ہے کہ سالار عاصم عمر شاید ہمیں لڑکی کو ساتھ نہ لے جانے دے۔ ... اسے ہم سنبھال لیں گے۔"

اگلے روز طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے سالار عاصم عمر اپنے چاروں محافظوں کے ساتھ روانہ ہُوا۔ اُن کے ساتھ اب ایک اونٹ بھی تھا جو داؤد بن نصر کے دیئے ہوئے تحفوں سے لدا ہُوا تھا۔ ایک محافظ کی برچھی کے ساتھ چھوٹا سا سفید جھنڈا بندھا تھا جو اُس نے بلند کر رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم دوست ہیں۔

قافلہ شہر سے دور نکل گیا۔ دریا بھی پار کر لیا گیا۔ سالار عاصم عمر جب ملتان کی طرف آ رہا تھا تو محافظوں کے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کرتا آیا تھا مگر اب وہ خاموشی سے آگے آگے جا رہا تھا۔ اُس کی گردن بادشاہوں کی طرح تنی ہوئی تھی۔ وہ محافظوں کے ساتھ کوئی بات کرتا بھی تھا تو یہ کوئی حکم ہوتا تھا، یا کوئی ہدایت۔ سورج غروب ہونے کو تھا جب یہ لوگ ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ ایک محافظ نے اپنے ساتھیوں کو ایک طرف اشارہ کیا۔ سب نے دیکھا۔ گھنی جھاڑیوں میں چار آنکھیں اور دو چہروں کے ذرا ذرا سے حصے نظر آ رہے تھے۔ عاصم عمر آگے نکل گیا تھا۔

محافظوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا جو انہوں نے گزشتہ رات تیار کیا تھا۔ اس کے مطابق ایک محافظ نے اپنا گھوڑا روک لیا اور گھوڑے کو آہستہ آہستہ گھنی جھاڑیوں اور درازی گھاس میں لے گیا۔ وہی جوان عورت جس نے انہیں درویش کے گھر جانے کا پیغام دیا تھا، اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی

بھی تھا۔ اس نے عورت اس محافظ کے حوالے کی اور خاموشی سے چلا گیا۔ محافظ عورت کو ساتھ لیے وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سوائے مسکرانے کے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ عورت اُسے اشاروں کی زبان میں کہہ رہی تھی کہ چلیں مگر محافظ اُسے بیٹھے اور چھپے رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ عاصم عمر نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ ایک محافظ غائب تھا۔ اُس نے دوسروں سے پوچھا تو تینوں محافظ حیران بھی ہوئے اور گھبرانے بھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور اب انہیں پتہ چلا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ عاصم عمر آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ تینوں پر خوب برسا۔

"وہ واپس ملتان چلا گیا ہے" — ایک محافظ نے کہا "اس نے ہمیں کہا تھا کہ ملتان نے اسے اتنا پسند آیا ہے کہ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ ہم اسے مذاق سمجھتے رہے۔"

"وہ کسی بازاری رقاصہ کو دل دے بیٹھا ہے"۔ دوسرے نے کہا "اُسے تلاش کرنا بیکار ہے۔"

عاصم عمر نے بہت سوچا اور بولا "اس کی تلاش اور تعاقب بے کار ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اُسے ذلیل و خوار ہونے کے لیے وہیں جانے دیا جائے جہاں وہ گیا ہے" — اس نے ایک اتنے اہم محافظ کی گمشدگی کو ذہن سے اتار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا اپنا ذہن ملتان میں داؤد بن نصر کے محل میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر وہاں سے آ گیا تھا، ذہنی طور پر وہ وہیں تھا۔ ایک محافظ تو معمولی سا آدمی تھا، اُس کی نظروں میں سلطان محمود کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ جب اپنے تین محافظوں کے ساتھ سویا ہُوا ہو گا، اُس کا گمشدہ محافظ ایک عورت کے ساتھ دُور آگے جا چکا ہو گا۔

سلطان محمود غزنوی پشاور میں اپنے ایلچی سالار عاصم عمر کا انتظار بے تابی سے کر رہا تھا۔ دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ سلطان محمود نے کئی بار اس خطرے کا اظہار کیا کہ عاصم عمر اپنے محافظوں سمیت مارا گیا ہے یا ہندوؤں کے کسی قید خانے میں پہنچا دیا گیا ہو گا۔ اُس

نے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ عاصم عمر اور اُس کے محافظوں کو ہندوؤں نے قید میں ڈال رکھا ہے۔ وہ اُن کی ریاستوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور وہاں اُسی ہندو کو زندہ رہنے کا حق دے گا جو اسلام قبول کرے گا۔

ایک روز اُسے اطلاع دی گئی کہ سالار عاصم عمر کا ایک محافظ ہندوستان کی بڑی حسین عورت کے ساتھ آیا ہے اور سفر زدہ ہو کر بہ پاس و تھکاوٹ سے نڈھال اور گرد سے دونوں کی حالت بہت بُری ہے۔

"انہیں فوراً اندر بھیجو" ۔ سلطان محمود نے گھبرا کر کہا ۔ "کوئی حادثہ ہو گیا ہے"

محافظ اندر آیا تو اُس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور اُس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ عورت کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ سلطان محمود کے حکم پر دونوں کو پانی پلایا گیا۔

"سلطان عالی مقام!" ۔ محافظ نے کہا ۔ "ہم راستے میں ذرا سی دیر اس لیے رکتے رہے کہ گھوڑا آرام کرے۔ ہمیں آپ کے حضور سالار عاصم عمر سے پہلے پہنچنا تھا۔ وہ شاید ابھی نہیں پہنچا۔ وہ آپ کے پیغام کا جواب لا رہا ہے جو سراسر فریب ہے۔ ملتان کا حکمران داؤد بن نصر ہندوؤں سے بڑھ کر آپ کا دشمن ہے۔ بجی راؤ اور آنند پال نے اُسے اپنا اتحادی بنا رکھا ہے۔ انہوں نے آپ کو مروانے اور ہماری فوج سے ہتھیار ڈلوانے کا کام داؤد بن نصر کے سپرد کیا ہے۔ اس قرامطی نے عاصم عمر کو ایک نقشہ دیا ہے جس پر وہ راستہ دکھایا گیا ہے جس سے آپ اپنی فوج ملتان لے جائیں گے۔ ہندو مہاراجوں نے آپ کے لیے ایک پھندا تیار کیا ہے"

"کیا عاصم عمر کو داؤد بن نصر کی نیت کا پتہ چلا ہے؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"عاصم عمر اپنا ایمان فروخت کر کے آ رہا ہے" محافظ نے سلطان محمود کو بتایا کہ عاصم پر کیسے طلسم طاری کیے گئے ہیں اور وہ اب ہمارا سالار نہیں، داؤد بن نصر کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ اُس نے کہا ۔ "وہ اسی فریب میں برابر کا شریک ہے جو آپ کو دیا جائے گا"

محافظ نے اس عورت کے متعلق سلطان محمود کو بتایا کہ اُسے کس طرح محل میں پہنچا دیا گیا تھا اور اس نے اپنی عزت کو محفوظ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کر رکھا تھا ... ایک ترجمان کے ذریعے عورت نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ داؤد بن نصر کے محل میں کیا ہوتا ہے، وہاں کیا مذہب رائج ہے اور عاصم عمر کو کس طرح جال میں پھانسا گیا ہے۔ اس نے داؤد اور عاصم عمر کی پوری گفتگو سنائی جو اُس نے اپنے کانوں سنی تھی۔

"اس عورت کو زنانہ میں بھیج دیا جائے" ۔ سلطان محمود نے کہا ۔ "اور اس محافظ کو ہمارے مہمان خانے میں رکھا جائے۔ جب عاصم عمر آئے تو اُسے پتہ نہ چلنے دیا جائے کہ یہ دونوں اُس سے پہلے آ گئے ہیں"

عاصم عمر پانچ چھ روز بعد آ گیا اور سیدھا سلطان محمود کے پاس گیا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ داؤد بن نصر نے بیش قیمت تحفے بھیجے ہیں اور کہا ہے کہ وہ سلطان کے انتظار میں بے تاب ہو رہا ہے۔ عاصم عمر نے نقشہ سلطان محمود کے آگے رکھ کر بتایا کہ داؤد بن نصر نے ہماری فوج کے لیے یہ راستہ بتایا ہے۔ اس کی فوج اس راستے کے دائیں بائیں کے علاقے میں موجود ہو گی۔ عاصم عمر نے کہا کہ داؤد بن نصر ہمارا مخلص دوست ہے۔

"میں نے اپنی فوج ملتان تک لے جانے کا راستہ دیکھ لیا ہے" ۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اب مجھے یہ بتاؤ کہ بجی راؤ اور آنند پال کی فوجیں کہاں کہاں ہماری فوج پر شبخون ماریں گی اور گھات کہاں کہاں لگائیں گی؟"

عاصم عمر نے حیرت سے سلطان محمود کی طرف دیکھا۔ سلطان محمود نے حکم دیا ۔ "ان دونوں کو لے آؤ"

ذرا سی دیر میں عاصم عمر کا جو محافظ تھا، ایک عورت کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اس عورت کو پہچانو" ۔ سلطان محمود نے عاصم عمر سے کہا ۔ "اور یاد کرو کہ جب تم داؤد کے ساتھ اپنے ایمان کا اور میری جان کا سودا طے کر رہے تھے، یہ عورت تم دونوں کو شراب پلا رہی تھی ... کیا اپنے گناہ کی ہر ایک تفصیل میری زبان سے سننا چاہتے ہو یا اس عورت کی زبانی؟ ... کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اپنی زبان سے اپنے گناہ کا اعتراف کر لو؟"

عاصم عمر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایمان فروشی اور گناہوں کے اثرات نے اُس کے جسم کی طاقت سلب کر لی۔ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل نہ رہا۔ اُس نے اپنی تلوار نکال لی اور بجلی کی سی تیزی سے اُس کی نوک اپنے پیٹ پر رکھی پیشتر اس کے کہ کوئی اُس تک پہنچتا اُس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار اتنے زور سے اپنے پیٹ میں داخل کر دی کہ اس کی نوک پیٹھ سے باہر آ گئی۔

"اس کی لاش شہر سے باہر پھینک دو" سلطان محمود نے کہا۔" ایمان فروشوں کو گور و کفن کا حق نہیں ملنا چاہئے۔"

عاصم عمر ابھی تڑپ رہا تھا جب اُسے اٹھا کر لے گئے۔ سلطان محمود نے اپنے سپہ سالار کو جو وہاں موجود تھا حکم دیا۔" فوج کو کوچ کے لیے تیار کرو۔ ہم ملتان پر حملہ کریں گے لیکن ہمیں راستے میں کئی معرکے لڑنے پڑیں گے۔ بت پرستوں کے ہاتھ میں قلعوں کا بھی صفایا کرنا ہے۔"

باپ کا پاپ

عاصم عمر نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر غداری کے گناہ کی سزا پالی۔ وہ باہر دھوپ میں پڑا تڑپ تڑپ کر مرا کسی کو اجازت نہیں تھی کہ اُس کے منہ میں پانی کے دو قطرے ٹپکا دیتا۔ سلطان محمود غزنوی نے اُس کے پسماندگان پر یہ کرم کیا کہ انہیں لاش اٹھا لے جانے کی اجازت دے دی۔

عاصم عمر سلطان کی فوج کے پرانے اور تجربہ کار سالاروں میں سے تھا مگر نسوانی حسن، شراب اور تھوڑے سے علاقے کی حکمرانی کے لالچ نے بڑے بڑے مضبوط قلعے سر کرنے والے اور لاکھوں کے لشکر کو دین و ایمان کی دیانتی سے کاٹ پھینکنے والے سالار کی اپنی تلوار اُس کے اپنے پیٹ میں آ اتری۔ عاصم عمر کا بیٹا قاسم بن عمر اسی فوج میں ایک جیش کا کماندار تھا۔ وہ خوبرو نوجوان تھا دلیر تھا اور فن حرب و ضرب کی سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔ باپ نے اسے بچپن میں ہی سپاہی بنا دیا تھا۔ اسے جب اطلاع دی گئی کہ اپنے باپ کی لاش لے جائے تو اسے ایک صدمہ تو یہ ہوا کہ اس کا باپ جو نامی گرامی سالار تھا، مر گیا ہے، اور دوسرا صدمہ یہ ہوا کہ وہ ملتان گیا تھا اور اُسے ہندوؤں نے قتل کیا ہے۔ وہ سمجھا شاید اس کی لاش ملتان سے آئی ہے۔

اسے باپ کی موت کا پیغام دینے والا شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ قاسم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے باپ کی لاش باہر دھوپ میں پیٹھ کے بل خون میں ڈوبی پڑی تھی اور اس کے پیٹ میں تلوار اتری ہوئی تھی قریب عمارت کے برآمدے میں سلطان محمود کی فوج کا سپہ سالار ابو عبداللہ محمد الطائی کھڑا تھا۔ ابو عبداللہ وہ سپہ سالار تھا جس کا ذکر تاریخوں میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا ہے۔ قاسم بن عمر کو اپنے باپ کی لاش کے پاس حیران و پریشان کھڑے

دیکھ کر ابو عبداللہ اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُسے اس نوجوان کمانڈر پر ترس آ رہا تھا۔ وہ قاسم کے قریب گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"تمہیں اور زیادہ حیران ہونا چاہیئے تھا" — سپہ سالار نے کہا — "عقل سے اپنے باپ کی محبت نکال کر اپنے عقیدے، اپنے مذہب اور اپنے فرض کی محبت پیدا کرو، جب سوچو کہ تمہارا باپ کس طرح مرا ہے تو تمہیں زیادہ صدمہ نہ ہو۔"

"خون کی تازگی بتاتی ہے کہ انہیں یہاں اور ابھی ابھی قتل کیا گیا ہے" — قاسم بن عمر نے کہا — "ان کا قصور کیا تھا؟ یہ تو ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہیں کس نے قتل کیا ہے؟"

"تمہارا باپ اپنا قاتل خود ہی ہے" — ابو عبداللہ نے کہا — "یہاں اس کا کوئی دشمن نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ خود دشمنی کی۔ اپنے مذہب، اپنے ملک اور اپنی فوج کے ساتھ دشمنی کی ہے۔"

ابو عبداللہ محمد الطائی نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُس کے باپ کا گناہ کیا تھا۔ قاسم بن عمر توجہ سے سنتا رہا۔

"کیا اپنے باپ کے گناہ کی سزا مجھے بھی بھگتنی پڑے گی؟" — قاسم نے پوچھا — "کیا مجھے میرے عہدے سے ہٹا دیا جائے گا؟"

"سلطان نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا" — سپہ سالار نے جواب دیا — "سلطان کے بعد میں ہوں جو تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہارے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تم نوجوان ہو۔ تمہارے سامنے ساری عمر پڑی ہے۔ تم میرے عہدے تک پہنچ سکتے ہو۔ اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرو۔ سوچو اور دیکھو کہ گناہ میں کشش کتنی ہوتی ہے کہ عاصم عمر جیسا دیندار سالار اس خوبصورت جال میں آ گیا۔ دیکھو کہ گناہ میں کتنی قوت ہوتی ہے کہ عاصم عمر جیسے نامور سالار نے اپنی پوری فوج کو تباہ کرنے اور محمود جیسے سلطان کو شکست دلانے اور ہندوؤں کے ہاتھوں مروانے کا انتظام کر دیا تھا۔ پھر اس سے عبرت حاصل کرو کہ گناہ جب سزا دینے پر آتا ہے تو عاصم عمر جیسا شیر دل سالار بھی اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔ تم نوجوان ہو۔ نوجوانوں کا ذہن ذرا سی انگیخت پر گناہ آلود خیالوں کا آشیاں بن جاتا ہے۔"

"تمہیں باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔"

"تمہیں موقع دیا جا رہا ہے" — ابو عبداللہ نے جواب دیا — "لاش کے پیٹ سے تلوار نکالو اور لاش لے جاؤ۔"

"کیا میں اُس عورت سے مل سکتا ہوں جو ملتان سے آئی ہے اور میرے باپ کے گناہوں کی عینی شاہد ہے؟"

"تم لاش لے جاؤ" — سپہ سالار ابو عبداللہ نے کہا — "میں اس عورت کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔ وہ تمہاری ماں کو بھی ساری بات سنا دے گی۔ تم محافظ دستے کے اُس آدمی سے بھی مل لینا جس کے ساتھ یہ عورت آئی ہے۔"

قاسم بن عمر نے اپنے باپ کی لاش کے پیٹ سے تلوار نکالی۔ سپہ سالار نے لاش قاسم کے گھر لے جانے کا انتظام کر دیا۔

عاصم عمر اپنی بیوی کو پشاور اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ یہ عورت اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔ راجہ جے پال نے جب ۹۷۷ء میں غزنی پر فوج کشی کی اور سلطان سبکتگین کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تھا تو بہت سی نوجوان لڑکیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جنہیں راجہ جے پال کی فوج کے بڑے بڑے افسروں نے آج کے پنجاب اور سرحد کے علاقوں سے اغوا کیا اور اپنے ساتھ میدانِ جنگ میں لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ساتھ عاصم عمر نے شادی کر لی تھی۔ اس کے بطن سے قاسم پیدا ہوا تھا۔ وہ ان علاقوں کی زبان بولا کرتی تھی جن پر راجہ جے پال کی حکومت تھی۔ قاسم نے بھی ماں سے یہ زبان سیکھ لی تھی۔

عاصم عمر کی لاش گھر پہنچی تو قاسم کی ماں کی چیخیں نکل گئیں۔ باپ کی خون آلود تلوار قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ ماں نے تلوار دیکھی تو اس کی چیخیں تھم گئیں۔ اُس نے حیرت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"یہ شخص اس قابل نہیں تھا کہ آپ جیسی عورت اس کا ماتم کرے" — قاسم نے کہا — "اس نے اپنی تلوار سے اپنی جان لی ہے" — قاسم نے تلوار پھینک دی اور بولا — "ماں! مجھے بتا دو کیا میں اس باپ کا بیٹا [illegible] ورنہ تو نہیں [illegible] نے غدار

اس باپ کے اغوا میں پرورش پائی ہے؟"

"بیٹا!" — اُس کی ماں نے بلا کر پوچھا "تم کہاں رہے ہو؟ یہ سب کیا ہے؟ ہم کیسے غدار کے ساتھ رہے ہو؟ بلخ اور بخارا کی باغی فوجوں سے ہتھیار ڈلوانے والا اور بت پرستوں کو ر الٹیوں کے پہاڑوں سے ٹکرا جانے والا غدار نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ملتان گئے تھے۔ وہاں سے کب آئے ہیں؟"

"آپ کو تمام سوالوں کے جواب ملتان کی ایک عورت دے گی" — قاسم بن عمر نے کہا "وہ آتی ہو گی۔ پھر آپ کو ان سوالوں کے جواب اُن محافظوں میں سے ایک دے گا جو اس کے ساتھ ملتان گیا تھا۔ میں نے اُسے بلایا ہے۔ وہ آ رہا ہو گا۔"

محافظ سے پہلے ملتان سے آنے والی عورت آ گئی۔ اُسے سپہ سالار ابوعبداللہ نے بھیجا تھا۔ قاسم نے دیکھا کہ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی اور وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب وہ معصومیت نہیں رہی تھی جو جوانی میں ہوا کرتی تھی۔ اب وہاں مظلومیت کے آثار تھے اور بڑے لمبے سفر کی تھکان کے اثرات۔ پھر بھی اُس کے نقش و نگار میں کشش اور جاذبیت باقی تھی۔

"میرا نام رابعہ ہے" — اُس نے کہا "مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔"

"میرے خاوند نے ملتان میں کیا کیا تھا؟" — قاسم عمر کی بیوی نے پوچھا۔

"انہوں نے وہاں وہی کچھ کیا تھا جو ایسے ماحول میں جا کر ہر مرد کیا کرتا ہے" — رابعہ نے جواب دیا اور بتایا کہ قاسم عمر کو داؤد بن نصر نے کس طلسم میں گرفتار کر لیا تھا۔ اُس نے کہا — "وہاں تو حسن اور گناہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آپ کے خاوند کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن داؤد بن نصر نے ان کے ساتھ سلطان محمود کو شکست دلوانے اور ان کی فوج کو راستے میں تباہ کرانے کا سودا طے کر لیا۔ میں اُس وقت دونوں کو شراب پلا رہی تھی اور ان کی حاضری میں موجود رہنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں اس طلسم کا ایک کل پرزہ بن چکی تھی۔ مجھے میرے باپ نے ایک آدمی کی بیوی بنایا اور اس آدمی نے مجھے داؤد بن نصر کے حرم میں تحفے کے طور پر دے دیا تھا۔ میرا ضمیر مر چکا تھا لیکن ایک درویش صفت انسان نے مجھے ایک راستہ دکھا کر میرے ضمیر کو زندہ کر دیا۔ وہ میری سہیلی کا باپ ہے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا میں داؤد کے دربار اور محل کے بعض راز اُن تک پہنچا کر اپنے خدا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتی ہوں۔"

اُس نے تفصیل سے بتایا کہ قرامطی فرقہ کیا ہے، اور اس فرقے کے اعمال کیا ہیں۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن عیش و عشرت اور ہر گناہ کو جائز قرار دیتا ہے۔

"ملتان اس فرقے کا مرکز بن گیا ہے" — رابعہ نے کہا — "اور مسلمان تیزی سے اسے قبول کرتے جا رہے ہیں۔ وہیں ایسے مسلمان بھی ہیں جنہوں نے قرامطیوں کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے۔ یہ درویش اسی محاذ کے قائد ہیں۔ وہ صحیح اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ان کے مالی وسائل محدود ہیں اس لیے غزنی تک کا سفر نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو اکسانا چاہتے ہیں کہ وہ ملتان پر چڑھائی کرے اور اس فرقے کو ختم کرے کیونکہ اسلام کے لیے ہندوؤں کا مذہب اتنا خطرناک نہیں جتنا یہ فرقہ ہے....

میں ان کے ہاں جاتی رہتی تھی اور داؤد کے محل میں جو کچھ ہوتا تھا وہ انہیں بتاتی رہتی تھی۔ میں نے وہیں سلطان محمود کا نام سنا تھا۔ وہاں ہندو راجے آنند پال اور بجی رائے آتے رہتے ہیں اور غزنی کی فوج کو شکست دینے اور سلطان محمود کو ختم کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ آپ کے خاوند کے متعلق مجھے پتہ چلا تھا کہ سلطان کی فوج کے سالار ہیں، اس لیے میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی مگر محل کی بڑی ہی حسین اور چالاک لڑکیوں کے جال میں آ کر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ انہوں نے اپنی ہی فوج کی شکست کا سودا کر لیا۔ میں نے اپنی سہیلی کے باپ کو بتایا۔ انہوں نے آپ کے خاوند کے ایک محافظ کو بلا کر بتایا۔ پس محافظ نے مجھے وہاں سے نکالنے کا انتظام کر لیا۔ ہم دونوں آپ کے خاوند کو دھوکہ دے کر ان سے پہلے سلطان کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کے خاوند بہت بعد میں آئے اور انہوں نے سلطان کو دھوکہ دینے کے لیے جھوٹی اطلاعیں دیں۔ سلطان نے مجھے اور محافظ کو ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں نے ان کے سامنے ان کی قلعی کھول دی۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی تلوار نکالی اور اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔"

قاسم اور اُس کی ماں خاموشی سے سن رہے تھے۔ رابعہ سنا چکی تو ماں نے اپنے

عاد نہ کی تلوار اُٹھائی اور قاسم کی طرف بڑھا کر بولی۔ "میں تمہارے سینے میں دشمن کی تلوار اُتری ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے تم اس تلوار سے اپنے جیسے ایک سو دشمنوں کو کاٹو گے۔"

"یہ تلوار مجھے نہ دو ماں!" — قاسم بن عمر نے کہا — "اس پر جو خون لگا ہوا ہے اس میں شراب کی ملاوٹ ہے۔ یہ تلوار ناپاک ہو چکی ہے۔"

عاسم عمر کو معمولی سے ایک آدمی کی طرح دفن کر دیا گیا۔ اُس کی بیوی نے اُس کا ماتم ویسے نہ کیا جیسا ایک سالار خاوند کا ہونا چاہیے تھا اور وہ اپنے سینے میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کا طوفان روکے ہوئے تھی۔ اُسے نوجوانی میں ہندوؤں نے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ تو اتفاق تھا یا اُس کی دعاؤں کا اثر تھا کہ راجہ جے پال کو شکست ہوئی تھی اور خدا نے اُسے ایک مسلمان خاوند دیا جو کچھ عرصہ بعد سالار بن گیا، مگر اسی خاوند کو ہندوؤں کے دوست نے ایسے جال میں پھانسا کہ اُسے خودکشی کرنی پڑی۔ نورین تو یہ سن کر بہت خوش ہوئی تھی کہ سلطان محمود نے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اسی لیے عاسم عمر کے ساتھ پشاور آ گئی تھی۔ وہ اُس کے ساتھ ہندوستان جانے کے ارادے سے آئی تھی۔ اس کا دل انتقام کی آگ میں جل رہا تھا مگر صورت حال ایسی بنی کہ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اُس نے اپنی امیدیں اپنے بیٹے کے ساتھ وابستہ کر دیں اور اُسے انتقام کے لیے تیار کرنے لگی۔ اُس نے رابعہ کو ایک نومسلمہ عورت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رابعہ کا یہ کارنامہ تو اُسے بہت ہی پسند آیا کہ اُس نے سلطان محمود کی فوج کو ایک بہت بڑے دھوکے سے بچا لیا تھا۔

جس روز عاسم عمر ملتان سے نقشہ لے کر چلا تھا جس میں وہ راستہ دکھایا گیا تھا جس سے سلطان محمود کی فوج کو ملتان جانا تھا، اُس سے اگلے روز داؤد بن نصر بھیرہ کے راجہ بجی رائے سے ملنے بھیرہ چلا گیا اور اُسے بتایا کہ اُس نے غزنی کی فوج کو کیا دھوکہ دیا ہے، اور

اب یہ بجی رائے کا کام ہے کہ وہ اس فوج کو راستے میں تباہ کرے۔ بجی رائے اُسی روز لاہور راجہ آنند پال سے ملنے چلا گیا اور اُسے بتایا کہ داؤد کے ہاتھوں اس نے کیا انتظام کرا دیا ہے۔

"کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ داؤد مسلمان ہے اور وہ ہمیں بھی دھوکہ دے سکتا ہے؟" — راجہ آنند پال نے کہا — "مسلمان پر اتنی جلدی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیا آپ ابھی تک داؤد کو مسلمان سمجھتے ہیں؟" — بجی رائے نے کہا — "آپ اس فرقے کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر اُس نے ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تو یہ اُس کی آخری غلطی ہو گی۔ وہ ہم میں گھرا ہوا ہے۔ ہم اُس کی ریاست پر قبضہ کر کے اُسے قتل کر دیں گے یا قید میں ڈال دیں گے۔ یہ پیشِ نظر رکھیں کہ محمود کی فوج ابھی حملہ کرنے نہیں آ رہی، ملتان میں رہنے اور یہاں اڈہ بنانے آ رہی ہے۔ یہاں سے محمود میرے اور آپ کے علاقوں پر حملے کرے گا۔ میں نے اپنے دو آدمی پشاور بھیج دیئے ہیں۔ جونہی وہاں سے محمود کی فوج ملتان کے لیے کوچ کرے گی، یہ آدمی تیز رفتار گھوڑوں پر آ کر مجھے اطلاع دیں گے۔ میں اپنے چھاپہ مار اُن پہاڑی علاقوں میں بھیج رہا ہوں جو راستے میں آتے ہیں۔ وہ راتوں کو محمود کے ہر پڑاؤ پر حملے کرتے رہیں گے۔ وہ ہماری فوجوں کو ڈھونڈتا رہے گا لیکن اُسے ہمارا ایک بھی سپاہی نظر نہیں آئے گا۔ اگر وہ ملتان پہنچ گیا تو اُس کے ساتھ آدھی فوج ہو گی اور وہ بھی بغیر سازوسامان کے ہو گی۔ میں نے ملتان میں محمود کے قتل کا انتظام بھی کر دیا ہے۔"

دونوں بہت دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ آنند پال اپنے باپ راجہ جے پال کی تین شکستوں کی وجہ سے محمود غزنوی کا باجگزار تھا اور اُس نے اُسی معاہدے کے مطابق جو اُس کے باپ نے آخری شکست کے بعد سلطان محمود سے کیا تھا، تاوان بھی ادا نہیں کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلطان محمود کی فوج اُس کے علاقے میں داخل ہو۔ اُسے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ بجی رائے کی فوج کے چھاپہ مار سلطان محمود غزنوی کی فوج کو نقصان پہنچاتے پہنچاتے اپنا نقصان کرا بیٹھیں گے۔

"چھاپہ مارنے کا جو کمال مسلمانوں کو حاصل ہے وہ ہمارے سپاہیوں میں نہیں ہے"

— انند پال نے کہا۔ "اس کے لیے عقل، دلیری اور پھرتی کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے چھاپہ مار بھیج دیں لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ محمود کو پشاور سے ادھر آنے کے لیے دریائے سندھ پار کرنا ہے۔ وہاں کشتیوں کا پل ہے جو ہم نے بنایا تھا۔ میں محمود کو یہ پل پار نہیں کرنے دوں گا۔ اپنی فوج کو ادھر ادھر چھپا کر رکھوں گا اور وہیں اس سے ٹکر لوں گا۔ اگر وہ آگے آگیا تو راستے میں اسے آپ سنبھال لیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ آجائے تو زندہ واپس نہ جاسکے۔"

اور وہ آرہا تھا۔ سلطان محمود نے فوری کوچ کا حکم دے دیا۔ اس کے پاس رسد اور دیگر سامان کی کمی نہیں تھی۔ اس نے کوچ سے ایک روز پہلے اپنے سالار، نائب سالاروں اور کمانداروں وغیرہ کو بلا کر انہیں کوچ کی ترتیب اور انداز بتایا۔ انہیں جنگی ہدایات اور احکام دیئے اور انہیں بتایا کہ راستے میں کم سے کم پڑاؤ ہوں گے، اور جہاں بھی پڑاؤ ہوگا وہاں شبخون مارنے والے جیش باری باری ارد گرد کے علاقے میں گھومتے پھرتے رہیں گے کیونکہ ملتان تک تمام راستے میں ہندوستان کے چھاپہ ماروں کا خطرہ ہے۔

اس نے ہراول کا دستہ منتخب کرنے کے لیے سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی سے کہا اور ساتھ یہ بھی کہا۔ "خیال رکھو ابوعبداللہ! یہ ہراول ویسا نہیں ہوگا کہ آپ کسی ایک دستے کو فوج کے آگے آگے روانہ کردیں اور اس کے سپاہی آزادی سے لوگوں کے کھیتوں سے بھٹے اور درختوں سے پھل توڑتے اور کھاتے چلے جائیں گے۔ اس کوچ میں یہ خطرہ ہے کہ جس راستے سے ہم جارہے ہیں، اس کے درخت، جھاڑیاں، پتھر اور چٹانیں بھی آپ کی دشمن ہیں۔ ہراول دستے کو تیز بھی چلنا ہوگا، اور قدم پھونک پھونک کر بھی رکھنا ہوگا۔ نظر یہی آرہا ہے کہ ہراول دستے کو معرکے لڑنے پڑیں گے۔"

کمانداروں کو معلوم نہیں تھا کہ سلطان محمود ہراول کے لیے ایسے سخت احکام کیوں دے رہا ہے۔ عامر عمر کے بیٹے قاسم بن عمر کو ان احکام کے پس منظر کا علم تھا۔ وہ

ان خطروں سے آگاہ تھا جن کی طرف سلطان محمود اشارہ کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سلطانِ عالی مقام!" قاسم بن عمر نے کہا۔ "اگر میری تجویز آپ کے منصوبے میں مداخلت بے جا نہ ہو تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہراول میں میرے جیش کو بھیجا جائے۔"

"تمہارا نام؟" سلطان نے پوچھا۔

قاسم کی بجائے سپہ سالار ابوعبداللہ نے اٹھ کر جواب دیا۔ "اس کا نام قاسم بن عمر ہے۔ عامر عمر کا بیٹا۔"

سلطان محمود کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی سی آئی۔ اس نے ذرا سوچ کر کہا — "ہراول دستے کا انتخاب ہم بعد میں کریں گے۔ اس کماندار کو یہیں رہنے دینا۔ میں اسے الگ کچھ سمجھاؤں گا۔"

کوچ کا دن اور وقت بتا کر اور ہدایات دے کر سلطان محمود نے سب کو رخصت کر دیا۔ سپہ سالار اور قاسم وہیں رہے۔ سلطان نے دونوں کو اپنے قریب بلایا۔

"تم نے اپنے آپ کو ہراول کے لیے کیوں پیش کیا ہے؟" سلطان محمود نے قاسم سے پوچھا۔

"کیونکہ راستے میں وہ خطرے ہیں جو ہماری فوج کے لیے میرے باپ نے پیدا کیے ہیں۔" قاسم نے جواب دیا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ جو خطرے باپ نے پیدا کیے ہیں، ان کا پہلا شکار اس کا بیٹا ہونا چاہیے۔"

"محترم سلطان!" سپہ سالار ابوعبداللہ نے کہا۔ "اس کی ماں میرے پاس آئی تھی۔ اسے اپنے خاوند کی خودکشی کا کوئی غم نہیں۔ وہ شرمسار ہے کہ اس کے خاوند نے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ میں اس عورت کی قدر کرتا ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ اس کے بیٹے کو پیش قدمی اور میدان جنگ میں اس جگہ رکھا جائے جہاں موت یقینی ہو اور اسے اپنے جوہر دکھانے کا ایسا موقع ملے کہ یہ بھاگ نہ سکے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم میں بھی اپنی ماں کا جذبہ ہے؟" — سلطان نے قاسم سے پوچھا۔ "کیا تم میں

بھی اپنے باپ کی کمزوریاں ہیں۔

"میں آپ کو حلف اور قسم کے سوا کسی اور طریقے سے یقین نہیں دلا سکتا کہ مجھ میں ماں کا جذبہ زیادہ اور باپ کی کمزوریاں کم ہیں"۔ قاسم نے کہا۔ "سپاہ گری میں میرا استاد میرا باپ تھا۔ میں اس کے متعلق یہی جانتا تھا کہ وہ خوش طبع اور زندہ دل انسان تھا۔ میں صرف سپاہ گری پر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے باپ کی لاش دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس کی غداری کا ازالہ کروں گا"۔

"تم شاید نہ جانتے ہو کہ تمہاری ماں کے سینے میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اُسے نوجوانی میں ہند کے فوجی اغوا کر لائے تھے۔ وہ ان کفار کی ہوس کا نشانہ بنی رہی۔ وہ خوش قسمت تھی کہ ہند کی فوج کو شکست ہوئی۔ تمہاری ماں جیسی بہت سی مسلمان لڑکیاں پیچھے رہ گئیں۔ ہم نے سب کی شادیاں اپنی فوج کے آدمیوں سے کر دیں ...... تم نوجوان ہو قاسم! شاید تمہارے دل میں ابھی یہ احساس بیدار نہ ہوا ہو کہ مسلمان کو دو چیزوں پر مرمٹنا چاہیئے۔ ایک ہے مذہب اور دوسری چیز جسے میں مذہب جتنا مقدس سمجھتا ہوں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت ہے۔ ہند میں جو مسلمان رہتے ہیں، وہ بھی ہماری قوم کے افراد ہیں۔ مسلمان لڑکی کی عزت لوٹنا ہندوؤں نے اپنے مذہب کا فریضہ بنا رکھا ہے۔ ہمارے مذہب کا حکم یہ ہے کہ لڑکی کسی بھی مذہب کی ہو، اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنا گناہِ کبیرہ ہے اور جب مسلمان کی ایک بیٹی کی عصمت پر کوئی کافر حملہ کرے تو عالمِ اسلام کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں۔ مسلمان کا ایمان ہونا چاہیئے۔ انتقام — اپنی بیٹی کی عصمت کا انتقام؟"

"میں انتقام لوں گا سلطانِ عالی مقام"۔ قاسم نے کہا۔

"جوانی اندھی ہوتی ہے قاسم"۔ سلطان نے کہا۔ "لیکن میرے پیر و مرشد نے مجھے لڑکپن میں بتایا تھا کہ انسان میں گناہوں کو قبول کرنے کی جتنی کمزوری ہوتی ہے اس سے زیادہ اس میں گناہ سے بچنے کی قوت بھی ہوتی ہے مگر قوت کردار میں ہے۔ کردار کی تلوار کو مضبوطی سے پکڑے رکھو تو گناہوں کو شکست دے سکتے ہو۔ مجھے تمہارے باپ کی جسمانی موت کا کوئی غم نہیں، غم اس کی روحانی موت کا ہے۔ وہ اپنی روح کو ملتان لے آیا تھا۔ یہاں آ کر اُس نے اپنے

جسم کو مارا ہے۔ تم اپنے جسم کو بھول جاؤ۔ روح کو سامنے رکھو۔ میرے پیر و مرشد ابوالحسن خرقانی نے مجھے بتایا تھا کہ انسان کے پاس روح خدا کی امانت ہے۔ اگر اسے ناپاک کرو گے تو خدا کی امانت میں خیانت کرو گے۔ تمہارے باپ نے روح کو پراگندہ کیا اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کیسی موت مرا ہے۔ ......

"اس سے تو یہ لڑکی خدا کے زیادہ قریب ہے۔ عیش و عشرت اور گناہوں کی دنیا میں رہی مگر اُس نے ایمان اور روح کو بچائے رکھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ کفار کے جنگل سے آزاد ہو آئی ہے۔ اسی نے مجھے تمہارے باپ کا دھوکہ بتایا تھا۔ یہ اسلام کی بیٹی کا کردار ہے ...... تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے کوچ کے راستے میں کیا خطرہ ہے؟"

"معلوم ہے سلطانِ عالی مقام!"۔ قاسم نے کہا۔ "مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنی پسند کے سپاہی منتخب کر سکوں۔ کفار کا کوئی چھاپہ مار فوج کے قریب نہیں آ سکے گا"۔

سلطان محمود غزنوی نے سپہ سالار ابو عبداللہ سے کہا کہ قاسم کو اس کی پسند کے آدمی دیدو۔

ہراول کا دستہ جس میں پانچ سو سوار تھے، سب سے پہلے پشاور سے نکلا۔ قاسم بن عمر کا گھوڑا سب سے آگے جا رہا تھا اور راستے کے ساتھ ساتھ، قاسم سے چند قدم دور ایک اور گھوڑا چلا جا رہا تھا جس پر ایک عورت سوار تھی۔ سیاہ نقاب سے اُس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ قاسم کو اس سوار کی موجودگی کا پورا پورا احساس تھا۔ پشاور سے کچھ دور جا کر قاسم نے بازو بلند کیا اور گھوڑا روک لیا۔ ہراول کا دستہ رک گیا۔ قاسم گھوڑے سے اُترا۔ اُدھر وہ عورت گھوڑے سے اُتری۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

"اب مجھے خدا کے حوالے کر دو ماں!"۔ قاسم نے عورت کے پاؤں چھو کر کہا۔

ماں نے قاسم کے دائیں بازو کے ساتھ ایک تعویذ سا باندھ دیا اور بولی۔ "یہ قرآن کی وہ آیت ہے جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے دین و ایمان کو مضبوط رکھا جائے۔ انسان کے جسم کی مضبوطی ایمان کی مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ الوداع میرے بیٹے! زندہ آؤ گے تو ماں کو خوشی ہو گی۔ تمہاری لاش آئے گی تو ماں بہت زیادہ خوش ہو گی لیکن میں فتح کی خبر سنوں گی"۔ ماں کی آواز حلق میں دب کے رہ گئی۔ اس پر رقت

طاری ہو گئی تھی۔

قاسم کود کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور ہراول دستہ چل پڑا۔ بہت دُور جا کر قاسم نے پیچھے دیکھا۔ اُسے صبح کے دھندلکے میں ایک چٹان پر ایک گھوڑا کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اُس کی ماں کا بازو ہوا میں ہل رہا تھا۔ پھر ایک بلند چٹان نے درمیان میں آ کر انہیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا جب سلطان محمود غزنوی پشاور کے ایک وسیع میدان میں اپنی فوج کے سامنے کھڑا تھا۔ رسد کا بڑا ہی لمبا قافلہ چل پڑا تھا۔ فوج کوچ کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔

"اسلام کے سپاہیو!" سلطان محمود اپنی فوج سے مخاطب ہُوا۔ "آج تم میرے حکم سے نہیں، اپنے خدا کے حکم سے کوچ کر رہے ہو۔ تم اُس ملک میں جا رہے ہو جہاں محمد بن قاسم کے مجاہدوں کی اذانیں گونجی تھیں۔ کفار نے وہ اذانیں خاموش کر دی ہیں۔ وہاں اسلام کی شمع بجھ رہی ہے۔ مسجدیں ویران ہو گئی ہیں۔ اُن پر بُت پرستوں کی حکمرانی ہے۔ تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لُٹ رہی ہیں۔ وہ مظلوم تمہیں پکار رہی ہیں۔ یہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کا حکم ہے کہ دنیا میں کہیں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے کہ کفار کے خلاف اُس وقت تک لڑو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے۔ ہندوؤں کی فوج تم پر تین حملے کر چکی ہے اور تم تینوں بار اُسے شکست دے چکے ہو۔ ہندو راجے تمہارے ملک کو صرف اس لیے فتح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے سرچشموں کو بند کر دیں۔ یہ جنگ دو فوجوں کی نہیں، دو مذہبوں کی ہے۔ آج ہم یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام سچا مذہب ہے، ایک اجنبی ملک میں جا رہے ہیں مگر اس ملک میں اپنے آپ کو اجنبی نہ سمجھنا۔ وہ زمین مسلمانوں کے گھوڑوں کے سُموں سے آشنا ہے اور اُنہی سُموں کی دھمک اور نعروں کی گرج کا انتظار کر رہی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کا خطاب جذباتی ہوتا چلا گیا۔ وہ ضروری ہدایات سالاروں اور کمانداروں کو دے چکا تھا۔ اُس نے سپاہیوں کو یہ ذہن نشین کرانا ضروری سمجھا تھا کہ یہ جنگ ملک گیری اور سلطنت کی توسیع کے لیے نہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کے جذباتی الفاظ

نے فوج میں ولولہ اور جوش پیدا کر دیا اور سپاہی کوچ کے لیے بے تاب ہونے لگے۔

قاسم بن عمر کا ہراول دستہ دوپہر سے ذرا بعد دریا کے اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں کشتیوں کا پُل تھا۔ دستہ پُل کے وسط میں پہنچا تو تیروں کی بوچھاڑ آئی جو قاسم کے گھوڑے سے چند قدم آگے کشتیوں کے اوپر رکھے ہوئے تختوں میں پیوست ہو گئی۔ قاسم نے گھوڑا روک لیا۔ دوسرے کنارے سے آواز آئی — "آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ سب کے سب تیروں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔"

"تم کون لوگ ہو؟" — قاسم نے بلند آواز سے پوچھا — "ہم سلطان محمود غزنوی کے سپاہی ہیں۔ راجہ آنند پال ہمارا باج گزار ہے۔ ہمیں اس پُل سے گزرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"یہ مہاراج آنند پال کا حکم ہے کہ کوئی مسلمان سپاہی اس پُل سے آگے نہ آئے" — قاسم کو جواب ملا — "واپس چلے جاؤ۔"

سامنے والے کنارے پر جھاڑیاں اور چٹانیں تھیں۔ قاسم سمجھ گیا کہ وہاں پُل کا محافظ دستہ چھپا ہُوا ہو گا۔ اُسے صرف ایک آدمی نظر آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے دستے کو پُل سے پیچھے چلے جانے کو کہا اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ وہاں صرف ایک ہندو فوجی کھڑا تھا۔ اُس نے قاسم کو بڑے رعب سے پوچھا کہ وہ اِن سواروں کو کیوں پُل سے گزار رہا ہے؟

"ہم کسی پر حملہ کرنے نہیں آ رہے" — قاسم بن عمر نے جواب دیا — "حملہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس جگہ کا راجہ ہمارا باجگزار ہے۔ ہم خیر سگالی کے لیے آئے ہیں۔"

"جو راجہ تمہارا باجگزار ہے، اُسی نے حکم دیا ہے کہ مسلمان فوج آ رہی ہے۔ اسے پُل سے نہ گزرنے دیا جائے۔" ہندو فوجی نے جواب دیا۔

"تمہارا راجہ تو یہاں ہو نہیں سکتا" — قاسم نے کہا — "وہ لاہور میں ہو گا یا بھٹنڈہ میں۔"

"مہاراج یہاں سے دو فرسنگ (تقریباً سات میل) دور پڑاؤ کیے ہوئے ہیں" — ہندو فوجی نے اُسے بتایا — "اگر اُن سے اجازت لینی ہے تو اپنے سلطان کو یا

اپنے وزیر کو اُن کے پاس بھیجو۔"

"میں ہی سلطان ہوں اور میں ہی وزیر ہوں" — قاسم نے کہا۔ "مجھے اپنے راجہ کے پاس لے چلو۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہارے اِن تیر اندازوں سے نہیں ڈروں گا جو یہاں پہاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ ہم پُلوں کے بغیر دریا پار کرنا جانتے ہیں۔ ایک غلط حکم پر اپنی جانیں ضائع نہ کرو۔"

ہندو اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ قاسم اِدھر اُدھر دیکھتا گیا۔ اُسے چٹانوں پر تیر انداز بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان چٹانوں سے نکل کر آگے گئے تو اُسے راجہ انند پال کی فوج کے خیمے نظر آنے لگے۔ قاسم اس زمین کے خدوخال کو دیکھتا گیا۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں انہیں لڑنا پڑے گا، اس لیے زمین سے واقفیت ضروری تھی۔ اس ویرانے میں راجہ کی موجودگی بتا رہی تھی کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔

ہرے بھرے درختوں نے اُس جگہ کو بہت خوبصورت بنا رکھا تھا جہاں راجہ انند پال کی شاہی خیمہ گاہ تھی۔ ہر طرف گھنا سبزہ تھا۔ قاسم کو جب ایک چوکور اور وسیع خیمے میں داخل کیا گیا تو اُسے محل کا گماں ہوا۔ راجہ جے پال اونچی اور سجی سجائی مسند پر بیٹھا تھا۔ اُس کے پیچھے دو رُشی خوبصورت لڑکیاں کھڑی مورچھل ہلا رہی تھیں۔ راجہ کو پہلے بتا دیا گیا تھا کہ اُسے ملنے کون آ رہا ہے اور وہ کیوں آیا ہے اس لیے وہ چہرے پر رعونت کے آثار لیے ہوئے تھا۔ اُس کے دائیں بائیں فوج کے بڑے افسر اور درباری بیٹھے تھے۔

"کیا تمہارا سلطان دریا پار کرنے کی اجازت چاہتا ہے؟" — راجہ انند پال نے پوچھا — "اُس کا ارادہ کیا ہے؟ وہ کہاں جا رہا ہے؟"

"آپ ہمارے باجگزار ہیں" — قاسم نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک تاوان بھی نہیں دیا۔ معاہدے کے مطابق آپ ہمارے مطیع ہیں۔ آپ یہ پوچھنے کے حق سے محروم ہیں کہ سلطان کیوں دریا پار کرنا چاہتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری فوج آپ پر حملہ کرنے نہیں آ رہی۔ ہم امن اور اطمینان سے گزر جائیں گے۔"

"ہم تمہاری گستاخی معاف کرتے ہیں" — راجہ انند پال نے کہا۔ "ہم کسی کے باجگزار

نہیں ہیں۔ معاہدہ کرنے والا میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ تمہارے سلطان نے مجھے شکست نہیں دی تھی۔ میں کوئی تاوان ادا نہیں کروں گا۔ اپنے سلطان سے کہنا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی فوج کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم تمہیں ملتان جا کر اُنہیں بچانے دیں گے۔ ہماری نظریں ان پہاڑوں کو چیر کر دیکھ لیا کرتی ہیں کہ ان کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ ہم تمہیں بتا سکتے ہیں کہ تمہارا سلطان اس وقت کہاں ہے اور اُس کے ساتھ کتنی فوج ہے۔ اُسے کہو واپس چلا جائے۔ ہم اُس کے مطیع نہیں۔ اُسے اگر دریا پار کرنے کی اجازت چاہیے تو خود ہمارے دربار میں آئے۔"

"ہم اپنے سلطان کو کسی ایسے اوچھے مہاراجہ کے دربار میں نہیں جانے دیا کرتے جو غرور سے گردن اکڑا کر بات کرنے کا عادی ہو" — قاسم نے کہا۔ "وہ اگر یہاں آنا چاہے گا تو بھی میں اُسے یہاں نہیں آنے دوں گا۔"

"تمیز سے بات کرو" — ایک درباری نے گرج کر کہا۔ "تم ہمارے مہاراج اور راج دربار کی توہین کر رہے ہو۔" اُس نے راجہ انند پال کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ راجہ مسکرا رہا تھا۔

"تم جا سکتے ہو" — راجہ نے کہا۔ "ہم تمہاری جوانی پر رحم کرتے ہیں۔ اس پل پر پھر کبھی قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔ اگر تمہارا سلطان لڑنے کے ارادے سے آیا ہے تو ہم تیار ہیں۔ اُسے کہو کہ دریا پار کرنے کی جرأت کرے۔"

"ہم لڑنے نہیں آئے" — قاسم نے غصہ پی لیا اور اُسے دھوکہ دینے کے لیے کہا — "سلطان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم جب لڑنے آئیں گے تو آپ سے دریا پار کرنے کی اجازت نہیں لینے آئیں گے۔ ہم آ جائیں گے۔ اب ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے اُسے کہا تھا کہ ہم لڑنے نہیں آئے، واپس جا رہے ہیں؟" — سلطان محمود نے قاسم سے پوچھا۔ قاسم سلطان کو اطلاع دینے کے لیے کہ انند پال نے دریا پار کرنے سے روک دیا ہے، پیچھے چلا گیا تھا اور اُس نے انند پال کے ساتھ جو باتیں

کی تھیں وہ من و عن سُنا دی تھیں۔

"میں تمہاری دانشمندی کی تعریف کرتا ہوں" ـــــ سلطان محمودؒ نے کہا ـــــ "اُسے ایسا دھوکہ ملنا چاہیئے تھا۔ میں آج ہی رات دریا پار کروں گا۔ تمہارا سوار دستہ کشتیوں کے پُل کے قریب پہاڑیوں میں چھپا رہے گا۔ تمہاری مدد کے لیے ایک اور دستہ آجائے گا۔ باقی فوج کسی اور جگہ سے دریا پار کرے گی اور انندپال پر حملہ کرے گی۔ تم میرے پیغام کا انتظار کرنا۔ اشارہ ملتے ہی تمہارا دستہ اور حفاظتی دستہ کشتیوں کے پُل سے دریا پار کرے گا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہارے سامنے دشمن کا پہلو ہوگا یا عقب۔ تم اپنی عقل استعمال کر کے کارروائی کرنا۔ تم واپس پُل کے قریب چلے جاؤ۔ احتیاط کرو کہ تمہیں یا تمہارے کسی سوار کو دشمن دیکھ نہ سکے۔ پُل پر نظر رکھو۔ کوئی بھی آدمی خواہ وہ کوئی درویش اور فقیر ہی ہو، پُل سے گزر کر ادھر آئے تو اُسے پکڑ لو۔ وہ دشمن کا جاسوس ہو سکتا ہے۔"

سلطان محمود غزنوی نے سپہ سالار ابوعبداللہ کو بُلا کر اُسے بتایا کہ راجہ انندپال دریا کے پار فوج لے کر بیٹھا ہے اور اُس نے ہمیں دریا پار کرنے سے روک دیا ہے۔ فوراً ماہی گیروں کے بھیس میں خود جائیں یا کسی اور سالار کو بھیجیں اور دیکھیں کہ دریا کہاں سے پار کیا جا سکتا ہے۔ آج ہی رات دریا پار کر کے انندپال پر حملہ کیا جائے گا۔

سلطان محمودؒ نے قاسم بن عمر سے دریا کے پار کی زمین کے خدوخال کی تفصیل معلوم کر لی تھی۔ اُدھر راجہ انندپال نے اپنی فوج کا کچھ حصہ دریا کے اُس حصے کے سامنے تیار کھڑا کر دیا جہاں کشتیوں کا پُل تھا۔ یہ جگہ اُس مقام سے ذرا سی اوپر کی طرف تھی جہاں دریائے کابل دریائے سندھ سے ملتا ہے۔ یہ اٹک کا مقام ہے۔ مشہور تاریخ دانوں نے جن میں فرشتہ، عتبی اور گردیزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمودؒ کی فوج نے اوپر جا کر اُس جگہ سے دریا پار کیا جہاں پاٹ چوڑا اور پانی کی گہرائی کم تھی۔ صبح کا اُجالا نکھرنے سے پہلے فوج دریا پار کر گئی تھی۔ ان تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ یہ ۱۰۰۶ء کا موسمِ بہار تھا۔

راجہ انندپال کو توقع نہیں تھی کہ مسلمانوں کی فوج اتنی جلدی دریا پار کر آئے گی۔ وہ بے خبری کی نیند سویا ہُوا تھا جب سلطان محمودؒ کی ذاتی قیادت میں اُس پر حملہ ہو گیا۔ اُس کی فوج پوری طرح تیار نہیں تھی   ہندوؤں نے مقابلہ کیا۔ انندپال کی وہی فوج تیاری

کی حالت میں تھی جسے پُل کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ اسے جوابی حملے کے لیے بُلایا گیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ قاسم کا سوار دستہ بے تابی سے اشارے کا منتظر تھا۔ اُس نے ایک اونچی پہاڑی پر دو آدمی بٹھا رکھے تھے جو دریا پار کے میدانِ جنگ کو دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ دریا کے قریب ہندوؤں کا جو دستہ تھا، وہ میدانِ جنگ کو دوڑ پڑا ہے تو انہوں نے اُوپر سے قاسم کو اشارہ دے دیا۔ قاسم نے اپنے دستے کو برق رفتار یلغار کا حکم دے دیا۔ اُس کے پیچھے ایک اور سوار دستہ تھا۔ دو نو دستے کشتیوں کے پُل سے بہت تیزی سے گزر گئے، اور پھیل کر ہندوؤں کے اُس دستے پر عقب سے ٹوٹ پڑے جو جوابی حملے کے لیے جا رہا تھا۔ راجہ انندپال کو سنبھلنے اور میدانِ جنگ کو سنبھالنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اُس کے لیے اب یہی چال رہ گئی تھی کہ اپنی جان بچا لے۔ وہ بھاگ نکلا۔ اُس کی فوج بکھر گئی۔ سلطان محمود نے تعاقب کا حکم دے دیا لیکن انندپال بہت پہلے نکل گیا تھا، پھر بھی تعاقب جاری رکھا گیا۔ اُس کی فوج دُور دُور تک بکھر گئی تھی۔ اِن میں سے بہت سے سپاہیوں کو پکڑ لیا گیا، باقی بھاگ نکلے۔

مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق جب سلطان محمود کا دستہ جو تعاقب کے لیے گیا تھا دریائے چناب کے کنارے پہنچا، اُس وقت راجہ انندپال دریا پار کر گیا تھا۔ یہ مقام اُس دَور میں سوہدرا کہلاتا تھا اور اب اسے وزیر آباد کہتے ہیں۔ راجہ انندپال کو غریب سے ملاحوں نے اپنی کشتی میں دریا پار کرایا تھا۔ تاریخ دانوں نے اس لڑائی کو معرکۂ دریائے سندھ کہا ہے۔

تعاقب میں سلطان محمود کی فوج بھی بکھر گئی تھی لیکن اُس نے قاصدوں کے ذریعے فوج کو دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر جمع کر لیا۔ اس اجتماع کی تکمیل میں ایک ماہ

بجی رائے کی فوج کے ساتھ ٹکر نہ ہو کیونکہ فوج تھک چکی ہے اور ہمارے ساتھ رسد اتنی زیادہ ہے کہ لڑائی کی صورت میں ہم اسے سنبھال نہیں سکیں گے۔ اس کی حفاظت میں دشواری پیش آئے گی ہمیں اب ملتان پہنچنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ داؤد بن نصر کو پہلے ٹھکانے لگایا جائے۔ آستین کے سانپ کو مارنا ضروری ہے۔

وہاں سے فوج نے کوچ کیا تو بھی قاسم بن عمر کا دستہ ہراول میں تھا۔ اُس کے دستے کے کچھ ساتھی مارے گئے تھے۔

تیسرے روز قاسم اپنے دستے کے آگے آگے جارہا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس علاقے کے دو گائیڈ تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ قاسم کو چار پانچ سو گز دُور ایک آدمی نظر آیا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے گھوڑا روک لیا تھا اور وہ قاسم کے دستے کو دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے گھوڑا موڑا اور ایڑ لگا دی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فوج سے ڈر کر بھاگ اٹھا ہو لیکن قاسم کو یہ خطرہ محسوس ہُوا کہ یہ آدمی بجی رائے کی فوج کا آدمی ہو سکتا ہے اور وہ بھیرہ میں اطلاع دے گا کہ فوج آرہی ہے۔ قاسم نے اپنے گائیڈوں سے پُوچھا کہ بھیرہ کتنی دُور ہے اور کس سمت کو ہے۔ اسے سلطان محمود کی یہ ہدایت یاد تھی کہ بھیرہ کے دُور سے گزرنا ہے۔ اپنے گائیڈوں کو اس نے یہی بتلایا تھا۔ گائیڈوں نے اُسے بتایا کہ بھیرہ قریب ہی ہے اور یہ سوار بھیرہ کی سمت گیا ہے۔

قاسم بن عمر نے دو سوار اپنے ساتھ لیے اور اس آدمی کے تعاقب میں گھوڑا دوڑا دیا۔ وہ خاصا آگے نکل گیا تھا لیکن قاسم اور اُس کے دو سواروں کے گھوڑے بہت تیز تھے۔ فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ پھر انہیں بھیرہ کے قلعے کے بُرج نظر آنے لگے۔ بھاگنے والے اور تعاقب کرنے والوں کے درمیان فاصلہ اور تھوڑا ہو گیا۔

"کمانیں نکالو" — قاسم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ شہر تک زندہ نہ پہنچے۔"

دونوں سواروں نے دوڑتے گھوڑوں سے تیر چلائے ایک تیر سوار کی پیٹھ میں اور دوسرا گھوڑے کی پیٹھ میں لگا۔ گھوڑا اور تیز ہو گیا۔ قاسم کے سواروں نے دو اور تیر چلائے لیکن بھاگنے والا سوار پیٹھ میں ایک تیر لیے ہوئے دُور نکل گیا تھا۔ دونوں تیر ضائع گئے۔ اب شہر کی دیوار صاف نظر آنے لگی تھی جو عام قلعوں کی نسبت زیادہ اونچی تھی۔ گھوڑا سوار شہر کے دروازے

میں داخل ہو گیا۔ قاسم اور اُس کے ساتھیوں نے گھوڑے موڑے اور اپنے دستے کی طرف چل پڑے۔

راجہ بجی رائے اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ اُسے اُس کی فوج کا سپہ سالار جسے وہ سینا پتی کہا کرتے تھے، رپورٹ دے رہا تھا کہ چھاپہ ماروں کو گئے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے، ابھی تک سلطان محمود غزنوی کی فوج نہیں آئی۔ انہوں نے اسی سلسلے میں وہی نقشہ رکھا ہُوا تھا جو داؤد بن نصر نے قاسم عمر کو دیا اور اس پر وہ راستہ بنایا تھا جس سے اُسے سلطان محمود کی فوج کو لانا تھا۔ بجی رائے نے اس فوج کو راستے میں شبخون سے نقصان پہنچانے کے لیے چھاپہ ماروں کی خاصی تعداد بھیج دی تھی اور انہیں علاقے تقسیم کر دیئے تھے۔ وہ ہر روز اس خبر کی امید لے کر جاگتا تھا کہ سلطان محمود کی فوج پر چھاپے اور شبخون شروع ہو گئے ہیں مگر ہر روز مایوسی کے سوا اُسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔

"پھر یہ فوج گئی کہاں؟" — بجی رائے نے اپنے سینا پتی سے غصے سے کہا۔ "پشاور سے اطلاع آئی تھی کہ وہاں سے فوج چل پڑی ہے۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ داؤد نے آپ کو دھوکہ دیا ہے یا سلطان محمود کا جو سالار داؤد کے پاس آیا تھا وہ دھوکہ دے گیا ہے" — سینا پتی نے کہا۔ "آپ مسلمانوں پر بھروسہ کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔"

اتنے میں بجی رائے کو اطلاع دی گئی کہ اپنا ایک سوار آیا ہے جس کی پیٹھ میں تیر اُترا ہُوا ہے۔

بجی رائے ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ آدمی اندر آگیا۔ اُس کی پیٹھ میں تیر اُترا ہُوا تھا اور خون سے اُس کے کپڑے لال ہو گئے تھے۔

"میں نے مسلمانوں کی فوج کا ایک سوار دستہ دیکھا ہے" — اس آدمی نے کہا اور سمت بتائی جدھر سے دستہ آرہا تھا — "تین سواروں نے میرا تعاقب کیا اور مجھ پر تیر چلائے، ایک مجھے لگا ہے اور دوسرا میرے گھوڑے کو۔ یہ دستہ ہراول کا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ہے وہ فوج جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں"۔۔۔ بجی راے نے کہا اور خبر لانے والے زخمی کو نظر انداز کر کے سیناپتی سے کہا۔ "ہم محمود کو اتنی مہلت نہیں دیں گے کہ وہ شہر کا محاصرہ کر سکے۔ اُس کی فوج کوچ کی تھکی ہوئی ہو گی۔ ہم اسے راستے میں روکیں گے اور شہر سے دُور لڑیں گے"۔

ذرا ہی دیر بعد سنکھ اور نقارے بج اُٹھے۔ بھیرہ کی فوج میں ہڑبونگ مچ گئی۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دینے لگی۔ ہزاروں گھوڑے ہنہنانے لگے۔ فوج کے دیکھ بھال کے آدمیوں کو یہ دیکھنے کے لیے دوڑا دیا گیا کہ مسلمانوں کی فوج کہاں ہے۔ تھوڑی دیر بعد اطلاع آ گئی کہ سلطان محمود کی فوج شہر سے آٹھ دس میل دُور سے گزر رہی ہے۔ بجی راے نے حکم دیا کہ فوج کو اُس راستے پر جنگی ترتیب میں کر دیا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بجی راے کی فوج شہر سے نکل گئی۔

قاسم بن عمر واپس جا کر اپنے ہراول کے دستے سے پیچھے سپہ سالار ابوعبداللہ کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ ایک سوار نے انہیں دیکھ لیا ہے اور ہمارے تیروں سے زخمی ہو کر شہر میں چلا گیا ہے۔ ابوعبداللہ نے سلطان محمود کو اطلاع دی۔ سلطان پریشان سا ہو گیا تاہم اُس نے رسد کے قافلے کو وہیں روک کر اس کے اردگرد حفاظت کا انتظام کر دیا۔ قاسم کو ہی دیکھنے کے لیے بھیجا گیا کہ بجی راے کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر اطلاع دے۔

قاسم بن عمر جو اطلاع لے کر آیا، وہ تشویش ناک تھی۔ بجی راے نے بھیرہ شہر سے تین چار میل دُور ایسی زمین پر جس کے نشیب و فراز اور خدوخال اُسی کو فائدہ دے سکتے تھے اپنی فوج کو جنگی ترتیب میں پھیلا دیا تھا۔ سب سے آگے ہاتھی تھے۔ سلطان محمود نے اس کے مطابق اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور آگے بڑھا۔ اُسے ہاتھیوں کی کمزوریوں کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہاتھی زخمی ہو کر پیچھے کو بھاگتے اور اپنی ہی فوج کو کچلنے لگتے ہیں چنانچہ اُس نے اُن پیادوں سے آمنے سامنے کا حملہ کیا جو تیروں اور برچھیوں سے مسلح تھے۔ ہاتھیوں نے حملہ روکنے کے لیے پیش قدمی کی۔ کئی ہاتھی زخمی ہو کر بے قابو ہوئے۔ پیچھے کو بھاگے مگر پیچھے بجی راے کی کوئی فوج نہیں تھی جسے ہاتھی کچلتے۔ ہاتھیوں کے بھاگنے اور گھوم

پھر کر لڑنے کے لیے زمین خالی رکھی گئی تھی۔

سلطان محمود ایک جگہ سے میدانِ جنگ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جہاں متفکر ہوا وہاں وہ بجی راے کی عقل پر عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے پہلی بار ہاتھیوں کا استعمال دانشمندانہ استعمال دیکھا تھا۔ بجی راے کے ہاتھیوں اور اُن کے سواروں سے مسلمان پیادہ حملہ آوروں کا بے دردی سے نقصان ہو رہا تھا۔ سلطان محمود نے پیادوں کی مدد کے لیے ایک سوار دستے کو حملے کا حکم دیا۔ کم و بیش ایک ہزار سواروں نے ہلہ بولا تو بجی راے نے اس دستے کے دونوں پہلوؤں پر اپنے سوار دستوں سے حملہ کرا دیا۔ مسلمان سوار اپنے پیادوں کی مدد کو پہنچ ہی نہ سکے۔

ہندو بہت دلیری سے اور اُن کے کمانڈر فنی فہم و فراست سے لڑ رہے تھے۔ سلطان محمود نے دشمن کے عقب میں دستے بھیجے مگر بجی راے نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ اُس کے دستوں نے سلطان محمود کے دستوں کو راستے میں ہی روک لیا اور کسی سمت سے اُن پر ہاتھی دوڑا دیئے۔ ہاتھیوں کے سوار تیروں کا مینہ برساتے آ رہے تھے۔ مسلمان دستوں کے لیے آگے بڑھنا ناممکن اور پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا۔۔۔ اور اس بھیانک جنگ کے پہلے دن کا سورج غروب ہو گیا۔

سلطان محمود کو شکست اور پسپائی صاف نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنے سپہ سالار ابوعبداللہ کو ساتھ لے کر اور دُور کا چکر کاٹ کر بھیرہ شہر کے قریب جا کر اندازہ لگایا کہ بجی راے کی توجہ میدانِ جنگ سے ہٹانے کے لیے شہر پر یلغار کی جا سکتی ہے یا نہیں لیکن شہر کے باہر بجی راے نے تیر انداز دستے مورچہ بند کر رکھے تھے۔ اس دوران رات کو سلطان محمود کی رسد پر حملہ ہو گیا۔ یہ سلطان کا طریقہ جنگ تھا جسے ہندو فوج اُس کے خلاف استعمال کر رہی تھی۔

رات جاگتے گزر گئی۔ سلطان محمود نے نماز سے فارغ ہوتے ہی دشمن کے ایک پہلو پر پیادہ دستے سے حملہ کرایا مگر پیادے کچلے گئے کیونکہ جسے سلطان محمود پہلو سمجھ رہا تھا وہ پہلو نہیں تھا۔ سلطان کا یہ دستہ پھندے میں آ گیا۔ ابوعبداللہ نے قاسم بن عمر کے سوار دستے کو مدد کے لیے آگے بھیجا۔ اس دستے نے ایک قسم کا خودکش حملہ کیا۔ بے تحاشا کشت و خون ہو رہا تھا۔ معرکہ بڑا ہی خونریز اور بھیانک تھا۔ مورخوں کے مطابق، دونوں فوجوں کا بے انداز نقصان

ہو رہا تھا۔ زمین لال سُرخ ہوگئی تھی ___ اور دوسرے دن کا سورج بھی گرد و غبار، زخمیوں کی آہ و بکا اور جانوروں کے شور و غل میں ڈوب گیا۔

تیسرے دن سلطان کی فوج تقریباً آدھی رہ چکی تھی اور اُس کی رسد کا خاصا حصہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ اس روز کی لڑائی نے سلطان محمود کو مایوس کر دیا۔ معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے اس خوفناک منظر کا آنکھوں دیکھا حال اِن الفاظ میں بیان کیا ہے ــ "سلطان محمود اس حد تک مایوس ہوگیا کہ اُس نے جنگ بندی کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے جب اپنی فوج کو بے جگری سے لڑتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ کچی فوج کا جذبہ ابھی زندہ ہے تو اُس نے اپنے محفوظہ کے دستوں سے ان الفاظ میں خطاب کیا کہ میں فتح کے لیے اپنی جان خدا کے حضور پیش کرتا ہوں۔ حملے کی قیادت میں خود کروں گا۔ سلطان کے الفاظ اور لہجے اور انداز میں جادو کا اثر تھا۔ محفوظہ کے دستوں کے نعرے نے لے بھرو کے آسمان کو ہلا ڈالا۔ سلطان نے خود اِن دستوں کی قیادت کی اور برق رفتار حملہ بول دیا مگر بجی رائے کے دشمنوں نے یہ حملہ بھی بیکار کر دیا۔ سلطان نے اپنے دستے پیچھے کر لیے۔ بجی رائے اب زیادہ تر دفاعی جنگ لڑ رہا تھا۔

سلطان محمود گھوڑے سے اُترا اور قبلہ رو ہو کر دو نفل پڑھے۔ سلام پھیرتے ہی وہ تیزی سے اُٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اُس نے گلا پھاڑ کر کہا ـــ مجھے خدا نے فتح کا اشارہ دیا ہے۔ مسلمانو! آگے بڑھو ـــ مسلمان سپاہیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دوسری بار حملہ بولا۔"

فرشتہ لکھتا ہے کہ بجی رائے بھی مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا گیا تھا۔ اِدھر جب سلطان خدا کے حضور سجدہ ریز تھا، بجی رائے اپنے دو پنڈتوں کے درمیان اپنے کسی دیوتا کے بُت کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔ اُس کی فوج کا بہت سا حصہ مارا گیا اور باقی فوج تھک چکی تھی۔ بجی رائے کو دوسرے حملے کی اطلاع ملی تو وہ بُت کے پاؤں کو چوم کر میدانِ جنگ میں آیا۔ اُسے ایک بڑی ہی بلند آواز سنائی دے رہی تھی ـــ "مسلمانو! فتح یا موت ... مسلمانو! یہ بتوں اور ہمارے رسولؐ کی جنگ ہے ... اسلام کے سپاہیو! تمہارے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ لڑتے ہوئے مرو، ہتھیار نہ ڈالنا۔"

اب مسلمان جذبے کی جنگ لڑ رہے تھے، اور قیادت سلطان کر رہا تھا۔ سپہ سالار ابوعبداللہ سلطان کے پہلوؤں اور عقب کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد

تھوڑی رہ گئی تھی، اور دوسرا خطرہ یہ کہ سلطان جذبات کے جوش میں آ گیا تھا۔ ابوعبداللہ نے میدانِ جنگ کے حقائق اور احوال و کوائف پر نظر رکھی اور دائیں بائیں سے دشمن پر حملے کراتا رہا۔ اس سے سلطان کا یہ حملہ کامیاب رہا۔

بجی رائے نے جو دستے شہر کے اردگرد پھیلا رکھے تھے انہیں بھی جنگ میں جھونک دیا ـــ اور سورج غروب ہو گیا۔ اگلے روز بجی رائے کا جھنڈا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی فوج بکھر رہی تھی۔ ابوعبداللہ نے شہر پر یلغار کر دی۔ دروازے توڑ دیئے۔ بجی رائے لاپتہ تھا۔ آخر وہ شہر سے کچھ دور ایک وسیع نشیب میں مسلمان سواروں کو مل گیا۔ اُس کا محافظ دستہ بھاگ گیا۔ بجی رائے کو للکارا گیا کہ ہتھیار ڈال دے مگر اُس نے تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔

سلطان کی فوج نے دو سو اسّی ہاتھی زندہ پکڑے اور وہ بھیرہ میں داخل ہوا۔

رات کو میدانِ جنگ میں لاشیں ہی لاشیں تھیں ـــ ان میں زخمی بھی تھے، زخمی گھوڑے بھی تھے۔ ان کے درمیان مشعلیں گھوم پھر رہی تھیں۔ ایک جگہ قاسم بن عمر زخمی پڑا تھا۔ اور اُسے ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی ـــ "قاسم .... قاسم .... زندہ ہو تو بولو۔"

چار کنواریوں کی حویلی

بھیرہ کی وہ رات آج کی راتوں کی طرح پُرسکون اور خاموش نہیں تھی۔ نوسو چھہتر سال پہلے بھیرہ کی اُس رات کے چاند کا رنگ بھی لال تھا۔ اس چاند کے آگے محمود غزنوی کی فوج کے گھوڑوں اور پیادوں کی تین دنوں اور راتوں کی اُڑائی ہوئی گرد نے پردہ سا ڈال رکھا تھا، اور اس میں سے چھن چھن کر آتی چاندنی میں دُور دُور تک ہزاروں زخمی تڑپ رہے تھے، اور ہزاروں لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ زخمیوں کی آہ و بکا سے، زخمی گھوڑوں کی کربناک اور بھیانک چیخوں جیسی ہنہناہٹ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے رات کانپ رہی تھی۔ میلوں وسیع میدان میں جیسے لہو کا موسلا دھار مینہ برس گیا تھا۔

آج وہاں خون کا نشان تک نہیں رہا۔ جن شہیدوں کو وہاں دفن کیا گیا تھا، اُن کی ہڈیاں کبھی کی بھیرہ کی خاک میں مل گئی ہیں ــ اور اس خاک میں سے پاکستان کا خمیر اُٹھا ہے۔ یہ سرزمین ملّت کے اُن سپاہیوں کے لہو سے دُھلی ہُوئی ہے جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ بہت دُور سے آئے تھے۔ وہ غزنی کی زمین کے سپوت تھے جنہوں نے بھیرہ کی اُن مسجدوں میں اذانیں دیں جنہیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے بت خانے اور اصطبل بنا رکھا تھا۔ انہوں نے محمد بن قاسم کے نعروں کو زندہ کیا تھا۔ زخمی مجاہدین کراہتے تھے تو یہی گمان ہوتا تھا کہ اُن کے سینوں سے اللہ اکبر کے نعرے اُمڈ رہے ہیں ــ اور جب کسی زخمی مجاہد کے جسدِ خاکی سے روح نکلنے لگتی تھی تو وہ اپنے عزیزوں کا نہیں، اللہ کا نام لیتا تھا۔

لاریب وہ ایمان والے تھے۔ وہ جذبۂ اسلام سے سرشار تھے۔ وہ تراشے ہوئے اُن پتھروں کو ضربِ کلیمی سے توڑنے آئے تھے جنہیں گنگا جمنا کے پجاریوں نے "خدا" بنا رکھا تھا۔ وہ اسلام کی اُن بیٹیوں کی عصمت کی پاسبانی کے لیے آئے تھے جنہیں ہند کے مہاراجاؤں

اور رملا نے اپنی لونڈیاں سمجھ رکھا تھا۔

نوسو چھہتر سال پہلے کی اُس رات اسلام کی آبرو کے پاسبانوں کے جسموں سے لہو نکل گیا تھا اور جو زندہ سلامت تھے، وہ لاشوں کا ملبہ زخمیوں کو مشعلوں کی روشنی میں پہچان اور اُٹھا رہے تھے۔ دُور دُور تک بھٹکی بھٹکی، کبھی کبھی چاندنی میں مشعلوں کے شعلے تیر رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے زخمیوں کی آہ و بکا، زخمی گھوڑوں اور ہاتھیوں کے قیامت خیز شور و غل میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی "قاسم ... قاسم ... کہاں ہو ... زندہ ہو تو بولو ... مجھے آواز دو" اور مشعلوں کی کہکشاں میں ایک مشعل بےتابی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ کہیں رُکتی تھی، اس کا شعلہ نیچے کو ہوتا تھا، مایوسی سے اُوپر اٹھتا تھا اور بےقراری سے موت کے میدان میں بھاگتا دوڑتا نظر آتا تھا۔

قاسم بن عمر موت کے اسی میدان میں کہیں زخمی پڑا تھا۔ اُس کا سارا جسم چھوٹے بڑے زخموں سے کٹا پڑا تھا۔ اُسے دُور کی یہ آواز "قاسم ... قاسم" ــ کبھی کبھی سنائی دیتی تھی، اور اُسے یہ آواز لہو اور گرد سے بوجھل فضا میں تیرتی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی وہ اس آواز کو اگلے جہان کی آواز سمجھ لیتا اور سکون کا سانس لیتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کر کے اور اپنا فرض پورا کر کے خدا کے حضور آیا ہے اور اسے فرشتے پکار رہے ہیں۔

پھر اُسے یہ آوازیں اپنی ماں کی محسوس ہونے لگیں۔ اُسے یاد آگیا کہ اُس کے باپ نے سلطان سے غداری کی اور کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا، اور اُس نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر خودکشی کر لی تھی۔ قاسم بن عمر کا زخمی جسم جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُسے ماں کے الفاظ یاد آنے لگے۔ ماں نے اسے اسکے باپ کے پیٹ سے نکالی ہوئی تلوار دے کر کہا تھا ــ "میں تمہارے سینے میں دشمن کی تلوار اتری ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے تم اس تلوار سے اپنے جیسے ایک سو دشمنوں کو کاٹو گے"

قاسم بن عمر کو یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے یہ تلوار جس سے اس کے باپ نے خودکشی کی تھی، اپنی ماں کی طرف پھینک کر کہا تھا ــ "یہ تلوار مجھے نہ دو ماں! اس پر جو خون لگا ہوا ہے، اس میں شراب کی ملاوٹ ہے۔ یہ تلوار ناپاک ہو چکی ہے" ــ اور وہ جب اپنی فوج کے ساتھ

پشاور سے کوچ کر کے آ رہا تھا تو ماں نے اُس کے بازو کے ساتھ قرآن کی ایک آیت کا تعویذ باندھ کر کہا تھا ـــ الوداع میرے بیٹے! زندہ واپس آؤ گے تو ماں کو خوشی ہوگی، تمہاری لاش آئے گی تو ماں بہت زیادہ خوش ہوگی لیکن میں فتح کی خبر سنوں ــــ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اُس کی ماں نے اُس کے سپہ سالار ابوعبداللہ محمد الطائی سے کہا تھا کہ میں اپنے اس اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

قاسم بن عمر کے جسم سے خون نکلتا جا رہا تھا۔ وہ خون سے تر زمین پر نیم شمانت کی گود میں پڑا تھا۔ جوں جوں یادیں آوازیں بن کر اُس کے ذہن کے پردوں سے ٹکراتی جا رہی تھیں، اُس کا دماغ بیدار ہوتا جا رہا تھا اور یہ سوال اُسے پریشان کرتا جا رہا تھا ـــ کیا ہم نے فتح حاصل کر لی ہے؟ ... کیا میں نے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے؟ ـــ اور پھر بہت سے سوال اُس کے ذہن میں رینگنے لگے ـــ سلطان محمود کہاں ہیں؟ ... سالار ابوعبداللہ کہاں ہے؟ ... میرے جانباز حبشی کے مجاہدین کہاں ہیں؟ ... وہ سب کٹ تو نہیں گئے؟ مارے تو نہیں گئے؟ ... سلطان پسپا تو نہیں ہو گیا؟ بھیرہ کا قلعہ سر ہوا تھا یا نہیں! ... میری خون آلود تلوار میری ماں تک کون پہنچائے گا؟ ... کون اُسے بتائے گا کہ تیرے بیٹے نے اس تلوار سے اپنے آپ کو نہیں سینکڑوں کفار کو ہلاک کیا ہے۔

قاسم بن عمر کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ فتح حاصل کی جا چکی ہے اور سلطان محمود اس وقت بھیرہ میں بجی راؤ کے محل میں بیٹھا سالاروں اور کمانداروں سے رپورٹیں لے رہا ہے اور احکام دے رہا ہے، اور بجی راؤ اپنی تلوار سے اپنے آپ کو ہلاک کر چکا ہے۔ قاسم بن عمر نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اُس نے ہر سو دیکھا۔ اُسے بے شمار مشعلیں گھومتی پھرتی نظر آئیں۔ چاندنی جو کبھی کبھی تھی، بالکل ہی پھیکی پڑ گئی ـــ اُسے پھر نسوانی آواز سنائی دی ـــ "قاسم ... قاسم ... کہاں ہو" ـــ آواز دُور تھی۔ اُسے ایک مردانہ آواز سنائی دی ـــ "یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟ کوئی اس کے ساتھ ہو جاؤ۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔"

"قاسم بن عمر کی لاش تلاش کر رہی ہے۔"

"اسے کہو ہم زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا رہے ہیں ... دیکھو یہ کون ہے۔"

ترک غزنی کی زبان بول رہے تھے۔ قاسم بن عمر نے بلند آواز سے انہیں بتانا چاہا کہ وہ یہاں ہے مگر اس کی آواز اُسے خود بھی نہ سنائی دی۔ نقاہت زیادہ تھی اور جنگ کے بعد کا ہیبت ناک شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا۔ مشعلیں دُور تو نہیں تھیں لیکن اس کے لیے کچھ دُور تھیں کیونکہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ دو تین قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک لاش سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا۔ اُس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر بڑی مشکل سے بیٹھ سکا۔ اُسے سسکی کی طرح آواز سنائی دی ـــ "پانی"

اُس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک زخمی پڑا تھا۔ اُس نے "آب" نہیں "پانی" کہا تھا۔ قاسم سمجھ گیا کہ ہندوستانی سپاہی ہے۔ قاسم کی ماں ہندوستانی تھی، اس لیے وہ اس ملک کی زبان سمجھتا تھا۔ اس ہندوستانی نے اُس سے پانی مانگا تو قاسم بن عمر کو پیاس کا احساس ہونے لگا۔ اُسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اُس نے کب پانی پیا تھا۔ اُس کے ذہن پر ماں غالب تھی، اور فتح۔ وہ بیرا دل میں رہا۔ اُس کے جیش نے چھاپہ مار لڑائی بھی لڑی اور جب سلطان محمود غزنوی نے اپنی قیادت میں بجی راؤ پر آخری حملہ کیا تو قاسم بن عمر اس حملے میں بھی شامل تھا۔ وہ سلطان ہی کی طرح بھوک اور پیاس سے بے نیاز تھا۔ اُس کی فوج ختم ہو رہی تھی اور ہندوستانیوں کا بھاری تھا۔ فتح دور ہٹتی جا رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" ـــ اُسے آواز سنائی دی ـــ "بھگوان کے نام پر میرے منہ میں پانی کے دو قطرے ڈال دو" ـــ اور سپاہی کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ یہ شدید درد کی سسکیاں تھیں۔

بھگوان کا نام سن کر قاسم بن عمر کو آگ لگ گئی۔ اُس نے تلوار نکالنی چاہی تو نیام خالی تھی۔ تلوار کہیں گر پڑی تھی۔ اُس نے خنجر نکال لیا۔ عین اُس وقت اُسے زخمی سپاہی کی درد سے کراہتی ہوئی آواز سنائی دی ـــ "تم شاید مسلمان ہو۔"

"ہاں! میں مسلمان ہوں" ـــ قاسم بن عمر نے خنجر نیام میں ڈالتے ہوئے کہا ـــ "مسلمان اپنے دشمن کو پیاسا نہیں مارا کرتا، اور بھگوان تمہیں پانی پلانے نہیں آئے گا ... مگر میرے پاس پانی نہیں۔ میں تمہیں پیاسا نہیں مرنے دوں گا۔ ذرا انتظار کرو میرے آنے تک زندہ رہنا۔"

وہ اُٹھا اور چلا مگر ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ بیٹھ کر پاؤں پر سرکتا قریب ایک لاش کے پاس

پڑا رہا۔ لاش کے ساتھ پانی کی چھوٹی سی چھاگل بندھی ہوئی تھی۔ اس نے چھاگل کھول اور سرکتا ہوا زخمی ہندوستانی کے پاس گیا۔ بولا "منہ کھولو۔"

"تم مسلمان ہو؟" — ہندوستانی نے پوچھا۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں"۔

"پھر رہنے دو" — ہندوستانی سپاہی نے کہا — "میں پانی نہیں پیوں گا۔"

اتنی نفرت! قاسم بن عمر نے سوچا، ہندو مسلمانوں کو اتنا پاک سمجھتے ہیں کہ مر جانا قبول کر لیتے ہیں مگر مسلمان کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے!

"پھر اپنے بھگوان کو آواز دو" — قاسم نے کہا — "اگر تم بھگوان کی خاطر لڑے تھے تو انتظار کرو، شاید تمہیں پانی پلانے آجائے۔ میں خدا کے نام پر لڑ رہا ہوں۔ میرا جسم قیمہ بن گیا ہے لیکن مجھے پیاس نہیں لگی۔ خدا نے میری روح کو تر کر رکھا ہے۔"

ہندو نے آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا اور چھاگل اپنی طرف گھسیٹ لی۔ قاسم نے چھاگل اٹھا کر اُس کے منہ سے لگا دی۔ ہندو آدھی چھاگل پی گیا۔

"جنگ کا فیصلہ کیا ہوا ہے؟" — قاسم بن عمر نے پوچھا "تم کچھ جانتے ہو؟"

"میں معمولی سا سپاہی نہیں" — ہندوستانی نے جواب دیا — "دو سو سپاہی میری کمان میں ہوتے ہیں۔ میں راجہ کے مرنے کے بعد زخمی ہوا تھا۔"

"ہمارا سلطان کہاں ہے؟"

"شہر کے اندر ہوگا" — ہندوستانی نے جواب دیا — "اور سنو ... تم نے مجھے پانی پلایا ہے۔ میں مر رہا ہوں، تمہیں ایک بات بتا دوں۔ ہمیشہ یاد رکھنا۔ میری قوم پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ یہ ہمارا دھرم ہے کہ مسلمان کو ختم کرنا ہے۔ ہم یہاں کے مسلمانوں کو پریشان بھی کرتے رہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو اپنا دوست بھی بنایا ہے۔ ہمیں پنڈتوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تہذیبی جنگ مذہب کی جنگ ہے جو اسلام کے خلاف ہمیشہ لڑی جائے گی۔ یہ جنگ ہمارے مرنے کے بعد بھی لڑی جاتی رہے گی۔"

قاسم بن عمر بیدار ہوتا جا رہا تھا اور ہندوستانی کی آواز دبتی جا رہی تھی — اور پھر اُس

کی آواز بالکل خاموش ہوگئی۔ اُس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل گیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ شہر میں فاتح بن کر داخل ہوا تھا تو شہر کے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے باہر نکل آئے تھے۔ وہ خوشی سے چیخ اور چلا رہے تھے۔ بعض سلطان کے گھوڑے کے آگے لیٹ جاتے تھے۔ سلطان پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ اُس نے اس خطے کے مسلمانوں کو غلامی سے آزاد کرایا تھا لیکن اس کی توجہ کسی اور طرف ہوگئی۔ شہر کے ہندو اپنے بال بچوں کو ساتھ لیے، سروں پر گٹھریاں اور بکس اٹھائے شہر سے جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے۔

"روک لو انہیں" — سلطان نے حکم دیا — "سورج غروب ہو رہا ہے۔ یہ کہاں جائیں گے۔ ہم کسی کو اجاڑنے نہیں آئے۔ ہم شہر کو لوٹ نہیں رہے۔ آگ نہیں لگا رہے ... روک لو انہیں اور انہیں کہو کہ میدانِ جنگ سے اپنی فوج کے زخمیوں کو اٹھا کر اُن خیموں تک پہنچائیں جن میں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس اس کام کے لیے اتنے آدمی نہیں جو ہیں وہ اپنے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا رہے ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے زخمیوں کو اٹھائیں۔"

شہر سے جانے والے ہندوؤں کو روک لیا گیا۔ وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ یہ جنگ اُن کے راجہ اور فوج کے خلاف تھی، شہریوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ شہر میں یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ ہندو شہری میدان سے اپنے زخمیوں کو اٹھائیں اور اپنے سپاہیوں کی لاشیں بھی اٹھا کر جلا سکتے ہیں۔

یہ اعلان مسلمانوں نے بھی سنا۔ وہ سلطان کی فوج کے زخمیوں کو اٹھانے، انہیں پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی کرانے کے لیے شہر سے نکل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ رات گہری ہوگئی تھی۔ ان کی عورتیں بھی میدان میں چلی گئیں۔

اس اعلان کے فوراً بعد شہر کے بڑے پنڈت نے اپنے چیلوں کے ذریعے شہر کے بہت سے ہندوؤں کو مندر میں بلا لیا۔ یہ لوگ جب مندر میں گئے تو مندر کی گھنٹیاں

خاموش تھیں، سنکھ خاموش تھے، بُت اور مورتیاں اداس تھیں۔ بہت سارے ہاتھوں والی دیوی کا بُت مسکرا رہا تھا لیکن یہ مسکراہٹ کھسیانی سی تھی۔ مندر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ پنڈت نے کوئی اشلوک نہ پڑھا۔ اُس نے پرارتھنا نہ کی۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی کے گہرے تاثرات تھے۔

"ہماری فوج ہار گئی ہے" — پنڈت نے کہا — "ہم نہیں ہارے۔ مسلمانوں کے سلطان نے ہمیں شہر میں رہنے کی اجازت دے دی ہے اور یقین دلایا ہے کہ مسلمان فوجی ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔ اگر وہ شہر کو لوٹنا اور جلانا چاہتے تو اب تک یہ کام کر چکے ہوتے۔ ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور شکست کا انتقام لے سکتے ہیں۔ رات گہری ہو گئی ہے۔ ہم اپنا کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ سلطان نے آپ سب کو اپنی فوج کے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے کی اجازت دے دی ہے۔ ... آپ لوگ اس کام کے لیے چلے جائیں۔ مشعلیں ساتھ لے جائیں۔ مسلمانوں نے فتح تو حاصل کر لی ہے لیکن ان کی فوج آدھی سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اس میں سے زیادہ تر نفری زخمی ہے۔ جو زخمی چل سکتے تھے وہ چل کر آ گئے ہیں۔ باقی سب میدانِ جنگ میں پڑے ہیں ....

"آپ اپنے زخمی اٹھانے کے لیے جائیں۔ کلہاڑیاں، تلواریں اور خنجر ساتھ لے جائیں۔ ہندو اور مسلمان فوجی کو پہچاننا مشکل نہیں۔ جو مسلمان زخمی اُٹھ اور چل نہیں سکتے، انہیں وہیں ہلاک کر دیں۔ اگر یہ زخمی مرہم پٹی کے لیے پہنچ گئے تو چند دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے، اور یہ ہندوستان اور ہمارے مذہب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوں گے۔ شہر کے ہر ہندو گھرانے تک یہ خبر پہنچا دو تو اچھا ہے، ورنہ کوئی ہندو مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے انہیں بتا دے گا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آپ ان کانوں میں جو یہاں موجود ہیں۔ اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مسلمان عورتیں بھی گئی ہیں۔ صبح تک آپ لوگ جتنے مسلمان زخمیوں کو مار سکتے ہیں مار ڈالیں۔ اپنے ملک اور مذہب کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسلمان فوج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔ وقت کم ہے۔ فوراً چلے جاؤ۔"

قاسم بن عراب کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ پڑا تھا جدھر کوئی آ بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے قاسم .... قاسم کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ وہ بھی خاموش ہو چکی تھیں۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اُسے دُور دُور مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اُسے مایوسی یہ نہیں تھی کہ اُسے اٹھانے کوئی نہیں آ رہا اور وہ خود مرہم پٹی کے خیموں تک پہنچنے کے قابل نہیں، وہ سلطان محمود تک یا اپنے سپہ سالار تک پہنچنا چاہتا تھا۔ نہیں یہ بتا کر مرنے کی سوچ رہا تھا کہ اُس نے باپ کے گناہ کا کفارا ادا کر دیا ہے۔

اُس پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی تو اُسے دو مشعلوں کے بڑے بڑے شعلے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اُن کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی اپنی فوج کے آدمی ہو سکتے تھے۔ اُسے نسوانی پکار ایک بار پھر سنائی دی — "قاسم .... قاسم .... زندہ ہو تو بولو" — وہ بول نہ سکا۔

دو مشعلیں اُس کے قریب اس طرح آ رہی تھیں کہ رکتی تھیں، جھکتی تھیں، اوپر اٹھتی تھیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتی تھیں۔ پھر دو آدمی اُس کے قریب آ کر رک گئے۔ دونو پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ دونو کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔

قاسم بن عمر کو ان میں سے ایک کی دبی دبی سی آواز سنائی دی — "مسلمان ہے۔ بڑا سوال ہے .... ہماری نہیں سمجھتا"۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں" — قاسم نے نحیف آواز میں کہا — "مجھے فتح کی خوشخبری سناؤ۔ تم اس شہر کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم میری زبان نہیں بول سکتے۔ میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتا ہوں۔"

دونو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونو مسکرائے۔ ایک نے تلوار نکالی اور طنزیہ لہجے میں بولا — "میں تمہیں تلوار کی زبان میں فتح کی خوشخبری سناؤں گا" — اُس نے تلوار اُوپر اٹھائی۔ قاسم بن عمر نیم غشی کی حالت میں تھا۔ اُس کی زندگی اور موت میں صرف ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ تلوار اُس کی گردن کی طرف جھکنے لگی تھی کہ ایک مشعل کا

شعلہ تلوار والے کے چہرے پر آلگا۔ اُس نے چیخ ماری اور تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اُس کے ہاتھ سے مشعل بھی گر پڑی۔

یہ ایک تیسری مشعل تھی جو ان دونوں کے عقب سے آئی تھی۔ یہ دونوں قاسم کو قتل کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ بارہ مسلمان زخمیوں کو قتل کر آئے تھے۔ قاسم بن عمر ان کا تیرھواں شکار تھا لیکن تیسری مشعل نے اُسے ایک تلوار سے بچا لیا۔ قاسم نے شعلوں کی روشنی میں دیکھا۔ وہ رابعہ تھی جو ملتان سے قاسم کے باپ عاصم عمر کے محافظوں کے ساتھ آئی تھی اور اُس نے سلطان محمود غزنوی کو بتایا تھا کہ عاصم عمر ملتان سے بڑا ہی خطرناک غدار بن کر آرہا ہے۔ عاصم عمر کی خودکشی کا باعث یہی لڑکی بنی تھی۔ وہ اب پشاور سے اتنی دور بھیرے کے میدانِ جنگ میں عاصم عمر کے بیٹے قاسم بن عمر کی زندگی کا ذریعہ بن گئی تھی۔

رابعہ نے ایک ہندو کو لوٹ گرایا، دوسرا پیچھے ہٹ گیا اور اُس نے تلوار نکال لی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اس جواں سال لڑکی کے ہاتھ میں صرف مشعل ہے، ہتھیار کوئی نہیں اور قاسم بن عمر اُٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ دونوں ہندو اپنے پنڈت کی اُس سکیم کے تحت آئے تھے جو اُس نے مندر میں ہندوؤں کو بتائی تھی۔ وہ اپنی فوج کے زخمیوں کو اُٹھانے کے بہانے مسلمان زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ دوسرے ہندو نے تلوار نکال کر رابعہ پر حملہ کیا۔ رابعہ تیغ زنی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اُس نے مشعل اس ہندو کے آگے کر دی اور خود ایک طرف ہو گئی۔ جو ہندو رابعہ کی مشعل کے شعلے سے گرا تھا، اُس کی آنکھیں جھلس گئی تھیں۔ وہ ایک طرف بیٹھا درد سے کراہ رہا تھا۔

قاسم بن عمر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے پاس خنجر تھا، تلوار نہیں تھی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ اُس نے خنجر نکال لیا۔ رابعہ مشعل کے شعلے سے اپنا دفاع کر رہی تھی۔ جونہی ہندو کی پیٹھ قاسم کی طرف ہوئی، قاسم نے خنجر اُس کی طرف پوری طاقت سے پھینکا۔ خنجر ہندو کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ وہ پیچھے کو گھوما تو رابعہ نے مشعل سے اُس کے کپڑوں کو آگ لگا دی۔ ہندو اُس کی طرف گھوما تو لڑکی نے مشعل کا شعلہ اُس کے چہرے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔ آخر بیٹھ گیا۔ اُس کی پیٹھ میں خنجر بھی اُترا ہوا تھا۔

لاشیں اور زخمی اُٹھانے والوں نے دُور ایک آدمی کو جلتے دیکھا تو وہ دوڑتے

آئے۔ یہ غزنی کی فوج کے آدمی تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ ان دو [illegible] نے کیا کیا ہے۔ ان میں سے جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا، وہ بات کرنے کے قابل تھا۔ اُس کے پیٹ پر تلوار کی نوک رکھی گئی تو اُس نے بتایا کہ وہ قاسم کو قتل کرنے لگے تھے، اور انہیں پنڈت نے کہا تھا کہ مسلمان زخمیوں کو قتل کرو۔

اُسی وقت یہ آدمی میدانِ جنگ میں دوڑنے لگے۔ انہوں نے بہت سے ہندوؤں کو پکڑا جو مسلمان زخمیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ پھر ہندو شہریوں کو میدانِ جنگ میں آنے سے روک دیا گیا۔ پنڈت کو بھی جا کر پکڑ لیا گیا۔

قاسم بن عمر کو وہاں سے اُٹھا لے گئے اور اُسے مرہم پٹی والے خیمے میں جا ڈالا۔

سلطان محمود غزنوی کی فوج پشاور سے چلی تھی تو سالاروں اور بعض کمانداروں کی بیویاں بھی ساتھ آئی تھیں۔ ان کی پالکیاں رسد کے قافلے کے ساتھ تھیں۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں۔ یہ بڑے افسروں کی بیویوں کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ تھیں اور ان کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ مرہم پٹی کے بعد زخمیوں کی دیکھ بھال کریں۔ یہ کام بھی فوج کو کرنا پڑتا تھا۔ سلطان محمود نے یہ سوچ کر عورتوں کو ساتھ آنے کی اجازت دے دی تھی کہ فوج تھوڑی ہے اور مختلف لڑائیوں میں یہ اور کم ہو جائے گی، اس لیے زخمیوں کی دیکھ بھال کا کام عورتوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

”مجھے تمہاری ماں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔“ رابعہ قاسم بن عمر کو اُس کی مرہم پٹی کے بعد سنا رہی تھی۔ ”جب تمہیں کوچ کا حکم ملا تو مجھے تمہاری ماں نے بتایا کہ عورتیں بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ بھجوا دے۔ میرے سینے میں جو آگ لگی ہوئی تھی وہ آج کچھ ٹھنڈی ہوئی ہے۔ یہ پوری طرح اُس روز ٹھنڈی ہوگی جس روز سلطان محمود ملتان فتح کرے گا اور میں اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں قتل کروں گی۔ میں نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ مجھے اگر اس نیکی کا انعام دینا چاہتے ہو کہ میں نے اُس کے ایک سالار کی غداری بے نقاب کی اور اُس کی فوج کو بہت بڑی شکست

اور تباہی سے بچایا ہے تو ملتان کے والی داؤد بن نصر کو میرے سامنے گرفتار کر کے لاؤ اور اُس کے محل کو زمین سے ملا دو ....

" تمہاری ماں کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کہا کہ جانا تو میں بھی چاہتی ہوں لیکن کہتے ہیں کہ وہاں جا سکتی ہیں، کسی کی ماں ساتھ نہیں جا سکتی۔ وہ بہت رو رہی تھی۔ اُس نے معلوم نہیں کس کس کے ساتھ بات کر کے مجھے ان عورتوں کے ساتھ جانے کی اجازت لے دی جو فوج کے ساتھ آئی ہیں۔ تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا — میرا بیٹا میدانِ جنگ میں انشاء اللہ سخت جان ہوگا۔ اُس کا جسم دو حصوں میں نہ کٹ گیا تو وہ گرے گا نہیں۔ میں نے اُسے کہا ہے کہ تمہاری لاش واپس آئے گی تو مجھے خوشی ہوگی، لیکن رالو میں ماں ہوں۔ جب سوچتی ہوں کہ میرا بیٹا پیاسا جان دے گا تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے میں قاسم کی ماں نہیں بلکہ کی ماں بن جاتی ہوں اور کہا کرتی ہوں کہ یہ اللہ کا سپاہی ہے جو میرے بطن سے پیدا ہوا ہے اور یہ اللہ کی امانت ہے جو مجھے واپس کرنی ہے، پھر مجھے تسکین سی ہو جاتی ہے ....

" اور قاسم! تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا — مجھے خود غرض کہہ لو۔ کچھ کہو، لو مجھ پر یہ احسان کرنا کہ جب زخمیوں کو اٹھانے کا وقت آئے تو تم سب سے پہلے میرے بیٹے کو تلاش کرنا۔ اُسے پانی پلا دینا۔ دل میں میرا خیال رکھ لینا اور اُس کی ماں بن جانا۔ میرا بیٹا پیاسا اس دنیا سے رخصت نہ ہو، رابعہ! تم ماں نہیں ہو۔ دل میں ماں کا پیار کر لینا۔ میں اپنے بیٹے کو خدا کے اور تمہارے سپرد کرتی ہوں ....

" اور قاسم! تمہاری ماں نے مجھے کہا تھا — میں تمہیں اس کی بھی اجازت دیتی ہوں کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میرے بیٹے نے پیٹھ دکھائی ہے یا کہیں چھپ گیا تھا تو اپنے ہاتھوں اُسے تلوار سے، تیر کمان سے، برچھی سے ختم کر دینا۔ میں سمجھوں گی کہ خاوند غدار تھا اور اُس کا نطفہ بھی غدار نکلا۔ میں باقی زندگی کسی پیر فقیر کی درگاہ پر جھاڑو دیتے گزار دوں گی۔"

" تمہیں میرے متعلق کچھ پتہ چلا ہے؟" — قاسم بن عمر نے پوچھا۔

" پشاور سے آتے جب دریا پار کرتے لڑائی ہوئی تھی تو میں نے سپہ سالار ابو عبداللہ

سے پوچھا کہ قاسم کی کیا خبر ہے؟ سپہ سالار کو معلوم تھا کہ مجھے تمہاری ماں نے بھیجا ہے۔ اُس نے بتایا تھا کہ تم بہت بہادری سے لڑے ہو۔ میں نے سپہ سالار سے کہا تھا کہ قاسم کو پتہ نہ چلے کہ میں بھی ساتھ آئی ہوں۔ میں نے یہ اس لیے اُسے کہا تھا کہ تمہاری توجہ میری طرف نہ ہو جائے ....

" یہاں ہمیں میدانِ جنگ سے بہت دُور رکھا گیا تھا۔ تین دن لڑائی ہوتی رہی۔ ہمیں اس طرف نہ آنے دیا گیا۔ ہم سب اپنی فوج کے لیے دعائیں کرتی رہیں اور ہمیں خبریں ملتی رہیں اور ایک روز تو کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ اپنی فوج کو شاید پسپا ہونا پڑے ... تمہارے متعلق مجھے بتانے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ تمام عورتیں لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی پسپائی کا نام سننے کے لیے تیار نہیں تھی ....

" آج دوپہر کو ہمیں اطلاع ملی کہ دشمن کو شکست دے دی گئی ہے لیکن دونوں فوجوں کا جانی نقصان اتنا زیادہ ہوا ہے کہ لاشوں کے اوپر لاشیں پڑی ہیں اور زخمیوں کو اٹھانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمیں شام سے ذرا پہلے یہاں لایا گیا لیکن ہمیں اُن خیموں میں بھیج دیا گیا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ طبیب زخموں کو صاف کرتے اور اُن پر دوائیاں لگاتے تھے اور عورتیں پٹیاں باندھتی اور زخمیوں کو کھلاتی پلاتی تھیں۔ اپنے زخمیوں کی قطاریں چلی آ رہی تھیں۔ ان میں بہت سے بیہوش تھے۔ کئی ہمارے ہاتھوں میں شہید ہو گئے۔ میں ہر ایک زخمی کو دیکھتی تھی۔ بعض کے چہرے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ان کے چہرے دھو کر انہیں دیکھتی تھی۔ میں ہر اُس زخمی سے جو ہوش میں تھا، پوچھتی تھی کہ قاسم بن عمر کو تم نے کہیں دیکھا ہے؟ تین نے مجھے ایک ہی جیسا جواب دیا — قاسم کا جیش جس طرف گیا تھا وہاں سے شاید ہی کوئی زندہ واپس آیا ہو ....

" سورج غروب ہونے کے بعد تمہارے جیش کا ایک زخمی سپاہی مل گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ قاسم بن عمر اگر ابھی تک نہیں آیا تو وہ مر چکا ہوگا۔ اُس نے بتایا کہ تم اُس کے سامنے زخمی ہوئے تھے۔ اُس نے یہ بھی کہا — میں اپنے جیش کا شاید ایک ہی آدمی زندہ بچا ہوں — تمہارے متعلق اُس نے کہا — قاسم بن عمر ہمارا کماندار تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ہندوستانی ہمیں بھگا کر ہی دم لیں گے۔ جب آخری حملے کا حکم ملا تو ہمارے

جیش کو دشمن پر اُس جگہ حملہ کرنے کو بھیجا گیا جہاں بھیرہ کے راجہ کا جھنڈا تھا۔ سپہ سالار ابوعبداللہ نے اُسے کہا تھا کہ قاسم! ہندیوں کا جھنڈا گرا دو تو جو انعام مانگو گے دوں گا۔ سپہ سالار نے ہمیں خدا حافظ کہا تھا'۔۔۔۔

"تمہارے جیش کے اس آدمی نے بتایا کہ قاسم پاگل ہو گیا تھا۔ اُسی نے ہمیں حکم دیا تھا کہ راجہ کا جھنڈا گرے گا یا ہم گریں گے۔ ہم ہندیوں کے دل میں اُتر گئے۔ جھنڈا گرا لیا گیا مگر ہم سے کوئی ایک بھی اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر نہ رہ سکا اور کوئی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ رہا۔ راجہ نکل گیا۔ ہندیوں پر یہ ضرب کاری لگی کہ اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اُس نے بتایا تھا کہ قاسم اگر یہاں نہیں لایا گیا تو وہ زندہ نہیں ہو گا۔۔۔۔

"میں اُسی وقت وہاں سے چل پڑی۔ ایک مشعل ہاتھ آ گئی۔ اگر میرے ہاتھ میں مشعل نہ ہوتی تو میں ہر قدم پر لاشوں سے ٹھوکر کھا کر لاشوں پر گرتی۔ میں نے مرا ہوا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا مگر یہاں لاشیں اس طرح پڑی ہیں جیسے جنگل کاٹ کر لکڑیاں پھینکی ہوئی ہوں۔ میں نے شاید ہر ایک لاش کا چہرہ دیکھ ڈالا ہے۔ اُن کے زخم بھی نظر آتے ہیں۔ میں نے کٹے ہوئے چہرے بھی دیکھے ہیں۔ میں نے ہندوؤں کی لاشیں بھی دیکھی ہیں اور مجھے روحانی سکون ملا ہے مگر اپنی فوج کی ہر لاش کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے کراہتے ہوئے زخمی بھی دیکھے ہیں۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔۔۔۔

"پھر میں نے تمہیں پکارنا شروع کر دیا۔ زخمیوں کو اٹھانے والوں نے مجھے کہا بھی کہ یہاں تمہیں قاسم نہیں ملے گا مگر میں وہاں تک چلی گئی جہاں لاشوں کا یہ سمندر ختم ہو جاتا ہے۔ میرے اندر تمہاری ماں کی روح اُتر آئی تھی۔ تم یہاں نہ ملتے تو میں رات یہیں گزار دیتی اور دن کی روشنی میں تمہیں تلاش کرتی۔ میں اس طرف آ گئی۔ دو مشعلیں دیکھیں۔ میں ان آدمیوں کے تعاقب میں تھی۔ میں آہستہ آہستہ ادھر آئی۔ مجھے ان سے بھی تمہارے متعلق پوچھنا تھا۔ قریب آئی تو مجھے تمہارا چہرہ نظر آیا۔ تم بیٹھے ہوئے تھے۔ دو مشعلوں کی روشنی میں میں نے تمہیں پہچان لیا۔ میں آ گئے بڑھی۔ معلوم نہیں تم مجھے کیوں نہیں دیکھ سکے۔۔۔۔

"ان دونوں کے لباس دیکھے تو خیال آیا کہ یہ فوجی نہیں اور یہ مسلمان بھی نہیں لگتے۔ مجھے

کوئی شک نہ ہوا۔ ان میں سے ایک اپنی تلوار نکال کر تم پر وار کرنے لگا تو میں نے دوڑ کر اپنی مشعل کا شعلہ اُس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ قاسم! یہ خدا کا حکم تھا کہ تم زندہ رہو۔ تمہارا فرض ابھی پورا نہیں ہوا۔"

ملتان میں داؤد بن نصر قرامطی کے محل سے ذرا ہٹ کر محمد بن قاسم کے دور کی ایک حویلی ہوا کرتی تھی جس کی ساخت قلعے کی طرح تھی۔ اس کے اندر بے شمار کمرے تھے۔ غلام گردشیں اور راہداریاں تھیں۔ میدان جیسا صحن بھی تھا۔ اندر کنواں بھی تھا۔ اس قلعہ نما حویلی کے متعلق مشہور تھا کہ آسیب زدہ ہے۔ اندر جاؤ تو عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آہٹیں یوں سنائی دیتی ہیں جیسے بچے بھاگ دوڑ رہے ہوں۔ بچوں کے قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے حویلی آباد ہو۔ اس کے متعلق بڑی ہی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگ اس حویلی کے قریب سے گزرتے بھی ڈرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے حویلی کی چھتوں کے اوپر مشعلوں کے شعلے ہوا میں تیرتے دیکھے ہیں۔ ایک روایت یہ مشہور تھی کہ محمد بن قاسم کے دور کے بعد جب یہ خطہ ہندوؤں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے حویلی میں رہنے والے مسلمان خاندان کو قتل کر دیا تھا۔ مقتولین میں بچے بھی تھے اور چار کنواری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکیوں کو بے آبرو کر کے قتل کیا گیا۔ اب چار کنواریوں اور بچوں کی بدروحیں حویلی میں رہتی ہیں۔ کوئی اندر چلا جائے تو اُسے بچوں اور کنواریوں کے رونے کی اور پھر ہنسنے کی آوازیں آتی ہیں۔ بچے بھاگتے دوڑتے ہیں اور بڑی بہنیں بین کرتی ہیں۔ کہتے تھے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود مقتولین کی ہڈیاں وہیں پڑی ہیں جہاں انہیں قتل کیا گیا تھا۔

جن دنوں سلطان محمود غزنوی نے بھیرہ فتح کیا اور وہ اپنی فوج کی کمی پوری کرنے میں مصروف تھا، ملتان کی آسیب زدہ حویلی میں راتوں کو میلے کا سماں ہوتا تھا۔ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر قرامطی تھا۔ اس فرقے کے متعلق تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ شراب، بدکاری اور بے حیائی جائز ہے۔ جی میں جو آئے کرو، یہی اسلام ہے۔ ان کا پیر و مرشد داؤد بن نصر تھا جو ملتان کا حاکم یعنی والی بھی تھا۔ آسیب زدہ

حویلی میں میلے کا اہتمام اسی نے کرایا تھا۔ اس کی طرف سے شہر اور گرد و نواح کے دیہات میں اعلان ہوا تھا ـــ "داؤد بن نصر حاکم ملتان ولی اللہ قرامطی نے اُن بدروحوں اور جنات کو حاضر کر لیا ہے جو اُجڑی ہوئی حویلی میں رہتے ہیں۔ یہ جنات ہر رات ایک آدمی یا ایک جانور کا خون پیتے ہیں۔ داؤد بن نصر نے مخلوقِ خدا کے سکون اور امان کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال کر بدروحوں اور جنات کو اپنے تابع کر لیا ہے۔ رات کو لوگ آ کر انہیں قیدی حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔"

لوگ شام کے بعد حویلی میں جاتے تھے۔ منڈیروں پر چراغاں ہوتی تھی۔ کمروں اور برآمدوں میں اس قدر خوشبو چھوڑی گئی تھی کہ جو اندر جاتا وہ باہر کی دنیا کو بھول جاتا، کمروں کو صاف نہیں کیا گیا تھا۔ ان کی چھتوں سے لٹکتے ہوئے جالے جو میلے کچیلے کپڑوں کی صورت اختیار کر گئے تھے، اسی طرح رہنے دیئے گئے تھے۔ فرشوں پر جو کائی اُگی ہوئی تھی، اسے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا۔ حویلی کی ہیبت جیسی تھی ویسی ہی رہنے دی گئی تھی ـــ اور شام کے بعد لوگ ان کمروں اور برآمدوں میں گھومتے پھرتے اور حویلی کے صحن میں جمع ہو جاتے تھے جہاں ایک چبوترہ بنایا گیا تھا۔ اس پر خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک مسند رکھی تھی جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ روشنی میں جھلمل کرتے ستاروں کی طرح چمکتے اور ٹمٹماتے تھے۔ یہ چبوترہ برآمدے کے بالکل ساتھ تھا۔

دو چار دنوں میں ہی شہر اور دیہات میں صرف ایک ہی موضوع رہ گیا جس پر لوگ باتیں کرتے تھے۔ یہ موضوع تھا "چار کنواریوں کی حویلی" ـــ لوگ حیرت زدہ ہو کر بھی اور اپنے اوپر وجد طاری کر کے بھی داؤد قرامطی کی کرامات کا ذکر کرتے تھے۔ ان سب کو چاروں کنواریاں جنہیں سینکڑوں سال پہلے قتل کیا گیا تھا حویلی کے صحن میں رکھے ہوئے چبوترے پر داؤد بن نصر نے اس طرح دکھائی تھیں کہ وہ جیسے ہوا میں سے نمودار ہوئیں اور ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ ان لوگوں نے کنواریوں کی آوازیں سنی تھیں۔ بچوں کے قہقہے سنے اور بچوں کو چبوترے پر آتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔

بعض مسجدوں میں بھی قرامطیوں کی کرامت کا ذکر ہونے لگا اور پھر ملتان کی ریاست میں یہ تغیر آیا کہ مسجدوں کے امام بھی داؤد قرامطی کا ذکر اپنے وعظ اور خطبے میں کرنے لگے ـــ

اور پھر یہ انقلاب آیا کہ پنڈتوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ داؤد بن نصر صرف حاکم یا والی نہیں، اس کے ہاتھ میں تو خدا کی قوت ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ پنڈتوں نے یہ بھی کہا کہ یہی اسلام ہے جسے مولویوں نے بے معنی پابندیاں عائد کر کے اور نیکی اور بدی کو الگ کر کے بگاڑ دیا ہے۔

ملتان میں ایک اور حویلی تھی۔ یہ ویسی ہی تھی جیسی گلی محلوں میں حویلیاں اور مکان ہوتے ہیں۔ یہ آباد تھی۔ اس میں مسلمانوں کا ایک کنبہ رہتا تھا۔ ملتان میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی کیونکہ یہ مسلمان ریاست تھی، ہندو ریاستوں کے مسلمان بھی ملتان جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان غیر قرامطی تھے۔ یعنی وہ صحیح معنوں میں مسلمان تھے، مگر ملتان کا سرکاری نظم و نسق اور تجارت قرامطیوں کے ہاتھ میں تھی۔ قرامطی اپنے باطل عقیدے کی تبلیغ بھی کرتے رہتے تھے۔

یہ حویلی شہر کے اندر ایک گنجان آباد محلے میں تھی۔ یہ کوئی آسیب زدہ اور پُراسرار حویلی نہیں تھی مگر ایک رات اس کے ایک کمرے میں جو چند ایک آدمی بیٹھے تھے، وہ پُراسرار طریقے سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک تو وہ درویش تھا جس نے عاصم عمر کے محافظوں کو اپنے ہاں بلایا اور انہیں بتایا تھا کہ تمہارا سالار عاصم عمر جو داؤد بن نصر کے پاس سلطان محمود کا ایلچی بن کر آیا ہے، وہ قرامطیوں کے طلسم میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اسی درویش نے عبدکو داؤد بن نصر کے محل سے نکالا اور اسے عاصم عمر کے ایک محافظ کے ساتھ پشاور روانہ کیا تھا۔

"حکومت کی گدی پر قرامطی بیٹھا ہے" ـــ درویش معمولی سی حویلی کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا ـــ "ہم آزادی سے لوگوں کو نہیں بتا سکتے کہ قرامطی فرقے کے لوگوں کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اسلام انسان کو گناہوں سے بچاتا اور نیکی کی طرف لاتا ہے۔ اسلام کا تعلق روح سے ہے اور قرامطی عقیدہ جسم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے جسمانی عیاشی، شر اور شراب کی کھلی اجازت دیتا ہے اور یہ اجازت بھی کہ خوبصورت عورت کسی ایک آدمی کی بیوی کو بن سکتی ہے لیکن وہ اپنے خاوند پر اور خاوند اس پر پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں عیش و عشرت کریں اور جسمانی لذت حاصل کریں کیونکہ خدا نے انسان کو عیش و عشرت کے لیے پیدا کیا ہے..... آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس فرقے کی تعداد بڑھتی

جا رہی ہے۔"

"انسانی فطرت لذت پرستی کی طرف جلدی مائل ہوتی ہے" — اس کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش عالم نے کہا۔ "نیکی میں جسمانی لذت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اصل چیز روح ہے جو نظر نہیں آتی۔ روحانی لذت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے دل میں بنی نوع انسان کی محبت پیدا کر کے اور اللہ کی عبادت کر کے روحانی لذت حاصل کی ہو۔ انسان یہ نہیں سمجھتے کہ روح علیل ہو تو جسم بھی علیل ہو جاتا ہے اور جب جسم کی ناجائز ضروریات پوری کی جائیں تو روح مرجھا جاتی ہے۔ پھر جسم وقت سے پہلے کمزور اور نحیف ہو کر قبر میں جا دفن ہوتا ہے اور روح خدا کے حضور چلی جاتی ہے۔"

"ہم سب جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" — ایک جواں سال آدمی نے کہا — "آپ اس مسئلے کے متعلق بات کریں جو ہم پر آپڑا ہے۔ داؤد قرامطی نے جب سے ویران حویلی میں بدروحوں اور جنات کو حاضر کرنا شروع کیا ہے، لوگ جوق در جوق اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ میں نے ایک مسجد میں امام کو وعظ کرتے سنا ہے جس میں وہ کہہ رہا تھا کہ سچا اسلام قرامطی ہے۔ جب ایک باطل عقیدہ مسجد پر قبضہ کر لیتا ہے تو لوگ اسے باطل نہیں سچا سمجھنے لگتے ہیں۔"

"کیا آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ ہندوؤں کے پنڈت بھی قرامطی عقیدے کو سچا اسلام کہہ رہے ہیں؟" ایک اور نے کہا۔

"مگر کوئی ہندو اپنا مذہب چھوڑ کر قرامطی نہیں ہوگا" — درویش نے کہا — "لوگوں کو ہم کس طرح بتائیں کہ قرامطی فرقہ عیسائیوں کا پیدا کردہ فتنہ ہے اور ہندوستان میں ہندو راجے مہاراجے اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ کفار کا ایک مقصد یہ ہے کہ اسلام کا چہرہ گناہوں اور عیش و عشرت سے گندہ کر دیا جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ ملتان کی گدی کو مسلمان گدی کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دیا جائے اور ملتان کی فوج استعمال کی جائے۔ ... اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش ہو رہی ہے۔ بیچار کنواریوں کی حویلی نے ملتان کی آدھی مسلمان آبادی کو قرامطی بنا دیا ہے۔ یہ سوچیں کہ ہم اس کی روک تھام کیسے کریں۔ ہم میں سے کوئی بھی حویلی میں یہ دیکھنے کے لیے نہیں گیا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ ہر رات چار کنواریاں اور تین چار بچے حاضر کیے جاتے اور لوگوں کو دکھائے جاتے ہیں" — عالم نے کہا — "لوگ کہتے ہیں کہ یہ بدروحیں ایک دھوئیں میں سے نمودار ہوتی ہیں اور کچھ باتیں کر کے وہیں کہیں غائب ہو جاتی ہیں ... ہم میں سے کسی کو وہاں جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم اس لیے نہیں جاتے کہ یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے۔"

"ہم آج اسی لیے یہاں جمع ہوئے ہیں" — جواں سال آدمی نے کہا — "اگر وہاں کوئی فریب کاری یا شعبدہ بازی ہو رہی ہے تو ہم اس حویلی کے قرامطیوں کے پردے چاک کر دیں گے" — اس نے وہاں بیٹھے ہوئے اپنے جیسے جوانوں اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا — "ہم اسلام کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں وہاں نقب لگانی پڑی تو لگائیں گے۔ آپ عالم اور درویش ہیں۔ آپ کتابوں کی باتیں کرتے ہیں، ہمیں سیاہ و سفید سمجھا دیں۔ ہماری راہنمائی کریں، عمل ہم کریں گے جن کے جسموں میں جوانی کا خون اور سینے میں ایمان کی حرارت ہے۔"

"غور سے سنو ہمارے بیٹو!" — عالم نے کہا — "سیدھی سی بات ہے کہ قرامطی فرقہ کفار کی پیداوار ہے۔ ان کے مقاصد تم جانتے ہو۔ جاننے اور سمجھنے والی ایک بات یہ ہے کہ مذہب انسان کی کمزوری بن جاتا ہے۔ ہم مسلمان مذہب پر مرمٹتے ہیں۔ دشمن ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے عزائم کے تکمیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ داؤد حکومت کی گدی کا شیدائی ہے۔ وہ بھی مذہب کی آڑ اور سہارا لے کر اپنی گدی کو محفوظ اور مستحکم کر رہا ہے۔ ہماری قوم جب بھی دھوکہ کھاتی ہے مذہب کے نام پر کھاتی ہے۔ وہ خلفائے راشدین اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں جنہوں نے صحیح اسلام کی پابندی کی بھی اور کرائی بھی تھی۔ اب وہ خلیفے آگئے ہیں جو مذہب کو حربے اور حیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور مذہب کے ان پڑھ اور پسماندہ ذہن شیدائی جذبات میں آ کر ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ انہیں بہت دیر بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ مرید نہیں بنے، ایک ہوس کار اور اقتدار پرست حکمران کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کے خلاف بات کرو تو وہ کفر کا فتویٰ لگاتے اور سزا دیتے ہیں ....

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ داؤد بن نصر مسلمان نہیں اور یہ بھی کہ وہ اسلام کی روح کو مار رہا ہے اور

یہ بھی کردہ ہندؤں اور عیسائیوں کا دوست ہے جو اسلام کے بدترین اور بہت خطرناک دشمن ہیں۔ ہم لوگ اُس کے خلاف سنے بغیر کچھ نہیں کر سکتے نہ کچھ کر سکتے ہیں۔
"اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس کے خلاف کوئی خفیہ کارروائی کریں۔" ایک نوجوان نے کہا۔

"آج رات ہم سب چار کنواریوں کی حویلی میں جائیں گے، اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔" درویش نے کہا۔

حویلی میں انہوں نے جو رونق دیکھی اس نے انہیں حیران کر دیا۔ لوگوں کی بیتابی اور بے قراری اور زیادہ حیران کن تھی۔ یہ وہی حویلی تھی جس کے قریب سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ لوگ کمروں اور برآمدوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ ہر جگہ دیئے جل رہے تھے۔ درویش کے ساتھ چھ سات جواں سال آدمی تھے جن میں دو سترہ اٹھارہ سال عمر کے نوجوان تھے۔ وہ بھی لوگوں کی طرح حویلی کے اندر گھومتے پھرتے اُس جگہ تک چلے گئے جہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے آگے بھی حویلی کے کمرے تھے اور ان سے آگے برآمدہ اور اس کے ساتھ چبوترہ تھا جس پر داؤد بن نصر بدروحوں اور جنات کو حاضر کرتا اور لوگوں کو دکھاتا تھا۔

وہاں ایک آدمی کھڑا تھا جو لوگوں کو وہاں سے واپس بھیج رہا تھا۔ درویش اور اس کے ساتھی بھی وہاں تک گئے۔ اُس آدمی نے انہیں روکا۔ درویش اس سے پوچھنے لگا کہ آگے کیا ہے۔ اُس آدمی نے کچھ بتانے کی بجائے غصے سے درویش کو وہاں سے واپس چلے جانے کو کہا۔ اس دوران اس آدمی کی توجہ کسی اور کی طرف ہو گئی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی۔ وہ آدمی دوسری طرف ہوا تو درویش نظر بچا کر وہاں سے اس طرح آگے چلا گیا کہ وہیں سے راہداری مڑتی تھی جو اندھیری تھی۔ وہ آدمی واپس ہوا تو اُس نے سب کو پیچھے ہٹا دیا۔ درویش کے ساتھی باہر آ گئے اور اُس ہجوم میں شامل ہو گئے جو چبوترے کے سامنے جمع تھا۔

درویش اندھیری راہداری میں جاتے جاتے رک گیا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کی درزوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک درز کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا۔ کمرہ سجا ہوا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ گاؤ تکیے بھی تھے اور رنگ برنگے فانوس جل رہے

تھے۔ پانچ چھ لڑکیاں نیم برہنہ حالت میں ناچ کود رہی تھیں۔ دو آدمی تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ اُن کے آگے صراحی اور پیالے تھے جن میں شراب ہی ہو سکتی تھی۔ وہ کبھی کسی لڑکی کو بازو سے پکڑتے اور گھسیٹ کر اپنے اوپر گرا لیتے تھے۔ لڑکی کو بالکل برہنہ کر کے چھیڑ چھاڑ کرتے اور قہقہے لگاتے تھے۔

درویش وہاں سے آگے چلا گیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر روشنی تھی۔ درویش وہاں جا رکا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ ایک کونے میں فرش کے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ نیچے تہہ خانہ ہو سکتا تھا یا یہ سرنگ کا دہانہ تھا۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ یہ چار پانچ سیڑھیاں تھیں جو پرانے زمانے کی نہیں تھیں، نئی بنائی گئی تھیں۔ سرنگ اتنی کھلی تھی کہ اس میں اچھے قد کا آدمی چل سکتا تھا۔ وہ چلتا گیا۔ کہیں کہیں ایک دیا رکھا تھا۔

وہ آگے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ ایک آدمی خنجر ہاتھ میں لیے اُس کے پیچھے تین چار قدم دور رہ گیا ہے۔ خنجر والا دبے پاؤں اُس کے پیچھے جا رہا تھا۔ اس نے درویش پر وار کرنے کے لیے خنجر والا ہاتھ دائیں کو زور سے کیا۔ وہ درویش کے پہلو میں خنجر گھونپنا چاہتا تھا مگر اُسے خیال نہ رہا کہ سرنگ اتنی چوڑی نہیں کہ بازو پورا گھما سکتا۔ اُس کا ہاتھ سرنگ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ آواز پیدا ہوئی تو درویش تیزی سے گھوما۔ خنجر والا خنجر پر گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ درویش نے بجلی کی پھرتی سے اپنی ناف میں سے خنجر نکالا اور وار کیا۔ اُدھر وہ بھی وار کر چکا تھا۔ دونوں کے خنجروں والے بازو ٹکرائے۔ درویش نے اُس آدمی کے پیٹ میں بایاں گھونسہ مارا۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ درویش نے نیچے سے وار کیا اور خنجر اس آدمی کے دل میں اتار دیا۔ اس آدمی نے گرتے گرتے کسی کو پکارا۔

درویش وہاں سے دوڑ پڑا اور سرنگ کے دہانے پر آ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ آیا۔ دوڑتا ہوا کمرے سے نکل رہا تھا کہ تین چار آدمی تیز دوڑتے آئے۔ انہوں نے مرنے والے کی پکار سن لی تھی۔ درویش اُن سے ٹکرا گیا لیکن حاضر دماغ تھا۔ گھبراہٹ کے لہجے میں بولا "نیچے جاؤ۔ دوڑ کر پہنچو، میں آتا ہوں" — وہ سب سرنگ کی طرف دوڑ پڑے اور درویش

باہر نکل گیا۔ اُس نے خون آلود خنجر ناف میں اُڑس لیا تھا۔ باہر جا کر وہ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اور سر پر چادر ڈال لی۔

لوگوں کی نظریں چبوترے پر لگی ہوئی تھیں جہاں شاہانہ مسند پڑی تھی۔ روشنی کم تھی۔ درویش نے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر کے انہیں بتایا کہ اُس نے اندر جا کر کیا دیکھا اور وہ کیا کر آیا ہے۔ ساتھیوں نے اُسے کہا کہ وہ وہاں نہ رُکے ورنہ پکڑا جائے گا۔ وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نقارے اور نفیر بجنے لگے۔ یہ داؤد بن نصر کی آمد کا اعلان تھا۔ وہ حویلی کے کسی اور حصے میں چلا گیا۔ چبوترے پر ایک آدمی نے بلند آواز سے اعلان کیا۔ "والیٔ ملتان، قرامطی پیغمبر ابو الفتح داؤد بن نصر بن شیخ حمید قرامطی جن کے قبضے میں ارواح اور جنات ہیں جو سچے اسلام کے علمبردار اور پیغمبر ہیں تشریف لاتے ہیں۔ سب پر لازم ہے کہ سب سر جھکا لیں"۔

نقارے اور نفیر بجتے رہے اور ایک وجیہہ آدمی جس کے سر پر تاج تھا، چبوترے پر آیا۔ تمام لوگوں نے سر اس طرح جھکا لیے جیسے سجدے میں چلے گئے ہوں۔ چوبدار نے اعلان کیا کہ صدیوں سے یہ حویلی بدروحوں اور جنات کا مسکن بنی رہی تھی۔ یہ ہر روز ایک انسان یا ایک جانور کا خون پیتے تھے۔ سچے مذہب کے پیغمبر نے اپنی خاص کرامات اور خدائی طاقت سے ارواح اور جنات کو اپنے تابع کر لیا ہے۔ قرامطی پیغمبر کا حکم ہے کہ تم لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو یہ ارواح اور جنات تم سب کو پریشان کرتے رہیں گے۔

یہ اعلان ایسے جذباتی اور سنسنی خیز انداز سے کیا گیا کہ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اس کے بعد رباب کی قسم کے کسی ساز کی دھیمی دھیمی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ چند اور سازوں کا ترنم سنائی دینے لگا۔ یہ سب تاروں والے ساز تھے۔ داؤد بن نصر مسند سے اُٹھا اور پیٹھ لوگوں کی طرف کر لی۔ اُس نے بازو پھیلا کر اُوپر کیے اور ترنم سے کچھ بڑبڑایا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ وہاں سے پہلے شعلہ اُٹھا پھر دُھواں پھیلنے لگا۔ داؤد نے بلند آواز سے کہا۔ "خدائے ذوالجلال! جن و انس کے پیدا کرنے والے خدا! مجھے اپنی خدائی قوت عطا کر کہ تیری مخلوق کو ان بدروحوں اور جنات سے جو آزاد ہیں، اُن سے محفوظ کر دوں" — اُس نے دھماکے کی سی آواز میں کہا۔ "آ جاؤ میرے سامنے"۔

دُھواں چبوترے تک آ گیا تھا۔ دُھواں کم ہونے لگا اور اس میں سے چار نوجوان لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور گورے رنگ کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کے لباس ریشمی اور چمکدار تھے۔ سازوں کا ترنم اور زیادہ پُرسوز اور بلند ہو گیا۔ اُن کے ساتھ گھنگھرو بج رہے تھے۔ لڑکیوں نے داؤد بن نصر کے آگے سجدہ کیا۔ داؤد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دُھواں چھٹا تو لڑکیاں غائب تھیں اور وہاں بونے سے پانچ چھ انسان کھڑے تھے۔ سر سے پاؤں تک اُن کے جسم سیاہ تھے۔ اُن کے دانت لمبے اور سر پر نئے چاند کی شکل کے سینگ تھے۔ وہ بے ہنگم سا ناچ ناچنے لگے۔ اعلان ہوا کہ یہ جنات ہیں۔ انہی کے رنگ کا ایک قوی ہیکل آدمی آیا جس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اُس نے ان بونوں کو جن کے قد تین ساڑھے تین فٹ سے زیادہ نہیں تھے، پیٹنا شروع کر دیا۔ بونوں نے ایسا واویلا بپا کیا کہ لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی۔

داؤد بن نصر کے حکم سے کوڑا زنی روک دی گئی۔ جنات نے مل کر ایک آواز میں کہا۔

"ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ اب ہم داؤد بن نصر کے مرید ہیں اور ہم جو غیب کے بھید جانتے ہیں، حلفیہ کہتے ہیں کہ داؤد بن نصر خدا کا پیغمبر اور ایلچی ہے"۔

دُھواں پھر پھیلا اور جب دُھواں چھٹا تو وہاں نہ داؤد بن نصر تھا نہ اُس کے جنات۔ چبوترہ خالی تھا۔ اعلان ہوا کہ قرامطی پیغمبر خدا کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ اب نئے چاند کی رات اسی جگہ نمودار ہوں گے۔

"یہ سب اس نیرنگ کا کمال ہے جس کے اندر میں ایک آدمی کو قتل کر آیا ہوں" — درویش اپنے ساتھیوں سے اُسی حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا جس میں وہ دن کو بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس فتنے کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اُس نے کہا۔ "جن لڑکیوں اور جنات کے متعلق تم بتا رہے ہو کہ دھوئیں میں سے نمودار ہوئے تھے، اُن لڑکیوں کو میں نے ایک بند کمرے کے دروازے کی درز میں سے دیکھا تھا۔ نیرنگ تازہ کھدی ہوئی ہے۔ میں آخر تک نہ جا سکا۔ یہ باہر والے چبوترے کے

قریب جا نکلتی ہے۔ دھواں سرنگ میں سے چھوڑا جاتا ہوگا اور لڑکیاں سرنگ میں یا چبوترے پر جاتی اور واپس آتی ہوں گی۔"

"ہمیں پہلے ہی شک تھا کہ بدروحوں اور جنات کا کم از کم اس حویلی میں کوئی وجود نہیں"۔۔۔ عالم نے کہا۔۔۔ "اب آپ اتفاق سے دیکھ آئے ہیں کہ یہ سرنگ اور دھوئیں کا کمال ہے اور سیدھے سادے لوگوں کو قرامطی فرقے میں شامل کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ لوگ اس باطل فرقے میں شامل ہو رہے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ اس فرقے کو ختم کس طرح کیا جائے اور لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ یہ ڈھونگ ہے۔"

وہ اسی سوچ بچار میں الجھے ہوئے تھے کہ حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ حویلی کا مالک باہر گیا۔ باقی تمام آدمی وہاں سے بھاگ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ خطرے کی صورت میں حویلی کے مالک کو دروازہ کھولتے ہی کھانسنا تھا۔ اس کی کھانسی کی بجائے اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کمرے میں آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جسے یہ سب جانتے تھے۔ وہ بھی انہی کے گروہ کا جانباز تھا۔

"اگر یہ خبر صحیح ہے جو میں سن کر آیا ہوں تو خدا نے قرامطی فرقے کے خاتمے کا انتظام کر دیا ہے"۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔۔۔ "بھیرہ سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ بھیرہ کی ریاست پر سلطان محمود نے قبضہ کر لیا ہے، اور بھیرہ کے راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین دن تک اتنی خونریز لڑائی ہوئی ہے کہ نہ غزنی کی فوج کا کچھ بچا ہے، نہ بھیرہ کی فوج کا۔ غزنی کے سلطان محمود نے حکم دیا ہے کہ بھیرہ میں سے وہاں کا کوئی باشندہ کہیں باہر نہیں جا سکتا۔ یہ معلوم نہیں کہ محمود ملتان پر بھی حملہ کرے گا یا نہیں۔ اس وقت اس کی فوج بہت کم ہے۔ کمک آتے بہت وقت لگے گا۔"

سب گہری سوچ میں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد عالم نے کہا۔۔۔ "ہم بادشاہی سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم یہی کر سکتے ہیں جو ہمارے درویش دوست نے کیا ہے کہ قرامطیوں کے اندرونی حلقے کے آدمیوں کو ایسے طریقے سے قتل کرتے رہیں کہ کوئی ہمارا سراغ نہ پا سکے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو چار جانباز تیار کیے جائیں جو داؤد بن نصر کو قتل کر دیں۔ اگر یہ شخص قتل

ہو جائے تو یہ فرقہ مر سکتا ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم دو چار آدمی بھیرہ چلیں اور اگر سلطان محمود واقعی وہاں آ گیا ہے تو اس کے حضور عرض کریں کہ اگر تم یہاں اسلام کے فروغ کے لیے آئے ہو تو پہلے ملتان آؤ اور اس فرقے کو ختم کرو جو اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔"

سب اس تجویز پر متفق ہو گئے اور انہوں نے طے کیا کہ عالم اور درویش دو آدمیوں کو ساتھ لے کر صبح بھیرہ کے لیے روانہ ہو جائیں۔

جس وقت ان لوگوں کو وہ آدمی بھیرہ میں سلطان محمود کی آمد اور لڑائی کی خبر سنا رہا تھا، اس وقت داؤد بن نصر کو بھی یہی خبر سنائی جا رہی تھی۔ اس وقت وہ اپنے ان آدمیوں کو جو چار کنواریوں کی حویلی میں کام اور شعبدہ بازی کرتے تھے، اپنے سامنے کھڑا کیے ہوئے تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ شراب کا نشہ بھی اتر گیا تھا۔ وہ ان سے ایک ہی سوال کا جواب مانگ رہا تھا۔۔۔ "اس آدمی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

اسے بتایا جا رہا تھا کہ ایک آدمی سرنگ والے کمرے میں سے دوڑتا باہر نکلا۔ وہ ان چار یا پانچ آدمیوں کے ساتھ ٹکرایا جو سرنگ میں سے مقتول کی پکار پر دوڑے آئے تھے۔ اس آدمی نے انہیں کہا۔۔۔ "پیچھے جاؤ، دوڑ کر پہنچو، میں آتا ہوں"۔۔۔ اس آدمی کی داڑھی تھی۔ چہرہ کسی کو یاد نہیں تھا۔ داؤد بن نصر ان کی یہ بات مان نہیں رہا تھا۔ کہتا تھا کہ تم میں سے کسی نے کسی لڑکی کے چکر میں آ کر اپنے ساتھی کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سب آدمی اس کے پاؤں میں لیٹ لیٹ جاتے تھے، اور داؤد گرج رہا تھا۔

اس دوران اس کے سالار نے اندر آ کر کہا کہ بھیرہ سے بڑی بری خبر آئی ہے۔ ایک آدمی کو اندر لایا گیا۔ وہ بھیرہ سے آیا تھا۔ اس نے داؤد بن نصر کو وہی خبر سنائی جو حویلی میں ایک آدمی عالم، درویش اور ان کے ساتھیوں کو سنا رہا تھا۔

"ان سب کو قید میں ڈال دو"۔۔۔ داؤد بن نصر نے حکم دیا۔۔۔ "انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دو۔ پھر بھی کچھ نہ بتائیں تو انہیں شکنجے میں ڈال دو۔"

انہیں لے گئے تو داؤد بن نصر نے اپنے سالار سے کہا۔۔۔ "اگر محمود بھیرہ پر قابض ہو

گیا ہے۔ تو بہت بُرا ہُوا ہے۔ صبح فوج کے کچھ آدمی تاجروں کے بھیس میں بھیرہ روانہ کردو۔ وہ اچھی طرح دیکھ کر آئیں کہ محمود کے پاس کتنی فوج ہے۔ اگر اُس کے پاس ملتان پر حملہ کرنے کے لیے فوج کم ہے تو ہم مہاراجہ آنند پال کو پیغام بھیجیں گے کہ بھیرہ پر حملہ کر دے۔"

صبح کے وقت چھوٹے چھوٹے دو قافلے ملتان سے نکلے۔ دونوں کا رُخ بھیرہ کی طرف تھا۔ ایک قافلے میں عالم، درویش اور ان کے ساتھ تین آدمی تھے۔ دوسرے قافلے میں ملتان کی فوج کے چھ آدمی تاجروں کے بھیس میں تھے۔ ان کے کمانڈر نے دوسرے قافلے کو دیکھا تو بولا۔ "وہ لوگ بھی اُدھر ہی جا رہے ہیں، چلو ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔"

حق جب باطل کے نرغے میں آیا

داؤد بن نصر نے اپنے سالار کو حکم دے کر فوج کے جو چھ آدمی ملتان سے بھیرہ یہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کیے تھے کہ یہ اطلاع لائیں کہ سلطان محمود غزنوی کے پاس کتنی فوج ہے، اور کیا وہ فوری طور پر ملتان پر حملہ کرنے کے قابل ہے یا نہیں، وہ چھ آدمی معمولی قسم کے فوجی نہیں تھے۔ وہ سب کمانداری کے عہدے کے ذہین اور تجربہ کار فوجی تھے۔ جاسوسی اور سراغرسانی کی مہارت بھی رکھتے تھے۔ بھیرہ سے مطلوبہ اطلاع وہی لا سکتے تھے۔ وہ تھے تو مسلمان لیکن عقیدے کے کٹر قرامطی تھے۔

انہوں نے تاجروں کے بھیس میں بھیرہ کو جاتے ہوئے ملتان سے کچھ دُور عالم، درویش اور ان کے تین ساتھیوں کو اُسی سمت جاتے دیکھا جدھر وہ خود جا رہے تھے تو وہ اُن سے جا ملے تاکہ دونوں قافلوں کا ایک قافلہ بن جائے اور ہو سکتا ہے ان لوگوں سے کام کی کوئی خبر مل جائے۔ ملتان کے ان فوجیوں کے پاس چھ گھوڑے تھے جن پر وہ سوار تھے اور تین اونٹ تھے جن پر سامان لدا ہُوا تھا۔ عالم اور درویش کے پاس گھوڑے تھے اور ان کے تین ساتھی تین اونٹوں پر سوار تھے۔ یہ کٹر اہلِ سنت مسلمان تھے جو بھیرہ سلطان محمود غزنوی سے کہنے جا رہے تھے کہ وہ ملتان کو مسلمان ریاست نہ سمجھے اور فوراً حملہ کرے کیونکہ یہاں قرامطی فرقہ اسلام کا چہرہ مسخ کر رہا تھا۔

دونوں قافلوں میں سلام و دعا ہوئی لیکن اپنے اپنے تعارف میں دونوں محتاط تھے۔ عالم نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق بتایا کہ ملتان کے دکاندار ہیں اور بھیرہ کچھ سامان لے جا رہے ہیں۔ اس کے بدلے وہ وہاں سے سامان لائیں گے۔ قرامطیوں نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ لاہور کے تاجر ہیں، ملتان آئے تھے اور بھیرہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے

''ہم جلد جائیں گے۔

"اگر آپ لوگ ملتان کے رہنے والے ہیں تو آپ قرامطی مسلمان ہوں گے"۔۔۔ ایک قرامطی فوجی نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ درویش نے جواب دیا۔ "ہم پکے مسلمان ہیں۔ قرامطی فرقے کو ہم مسلمان نہیں سمجھتے ...... آپ لوگ یقیناً سنی مسلمان ہوں گے۔ قرامطی صرف ملتان میں ہیں"۔

"ہمارا اس فرقے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔۔۔ قرامطی فوجیوں کے کمانڈر نے جھوٹ بولا۔۔۔ "ہم آپ کی طرح سنی مسلمان ہیں ... کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے بھیرہ پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے؟"۔۔۔ ان فوجیوں کو سب کچھ معلوم تھا۔

"سنا تو یہی ہے"۔۔۔ عالم نے کہا۔ "اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم اور آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ محمد بن قاسم کے بعد کسی مسلمان سلطان نے ہندوستان کا رخ کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں کس تیزی سے ہندو مذہب اسلام پر غالب آ رہا ہے"۔

"ہم بہت خوش ہیں"۔۔۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "ہم کو چاہتے ہیں کہ لاہور پر بھی سلطان محمود قبضہ کرے۔ اس ملک کو اسلامی ملک بننا چاہیئے"۔

"لاہور سے پہلے سلطان محمود ملتان پر قبضہ کرے تو زیادہ بہتر ہو گا"۔۔۔ درویش نے کہا۔ "سب سے زیادہ خطرناک فتنہ وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر سے اٹھتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر عیسائیوں اور ہندوؤں کا آلۂ کار ہے، اور وہ اسلام کا نقاب چڑھا کر اسلام کی بیخ کنی کر رہا ہے"۔

"معلوم نہیں سلطان محمود کو داؤد بن نصر کی اصلیت کا علم ہے یا نہیں"۔۔۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "سلطان دھوکے میں نہ ہو"۔

"سلطان کو حقیقت کا علم ہونا چاہیئے"۔۔۔ عالم نے کہا۔

"کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اتفاق سے بھیرہ جا رہے ہیں، ہم سلطان محمود کو بتائیں کہ وہ داؤد بن نصر کو اپنا دوست نہ سمجھے؟"۔۔۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔

"کیوں نہیں!"۔۔۔ درویش نے کہا۔ "ہمیں یہ فرض ادا کرنا چاہیئے"۔

وہ چلے جا رہے تھے۔ عالم اور درویش یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ وہ سلطان محمود کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ قرامطیوں کو ان پر ایسا شک بھی نہیں تھا۔ قرامطی زیادہ ذہین اور چالاک تھے۔ وہ بھی اپنی اصلیت بے نقاب نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے عالم اور درویش کے ساتھ ایسی باتیں شروع کر دی تھیں جو عالم اور اس کے ساتھیوں کا ایمان تھا۔ وہ ان قرامطیوں کو فی الواقع تاجر اور اپنا ہم خیال سمجھ بیٹھے۔ وہ تمام راہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے انہوں نے دریائے راوی پار کر لیا۔ یہ مقام ملتان سے بہت دور تھا جہاں دریا کا پاٹ چوڑا اور پانی کم گہرا تھا۔ پار جا کر انہوں نے پڑاؤ کیا۔ دونوں قافلوں کے پاس کھانے کے لیے جو کچھ تھا، وہ انہوں نے سامنے رکھ دیا۔ قرامطی کمانڈر گھوڑے کی زین اتار رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ساتھی تھا۔ کمانڈر نے ساتھی سے کہا۔۔۔ "یہ لوگ گتے تو دو کا نمازی ہیں لیکن ان کی بعض باتوں سے مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ ہمارے خلاف کوئی فتنہ پیدا کرنے بھیرہ جا رہے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے دلوں پر پوری طرح قبضہ کر لیں۔ یہ دو آدمی جو ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے ہیں علم و فضل والے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ ہمارے خلاف یعنی ملتان کی قرامطی ریاست کے خلاف کوئی کارروائی کرنے نہیں جا رہے تو بھی ہمیں چاہیئے کہ انہیں اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ دو آدمی عالم ہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر بھیرہ کے لوگ ہمارا بھی احترام کریں گے"۔

"پھر آج رات ہم شراب نہیں نکالیں گے"۔۔۔ قرامطی کمانڈر کے ساتھی نے کہا۔۔۔ "تاکہ یہ لوگ ہمیں مومن قسم کے مسلمان سمجھتے رہیں۔ یہ بوڑھا عالم بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ اسے ہم اکسائیں گے کہ سلطان محمود سے ملے۔ ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ چلا جائے گا۔ سلطان کی نیت اور ارادے کا علم ہو جائے گا"۔

کھانے کے دوران قرامطی کمانڈر نے اسی موضوع کو جاری رکھا جس پر وہ سارا دن تبادلۂ خیالات کرتے آئے تھے۔ عالم اور درویش تربیت یافتہ جاسوس نہیں تھے۔ یہ تو ان کا جذبہ تھا جو انہیں اسلام کی پاسبانی کے لیے اکساتا رہتا تھا۔ وہ قرامطیوں کو اپنی طرح

اسلام اور سلطان محمود کے بہی خواہ سمجھ بیٹھے۔ بات سے بات نکلی تو قرامطی فرقے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"ہم اس فرقے کو جھوٹا مانتے ہیں" — قرامطی کمانڈر نے کہا — "لیکن ملتان میں رہ کر ہم جیسے بھی ملے وہ داؤد بن نصر کا پیروکار نکلا۔ وہاں چار کنواریوں کی حویلی کے چرچے سے تو کل رات ہم بھی لوگوں کے ساتھ اُس حویلی میں چلے گئے۔ ہم نے جنات کو دیکھا جنہیں داؤد نے حاضر کیا تھا، پھر ہم نے چار کنواریوں کو بھی دھوئیں میں سے نمودار ہوتے اور دھوئیں میں ہی غائب ہوتے دیکھا۔ ہم تو اسے معجزہ سمجھتے ہیں۔ داؤد کے ہاتھ میں کوئی طاقت ضرور ہے۔"

"جہاں سے یہ جنات اور چار کنواریاں نکلی تھیں، وہاں سے آپ نے ایک لاش نکلتی نہیں دیکھی؟" — درویش نے قرامطیوں کی باتوں سے متاثر ہو کر راز اگل دیا۔

"لاش؟" — قرامطی کمانڈر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس کی لاش؟"

"داؤد کے ایک خاص آدمی کی لاش" — درویش نے کہا — "دھوئیں میں سے نمودار ہونے والے جنات اور چار کنواریوں کی اصل حقیقت کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔"

"خدا کے لیے ہمیں بتاؤ یہ راز کیا ہے؟" — قرامطی کمانڈر نے اشتیاق اور حیرت سے پوچھا۔ "ہم میں سے کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک باطل فرقے کے کسی آدمی میں اتنی طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ جنات اور ارواح کو حاضر کر سکے۔ ہم تو داؤد کا یہ کمال دیکھ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے تھے۔ ہمارے دلوں کو شکوک سے پاک کرو۔ یہ آپ کی نیکی ہوگی۔"

درویش نے من و عن سنا دیا کہ وہ کس طرح حویلی کے اندر اُس سرنگ میں داخل ہو گیا تھا جس میں سے چار لڑکیاں گزر کر دھوئیں میں جاتی اور لوگ انہیں دھوئیں میں سے نمودار ہوتا دیکھتے تھے۔ درویش نے بتایا کہ اُس نے یہ لڑکیاں ایک کمرے میں دیکھی تھیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح سرنگ میں ایک آدمی کو دیکھا۔ اُس سے بچنے کے لیے درویش نے اُسے قتل کر دیا اور سرنگ سے نکل آیا۔

قرامطی کمانڈر اور اُس کے ساتھیوں نے درویش کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان قرامطیوں کو معلوم تھا کہ داؤد بن نصر اُس آدمی کے قاتل کو ڈھونڈ رہا ہے اور

اُس نے حویلی میں کام کرنے والے آدمیوں کو قید خانے کی اذیتوں میں ڈال رکھا ہے۔

کچھ دیر اور باتیں کر کے وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ قرامطی کمانڈر اب درویش میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ سونے کی جگہیں دیکھنے لگے تو قرامطی کمانڈر نے درویش سے کہا کہ وہ اُس کے قریب سوئے۔ وہ عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ اُس نے سب سے الگ ایک جگہ دیکھی اور وہاں اپنا اور درویش کا بستر بچھا لیا۔ دن بھر کی مسافت کے تھکے ہوئے لیٹتے ہی سب سو گئے۔

آدھی رات کے قریب درویش کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے بولنا چاہا مگر بول نہ سکا۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ دو آدمی اس کے پاؤں رسیوں سے جکڑ رہے تھے۔ وہ اٹھا تو دو آدمیوں نے اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ اُسے اُٹھا کر ایک اونٹ پر ڈال دیا گیا اور اُسے اونٹ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اونٹ اٹھا۔ اس کی مہار ایک گھوڑے کے پیچھے باندھ دی گئی۔ گھوڑا چل پڑا۔ اس کے ساتھ ایک اور گھوڑا چلا۔

درویش کے ساتھی اُس سے دُور گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اونٹ اور دو گھوڑ سوار واپس ملتان کو چلے جا رہے تھے۔ قرامطیوں کو اپنے خاص آدمی کا قاتل مل گیا تھا۔ انہیں داؤد سے انعام کی توقع تھی۔

صبح سب سے پہلے عالم کی آنکھ کھلی۔ اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ درویش کو جگانے گیا تو اُس کا بستر خالی تھا۔ قرامطی جاگ اٹھا۔ عالم کا خیال تھا کہ درویش وضو کرنے دریا پر چلا گیا ہوگا۔ قرامطی کمانڈر گھوڑوں اور اونٹوں کی طرف گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد قرامطیوں نے واویلا بپا کر دیا کہ ان کا ایک اونٹ اور دو گھوڑے اور ان کے دو ساتھی غائب ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا قیمتی سامان بھی چوری ہو گیا ہے۔

"چلو.... اِدھر اُدھر دیکھو.... وہ دور نہیں گئے ہوں گے" — گھوڑوں پر زینیں ڈالی جانے لگیں۔ اونٹوں پر سامان رکھا جانے لگا۔ تب عالم نے کہا — "ہمارا درویش ساتھی بھی غیر حاضر ہے۔"

"یہ اُسی کی کارستانی ہے" — قرامطی کمانڈر نے کہا — "اُس نے بڑی دلیری سے سرنگ کے

اندر جا کر ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ میں اسے درویش سمجھتا رہا لیکن وہ پیشہ ور ڈاکو اور قاتل ہے۔ وہ ہمارے آدمیوں کو ورغلا کر لے گیا ہے۔"

"ان کا تعاقب بیکار ہے"۔۔۔ ایک قرامطی نے کہا "معلوم نہیں وہ کس طرف گئے ہیں اور یہاں سے کس وقت بھاگے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو"۔ قرامطی کمانڈر نے کہا۔ "ہمیں اس بیابان میں مارے مارے نہیں پھرنا چاہیے۔ اب وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئیں گے۔"

عالم چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ تین آدمی بھی حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ درویش کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں درویش اور مردِ مومن تھا۔ اُس کی فطرت میں یہ تھا ہی نہیں کہ قیمتی مال کے لالچ میں آ جاتا۔ اُس کی جوانی اسلام کی پاسبانی اور زمین دوز جہاد میں گزر گئی تھی۔ جب سے اُس نے سنا تھا کہ سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں آ گیا ہے، اُس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ ہماری منزل خود چل کر ہمارے پاس آ گئی ہے۔

"مجھے تم لوگ بھی رہزن لگتے ہو"۔ قرامطی کمانڈر نے عالم سے کہا۔

"اگر ہم رہزن ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں نہ ہوتا"۔ عالم نے کہا۔ "اور یہاں تمہاری لاشیں پڑی ہوئی ہوتیں۔"

"پھر یہ سب کیا ہے؟"

"آدمی تمہارے غائب ہوئے ہیں"۔ عالم نے کہا۔ "اگر تم لوگ میری بات پر غور کرو تو میں بتاتا ہوں... تمہارے آدمی جو لاپتہ ہوئے ہیں، وہ رات سامان چرائے جانے کے لیے باندھ رہے ہوں گے۔ درویش نے انہیں دیکھ لیا ہوگا اور ان کے پاس جا کر پوچھا ہوگا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ تمہارے آدمیوں نے اس ڈر سے کہ پکڑے جائیں گے، درویش کو سر پر چوٹ لگا کر یا کسی طرح بے ہوش کیا اور اُسے اونٹ یا گھوڑے پر ڈال کر ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔ وہ ان کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوگا اور اس کی لاش دریا میں بہا دی گئی ہوگی۔"

قرامطیوں کو تو معلوم تھا کہ اُن کے دو ساتھی اور درویش کہاں گئے ہیں۔ عالم اور اس

کے ساتھی پریشان ہو رہے تھے۔ قرامطی اب یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ درویش کے یہ چار ساتھی بھی اس کی زمین دوز سرگرمیوں میں شریک ہیں؟ قرامطی کمانڈر نے بہتر سمجھا کہ عالم اور اس کے ساتھیوں کو ناراض نہ کیا جائے ورنہ ان سے کوئی راز نہیں لیا جا سکے گا۔

دونوں قافلے پہلے کی طرح بھیرہ کی سمت اکٹھے چلے جا رہے تھے۔ قرامطی آگے اور عالم اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیچھے تھا۔

"مجھے یہ لوگ مشکوک نظر آتے ہیں"۔ عالم نے اپنے ساتھیوں سے دھیمی آواز میں کہا۔۔۔ "میں صبح سے انہیں بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تاجر معلوم نہیں ہوتے۔ ان کی باتوں کا انداز اور چال ڈھال بتاتی ہے کہ یہ اور کچھ ہو سکتے ہیں، تاجر نہیں ہو سکتے۔ درویش کو انہوں نے خود غائب کیا ہے۔ درویش نے جذبات میں آ کر انہیں بتا دیا تھا کہ اُس نے سرنگ میں داؤد بن نصر کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے درویش کو اغوا کر کے ملتان بھیج دیا ہے۔ مجھے تو یہ جاسوس لگتے ہیں جو بھیرہ یہ دیکھنے جا رہے ہوں گے کہ سلطان محمود کی فوج کتنی ہے اور اس کا ارادہ کیا ہے۔"

"ہمیں محتاط رہنا چاہیے"۔ عالم کے ایک جوان سال ساتھی نے کہا۔ "ہمیں یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ درویش کے ساتھ ہمارا کوئی گہرا تعلق نہیں۔"

"اگر یہ واقعی جاسوس ہیں تو میں انہیں بھیرہ میں پکڑوا دوں گا"۔ عالم نے کہا۔ "ہمیں ان کے ساتھ دوستی اور زیادہ گہری کرنی چاہیے۔"

"یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ یہ سب قرامطی فرقے اور ہمارے حاکم اور پیر و مرشد داؤد بن نصر کے دشمن ہیں"۔ قرامطی کمانڈر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ "اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کی در پردہ سرگرمیاں کیا ہیں۔ انہیں ہم دوست بنائے رکھتے ہیں۔"

سورج جب سر پر آ گیا تو قرامطی کمانڈر نے جانوروں کو پانی اور چارے کے لیے اور خود بھی کھانا کھانے اور ذرا آرام کے لیے قافلے کو روک لیا۔ کھانے کے دوران قرامطی کمانڈر نے عالم سے پوچھا کہ وہ درویش کو کب سے جانتے ہیں۔ عالم نے بتایا کہ وہ اُسے اتنا ہی جانتے

ہیں کہ ملتان میں اس کی بکار ہے۔ اُسے پتہ چلا کہ ہم بھیرہ جا رہے ہیں تو وہ ساتھ چل پڑا۔

"کیا آپ لوگوں کو معلوم تھا کہ اس نے حویلی میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے؟"

"اگر پتہ ہوتا تو ہم اسے ساتھ نہ لاتے"۔ عالم نے جواب دیا۔ "اگر اس نے یہ قتل مذہبی جنون کے تحت کیا تھا تو بھی میں اسے پسند نہیں کرتا۔ قتل بہر حال قتل ہے۔ مذہب قتل جیسا جرم بخشا نہیں کرتا۔"

قراسطی کمانڈر نے بہت کوشش کی کہ عالم کے سینے سے کوئی راز نکال سکے۔ اُسے کوئی راز نہ ملا۔ قراسطی کمانڈر اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ قراسطی نہیں پکا مسلمان ہے۔

راجوں، مہاراجوں اور سلطانوں کی دنیا سے دور جنگل بیابان میں یہ دو قافلے ایک قافلے کی صورت میں چلے جا رہے تھے۔ وہ حق و باطل کے میدان جنگ سے بہت دور تھے لیکن اس جنگ سے لاتعلق نہیں تھے۔ دونوں قافلے بظاہر اکٹھے جا رہے تھے لیکن ان کے درمیان درپردہ حق و باطل کی جنگ جاری تھی۔ دونوں اپنے اپنے عقیدے اور نظریے کے پکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کی سوچ رہے تھے۔ عالم کو یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کے قافلے والے تاجر نہیں اور یہ قراسطی ہیں۔ عالم کے تین ساتھی جوان سال آدمی تھے اور قراسطی بھی چار تھے۔ عالم سوچ رہا تھا کہ یہ تربیت یافتہ فوجی ہوئے تو ان سے لڑائی ہو جانے کی صورت میں اُس کے تین ساتھی مقابلہ کر سکیں گے یا نہیں۔ عالم خود بوڑھا تھا۔

عالم کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ اُس کے سینے میں اللہ کا ایمان تھا۔ کسی انسان کا ڈر اور خوف نہیں تھا۔ وہ اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ اس کے ساتھ بھیرہ پہنچ جائیں تو انہیں پکڑوا دے گا۔ درویش کے متعلق وہ بہت پریشان تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ درویش کو اگر واقعی ملتان بھیج دیا گیا ہے تو اُسے بڑی اذیتیں دی جائیں گی۔ درویش کب تک برداشت کرے گا۔ وہ سب کی نشاندہی کر دے گا۔ ان سب کے بیوی بچے اور عزیز و اقارب ملتان میں تھے۔ نشاندہی ہو جانے کی صورت میں وہ جانتے

تھے کہ ان کے بچوں کو بھی غیر انسانی اذیتیں دی جائیں گی۔

اسلام کی پاسبانی ان سے بہت بڑی قربانی مانگ رہی تھی۔ عالم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "عزیز بیٹو! ہم جس راستے پر جا رہے ہیں، اس میں ایسے خطرے ہیں جن سے گھبرا کر تم بھاگ جاؤ گے۔ لیکن یاد رکھو کہ جس قوم اور جس مذہب میں بھاگ جانے والے وجود ہوں وہ قوم اپنے مذہب سمیت تاریخ کے اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں اپنی بہنیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی قربان کرنے پڑیں۔ اگر تم نے یہ قربانی خندہ پیشانی سے دے دی تو خدا کی خوشنودی حاصل کر لو گے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اگر تمہارے دلوں میں کوئی شک ہے تو یہیں سے واپس چلے جاؤ۔"

ان میں سے کوئی بھی واپس نہ گیا۔ تینوں نے یقین دلایا کہ وہ اُس کے ساتھ رہیں گے۔ عالم کے پاس علم تھا۔ اس کی نظر قوموں کی تاریخ پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قوموں کے عروج اور بادشاہوں کی فتح کے پیچھے چند ایک گمنام لوگوں کی قربانیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ تاریخ ان لوگوں کو نہیں جانتی کیونکہ تاریخ میدان جنگ میں نہیں جاتی اور تاریخ نہیں وزنہ محاذ پر بھی نہیں جایا کرتی۔ ان مجاہدین کو خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ عالم بھی خدا کے سامنے جوابدہ تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ قراسطی کمانڈر رات کے پڑاؤ کے لیے اچھی سی جگہ دیکھ رہا تھا۔ یہ علاقہ سرسبز تھا۔ چٹانیں تھیں۔ درختوں کا جنگل اور سبزہ تھا۔ ایک جگہ ایک خاندان بیٹھا نظر آیا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا اور دو جوان لڑکیاں تھیں جو بہت خوبصورت تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان کے لباس بتاتے تھے کہ یہ ہندو ہیں۔ لڑکیاں شہزادیاں لگتی تھیں۔ وہاں دو مشعلیں جل رہی تھیں۔

قراسطی کمانڈر نے عالم سے کہا۔ "آپ آگے چلیں۔ کوئی اچھی جگہ نظر آئی تو ہمیں بلا لینا۔ میں بھی کوئی جگہ دیکھتا ہوں۔"

عالم اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے نکل گیا۔ اُسے ایک بڑی سرسبز جگہ نظر آئی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چارہ بھی تھا اور پانی بھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں

ڈیرے ڈال دیں۔ قزاملی کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ عالم نے ان کی پروا نہ کی۔ اسے خیال تھا کہ وہ خود ہی آجائیں گے۔

رات گہری ہوگئی۔ قزاملی نہ آئے۔ عالم نے ایک مشعل جلا کر اس کا ڈنڈہ زمین میں گاڑ دیا۔ اُسے تھوڑی ہی دُور شور شرابہ سنائی دیا اور دوڑتے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ عالم اور اس کے ساتھیوں نے تلواریں نکال لیں۔ مشعل کی روشنی میں عالم کو دو بوڑھا اور ایک جوان آدمی اپنی طرف آتے نظر آئے جنہیں انہوں نے تھوڑی دور پیچھے ایک جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت اور دو خوبصورت لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اب ان کے ساتھ نہیں تھیں۔

عالم اور اس کے ساتھی تلواریں ہاتھوں میں لیے ان کی طرف بڑھے تو وہ آدمی دوسری سمت دوڑ پڑے۔ عالم نے انہیں للکار کر کہا۔ "مت بھاگو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ نہیں رکو گے تو گھوڑوں سے تمہارا تعاقب کریں گے اور تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔"

وہ ڈر کے مارے رُک گئے۔ جب عالم اور اس کے ساتھی ان کے قریب گئے تو انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے اور التجا کی کہ ان کی جان بخشی کی جائے۔ عالم نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ وہ بتائیں کہ وہ کیوں بھاگے جا رہے ہیں۔

"تمہارے ساتھیوں نے ہم سے دونوں لڑکیاں چھین لی ہیں۔" بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے پاس سونے کی ڈلیاں اور بہت سی رقم تھی۔ انہوں نے وہ بھی چھین لی ہے۔"

"لڑکیاں تمہاری کیا لگتی ہیں؟"

"میری بیٹیاں ہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اور یہ میرا بیٹا ہے۔ ان کی ماں بھی ساتھ ہے۔ ہم بھیرہ سے بھاگ کر آرہے ہیں۔ شہر پر غزنی کے مسلمانوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہم ہندو ہیں۔"

"کیا غزنی کے مسلمانوں نے تمہارے گھر لوٹے ہیں؟ قتل عام کیا ہے؟ تمہاری عورتوں کو بے آبرو کر رہے ہیں؟"

"نہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "ان کے سلطان نے حکم دیا ہے کہ ہندوؤں

کے گھروں کی اور ان کی عزت کی حفاظت کرو۔ لیکن آپ نے ہمارے قریب سے گزرتے میری بیٹیاں دیکھی ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ انہیں مسلمان فوجیوں سے بچانے کے لیے ہم بھیرہ سے بھاگ آئے ہیں۔ اب پتہ چلا ہے کہ بھیرہ میں رہتے تو ہماری عزت محفوظ رہتی۔ آپ کے ساتھیوں سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ آپ بزرگ انسان ہیں۔ وہ چار آدمی ہیں یہ تین آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ میری بیٹیوں پر رحم کریں۔ وہ مر جائیں گی۔ ہمارے پاس جو سونا اور رقم ہے وہ لے لیں ہمیں جانے دیں۔ میری بیٹیوں کو چھوڑ دیں۔"

عالم کو یقین ہوگیا کہ اُس کے ساتھ آنے والے چھ سوار ملتان کے فوجی ہیں اور وہ قزاملی ہیں۔ ان میں سے دو تو درویش کو ساتھ لے کر جا چکے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر قزاملیوں کی نیت بدل گئی اور ان کے سامنے ان کے فرقے کا یہ اصول آگیا کہ انسان عیش و عشرت کے لیے پیدا ہوا ہے اور گناہ کا کوئی وجود نہیں۔

"کیا تم دونوں خالی ہاتھ ہو؟" عالم نے ہندوؤں سے پوچھا۔

"ہماری تلواریں سامان کے ساتھ پڑی تھیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "تمہارے ساتھی ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہمیں تلواریں اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ ہم ان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا کہ ہمیں قتل نہ کرو۔ انہوں نے ہمیں بہت مارا پیٹا اور بھگا دیا۔ ہم واپس بھیرہ کو بھاگے جا رہے تھے۔"

عالم نے اپنے تین جواں سال ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں ان ہندوؤں پر ثابت کرنا ہے کہ بیٹی اپنے مذہب کی ہو یا کسی کے مذہب کی، اس کی عزت بچانا مسلمان کا فرض ہے.... اور میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ ہمارے سامنے دو لڑکیوں کی آبروریزی ہو رہی ہے۔ ہمیں عملاً ثابت کرنا ہے کہ اس صورت حال میں اسلام کا حکم کیا ہے.... میں تم تینوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ تم ان لڑکیوں کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

عالم چل پڑا۔ اُس نے اپنے تین ساتھیوں سے کہا کہ جذبات میں آکر جلد بازی

نہ کریں۔ پہلے دیکھیں گے کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ تربیت یافتہ فوجی معلوم ہوتے تھے۔ ... وہ دبے پاؤں بڑھتے گئے۔ وہ جگہ کچھ دور تھی۔ آگے چٹان آ گئی۔ یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ چٹان سے گھوم کر عالم نے اوٹ سے دیکھا۔ دو مشعلیں جل رہی تھیں جو انہوں نے طرز بنا کر رکھا تھا۔ وہ گھاس پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پیالے تھے۔ دونوں لڑکیاں بالکل برہنہ تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں صراحیاں تھیں۔ یہ صراحیاں اور شراب قرامطی اپنے ساتھ لائے تھے۔

لڑکیاں ان کے پیالوں میں شراب ڈالتی تھیں۔ کبھی ایک قرامطی ایک لڑکی کو اپنے اوپر گرا لیتا کبھی دوسرا۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ انتہائی بیہودہ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ عالم اور اس کے ساتھی اوٹ سے دیکھتے رہے۔ قرامطی ہنسی مذاق اور چھیڑ خانی میں زیادہ بڑھ گئے تھے۔ قرامطی کمانڈر اٹھا اور اس نے کپڑے اتار دیئے۔ وہ اتنی زیادہ پیئے ہوئے تھا کہ پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک لڑکی کو بازوؤں میں لیا اور اسے گھاس پر گرا دیا۔

"ٹوٹ پڑو" — عالم نے کہا۔

عالم کے ساتھی اتنی تیزی سے جھپٹے کہ قرامطیوں کو سنبھلنے کا موقعہ نہ ملا۔ شراب نے بھی انہیں مقابلے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ قرامطی کمانڈر کی گردن تو عالم کی تلوار کے ایک ہی وار سے الگ جا پڑی۔ جس لڑکی کو اس قرامطی نے نیچے گرا رکھا تھا، وہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ قرامطی کے خون نے اسے نہلا دیا۔ باقی تین کو بھی ختم کر دیا گیا۔

بے ہوش لڑکی کے اوپر پانی پھینکا گیا، تب ہوش میں آئی۔ دونوں سے کہا گیا کہ وہ کپڑے پہن لیں۔ خوفزدگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ چار وحشیوں سے بچ کر وہ دوسرے چار وحشیوں کے قبضے میں آ گئی ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انہیں پتہ چل گیا کہ یہ وحشی نہیں ہیں۔ عالم نے دونوں ہندوؤں سے کہا کہ وہ ان مرے ہوئے آدمیوں کے سامان پر قبضہ کر لیں اور اسے اپنا سامان سمجھیں۔ ان کے گھوڑے اور اونٹ بھی لے لیں اور ان سے اپنا سونا اور رقم بھی برآمد کر لیں۔

ہندوؤں نے لاشوں کی تلاشی لی تو انہیں اپنا سونا اور رقم مل گئی۔ عالم نے ان سے پوچھا کہ اتنی دولت پاس ہوتے ہوئے وہ پیدل کیوں آئے ہیں۔ کیا وہ گھوڑے یا اونٹ یا بگھیاں خرید نہیں سکتے تھے؟ ہندوؤں نے بتایا کہ بھیرہ سے کسی کو باہر نہیں آنے دے رہے تھے۔ وہ سارا کنبہ ایک ایک فرد چھپ چھپا کر باہر نکلے اور شہر سے دور آ کر اکٹھے ہوئے تھے۔

"تم ہماری حفاظت میں ہو" — عالم نے انہیں کہا — "کہو تو ہم تمہیں واپس بھیرہ لے چلتے ہیں کہو تو ملتان تک تمہیں اپنی حفاظت میں پہنچا دیتے ہیں۔"

بوڑھے ہندو نے کچھ سونا اور کچھ رقم عالم کے آگے رکھ کر کہا — "ہم خود ملتان چلے جائیں گے ہمیں گھوڑے اور اونٹ مل گئے ہیں۔ آپ یہ نذرانہ قبول کر لیں۔"

"کیا تم نے ہمیں کرائے کے قاتل سمجھ لیا ہے؟" — عالم نے غصے سے گرج کر کہا — "اٹھا لو۔ اگر ہم اس کے لالچ میں ہوتے تو تم سنتے اور کی لوگ پر یہ دولت لے سکتے تھے ... آج رات آرام کرو ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ اس لڑکی کو چشمے پر لے جاؤ اس کا جسم خون میں ڈوبا ہوا ہے۔"

ہندوؤں کو ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنے بھائی کے ساتھ چشمے پر چلی گئیں۔ عالم نے بوڑھے سے پوچھا کہ بھیرہ کے حالات کیسے ہیں۔ بوڑھے نے بتایا کہ بھیرہ کے باہر بڑی خونریز جنگ ہوئی ہے۔ راجہ بجی رائے نے خودکشی کر لی ہے اور دونوں فوجوں کا نقصان اتنا زیادہ ہوا ہے کہ آدھی آدھی لشکری ماری گئی ہے۔ بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کی فوج اتنی تھوڑی رہ گئی ہے کہ اگر کسی طرف سے بھیرہ پر حملہ ہو جائے تو سلطان محمود بھیرہ کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے گا۔

"حملہ کون کر سکتا ہے؟" — عالم نے پوچھا۔

"راجہ انند پال" — بوڑھے نے کہا — "لیکن سنا ہے کہ انند پال لاہور میں نہیں ہے۔ اس نے پشاور کے قریب ہی میں سلطان محمود کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن مسلمانوں نے دریا پار کر کے انند پال کو ایسا گھیرے میں لیا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکل

بھاگا۔ ہم نے سنا ہے کہ لاہور میں راجہ انند پال کا نوجوان بیٹا سکھ پال ہے۔ وہ شاید بھیرہ پر حملہ کر دے“۔۔۔ بوڑھے نے ذرا سا خاموش رہ کر عالم سے پوچھا ”آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟“

”ملتان سے ..... ہم ملتان کے رہنے والے ہیں“۔

”پھر آپ قرامطی مسلمان ہوں گے“۔۔۔ بوڑھے ہندو نے کہا ”آپ ہمارے دوست ہیں“۔

”ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں“۔ عالم نے کہا ”ہم قرامطی نہیں۔ تم بات کرو اور ہم سے ڈرو مت“۔

عالم نے اس ہندو کو غور سے دیکھا، پھر اُس عورت کو دیکھا جسے وہ اپنی بیوی کہہ رہا تھا۔ اتنے میں دونوں لڑکیاں نہا کر آ گئیں۔ عالم نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا۔ ان کا حسن دُھل کر نکھر آیا تھا۔ عالم نے اس جوان آدمی کو دیکھا جو اپنے آپ کو ان لڑکیوں کا بھائی کہتا تھا۔ ان سب میں ذرہ بھر مشابہت نہیں تھی۔ لڑکیاں شہزادیاں لگتی تھیں اور ان کی ماں ان کی خادمہ۔ بوڑھا اور جوان آدمی گہرے سانولے رنگ کے تھے اور لڑکیوں کے رنگ گورے تھے۔

”یہ جو چار آدمی مرے پڑے ہیں، انہوں نے تم دونوں کو بھاگ جانے کی اجازت دے دی تھی“۔ عالم نے دونوں ہندوؤں سے کہا ”ہم تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے۔ ان عورتوں کے سامنے تمہیں قتل کریں گے، پھر ان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں گے اور اس عورت کو اس جنگل بیابان میں کسی درندے کا شکار ہونے کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ ہمیں دھوکہ دینے کی نہ سوچو۔ سچ بتا دو تمہارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ یہ آدمی ان لڑکیوں کا بھائی نہیں۔ یہ عورت ان کی ماں نہیں اور تم ان کے باپ نہیں۔ ہندوؤں والی ذہنیت کو الگ رکھ دو۔ ہم نے تم پر جو احسان کیا ہے، اسے مت بھولو۔ ہم نے تمہیں مدد اور منزل تک حفاظت کی پیشکش کی ہے اور تم جھوٹ بول رہے ہو“۔

دونوں ہندو خاموشی سے سنتے رہے۔

”کیا تم نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ تم قرامطیوں کو دوست سمجھ کر ملتان جا رہے ہو؟“ عالم نے پوچھا۔

”بتایا تھا“۔۔۔ بوڑھے ہندو کے منہ سے نکل گیا۔ ”اسی لیے انہوں نے ہماری جان بخشی کر دی تھی۔ کہتے تھے تم ملتان پہنچو“۔

”اگر تم صحیح بات بتا دو گے تو بھی ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے“۔ عالم نے کہا ”ہمارا بادشاہوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہم تاجر ہیں“۔

”آپ لوگوں نے ہم پر واقعی احسان کیا ہے“۔ بوڑھے ہندو نے کہا ”آپ ہمیں قتل کر سکتے تھے مگر آپ نے ہماری مدد کی۔ آپ نے ہمارا انعام بھی قبول نہیں کیا۔ اگر آپ ہمارے منہ سے سچ سن کر خوش ہو سکتے ہیں تو مجھے خوشی ہوگی کہ میں نے آپ کو احسان کے بدلے میں کچھ دیا۔ میں ان میں سے کسی کا بھی باپ نہیں۔ یہ آدمی ان لڑکیوں کا بھائی نہیں۔ یہ عورت ان لڑکیوں کی نوکرانی ہے جو ان کے ساتھ ملتان جا رہی ہے“۔

”اور تم کسی خاص مقصد کے لیے ملتان جا رہے ہو؟“۔ عالم نے کہا ”ہم مکمل اور سچی بات سننا چاہتے ہیں“۔

”ہاں!“ ہندو نے کہا ”ہم ملتان کے والی داؤد بن نصر قرامطی کے پاس یہ پیغام لے کر جا رہے ہیں کہ محمود غزنوی کے پاس فوج کی کمی ہے اور داؤد بن نصر فوراً آ کر بھیرہ کو محاصرے میں لے لے۔ محمود بھیرہ کو نہیں بچا سکے گا۔ اس کے پاس راجہ بجی رائے کی فوج کے کم و بیش تین ہزار جنگی قیدی ہیں جنہیں وہ غلاموں کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ ان قیدیوں سے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔ اگر داؤد بن نصر بھیرہ کو محاصرے میں لے لے تو یہ ہندو جنگی قیدی شہر کے اندر باغی ہو کر مسلمان فوج کے لیے مصیبت بن جائیں گے“۔

”تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

”جس طرح تمہاری فوج کے سالار ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری فوج کے سالار ہوتے ہیں“۔ بوڑھے نے کہا ”راجہ بجی رائے کی زیادہ تر فوج ماری گئی ہے۔ باقی مسلمانوں کی قید میں ہے اور کچھ ادھر اُدھر بھاگ گئی ہے۔ چند ایک اعلیٰ عہدیدار زندہ بچ گئے ہیں

ان میں سے کچھ لاہور چلے گئے ہیں اور دو تین بھیرہ کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔ میں بجی رائے کے راج دربار کا عہدیدار ہوں۔ میں بھی شکست کے بعد مندر میں جا چھپا تھا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ کسی ہندو کو پریشان نہ کیا جائے اور کسی ہندو گھرانے میں کوئی مسلمان داخل نہ ہو۔ اس حکم کی وجہ سے ہم محفوظ ہو گئے۔۔۔۔

"مندر میں ہماری فوج کے جو اعلیٰ حکام چھپے ہوئے تھے، انہوں نے سر جوڑے اور فیصلہ کیا کہ داؤد قرامطی تک اطلاع بھجوائی جائے کہ وہ بھیرہ پر فوراً حملہ کر دے۔ ایسا ہی پیغام لاہور راجہ انندپال کے لیے بھی بھیجا گیا ہے لیکن اُدھر سے حملے کی توقع نہیں کیونکہ راجہ انندپال وہاں نہیں۔ داؤد بن نصر کو سب راجے جانتے ہیں کہ عیاش آدمی ہے۔ اس کے ساتھ ہندو راجے حسین لڑکیوں اور زر و جواہرات کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اس پر سلطانی فوجی حاکموں نے ان دو لڑکیوں کا انتظام کیا۔ یہ دونوں راج محل کی لڑکیاں ہیں۔ یہ بھی ایک ہندو گھر میں چھپی ہوئی تھیں۔ انہیں بلا کر سمجھایا گیا کہ انہیں داؤد کے ہاں تحفے کے طور پر بھیجا جا رہا ہے اور داؤد کو بھیرہ پر حملے کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان کے علاوہ یہ سونا اور رقم بھی داؤد کے لیے جا رہی ہے۔ ہمارے پاس اور بھی سونا ہے جو ان سے ہوئے آدمیوں کو نظر نہیں آیا۔۔۔ میں آپ سے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں آپ کو جو سونا اور رقم پیش کر رہا ہوں، یہ آپ لے لیں۔"

"اور میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میرے سامنے سونے اور رقم کا بار بار نام نہ لو۔"

"تم جیسے لوگ؟ ہم میں سے کسی کو ان چیزوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں"۔ عالم نے اُس کے سینے سے پوری بات اگلوانے کے لیے کہا۔ "اور جو بات تم ہمیں سنا رہے ہو، ہمیں اس کے ساتھ بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ کسی مصرف کی ہے کہ ہم نے تم سب کو اپنی پناہ میں لیا ہے تو تمہیں حفاظت سے ملتان پہنچا دیں۔۔۔ تمہارے فوجی سپاہیوں نے راجہ کے مارے جانے کے بعد اور بھیرہ پر سلطان محمود کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی شکست تسلیم نہیں کی۔"

"پنڈتوں نے اسے مذہبی مسئلہ بنا رکھا ہے۔"— اُس نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ محمود غزنوی کے پاؤں یہاں جم گئے تو سندھ دھرت ختم ہو جائیگا اور اس ملک میں ایک بار پھر اسی طرح

اسلام پھیل جائیگا جس طرح محمد بن قاسم کے دور میں پھیلا تھا۔ پنڈت ہر ہندو کے ذہن میں یہی ڈالتے ہیں کہ مسلمان کا قتل صرف جائز نہیں بلکہ ہر ہندو کا فرض ہے، اور اسلام کا خاتمہ مذہبی فریضہ ہے۔۔۔۔ آپ مسلمان ہیں۔ آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگی ہوں گی لیکن آپ نے مجھے یہ باتیں اگلنے کو کہا ہے۔ اب ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمیں قتل کر دیں، چاہیں تو جانے کی اجازت دے دیں۔"

یہ دونوں ہندو فوجی نہیں تھے۔ مذہبی جنون میں لڑکیوں اور زر و دولت کے ساتھ بھیرہ سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ راستے میں کیسے کیسے خطرے ہیں۔ اگر تربیت یافتہ فوجی ہوتے تو آسانی سے ڈر کے اپنا قیمتی راز دے دیتے۔ عالم نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ بے خوف ہو کر سو جائیں۔ عالم کے آدمی پہرہ دیتے رہیں گے۔

ایک آدمی کو پہرے پر کھڑا کر کے عالم اپنے دو ساتھیوں کو پرے لے گیا اور وہ اس مسئلے پر بحث مباحثہ کرنے لگے کہ ان ہندوؤں کو ملتان جانے دیا جائے یا انہیں واپس بھیرہ لے چلیں۔ اس پر بھی انہوں نے غور کیا کہ انہیں ملتان جانے دیں اور عالم اور اس کے ساتھی فوراً بھیرہ پہنچیں اور سلطان محمود کو خبردار کر دیں اور یہ بھی اُسے بتائیں کہ مندروں اور گھروں کی تلاشی لے کر بجی رائے کے چھپے ہوئے فوجیوں کو پکڑ لیا جائے۔

گذشتہ رات دو قرامطی درویش کو باندھ کر ملتان لے گئے تھے۔ وہ اس قدر تیز گئے تھے کہ دن کے پچھلے پہر ملتان پہنچ گئے اور انہوں نے درویش کو داؤد کے سامنے لے جا کر بتایا کہ یہ ہے وہ قاتل جس نے سرنگ میں ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس نے یہ راز کس طرح منہ سے نکالا تھا اور اسے کس طرح یہاں تک لائے ہیں۔ داؤد بن نصر کو جب یہ بتایا گیا کہ اس کے ساتھ بوڑھا عالم اور تین جوان آدمی بھی تھے اور یہ سب بھیرہ جا رہے تھے تو داؤد بن نصر نے غصے سے گرج کر کہا۔ "تو انہیں بھی کیوں نہیں لائے؟"

"کماندار کا یہی حکم تھا"۔ ایک نے کہا۔ "اُس کے ساتھی ہمارے آدمیوں کے ساتھ بھیرہ جا رہے ہیں۔"

داؤد بن نصر نے حکم دیا کہ دس بارہ سوار فوراً ان کے ساتھ دوڑاؤ اور اس آدمی کے ساتھیوں کو پکڑ لاؤ۔۔۔ حکم کی تعمیل بلا تاخیر ہوئی۔ بارہ تیز رفتار سوار ان دو آدمیوں کے ساتھ

لوٹا دیئے گئے جو درویش کو لائے تھے۔ یہ فوج کے گھوڑے تھے۔ وہ حیران کن رفتار سے شہر سے نکلے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رات آدھی گزر چکی تھی۔ عالم اور اُس کے دو ساتھی سو گئے تھے۔ تیسرا آدمی بمشکل پر پہرہ دے رہا تھا۔ اُسے گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیئے۔ آواز بتاتی تھی کہ گھوڑے بہت سے ہیں۔ اُس نے عالم اور اپنے ساتھیوں کو اور ہندوؤں کو بھی جگا لیا۔ عورت اور لڑکیاں بھی جاگ اٹھیں۔ عالم نے کہا کہ سب چٹان کی اوٹ میں ہو جائیں۔

گھوڑے بہت تیز آ رہے تھے اور سیدھے ادھر ہی آ رہے تھے۔ اگلے سواروں کے پاس جلتی ہوئی مشعلیں تھیں۔ وہ اسی رفتار سے اس جگہ سے گزرنے لگے جہاں چار ڈاکوؤں کی لاشیں پڑی تھیں تو شعلوں کی روشنی میں انہیں لاشیں نظر آ گئیں۔ گھوڑے اور اونٹ قریب ہی بندھے تھے۔ سوار رک گئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انہوں نے لاشیں بھی دیکھیں اور للکارنے لگے۔ "سامنے آ جاؤ، ورنہ کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

گھوڑوں اور اونٹوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے مالک یہیں ہیں۔ کوئی جواب نہ ملا تو سوار ادھر اُدھر پھیل گئے۔ انہیں لڑکیاں نظر آ گئیں۔ وہ پکڑی گئیں تو دونوں ہندو سامنے آ گئے۔ سواروں نے انہیں بتایا کہ وہ داؤد بن نصر کے فوجی ہیں اور انہیں ملتان لے جانے آئے ہیں۔ اُن دو آدمیوں نے جو درویش کو پکڑ کر لے گئے تھے، سواروں کو بتایا کہ یہ کوئی اور ہیں ہم جنہیں پکڑنے آئے ہیں اُن کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔

"انہیں کس نے قتل کیا ہے؟" ایک سوار نے ہندوؤں سے پوچھا۔

"ہمیں معلوم نہیں"۔ بوڑھے ہندو نے جواب دیا۔ "ہم بھیرہ سے آ رہے ہیں اور داؤد بن نصر کے لیے ایک ضروری پیغام لے کے جا رہے ہیں۔ ہم یہاں پڑاؤ کے لیے رکے۔ لاشیں پہلے ہی یہاں پڑی ہوئی تھیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو"۔ سواروں کے کمانڈر نے کہا۔ "کیا پیغام لے کر جا رہے ہو؟"

"ہمیں ملتان لے چلو"۔ بوڑھے ہندو نے کہا۔ "پیغام ایسا ہے جو صرف تمہارے حاکم کو دیا جائے گا۔"

سواروں نے بستر دیکھے اور ایک سوار بولا۔ "بستر زیادہ ہیں اور ان کی تعداد کم ہے۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"ان لڑکیوں کو برہنہ کر دو"۔ کمانڈر نے حکم دیا۔ "اور اس عورت کے بھی کپڑے اتار دو۔ ان آدمیوں کو گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر گھوڑے دوڑا دو۔ ملتان پہنچنے تک ان کی صرف ہڈیاں رہ جائیں گی۔ لڑکیوں کو ذرا پرے لے جاؤ، ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔"

لڑکیوں نے چودہ سواروں کو دیکھا۔ تین چار سوار انہیں برہنہ کرنے کو بڑھے۔ لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دونوں ہندو مردوں نے عالم اور اُس کے ساتھیوں کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا۔ وہ احسان کا بدلہ چکا رہے تھے۔ جب سوار لڑکیوں کی طرف لپکے تو بھی وہ خاموش رہے۔

ایک طرف سے آواز آئی۔ "لڑکیوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ ہمیں پکڑ لو۔ ان چاروں کے قاتل ہم ہیں۔"

یہ عالم کی آواز تھی۔ وہ سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ اُس کے تین ساتھی تھے۔ اُس نے کہا۔ "ان لڑکیوں کو پریشان نہ کرنا۔ ہمیں اپنے حاکم کے پاس لے چلو۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے ملتان کے دربار میں کہیں گے۔"

ملتان کے دربار میں درویش موت کے منہ میں کھڑا تھا۔ داؤد بن نصر خود اُس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ سُرنگ میں کس طرح داخل ہوا تھا اور اُس نے اس آدمی کو کیوں قتل کیا تھا۔

"یہ ثابت کرنے کے لیے کہ حاکم ملتان داؤد بن نصر کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں کہ وہ جنات اور مرے ہوؤں کی ارواح کو حاضر کر سکے"۔ درویش نے پوری دلیری سے کہا۔ "اور میں نے سُرنگ میں اُس آدمی کو قتل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس حویلی میں جنات بھی نہیں، ارواح بھی نہیں اور قرامطی فرقہ باطل کا علمبردار ہے۔"

داؤد بن نصر نے اُس کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ مارا اور کہا۔ "تم ہماری کرامات کو جھٹلاتے ہو؟ ... تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری زندگی ہمارے ہاتھ میں ہے؟ تمہیں ہم سے کون بچا سکتا ہے؟"

"خدائے ذوالجلال" ــــ درویش نے کہا۔ "داؤد! فرعونوں نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کا انجام دیکھ۔ تیرا انجام اس سے بھی برا ہوگا۔ تیرا سورج غروب ہو رہا ہے۔"

داؤد بن نصر نے درویش کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارا اور بولا "ہمارے پاؤں کے نیچے تمہاری حیثیت ایک چیونٹی کی سی ہے۔ تم اتنے بڑے آدمی نہیں کہ ہم تم سے منہ لگائیں۔ ہمیں یہ بتا دو کہ تمہارے ساتھ اور کون ہے اور یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں جا رہے تھے۔"

"میں اکیلا ہوں"۔ درویش نے کہا۔ "خدا کے سوا میرا کوئی ساتھی نہیں۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں بھیرہ جا رہا تھا لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ کیوں جا رہا تھا۔"

"تم سلطان محمود غزنوی سے یہ کہنے جا رہے تھے کہ وہ ملتان کو محاصرے میں لے کر قرامطی گدی کو ختم کرے"۔ داؤد نے کہا۔ "تم نے ہماری کرامات نہیں دیکھی کہ تم نے جنگل میں ایک بات کہی اور ہم نے یہاں سن لی۔ اگر تم ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دو گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ تمہاری ہڈیوں سے گوشت آہستہ آہستہ الگ کیا جائے گا، پھر تم چیخ چیخ کر ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب دو گے مگر ہم نہیں سنیں گے۔ ہم تمہیں آج رات سوچنے کی مہلت دیتے ہیں۔ قید خانے میں بیٹھ کر اطمینان سے سوچو اور کل ہمیں بتا دینا کہ تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ تم سرنگ میں کس طرح داخل ہوئے تھے اور کیا سلطان محمود کے جاسوس ملتان میں موجود ہیں؟ اور وہ کہاں ہیں؟"

"ان سوالوں کے جواب تو میں کل دوں گا"۔ درویش نے کہا۔ "آج یہ سن لو اور رات کو میری اس بات پر غور کرتے رہنا کہ تخت و تاج نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ حکومت کی مسند کے لالچ نے قوموں کو ڈبو دیا ہے۔ انسان تخت پر بیٹھ کر جب سر پر تاج سجاتا ہے تو وہ اپنی ہی قوم کو فریب دینے لگتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ خدا کی ذات بھی موجود ہے۔ تم جیسے حکمران اپنے تخت کی مضبوطی کے لیے رعایا کو نئے جھانسے دیتے ہیں لیکن خدا کو کوئی جھانسہ نہیں دیا جا سکتا۔ خدا ظالم کی نہیں مظلوم کی سنتا ہے اور خدا فریب کار کا نہیں فریب خوردہ کا ساتھ دیتا ہے۔ تم نے خدا کے سچے مذہب کو بگاڑ کر پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔

تم نے خدا کے بندوں کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے خدا کے مذہب کو عجوبہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہارا فریب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خدا تمہیں اتنا بڑا گناہ بخشنے کا نہیں۔"

داؤد بن نصر اچانک گرجا۔ "لے جاؤ اسے .... قید خانے میں بند کر دو"۔

درویش کو گھسیٹ کر لے گئے۔ درویش جوں جوں دور ہٹتا جا رہا تھا اس کی آواز داؤد کے قریب آتی جا رہی تھی۔

"داؤد! تیری پیغمبری پر بجلی گرنے والی ہے .... داؤد! تم خدا کی آواز کو قید نہیں کر سکتے۔"

"اگر عالی جاہ مجھے اجازت دیں تو میں اس بدبخت کی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں"۔ ــــ ایک درباری نے داؤد بن نصر کو خاموش کھڑے دیکھ کر کہا۔ "میں حیران ہوں کہ آپ قرامطی مسند کی توہین کس طرح برداشت کر رہے ہیں؟"

"ملتان کی آستینوں میں سانپ پل رہے ہیں"۔ داؤد نے کہا۔ "اس سے معلوم کرنا ہے کہ وہ کون اور کون کون ہیں۔ اسے ہم اپنے ہاتھوں ختم کر سکتے تھے لیکن اس کی ابھی ضرورت ہے۔"

"اس کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ شاید پکڑے جائیں گے"۔ درباری نے کہا۔

"کہیں غائب نہ ہو گئے ہوں"۔ داؤد بن نصر نے کہا۔ "مجھے ان سے زیادہ محمود غزنوی کا خیال آ رہا ہے۔ بھیرہ سے جلدی اطلاع آنی چاہیے کہ محمود کا ارادہ کیا ہے۔ ہم نے اسے اس کے ایک سالار کے ذریعے دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن اطلاع ملی ہے کہ یہ سالار اپنی تلوار سے مارا گیا ہے اور ہمارا دھوکہ ناکام ہو گیا ہے۔ راجہ بجی رائے دھوکے میں مارا گیا ہے۔ محمود غزنوی کو خدا نے اگر فوج تھوڑی دی ہے تو دماغ بہت زیادہ دیا ہے۔ ہندوستان میں فوج کی کمی نہیں، دماغ کی کمی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی اپنی فوج کی کمی کو بڑی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس کا کام بھیرہ فتح کرنے پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ اصل مہم یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اسے ملک گیری کی ہوس نہیں تھی۔ اس کا مقصد زر و جواہرات اکٹھے کر کے غزنی لے جانا بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو اس نے فتح کیا تھا اور اس نے پہلے شہر میں ہی سارے

ہندوستان کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اُس نے مسجدوں پر مندروں کے گھناؤنے سائے پڑے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بھیرہ میں مسلمانوں کی آبادی کچھ کم تو نہیں تھی لیکن اسلام کا کہیں نشان نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کے پاس سب سے پہلے پنڈتوں کا وفد آیا تھا۔ پنڈتوں نے اُس کے آگے پہلے گھٹنے ٹیکے پھر ماتھے زمین پر رگڑے تھے۔ پشاور کے پنڈتوں نے بھی اُس کے آگے اسی طرح سجدے کیے تھے۔ اب بھیرہ کے پنڈتوں نے بھی اُس کے آگے ماتھے رگڑے تو سلطان محمود غزنوی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کھڑے ہو جاؤ" — اُس نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں خدا نہیں۔ میں نے اس شہر پر قبضہ کیا ہے، شہر کے انسانوں پر نہیں۔ ہمارے مذہب میں سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔ تم لوگ مجھے گناہگار کر رہے ہو ..... اپنا مطلب بیان کرو۔"

"ہم جان کی سلامتی اور مندروں کی حُرمت مانگنے آئے ہیں" — پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کیا تم اپنے مندروں کی ویسی ہی عزت چاہتے ہو جیسی تم مسجدوں کی کرتے رہے ہو؟" — سلطان محمود نے کہا۔ "کیا یہاں کے ہندوؤں کی ویسی ہی عزت چاہتے ہو جیسی تم مسلمانوں کی کرتے رہے ہو؟ تمہارے راجہ کے اس محل میں اتنی ہندو لڑکیاں نہیں تھیں جتنی مسلمان لڑکیاں تھیں۔ انہیں زبردستی راج محل میں رکھا گیا تھا۔ اگر تم پنڈت لوگ مذہب کے پابند ہوتے تو اس شہر کی بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کرتے۔"

"ہم مجبور تھے سلطان مہاراج!" — بڑے پنڈت نے کہا۔ "ہمارے دیس میں مہاراجہ کا حکم مذہب کے حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"تمہارے دیس میں مذہب مہاراجہ کا غلام ہے" — سلطان محمود نے کہا۔ "اور تم جو اپنے مذہب کے پیشوا اور پاسبان ہو، اپنا مذہب مہاراجہ کے قدموں میں رکھ دیتے ہو" — سلطان محمود نے اپنے ترجمان سے توجہ ہٹا کر اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک فوجی مشیر سے کہا۔ "ہمارے مسلمان بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں میں بھی یہی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

ہمارے مذہبی پیشوا اپنے بادشاہوں اور اُمرا کی بدکرداری پر مذہب کا پردہ ڈالے رکھتے ہیں اور بادشاہ اپنا حکم منوانے کے لیے اس پر خدا کے حکم کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔"

"ملتان کا بادشاہ داؤد بھی اسی مرض کا مریض ہے" — مشیر نے کہا۔

یہ باتیں فارسی زبان میں ہو رہی تھیں اس لیے پنڈت سمجھ نہ سکے۔ سلطان محمود نے اپنے ترجمان سے کہا۔ "ان پنڈتوں سے کہو کہ تمہارے بُت اگر سچے ہیں تو انہیں کہو کہ تمہاری جان و عزت اور اپنے مذہب کی حفاظت کریں۔ اپنے بتوں سے کہو کہ اپنی حفاظت کریں۔ میں ایک گناہگار آدمی سے کہتا ہوں کہ تمہارے خداؤں کو اُٹھا کر باہر پھینک دے۔ تم کھڑے دیکھتے رہنا کہ مٹی اور پتھر کا خدا اپنے آپ کو ایک گناہگار انسان سے بچا سکتا ہے؟ اور اس انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دے سکتا ہے؟"

ترجمان نے جب سلطان محمود غزنوی کی یہ بات پنڈتوں کو اُن کی زبان میں کہی تو وہ خاموش کھڑے رہے۔ اُن کے چہروں پر کھسیانا سا تاثر تھا۔

"اور میں جانتا ہوں کہ تم لوگ مندروں میں کیسے کیسے گناہ کرتے ہو" — سلطان محمود نے کہا۔ "تمہارے ہاتھوں تمہارے اپنے مذہب کی کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں۔ تم نے اسی لیے پتھر کے خدا تراش رکھے ہیں کہ یہ تمہیں کسی گناہ سے روک نہیں سکتے۔ تم اگر میرے پاس جان و مال اور عزت و آبرو کی التجا لے کر نہ آتے تو بھی میں کسی بے گناہ کو قتل اور کسی عورت کو بے آبرو نہ ہونے دیتا کیونکہ یہ میرے خدا کا حکم ہے اور خدا نے میرا ہاتھ روک رکھا ہے۔ میں خدا کے حکم سے آیا ہوں اور میرا ہر فعل خدا کے حکم کا پابند ہے۔"

سلطان محمود نے سر کو جھٹک کر اپنے ترجمان کی طرف دیکھا اور پنڈتوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ان سے پوچھو کہ انہوں نے مندروں میں لڑائی سے بچے اور بھاگے ہوئے فوجی ہندو سپاہیوں کو چھپا کے نہیں رکھا ہوا؟ ان سے کہو کہ یہ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ مندروں میں ہماری فتح کو شکست میں بدلنے کی سازشیں نہیں ہو رہیں؟"

"نہیں سلطان مہاراج!" — بڑے پنڈت نے ترجمان کی بات سن کر کہا۔ "ہم آپ کے غلام ہیں۔ مندروں میں کوئی سازش نہیں ہو رہی۔"

"وہ کہاں ہیں؟" — سلطان محمود نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ "انہیں سے آدھے نہیں

لاہور کے راستے سے پکڑا گیا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی اندر لائے گئے جن کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

"انہیں پہچانتے ہو؟" ۔ سلطان محمود نے پنڈتوں سے پوچھا اور دونوں قیدیوں سے کہا ۔۔۔ "انہیں بتاؤ کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کیوں پکڑے گئے ہو؟"

"ہمیں ان پنڈتوں نے لاہور جانے کو کہا تھا"۔ ایک قیدی نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے مہاراجہ انندپال کے لیے پیغام دیا تھا کہ بھیرہ میں مسلمانوں کی فوج بہت تھوڑی ہے۔ فوراً حملہ کرو اور راجہ بجی رائے کی شکست کا انتقام لو"۔

انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری فوج کے جو ہزاروں قیدی سلطان محمود کے پاس ہیں وہ حملے کی صورت میں باغی ہو کر لاہور کی فوج سے مل جائیں گے"۔ دوسرے قیدی نے کہا۔

"اور انہیں میری فوج نے راستے میں مشکوک حالت میں پکڑ لیا"۔ سلطان محمود نے کہا ۔۔۔ "ان دونوں قیدیوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں نے اسی قسم کا پیغام ملتان داؤد بن نصر کو بھیجا ہے۔ تم میرے پاس جان بخشی کے لیے آئے ہو ۔۔۔ غور سے سنو۔ جن کو خدا ماننے والو! یہاں کے انسان میری فوج کے طوفان کو نہیں روک سکے۔ اپنے بتوں سے کہو کہ میری فتح کو شکست میں بدل دیں، لیکن جس طرح تم بیکار اور جھوٹے ہو، اسی طرح تمہارے بنائے ہوئے خدا جھوٹے ہیں، میں تمہیں صرف یہ رعایت دیتا ہوں کہ اپنے بت اٹھاؤ اور اس شہر سے نکل جاؤ۔ اگر رکے رہو گے تو میں یہ بت ہندو قیدیوں کے ہاتھوں تڑواؤں گا۔ اگر تم وہ مذہب قبول کر لو جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں تو باقی زندگی سکون سے گزار سکو گے۔ تم جسمانی لذت کے عادی رہے ہو، روحانی لذت کا ذائقہ بھی چکھ لو۔ اپنے آپ کو سچے خدا کی نعمتوں سے مالا مال کر لو۔ سونے اور جواہرات میں وہ بات نہیں جو اللہ کی نعمتوں میں ہے ۔۔۔ جاؤ اور سوچو اور مجھے جواب دو"۔

وہ چلے گئے تو سلطان محمود کے ایک عالم نے کہا "سلطان! یہ ہندو ہیں، یہ اسلام قبول کرنے نہیں، دھوکہ دینے آئے تھے۔ یہ جسمانی لذتوں کے شیدائی ہیں حکومت اور مذہب

کی پیشوائی کو یہ صرف اپنا حق اور ورثہ بنائے بیٹھے ہیں کیونکہ یہ برہمن ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کی نفرت بھری ہوئی ہے، اور یہ نفرت صرف اس لیے ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام اونچی نیچی ذاتوں کا قائل نہیں۔ امیر کو غریب پر اس لیے برتری حاصل نہیں کہ وہ امیر ہے۔ اسلام بالادستی کا حق اسے دیتا ہے جو قوم کی برتری اور اپنے اوپر اللہ کی حکمرانی کو تسلیم کرے"۔ یہ

یہ عالم سعید اللہ قاسمی تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ قاسمی کا اضافہ محمد بن قاسم کی عقیدت مندی کے اظہار کے لیے رکھا تھا۔ اس وقت کی بعض کہیں کہیں تحریروں میں ایک مولوی سعید کا ذکر آتا ہے۔ ایک تحریر میں سعید اللہ بھی لکھا ہے۔ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمود علما دین کا قدر دان تھا۔ اس نے بھیرہ فتح کیا تو سعید اللہ قاسمی اس سے ملنے بھیرہ آئے تھے۔

"ہم نے اس خطے میں قاسمی مسلمانوں کا ایک گروہ بنا رکھا ہے"۔ مولوی سعید قاسمی نے کہا۔ "ہم کسی ایسے سلطان یا ایسے مسلمان حملہ آور کی راہ دیکھ رہے تھے جو یہاں محمد بن قاسم کے دورِ حکومت کو بحال کر دے۔ ہندو پنڈتوں اور دیگر برہمنوں نے ہم پر نظر رکھی۔ ہم نے ان سے دوستی بھی کی۔ ان کا صرف یہ مطالبہ تھا کہ ہم اُن کے مذہب کو قبول کریں۔ آپ ان کے بت توڑ سکتے ہیں، انہیں اپنے مذہب سے نہیں ہٹا سکتے۔ ان کے دلوں میں اسلام کی جو نفرت ہے، وہ اُس وقت تک نہیں نکلے گی جب تک یہاں ایک بھی مسلمان موجود ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ان پنڈتوں نے آپ پر حملہ کرانے کا اہتمام بھی کیا ہے اور آپ کے سامنے آ کر انہوں نے سجدہ بھی کیا ہے۔ اس ملک میں آپ نے کسی بھی خطے میں اسلامی ریاست بنا لی تو یہ ہندو اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے رہیں گے"۔

"اسلامی ریاست کی جڑیں تو ہمارے اپنے بھائی کھوکھلی کر رہے ہیں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں یہاں آ گیا ہوں لیکن میرا دھیان پیچھے غزنی اور بلخ بخارا پر لگا ہوا ہے۔ اسلامی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے آپ کو ساری دنیا کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ ہم خانہ جنگی لڑ چکے ہیں۔ جس فوج کو باطل کے بت توڑنے تھے، وہ ایک دوسرے کا سر توڑنے میں لگی رہی اور کمزور ہو گئی ہے۔ اگر ان ریاستوں کی فوجیں متحد ہو جائیں

تو ہم سارے ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنا سکتے ہیں ۔ مگر ہر لمحہ میں اس اطلاع کا منتظر رہتا ہوں کہ میرے کسی مسلمان پڑوسی نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے ۔ یہ لوگ اپنا ایمان نیلام کر چکے ہیں جنہیں ہمارے رسول صلعم نے سرفروش بننے کو کہا تھا وہ ایمان فروش ہو گئے ہیں ۔"

"آپ یہاں رہیں یا نہ رہیں ، ہم یہ مہم جاری رکھیں گے کہ یہاں ہندو کسی مسلمان کا ایمان نہ خرید سکیں ۔" ۔۔۔ مولوی سعید اللہ نے کہا ۔

"سب سے بڑا ایمان فروش تو ملتان کی گدی پر بیٹھا ہے ۔" سلطان محمود نے کہا ۔۔۔ "اُس نے اپنی قوم کے ایمان کی منڈی لگا رکھی ہے ۔"

"ہم نے سنا ہے کہ داؤد ہندو اور قرامطی مل کر شعبدہ بازی کر رہے ہیں ۔" ۔۔۔ مولوی سعید اللہ نے کہا ۔۔۔ "اور لوگ متاثر اور مسحور ہو کر قرامطی بنتے جا رہے ہیں ۔"

"میں اُس عیسائی کے دماغ کی تعریف کرتا ہوں جس نے یہ فرقہ بنایا ہے ۔" سلطان محمود نے کہا ۔۔۔ "انسانی فطرت گناہ کی طرف جلدی مائل ہوتی ہے ۔ ذہنی اور جسمانی لذت کو انسان جلدی قبول کرتا ہے ۔ اس فرقے نے ہر گناہ کو جائز قرار دے رکھا ہے ۔ ہندو پنڈتوں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا لیکن اس فرقے کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور اس کی شعبدہ بازیوں میں پوری طرح شریک ہیں ، تاکہ مسلمان اس فرقے کے پیروکار بن کر اسلام کے خاتمے کا باعث بنیں ۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہندو اپنی لڑکیوں کو اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی گمراہی کے لیے استعمال کر رہے ہیں ۔ داؤد قرامطی کو نہ اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے نہ وہ اپنے فرقے کا وفادار ہے ۔ وہ اپنی گدی کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے ۔"

یہ اسی دلچسپی کا مظاہرہ تھا کہ داؤد بن نصر پر درویش کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ اُس کے دل میں خوفِ خدا پیدا نہ ہوا ۔ اُس پر درویش کی اس للکار کا بھی اثر نہ ہوا ۔۔۔ "داؤد ! تمہاری پیغمبری پر بجلی گرے گی ۔ ... تم خدا کی آواز کو قید نہیں کر سکتے ۔" حکومت کے نشے نے اُسے بدمست کر رکھا تھا اور وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ اُس نے خدا کی آواز کو قید کر رکھا ہے ۔

ملتان میں ایک قافلہ داخل ہوا جس میں فوج کے بارہ چودہ سوار تھے ۔ ایک بوڑھا اور ایک جوان ہندو ، ایک ادھیڑ عمر عورت اور دو بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں ، اور اس قافلے میں چار

قیدی بھی تھے جن کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے ۔ ان میں ایک بوڑھا تھا جسے ملتان کے لوگ جانتے تھے کہ عالم فاضل ہے ۔ تین قیدی جوان سال تھے ۔ ملتان کے بعض لوگ انہیں بھی پہچانتے تھے ۔ ان چاروں کو جاننے پہچاننے والے حیران و پریشان ہو گئے کہ انہیں کس جرم میں اور کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے ۔ عالم کوئی جرم نہیں کر سکتا ۔ عالم ہونے کی وجہ سے بعض قرامطی بھی اس کا احترام کرتے تھے ۔

"انہوں نے کیا کیا ہے ؟" ۔۔۔ کسی تماشائی نے گھوڑ سواروں سے بلند آواز میں پوچھا ۔

"قتل .... یہ قاتل ہیں ۔"

"انہوں نے کسے قتل کیا ہے ؟"

"فوج کے سواروں کو ۔"

"ہم نے اسلام کے غداروں اور ڈاکوؤں کو قتل کیا ہے ۔" ۔۔۔ عالم نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا ۔

"ہم نے ان لڑکیوں کی عصمت پر حملہ کرنے والے چار قرامطیوں کو قتل کیا ہے ۔" ۔۔۔ ایک جوان سال قیدی نے کہا ۔

"زبانیں بند رکھو ۔" ۔۔۔ ایک سوار نے گرج کر کہا ۔

"تم خدا کی آواز کو خاموش نہیں کر سکتے ۔" ۔۔۔ ایک اور جوان سال قیدی نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا ۔

گھوڑ سواروں نے انہیں گھسیٹنا شروع کر دیا ۔

داؤد بن نصر کو دو اطلاعیں دی گئیں ۔ ایک یہ کہ درویش کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے آئے ہیں اور دوسری اطلاع یہ کہ اپنے جو چار سوار بھیرہ جا رہے تھے ، وہ درویش کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ بھیرہ سے رو ہندو کولی منام بے کر آئے ہیں ۔ داؤد نے سب سے پہلے ہندوؤں کو بلایا ۔

ہندوؤں نے دو نو لڑکیاں داؤد کو پیش کیں ، پھر چمڑے کی ایک خوشنما تھیلی اُس کے قدموں میں خالی کی ۔ داؤد کبھی لڑکیوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنے قدموں میں رکھے ہوئے

سونے کے ڈھیر کو۔ لڑکیاں خوبصورت تو تھیں لیکن اُن کے چہروں پر جو تبسم تھا اور اُن کا جو انداز تھا، اُس نے داؤد پر نشہ طاری کر دیا۔ وہ تربیت یافتہ لڑکیاں تھیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ انہیں کس کے پاس اور کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

بوڑھے ہندو نے داؤد کو بتایا کہ وہ فوج میں کماندار تھا۔ اُس نے بجے رائے کی شکست کی تفصیل سنائی اور بتایا کہ کس طرح چند ایک فوجی عہدیدار مندروں میں چھپ گئے تھے۔ خزانے پر تو مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن بہت سی دولت مندروں اور لوگوں کے گھروں میں پہنچا دی گئی تھی۔

"سلطان محمود نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی مسلمان فوجی کسی ہندو کے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔" بوڑھے ہندو نے کہا۔ "اُس نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہندو اپنے فوجیوں کی لاشیں اُٹھا کر جلا سکتے ہیں اور زخمیوں کو مرہم پٹی کے خیموں تک پہنچا سکتے ہیں۔ بھیرہ کے ہندوؤں کو پنڈتوں نے اور ہم نے در پردہ کہا کہ میدانِ جنگ میں اپنے زخمی اُٹھائیں اور مسلمان زخمیوں کو ختم کریں۔ انہوں نے بہت سے مسلمان زخمیوں کو قتل کیا لیکن مسلمانوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے ہندوؤں کو شہر سے باہر جانے سے روک دیا....

"ہم نے دیکھا کہ ہندوؤں کے گھر مسلمانوں سے واقعی محفوظ ہیں تو ہم نے جو رقم اور سونا ہاتھ لگا، چند ایک گھروں میں چھپا دیا۔ بڑے مندر میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ آپ کو یہ اطلاع دی جائے کہ آپ فوراً بھیرہ پر چڑھائی کر دیں تو آپ نہ صرف بھیرہ کو مسلمانوں سے آزاد کرائیں گے بلکہ آپ سلطان محمود کو قید اور اس کی فوج کو تباہ کر سکتے ہیں۔ وہ تین ہزار ہندو جنگی قیدی جو مسلمانوں کی بیگار میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی مدد کو آجائیں گے اور محاصرے کی صورت میں شہر میں تباہی بپا کر دیں گے....

"لاہور اور بٹھنڈہ بھی پیغام بھیج دیئے گئے ہیں۔ وہاں کی فوجیں بھی آجائیں گی۔ آپ کا کام اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اگر آپ اپنی ریاست کی خیریت چاہتے ہیں تو آپ کو بھیرہ پر فوج کشی کرنی ہوگی۔ آپ کو بھیرہ سے مالی امداد بھی مل جائے گی۔"

داؤد بن نصر انہماک سے سُن رہا تھا۔ اُس نے ابھی کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ ہندو بوڑھا

جانتا تھا کہ داؤد کے خاندان کی تاریخ میں جنگ و جدل کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ سازش پسند خاندان ہے جسے عیسائیوں نے گدی پر بٹھایا اور ہندو راجے مہاراجے اسے آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ بوڑھا ہندو داؤد کی کمزور رگوں سے واقف تھا۔ بھیرہ سے اُسے سب کچھ بتا کر بھیجا گیا تھا۔

"حاکمِ ملتان!" بوڑھے ہندو نے ذرا آگے جھک کر کہا۔ "بٹھنڈہ اور لاہور کی فوجوں کو آپ کی فوج کے تعاون اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ آپ کو یہ تو احساس ہوگا ہی کہ آپ کی گدی ہمارے تعاون کی بدولت محفوظ ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آپ ہندو راجوں اور مہاراجوں کے گھیرے میں ہیں۔ آپ پر کوئی حملہ نہ کرے اور صرف مالی اور فوجی امداد بند کر دی جائے تو آپ ملتان کو ہمارے قدموں میں پھینک کر بھاگ جائیں گے۔ اگر آپ نے بھیرہ پر فوج کشی نہ کی تو ہم یہ سمجھیں گے کہ آپ ہمارے نہیں غزنی والوں کے دوست ہیں۔ ہم آپ کی دوستی سے دستبردار ہو جائیں گے اور پورے قرامطی فرقے کو بتا دیں گے کہ آپ کی پیغمبری محض شعبدہ بازی ہے۔"

"آپ خود فوجی عہدیدار رہیں ہیں۔" داؤد نے گھبرائے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو اپنی فوج دکھاؤں گا۔ آپ خود دیکھیں گے کہ یہ فوج محاصرے میں لڑ سکتی ہے، ایک سو میل دُور جا کر کسی قلعہ بند شہر کو محاصرے میں لینے کے قابل نہیں کیونکہ تعداد کم ہے۔"

"آپ کو اپنی فوج شہر سے ایک سو میل دُور لے جانی پڑے گی۔ ہم آپ کی فوج کو اسی لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ تھوڑی ہے۔ آپ کی فوج سے ہم سلطان محمود کو دھوکہ دیں گے۔ وہ آپ کی فوج کو دیکھ کر اپنی فوج باہر لے آئے گا۔ آپ کو محاصرہ نہیں کرنے دے گا کیونکہ اُسے یہ توقع ہوگی کہ وہ آپ کو آسانی سے شکست دے دے گا۔ وہ جونہی باہر آئے گا، لاہور سے آئی ہوئی مہاراج انند پال کی فوج جو دریا کے پار چھپی ہوئی ہوگی، شہر پر دھاوا بول دے گی۔ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ سلطان محمود آپ کی اور انند پال کی فوجوں کے درمیان پس جائے گا۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ محمود کو گرفتار کر کے ہم آپ کے حوالے کر دیں گے۔"

داؤد بن نصر گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس کی نظر قدموں میں رکھے ہوئے سونے

پر پڑی۔ اُس نے سر اُٹھا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ یہ تاثر صاف بتا رہا تھا جیسے وہ چاہتا ہو کہ یہ بوڑھا ہندو اور اس کا جوان ساتھی ان لڑکیوں کو اس کے پاس چھوڑ کر نکل جائیں۔

"میری فوج کو بھیرہ کے لیے کب کوچ کرنا ہوگا؟" داؤد نے پوچھا۔

"آپ تیاری شروع کر دیں۔" بوڑھے نے کہا۔ "میں واپس بھیرہ جا رہا ہوں وہاں ہمیں لاہور اور بھٹنڈہ کی فوجوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملے گی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ اس اطلاع کے بعد آپ کو تیاری کی مہلت نہیں ملے گی۔ آپ کی فوج تیاری کی حالت میں رہے۔ رسد بیل گاڑیوں پر لدی رہے۔"

داؤد بن نصر نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے شراب و کباب لانے کا حکم دیا تو اُسے کسی درباری نے یاد دلایا کہ قیدی باہر کھڑے ہیں۔ داؤد نے کہا کہ قیدیوں کو پیش کرو۔ قیدی لائے گئے۔

"میں تمہیں زیادہ بولنے کی مہلت نہیں دوں گا۔" داؤد نے عالم اور اُس کے ساتھیوں سے کہا۔ "تمہارا ایک ساتھی گرفتار ہو کر ہمارے پاس آچکا ہے۔ اُس نے ایک آدمی کو چار کنواریوں کی حویلی میں قتل کیا تھا۔ تم اس کے ساتھی ہو۔ تم نے ہمارے چار بڑے ہی تجربہ کار فوجیوں کو قتل کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اور تم نے انہیں کیوں قتل کیا ہے؟"

"اس کا جواب ہم سے سنو۔" بوڑھا ہندو بول پڑا۔ "اگر یہ اُن چار آدمیوں کو قتل نہ کرتے تو نہ یہ سونا آپ کے پاس پہنچتا نہ یہ لڑکیاں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کی فوج کے آدمی ہیں۔"

بوڑھے نے داؤد کو پوری تفصیل سے سنایا کہ اُن چار آدمیوں نے کس طرح انہیں لوٹا اور اِن لڑکیوں کو برہنہ کر کے ان کے ہاتھوں شراب پیتے رہے، پھر اُن میں سے ایک نے ایک لڑکی کو زمین پر گرا لیا۔ اچانک یہ بزرگ اور یہ آدمی اندھیرے میں سے نکلے اور اِن چاروں کو قتل کر دیا۔

"ہمیں ڈر تھا کہ ہم اُن چاروں سے بچ کر اِن چار وحشیوں کے جنگل میں آگئے ہیں" — بوڑھے نے کہا۔ "لیکن انہوں نے لڑکیوں کو کپڑے پہننے کو کہا۔ ہم نے انعام پیش کیا جو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور ہماری حفاظت کے لیے ہم پر پہرہ کھڑا کر دیا۔ آدھی رات کو بہت سے سوار آئے اور انہیں باندھ کر لے آئے۔"

داؤد نے قیدیوں کی طرف دیکھا تو عالم نے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کے سوار ہیں۔ ہم نے انہیں ان کی لڑکیوں کی عزت بچانے کے لیے قتل کیا ہے۔"

"اور وہ جو قیدی پہلے لایا گیا ہے، اُس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟" داؤد بن نصر نے پوچھا۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم بھیرہ سلطان محمود کے پاس جا رہے تھے۔"

"اُس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" عالم نے جواب دیا۔ "ہم بھیرہ ضرور جا رہے تھے لیکن کسی سلطان سے ملنے نہیں بلکہ اپنے کاروبار کے لیے جا رہے تھے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان محمود کون ہے اور وہ کہاں ہے۔"

"انہوں نے ہماری جانیں اور ہماری عزت بچائی ہے۔" بوڑھے ہندو نے کہا۔ "انہوں نے آپ کی امانت کی حفاظت کی ہے۔ انہوں نے ہمارا انعام قبول نہیں کیا تھا۔ ہم آپ سے انہیں یہ انعام دلانا چاہتے ہیں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔"

داؤد بن نصر نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں نے باری باری کہا۔ "ہاں! انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اگر یہ اُن درندوں کو قتل نہ کرتے تو ....."

"انہیں رہا کر دو۔" داؤد نے مسکرا کر حکم دیا۔

عالم اور اُس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا گیا۔

دو تین روز بعد۔ وہی حویلی تھی جس میں عالم اور درویش اور اُن سب کے زمین دوز گروہ کے آدمی رات کو اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ رات ابھی ابھی گہری ہوئی تھی۔ عالم اس حویلی میں آچکا تھا۔ اُس کے ساتھ جو تین آدمی گرفتار ہوئے تھے، وہ بھی باری باری آگئے تھے پھر دو آدمی اور آگئے۔ ان کا موضوع اور مسئلہ یہ تھا کہ درویش کو کس طرح رہا کرایا جائے۔ کسی کو کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ قید خانے سے وہ واقف نہیں تھے۔ گزشتہ دو تین دنوں

میں انہوں نے کئی طریقے سوچ لیے تھے۔ قید خانے کی دیوار بھی دیکھی اور کمند پھینک کر اوپر چڑھنے اور قید خانے میں داخل ہونے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ اس گروہ کے جوان اور نوجوان رُکن جانوں کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے لیکن عالم جانیں ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ پہلے طریقہ سوچو۔

"کیا آپ لوگوں کو یہ احساس نہیں کہ ہمارا یہ بزرگ ساتھی (درویش) جلّاد کی تلوار کے نیچے کھڑا ہے؟" — ایک نوجوان نے کہا۔ "ہم میں سے کسی کی جان چلی بھی گئی تو آپ اسے ضائع ہونا نہ کہیں"

"اگر تم لوگ ناکام ہو گئے تو درویش کو اُسی وقت جلّاد کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ کے نام پر کر رہے ہیں"

دروازے پر دستک ہوئی۔ سب اُٹھے اور صحن میں چلے گئے تاکہ خطرے کی صورت میں پچھلے دروازے سے نکل جائیں۔ انہیں ہر لمحہ یہ خطرہ نظر آتا تھا کہ درویش اذیتوں سے گھبرا کر سب کی نشان دہی کر دے گا اور اس حویلی پر چھاپہ پڑے گا۔ دو آدمی دروازہ کھولنے گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ایک نے دروازے کی زنجیر اُتاری اور کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔ دوسرا دوسرے کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔ ایک آدمی اندر آیا اور اُس نے کواڑ بند کر دیئے۔ وہ اُن کا اپنا آدمی تھا۔

"یہاں کتنے آدمی ہیں؟" — اُس نے پوچھا

"آٹھ ہیں"

وہ سب اُس کمرے میں چلے گئے۔ باقی سب صحن سے کمرے میں آ گئے۔

"ذرا باہر آؤ" — آنے والے نے کہا۔ "درویش کو چار فوجی لا رہے ہیں۔ وہ زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ گلیاں اور بازار خالی ہیں۔ ہم اُسے چھڑا سکتے ہیں"

قید خانے میں درویش سے ایک ہی سوال پوچھا جا رہا تھا کہ اُس کے ساتھی کون کون ہیں اور کہاں کہاں رہتے ہیں۔ درویش نے اپنی ہڈی پسلی ایک کرا لی تھی کسی کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ اُس رات یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُسے اُس کے گھر لے جایا جائے اور گھر کی تلاشی لی جائے۔ پھر اس کے گھر کی عورتوں کو دہشت زدہ کر کے پوچھا جائے کہ اس کے تعلقات

کس کس کے ساتھ ہیں۔

اس مقصد کے لیے رات کا وقت بہتر سمجھا گیا تھا۔ درویش کا گھر اس حویلی سے بہت آگے تھا جہاں یہ گروہ بیٹھا کرتا تھا۔ ان میں سے پانچ چھ آدمی ڈنڈے لے کر باہر نکل گئے۔ گلیاں اور بازار سنسان پڑے تھے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں چار پانچ آدمی نظر آئے۔ پانچ چھ آدمی اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ درویش اور فوجی اُن کے قریب سے گزر گئے۔ گروہ کے تمام آدمی اُٹھے اور بے پاؤں فوجیوں کے سروں پر پوری طاقت سے ڈنڈے مارے۔ بے ہوش کرنے کے لیے سر پر ایک ہی ضرب کافی ہوتی ہے۔ اُن کے سروں پر دو دو تین تین ضربیں لگائی گئیں۔ وہ سنبھلے بغیر بیہوش ہو کر گر پڑے۔

درویش آزاد تھا لیکن زنجیر میں — سب اُسے ساتھ لے کر اندھیرے میں اندھیری گلیوں میں غائب ہو گئے۔

جس روز عالم رہا ہوا تھا، اُس نے اُسی روز ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر بھیرہ روانہ کر دیا تھا کہ ملتان میں بھیرہ پر چڑھائی کی تیاری ہو رہی ہے اور بھیرہ سے ملتان پیغام اور تحفے آ رہے ہیں۔ یہ آدمی بھیرہ چلا گیا اور سلطان محمود کو پیغام دیا۔ سلطان کے لیے یہ پیغام کوئی نیا نہیں تھا۔ اُس کے جاسوسوں نے دو ہندوؤں کو لاہور کی طرف جاتے ہوئے پکڑا تھا۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ وہ راجہ انند پال کے لیے پیغام لے کے جا رہے ہیں کہ بھیرہ کو محاصرے میں لے لو۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایسے ہی پیغام ملتان اور بٹھنڈہ بھی بھیجے گئے ہیں۔

سلطان محمود نے یہ کارروائیاں کی تھیں۔ ایک یہ کہ بھیرہ کے دونوں مندروں کی تلاشی لی۔ دونوں میں بجی راؤ کی فوج کے چند ایک عہدیدار پکڑے گئے۔ سلطان نے پنڈتوں کو بھی پکڑ لیا۔ پھر شہر کے تمام ہندوؤں کو باہر میدان میں اکٹھا کر کے دونوں مندروں کے بُت اور مورتیاں اُن کے سامنے رکھ دیں۔

"میں نے تم لوگوں کو یہ دکھانے کے لیے بُلایا ہے کہ یہ بُت اور یہ تصویریں خدا نہیں"

— سلطان محمود غزنوی نے گھوڑے پر سوار ہو کر ہجوم سے کہا "اگر ان میں خدائی قوت ہے تو انہیں کہو کہ اپنے آپ کو بچائیں۔ ان کا انجام دیکھو اور اُس خدا کی عبادت کرو جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اور جس کے ہاتھ میں ہماری زندگی اور ہماری موت ہے۔"

سلطان محمود کے حکم پر بُت توڑ دیئے گئے اور مندروں کو آگ لگا دی گئی۔

سلطان محمود نے بھیرہ فتح کرتے ہی تیز رفتار قاصد پشاور کو اس حکم سے ساتھ دوڑا دیئے تھے کہ جس قدر کمک ہو سکے بھیج دو، رسد کی ضرورت نہیں۔ سلطان اب ہر روز کمک کا انتظار کرتا تھا۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں کا زمانہ تھا۔ فاصلے طے کرتے دن اور راتیں گذر جاتی تھیں۔ دریاؤں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ کمک کو جس علاقے سے گذر کر آنا تھا وہ دشمن کا علاقہ تھا۔ راستے میں دشمن سے تصادم کا خطرہ تھا۔ سلطان محمود نے یہ پیغام بھی دیا تھا کہ دشمن سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ جو گائیڈ قاصد کے ساتھ بھیجے گئے تھے، انہیں کہا گیا تھا کہ وہ کمک کو عام راستوں سے دُور رہ کر لائیں۔

سلطان کی فوجی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ اُسے جانوروں کی ضرورت نہیں تھی۔ راجہ بجی رائے کی فوج کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور بیل (رسد کی گاڑیاں کھینچنے والے) خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ضرورت گھوڑسواروں کی تھی۔ بھیرہ سے تھوڑے سے مسلمان مل گئے تھے جو گھوڑسواری اور تیغ زنی کی سُوجھ بوجھ رکھتے تھے، مگر دشواری یہ بھی کہ ہندوستان میں مسلمان تھوڑے سے تھے اور یہ ہندوؤں کی رعایا تھے۔ ان پر نظر رکھی جاتی تھی کہ تیغ زنی اور تیر اندازی کو اپنا شغل نہ بنائیں۔ مسلمانوں کو فوج میں بھی کم ہی لیا جاتا تھا۔ ہندو راجے مہاراجے اور پنڈت ان کی عسکری روح مار رہے تھے۔ مسلمانوں کی یہ کیفیت سلطان محمود کے لیے دشواری پیدا کر رہی تھی۔ وہ یہاں سے فوج کی کمی پوری نہیں کر سکتا تھا۔

بھیرہ میں سلطان محمود کی حالت ایسی تھی جیسے ایک شیر زخموں سے چُور شکاریوں کے نرغے میں آیا ہُوا ہو اور شیر ان سب کو چیر پھاڑ دینے کو بے تاب ہو۔ سلطان اپنے

مستقر سے بہت دُور تھا۔ اور دشمن کے نرغے میں بیٹھا تھا۔ صورت ایسی پیدا ہو گئی تھی جس میں نہ صرف اُس کی فوج کی تباہی یقینی تھی بلکہ اُس کی اپنی جان بھی بچتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے سالاروں پر ایسی سنجیدگی طاری تھی جو تذبذب کی صورت بھی اختیار کر جاتی تھی۔

"میں جوا نہیں کھیل رہا" — سلطان محمود نے ایک روز اپنے سالاروں اور اُن کے نائبوں کو بلا کر کہا۔ "مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ ہمیں کیسی کیفیت اور کتنی خطرناک صورت حال کا سامنا ہے، مگر ہم بھاگیں گے نہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ بہت سے زخمی لڑنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ کمک آ جائے گی۔ ہمیں ملتان پر فوج کشی کرنی ہے۔ جاسوسوں کی اطلاعیں تمہارے سامنے ہیں۔ ملتان کی فوج کو لڑنے کا تجربہ نہیں۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو ملتان کی فوج ہمیں محاصرے میں لے لے گی اور انند پال اور دوسرے چھوٹے راجاؤں کی فوجیں بھی آ جائیں گی۔ اگر ہم نے ملتان پر قبضہ کر لیا تو وہاں کی فوج ہمارے کام آ سکتی ہے۔ وہ آخر مسلمان ہیں۔"

سلطان محمود نے ایک حکم یہ دیا کہ تمام جنگی قیدیوں کو اس طرح بیڑیاں ڈال دی جائیں کہ وہ کام کر سکیں لیکن پورا قدم نہ اٹھا سکیں۔ تاکہ وہ جنگ کی صورت میں آہستہ آہستہ چلنے کے قابل رہیں، تیز نہ چل سکیں۔

جس وقت سلطان محمود کمک کا انتظار کر رہا تھا، اُس وقت بھیرہ کی مسجدیں جو ویران پڑی تھیں اور چھوٹی مسجدیں جو کھنڈر بن چکی تھیں، صاف کر دی گئی تھیں۔ سلطان محمود نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ مسجدوں میں اور عورتیں گھروں میں قرآن ختم کریں اور ہر کوئی نفل پڑھتا رہے۔

انہی دنوں لاہور میں مہاراجہ انند پال کے راج دربار اور راج محل میں زلزلے جیسے جھٹکے محسوس کیے جا رہے تھے۔ پشاور کے راستے میں انند پال نے سلطان محمود کی فوج کو روکنے کی کوشش کی اور وہ منہ کی کھا کر بھاگ گیا تھا۔ مسلمان سواروں نے سوہدرہ اور وزیر آباد تک اُس کا تعاقب کیا تھا۔ اُسے ماہی گیروں نے دریا پار کرا دیا۔ محمود نے

لکھتے ہیں کہ وہ لاہور جانے کی بجائے کشمیر چلا گیا۔ وجہ بیان نہیں کی گئی کہ وہ کشمیر کیوں چلا گیا تھا۔ شاید اُسے ڈر تھا کہ مسلمان لاہور تک اُس کا تعاقب کریں گے اور اس کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی۔

لاہور میں اُس کا نوجوان بیٹا سکھ پال تھا۔ وہاں جو فوج تھی اُس کی کمان سکھ پال کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فوج تازہ دم تھی لیکن اُس کا لڑنے کا جذبہ یوں گرتا جا رہا تھا کہ اٹک کے قریب سلطان محمودؒ سے شکست کھا کر انند پال تو غائب ہو گیا تھا اور اُس کی فوج کے سوار اور پیادے بڑی بُری حالت میں اکیلے اکیلے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لاہور پہنچ رہے تھے۔ شکست میں اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے وہ سلطان محمودؒ کی فوج کے متعلق دہشت انگیز خبریں سناتے تھے۔ اُن کی مبالغہ آمیز باتوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ غزنی کی فوج میں انسان نہیں، جن اور بھوت ہیں۔ اس مبالغہ آرائی سے لاہور کی تازہ دم فوج کا حوصلہ پست ہو رہا تھا۔

انند پال کا بیٹا سکھ پال اور اس نوجوان کی ماں پریم دیوی اس صورتِ حال سے پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ ماں بیٹا انند پال کا انتظار کر رہے تھے لیکن اُس کی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ پریم دیوی کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں اُس نے سکھ پال کو جنم دیا تھا۔ تین اور عورتوں کے بطن سے انند پال کے بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ پریم دیوی کی کوشش یہ تھی کہ باپ کی گدی پر اُس کا بیٹا بیٹھے۔ اُسے اپنے خاوند مہاراجہ انند پال کے مر جانے یا لاپتہ ہو جانے کا کوئی غم نہیں تھا۔

ایک روز سکھ پال کو اطلاع ملی کہ بھیرہ سے دو آدمی کوئی بڑی ضروری اطلاع لے کر آئے ہیں۔ ان آدمیوں کو فوراً اندر بلا لیا گیا۔ یہ وہ آدمی تھے جنہیں بھیرہ کے ہندوؤں اور مندروں میں چھپے ہوئے فوجی عہدیداروں نے بھٹنڈہ اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا کہ بھیرہ کو فوراً محاصرہ میں لے لیں۔ یہ دونوں بھٹنڈہ گئے۔ یہ شہر مہاراجہ انند پال کا دوسرا دارالحکومت تھا۔ وہاں سے ان آدمیوں کو تازہ دم گھوڑے دے کر لاہور بھیج دیا گیا کیونکہ حکم

دینے والے لاہور میں تھے۔

ان آدمیوں نے سکھ پال کو بھیرہ اور سلطان محمود غزنوی کے متعلق وہی خبر سنائی جو بوڑھے ہندو نے داؤد بن نصر کو سنائی تھی۔ پیغام میں وہی ہدایت تھی جو داؤد بن نصر کو دی گئی تھی کہ بھیرہ کو محاصرے میں لے لو، محمود غزنوی لڑنے کی حالت میں نہیں۔

سکھ پال نے یہ خبر اپنی ماں کو سنائی تو ماں نے اُسی وقت اپنی فوج کے کمانڈر کو بلایا جسے سیناپتی کہا کرتے تھے۔ اس کا نام راج گوپال تھا۔ اُس نے بھیرہ پر فوج کشی سے انکار کر دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ مسلمانوں کی جس فوج نے راستے میں مہاراج انند پال کو شکست دی اور اپنی کمی پوری کیے بغیر بھیرہ تک پہنچی اور راجہ بجی رائے کی فوج کو شکست دی ہے، اس فوج کو شکست دینے کے لیے ہمارے پاس اس سے تین گنا فوج ہونی چاہیے۔ ہماری آدھی سے زیادہ فوج جو مہاراج کے ساتھ تھی بیکار ہو چکی ہے۔ یہاں جو دستے ہیں وہ بھی اچھی ذہنی حالت میں نہیں۔ بھیرہ تک ہمیں لڑ دیا مجبور کرنے ہوں گے۔ راج گوپال نے یہ بھی کہا کہ مہاراج کو واپس آ لینے دیں۔ سکھ پال ابھی بچہ ہے۔

”میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں“ — رانی پریم دیوی نے کہا — ”بھیرہ میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اتنی تھوڑی ہے کہ وہ ہمارا حملہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اگر یہ فتح میرے بیٹے کے نام لکھ دی گئی ہے تو یہ باپ کی گدی کا حق دار ہو جائے گا۔“

”اور اگر شکست ہوئی تو یہ میرے کھاتے میں لکھی جائے گی، کیونکہ فوج کی کمان میرے ہاتھ میں ہو گی؟“ — راج گوپال نے کہا — ”سکھ پال ساتھ تو ہو گا لیکن دُور پیچھے یا وسط میں ہو گا جہاں اُس کی حفاظت کا پورا انتظام ہو گا۔“

”راج گوپال!“ پریم دیوی نے کہا — ”اگر ہم سے پہلے ملتان کے داؤد نے بھیرہ لے لیا تو اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہو گا؟ داؤد آخر مسلمان ہے۔ وہ سلطان محمودؒ کے ساتھ ساز باز کر کے بھیرہ کو خالص مسلمان ریاست بنا سکتا ہے۔ اس طرح غزنی والوں کو یہاں مستقل اڈے مل جائیں گے۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ داؤد فوج کشی کی جرأت کرے گا۔“ — راج گوپال نے کہا —

"عورت، شراب اور زر و جواہرات میں ڈوبا ہوا مسلمان جسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اُس کا مذہب کیا ہے، جنگجو نہیں ہو سکتا۔ غزنی کی فوج ایمان کی طاقت سے لڑتی ہے جسے ہم دھرم کہتے ہیں۔ داؤد اپنا ایمان ہمارے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔"

پریم دیوی راج گوپال کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اُس کی عمر اُس وقت بتیس سال کے قریب تھی لیکن چہرے کے حسن اور جسم کی جاذبیت سے پچیس سال کی لگتی تھی۔ اُس نے راج گوپال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ـــ "راج گوپال! بھول گئے ہو کہ سکھ پال تمہارا اپنا بیٹا ہے اور لوگ انند پال کو اس لیے سکھ پال کا باپ کہتے ہیں کہ وہ میرا خاوند ہے۔ میں نے مہاراج کی بیوی ہوتے ہوئے تمہیں اپنا خاوند بنائے رکھا۔ مہاراج تمہیں بھی اپنے ساتھ پشاور کی اُس لڑائی میں لے جانا چاہتے تھے جس میں وہ شکست کھا کر بھاگے ہیں۔ یہ میں تھی جس نے انہیں یہ کہہ کر تمہیں لاہور میں رکوا لیا کہ یہاں تجربہ کار سینا پتی کی ضرورت ہے .... اپنے بیٹے کو راج کا وارث بنا دو۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا اور تمہارا بیٹا محمود غزنوی کو قیدی بنا کر لاہور لائے۔ تمہیں میری محبت کی قسم!"

سلطان محمود کو معلوم تھا کہ پشاور سے کمک اتنی جلدی نہیں پہنچے گی، پھر بھی وہ بے تاب ہو کر شہر کی دیوار پر چڑھ جاتا اور اُس کی نگاہیں شمال مغرب کے اُفق پر گھومنے لگتی تھیں۔ کہیں بگولا اُٹھتا تو اُس کی گرد کو دیکھ کر سلطان محمود کا چہرہ دمکنے لگتا کہ کمک کی گرد ہے۔

ملتان کا داؤد بن نصر بھیرہ سے تحفے میں آئی ہوئی دونو لڑکیوں میں گم تھا۔ یہ لڑکیاں اُسے شراب پلا پلا کر مدہوش رکھتیں اور اُسے بھیرہ پر حملہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی رہتی تھیں۔ اُسے جب اطلاع دی گئی تھی کہ قیدی (درویش) کو اُس کے گھر کی تلاشی کے لیے جایا جا رہا تھا تو بہت سے آدمیوں نے سپاہیوں پر حملہ کیا اور قیدی کو چھڑا لے گئے ہیں، تو داؤد نے بدمستی کی کیفیت میں کہا تھا ـــ "اُن سپاہیوں کو اور اُن کے کماندار کو تہہ خانے میں بند کر دو۔ انہوں نے قیدی کو خود بھگایا ہے۔ اس کے عوض انہوں نے قیدی سے دولت بٹوری ہو گی .... اور

قیدی کے گھر کا اتا پتا معلوم کر کے اُس کے گھر کے تمام افراد کو، بچوں اور عورتوں کو بھی قید خانے میں ڈال دو۔"

درویش کے گھر گئے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایک صبح سلطان محمود نے شمال مغرب کی بجائے شمال مشرق کی طرف گرد اُٹھتی دیکھی۔ اس گرد کو وہ پہچانتا تھا۔ یہ فوج کی گرد تھی، اور یہ کمک کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر ملتان کو کوچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ترکستان ہی جا رہا تھا لیکن راجہ بجی رائے نے اُسے راستے میں روک لیا اور اُسے بڑی ہی خونریز جنگ لڑنی پڑی۔

اُس نے اپنے سالاروں کو بلایا اور انہیں بتانے لگا کہ کمک آ رہی ہے اور وہ کس طرح اور کب کوچ کرے گا۔ اسی دوران ایک سوار آیا۔ یہ دیکھ بھال والی ٹولیوں کا سوار تھا جنہیں شہر سے دور دور گشت پر رکھا جاتا تھا۔ سوار نے کہا کہ دشمن کی فوج آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہاتھی بھی ہیں اور زیادہ نفری سواروں کی ہے۔ پیادے بھی ہیں اور یہ فوج بلاشبہ ہندوؤں کی ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کون سے راجے مہاراجے کی ہے۔

سلطان محمود یہ کہہ کر باہر نکلا ـــ "میں خود دیکھوں گا" ـــ اور کچھ دیر بعد وہ درختوں میں ڈھکی ہوئی ایک چٹان پر کھڑا اس فوج کا جائزہ لے رہا تھا جو بھیرہ کی طرف آ رہی تھی۔ اُس نے کئی جگہوں پر جا کر اور چھپ چھپ کر دیکھا اور اس فوج کی نفری کا اندازہ کیا۔

"ہم محاصرے میں نہیں لڑیں گے" ـــ اُس نے اپنے سالار سے کہا جو اُس کے ساتھ تھا۔ دشمن کی فوج کو دیکھتے ہوئے بولا ـــ "ہم نے دشمن کو محاصرے کی مہلت دے دی تو ملتان سے بھی فوج آ کر محاصرہ مضبوط اور طویل کر سکتی ہے .... کسانوں اور مسافروں کے بھیس میں دو تین آدمی بھیج دو جو اس فوج کی نقل و حرکت دیکھتے رہیں اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ یہ کس کی فوج ہے اور کہاں سے آئی ہے۔"

سلطان محمود واپس شہر میں آیا اور اس کے پاس جو فوج تھی اُسے مقابلے کے لیے تقسیم کرنے لگا۔ اتنے میں اُسے اطلاع ملی کہ شمال مغرب کے اُفق پر کسی فوج کی گرد اُٹھ رہی ہے۔ وہ دوڑتا ہُوا شہر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ گھوڑوں کی گرد تھی جسے وہ پہچانتا تھا۔ یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگا کہ یہ پشاور سے کمک آئی ہے یا راجہ انند پال کی فوج ہے۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔

وہ کبھی اس گرد کو دیکھتا تھا کبھی شمال مشرق کی طرف سے اُٹھنے والی گرد کو۔ شمال مغرب کی طرف سے آنے والی فوج کے آگے دریا تھا۔ سلطان محمود کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

دریا کی طرف سے ایک گھوڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا شہر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو اُسے اشارے سے سلطان کی طرف بلا لیا گیا۔

سوار نے دیوار کے قریب گھوڑا روکا اور بولا "سلطانِ غزنی! کمک آگئی ہے۔"

سلطان محمود نے معاً کہا "اُسے دریا کے پار روک لو۔ فوراً ایک سوار کو دوڑا دو۔ اس سوار کو واپس نہ بھیجنا۔ گھوڑا بہت تھکا ہُوا ہے۔"

رات کو سلطان محمود نہ خود سویا نہ اس نے کسی کو سونے دیا۔ اُسے شمال مشرق کی طرف سے آنے والی فوج کے متعلق مصدقہ اطلاع ملی کہ لاہور سے آئی ہے لیکن راجہ انند پال ساتھ نہیں۔ اس کا بیٹا سکھ پال ساتھ ہے۔ اس فوج کی تعداد بھی معلوم ہوگئی۔ اس اطلاع کے تین گھنٹے بعد یہ اطلاع آئی کہ سکھ پال کی فوج نے تقریباً تین میل دُور پڑاؤ کیا ہے لیکن خیمے نہیں لگائے جس سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ تیاری کی حالت میں ہے اور صبح تک شہر کو محاصرے میں لے لے گی۔

اس اطلاع کے فوراً بعد سلطان محمود اپنے دو سالاروں کو ساتھ لے کر دریا کے پار چلا گیا جہاں اُس نے کمک کو روکنے کا حکم بھیجا تھا۔ کمک اور سکھ پال کی فوج کے درمیان کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ ان کے درمیان دریائے جہلم اور جنگل حائل تھا۔

سلطان محمود نے کمک کے سالار کو گلے لگا کر اور اُس کے گال چوم کر کہا۔۔۔

"تم میرے لیے آسمان سے اللہ کی غیبی مدد بن کر اُترے ہو۔ اگر تم کل آتے تو میں بتا نہیں سکتا کہ ہم اس زمین پر کس حال میں پڑے ہوتے۔۔۔ میری باتیں غور سے سُن لو سلطان! تم سے پانچ میل دُور مشرق میں لاہور کے راجہ کی فوج پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ وہ صبح یا اس سے کچھ پہلے شہر کا محاصرہ کرے گی یا یلغار۔ تم صبح طلوع ہونے سے پہلے تمام دستوں کو دریا پار کرا دینا لیکن شور نہ ہو، خاموشی رہے۔ دستے نشیبی جگہوں میں رہیں اور صرف دیدبان کہیں چھپ کر رہیں۔ میں ہندوؤں کو محاصرہ کرنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ ایک پیادہ دستہ آگے بھیجوں گا جو دشمن سے ٹکرا کر پیچھے ہٹے گا۔ دشمن آگے آئے گا۔ تم کسی بلندی پر آ کر دیکھتے رہنا۔ سب کچھ سمجھتے ہو۔ دشمن کا پہلو تمہارے سامنے ہوگا اور تم اس کے عقب میں آسانی سے جا سکو گے۔ دشمن کے سامنے اور بائیں پہلو کو میں سنبھال لوں گا۔"

سکھ پال اور اُس کے سیناپتی راج گوپال نے صبح طلوع نہ ہونے دی۔ سلطان محمود نماز سے فارغ ہُوا ہی تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے پیش قدمی شروع کر دی ہے اور دشمن کی ترتیب محاصرے کی ہے یعنی فوج پھیلی ہوئی آ رہی ہے۔ شہر کے قریب آکر اس فوج کو اور زیادہ پھیلنا اور محاصرہ مکمل کرنا تھا۔ سلطان محمود کی چال بیکار گئی کہ وہ ایک دستہ آگے بھیج کر دشمن کو آگے لائے گا۔

اُس نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا۔ کوئی ایک میل دُور اُسے سکھ پال کی فوج کا پھیلاؤ نظر آ رہا تھا۔ سلطان نے اپنے سالار سے کہا کہ سوار دستے کے دو حصے کر دو اور دونوں دستے بیک وقت دشمن کے دائیں بائیں پہلو پر حملہ کریں اور اُسے دبانے کی کوشش کریں۔۔۔ شہر میں فوج تیار کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں شہر سے پانچ سو سواروں کا ایک دستہ نکلا۔ نعرۂ تکبیر کی گرج سنائی دی۔ سواروں نے ایڑ لگائی اور دستہ ذرا آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اُن کے رُخ دشمن کے پھیلاؤ کے سروں کی طرف تھے۔

راج گوپال نے یہ چال بھی بڑی تیزی سے سمجھ لی۔ پھیلاؤ کو سکیڑ لیا کہ سواروں کو لپیٹ میں لے کر واپس نہ جانے دیا جائے۔ سواروں نے ۔۔۔ پہلوؤں پر حملہ کیا۔ سلطان دیوار پر کھڑا تھا۔ اُس نے شہر سے ایک پیادہ دستہ نکالا اور اسے دشمن کے بائیں پہلو پر بھیجا۔

ہدایت کے مطابق سوار اور پیادے پیچھے ہٹنے لگے اور دشمن کی زیادہ تر توجہ اپنے بائیں پہلو پر ہوگئی جہاں پیادوں نے حملہ کیا تھا۔ اس طرح دشمن کی محاصرے کی ترتیب ٹوٹ گئی، اور دشمن کی پیٹھ اُدھر کو ہوگئی جدھر سلطان محمود نے کمک روک رکھی تھی۔ نعمان تجربہ کار سالار تھا۔ اُس نے عقب سے حملہ بول دیا۔ اُس کے دستوں نے صبح طلوع ہونے سے بہت پہلے دریا پار کر لیا تھا۔ ہندوؤں کو بالکل توقع نہیں تھی کہ شہر سے باہر اُن کے عقب میں بھی فوج ہے۔ کمک میں زیادہ تر سوار تھے۔ اِدھر سے سلطان محمود نے کم سے کم نفری کے دستے شہر سے نکال دیئے۔ نعمان کے عقبی حملے نے ہندوؤں کے اوسان خطا کر دیئے۔ شہر کے دستوں نے الگ قیامت بپا کر دی۔ دشمن کا نکل بھاگنا ناممکن ہوگیا۔ اُس کے زخمی ہاتھیوں کی بھگدڑ نے اُسے اور زیادہ نقصان دیا۔

سورج نکل آیا تھا۔ ہندوؤں کے بے کار سے نقارے، نعرے اور مسلمانوں کے تکبیر کے نعروں کی گرج، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، گھوڑوں کے فلک شگاف شور میں دب گئے تھے۔ سلطان محمود دیوار پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر سکھ پال کے جھنڈے پر تھی جو ابھی گرا نہیں تھا۔ جھنڈا پیچھے یا دائیں بائیں جانے کی بجائے شہر کی طرف آرہا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا۔ نقصان دشمن کا ہو رہا ہے اور مسلمان غالب ہیں۔

سکھ پال کا جھنڈا جو ایک ہاتھی پر تھا، شہر کے دروازے پر آگیا۔ سلطان محمود کو ہاتھی پر ایک جواں سال چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ بلاشک و شبہ راجہ انند پال کا بیٹا سکھ پال تھا۔ وہ خود ہاتھی کو شہر میں نہیں لا رہا تھا بلکہ ہاتھی اُسے اِدھر لے آیا تھا۔ ہاتھی اپنے راج کمار کی طرح خوف زدہ تھا۔ جب ہاتھی شہر کے دروازے پر پہنچا تو مہاوت ہاتھی سے کود کر بھاگ گیا۔ ہاتھی کے ساتھ سکھ پال کا کوئی محافظ نہیں تھا۔ ہودے میں دو محافظ تھے جو جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔

ہاتھی کی پیشانی میں بیک وقت تین تیر اُتر گئے۔ ہاتھی بڑی بھیانک آواز سے چنگھاڑا۔ اِس کے ساتھ ہی اُوپر سے سلطان محمود غزنوی کی گرجدار آواز گرجی ”پکڑ لو اس

ہاتھی کو“ سکھ پال ہاتھی سے کود آیا اور شہر کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ سلطان محمود کے حکم پر اُسے پکڑ لیا گیا اور اُسے اُوپر دیوار پر لے گئے۔

”گھبراؤ نہیں لڑکے!“ سلطان محمود نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہاری جرأت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کوچ سے پہلے اپنے باپ سے پوچھ لیا ہوتا کہ غزنی کی فوج سے ٹکر لینے کی کتنی قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہاں سے اپنی جنگی قوت کا انجام دیکھو۔“

سکھ پال نے دیکھا۔ دُور دُور تک اُس کی بکھری ہوئی فوج کا کشت و خون ہو رہا تھا۔ ہر طرف مسلمان دندناتے اور نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ جن ہاتھیوں پر ہندوؤں کو ناز تھا، وہ منہ زور اور بے لگام اِدھر اُدھر چیختے چنگھاڑتے اور بھاگتے پھر رہے تھے — اور سکھ پال کانپ رہا تھا۔ اُسے اپنا پتا جی راج گوپال کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

”میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟“ سکھ پال نے پوچھا۔

”اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرو“ سلطان محمود نے کہا۔ ”فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے آپ کو یہ یقین دلاؤ کہ بت اور مورتیاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔ حقیقی خدا کو مانو اور اسی کی عبادت کرو۔ مجھے اسی خدا نے صرف اس مہم میں یہ تیسری فتح دی ہے۔“

”میں اپنے مذہب سے بیزار ہوں“ سکھ پال نے کہا۔

سلطان محمود نے مولوی سعید اللہ قاضی کو بلایا اور انہیں کہا کہ اس لڑکے کو لے جائیے۔ یہ قیدی نہیں لیکن یہ آزاد بھی نہیں۔ یہ اپنے مذہب سے بیزار ہے۔ مولوی سعید اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ اس نوجوان کی خوب خاطر تواضع کرو۔

تیسرے روز سلطان محمود نے ملتان کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس کے سامنے دو سو میل طویل مسافت تھی اور اُسے دو دریا، چناب اور راوی عبور کرنے تھے۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی۔ بارشیں سست ہو چکی تھیں۔ سلطان محمود نے جنگی قیدی

کی بیڑیاں کھلوا کر لوہے کے کڑے اُن کے گلوں میں ڈال دیئے تھے تا کہ پہیے پھنس نہ جائیں۔ جہاں بیل گاڑیاں دلدل، ریت یا چڑھائی کی وجہ سے سست ہو جاتی تھیں، جنگی قیدی گاڑیوں کو دھکیلتے تھے۔ اس سے رفتار سست نہ ہوئی۔

داؤد بن نصر بھیرہ سے اس اطلاع کا منتظر تھا کہ لاہور اور بٹھنڈہ کی فوج تیار ہے اور وہ بھیرہ کو محاصرے میں لینے کے لیے کوچ کرے۔ اُسے یہ اطلاع دینے والے بھیرہ میں قید ہو چکے تھے۔ داؤد کوچ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ہندوؤں کا نمک حلال کرنے کے لیے فوج کو تیار رکھے ہوئے تھا۔

اُسے بھیرہ سے تو کوئی اطلاع نہ ملی، ملتان کے گرد و نواح سے اُسے یہ اطلاع دی گئی کہ ایک فوج بڑی تیز رفتاری سے بڑھی آ رہی ہے۔ داؤد بن نصر دوڑا ہوا شہر کی دیوار پر چڑھ گیا اور ایک برج میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ فوج قریب آ گئی تھی۔ داؤد نے شہر کے دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا اور فوج کو محاصرے میں لڑنے کے لیے دیوار پر بلا لیا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے باہر فوج نے شہر کو محاصرے میں لے لیا۔

سلطان محمود غزنوی کے حکم سے داؤد بن نصر کو للکارا گیا کہ وہ شہر کے دروازے کھول دے اور صلح کے لیے باہر آ جائے، ورنہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

اس للکار کا جواب دیوار سے آیا۔ قرامطی مرنے سے پہلے شہر نہیں دیں گے۔ ہمت ہے تو آؤ اور دروازے کھلوا لو۔

سلطان محمود کو قرامطیوں کے متعلق غلط اطلاعیں ملی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے قرامطی لڑنے سے گریز کریں گے اور وہ جنگجو نہیں ہوں گے۔ اُنہوں نے جب مقابلہ شروع کیا تو سلطان محمود کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ غزنی کے مجاہد دیوار تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے تو اوپر سے تیروں کی اتنی بوچھاڑیں آتی تھیں کہ ان میں بمشکل آدھے زندہ واپس آتے تھے۔

سات دن محاصرہ رہا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ محاصرہ طویل نہیں ہوگا۔ آٹھویں روز اُس نے تمام شہر کے گرد گھوم کر اپنی فوج سے کہا کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ محاصرہ کر کے بیٹھے رہیں۔ خدا نے تمہیں ہر میدان میں فتح دی ہے۔ تم اس دیوار کو بھی توڑ لو گے۔ اپنے اللہ کے نام پر قربان ہو جاؤ۔ یہ وہ دشمن ہے جس نے اسلام میں باطل کی آمیزش کر رکھی ہے۔

سلطان نے اپنی فوج کو جوش دلایا اور محاصرہ اُٹھا کر فوج کو شہر کے دروازوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اُس نے درخت کٹوائے اور ان کے سیدھے اور مضبوط تنے کاٹ کر دو دو ہاتھیوں کے درمیان سیدھے باندھ دیئے۔ ہاتھی دوڑتے ہوئے دروازے تک جاتے تھے تو شہتیر دروازے سے ٹکراتے تھے۔ بیلوں کو بھی استعمال کیا گیا۔ انسانوں نے بھی دروازے توڑنے کی کوشش کی اور جانیں قربان کرتے گئے۔

یہ سلسلہ تین روز چلتا رہا۔ ہر دروازے کے اوپر تیروں کا مینہ برسایا گیا۔ تکبیر کے نعروں میں دروازوں کے ساتھ ہاتھی ٹکراتے اور زخمی ہو کر بھاگتے رہے۔ اندر کی فوج کی توجہ دروازوں کی طرف کر کے دیوار میں شگاف ڈالنے کی بھی کوشش ہوتی رہی۔ شہر کے اندر شہریوں نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ وہ نعروں اور دروازوں کے دھماکوں سے خوف زدہ ہوئے جا رہے تھے۔

دو مؤرخ عطبی اور عنصری لکھتے ہیں کہ اندر مسلمانوں کو جب پتہ چلا کہ حملہ آور غزنی کے مسلمان ہیں تو انہوں نے اندر سے دروازے کھولنے کیلئے ہلہ بول دیا لیکن سب کو قتل کر دیا گیا۔

آخر چوتھے روز داؤد بن نصر نے گھبرا کر سلطان محمود کو پیشکش کی کہ وہ بیس ہزار درہم سالانہ ادا کرتا رہے گا اور اُس کی اطاعت قبول کرے گا۔ بعض مؤرخوں نے یہ رقم بیس لاکھ لکھی ہے۔ سلطان محمود نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ اُس نے دروازوں پر ایک ہلہ بولا اور دو تین دروازے توڑ لیے۔ قرامطیوں نے اپنے عقیدے کے تحفظ کے لیے خون کی بے دریغ قربانی دی۔ انہوں نے ملتان کی گلیوں میں مسلمانوں کے ساتھ

زندگی کا آخری معرکہ لڑا۔ اُن کی عورتیں اور بچے تک لڑے، لیکن مسلمانوں کے قہر کے آگے فنا ہوتے گئے۔

عتبی اور عنصری لکھتے ہیں: سلطان محمودؒ کو جب پتہ چلا کہ مسلمانوں نے اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، اور قرامطیوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں، تو اُس نے تلوار نکال لی اور قرامطیوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ شہر کے مغربی طرف گلیاں اور نالیاں قرامطیوں کا خون ندی کی طرح بہہ نکلا۔ سلطان محمودؒ نے اتنے قرامطی قتل کیے کہ اس کے بعد اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر اکڑ گیا۔ اُنگلیاں کھلتی نہیں تھیں۔ ہاتھ خون سے دستے کے ساتھ چپک بھی گیا تھا۔ اُس کا ہاتھ دستے سمیت گرم پانی میں رکھا گیا تو اُس کی انگلیاں کھلیں۔

داؤد بن نصر لاپتہ ہوگیا۔ بہت تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ سے بھی لاپتہ ہوگیا اور قرامطی فرقہ ایک بھولی بسری کہانی بن کے رہ گیا۔ سلطان محمودؒ نے قرامطیوں کی عبادت گاہ کو زمین سے ملا دیا تھا۔

عالم، درویش اور اُن کے گروہ کا کوئی آدمی زندہ نہ رہا۔

ملتان میں قرامطیوں کے نشان اور یادگاریں مٹا کر سلطان محمودؒ نے ملتان کو اپنا مستقل اڈہ بنانے کا منصوبہ بنایا مگر غزنی سے ایک قاصد آیا جسے ہرات کے گورنر ارسلان جاذب نے بھیجا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ کاشغر کے بادشاہ ایلک خان نے غزنی کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے۔ سلطان محمودؒ دسر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

اُس نے ابوعلی سنجوری کو ملتان کا امیر یا گورنر مقرر کیا اور بھیرہ پہنچا۔ وہاں اُسے پتہ چلا کہ سکھ پال نے اسلام قبول نہیں کیا ہے اور نہ اب سلطان محمود کا مرید اور غلام بنا رہے گا۔ سلطان محمودؒ کا دماغ اب غزنی پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سکھ پال کو بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا۔ سلطان کو کہا گیا کہ سانپ کے بچے پر بھروسہ نہ کرے لیکن وہ نہ مانا اور غزنی کے لیے روانہ ہوگیا۔

سکھ پال آستین کا سانپ ثابت ہوا۔

جب دشمن پر اعتبار کیا

سُلطان محمود غزنوی نے راجہ انند پال کو شکست دی اور اپنی راجدھانی میں جانے کی بجائے کشمیر کے کسی مقام پر چلا گیا۔ پھر محمود غزنوی نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کو ایسی شرمناک شکست دی کہ اس ہندو راجے نے خودکشی کر لی۔ اس کے بعد سلطان نے قرامطی فرقے کو ختم کر کے اسلام کے چہرے سے یہ بدنما داغ دھو ڈالا اور ملتان کی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ محمود غزنوی اپنی جس کامیابی پر بہت خوش تھا، وہ انند پال کے بیٹے سکھ پال کا قبولِ اسلام تھا۔ سکھ پال تو لاہور سے بڑے طمطراق سے بھیرہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اُس کی ماں نے اس امید پر اُسے بھیرہ بھیجا تھا کہ وہ محمود غزنوی کو قیدی بنا کر لائے گا اور اپنے باپ کا جانشین بنے گا، لیکن اُسے سلطان محمود غزنوی کے آگے نہ صرف ہتھیار ڈالنے پڑے بلکہ اُس نے اپنا مذہب بھی سلطان کے قدموں میں رکھ دیا۔

سکھ پال نے مولوی سعید اللہ قاسمی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اس عالم نے سکھ پال کا نام نواسا شاہ رکھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے مشیروں کے منع کرنے کے باوجود اس نومسلم کو بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا۔ امیر کی حیثیت آج کے گورنر کی ہوا کرتی تھی۔

راجہ انند پال اور اُس کے بیٹے سکھ پال کو ہندوستان میں یہ اہمیت حاصل تھی کہ یہ خاندان پنجاب کا حکمران تھا اور پنجاب ہندوستان کا دروازہ تھا۔ پنجاب کی اہمیت سے سلطان محمود واقف تھا۔ اُس نے بھیرہ اور ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے ہندوستان کا دروازہ توڑ لیا تھا مگر اُسے اس دروازے میں داخل ہوتے ہی غزنی واپس جانا پڑا کیونکہ

اُسے اطلاع ملی تھی کہ کاشغر کے حکمران ایلک خان نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔

اُس نے ملتان سے روانہ ہوتے ہی تیز رفتار قاصد کو اس حکم کے ساتھ بھیرہ بھیجا کہ وہاں کا امیر نواسا شاہ (سابق سکھ پال) اور فوج کے سالار اور نائب سالار اُسے بھیرہ کے باہر دریائے چناب پر ملیں۔ ملتان کے امیر ابوالفتح لودھی اور ملتان میں رہنے والی فوج کے سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ ساتھ لے آیا تھا۔

سلطان محمود جب بھیرہ کے قریب سے گزر کر دریائے چناب کے کنارے پہنچا تو جن لوگوں کو اُس نے بلایا تھا، وہ وہاں موجود تھے۔ سب کو توقع تھی کہ سلطان وہاں کھانے کے لیے رکے گا۔ انہوں نے دریا کے کنارے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا لیکن سلطان نے کھانے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ گھوڑے سے اُترا اور سب کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"میں ہندوستان سے اتنی جلدی واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔" اُس نے کہا۔ "آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیوں آیا تھا، پھر بھی آپ کو یاد دلا دیتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جانے کے بعد آپ میں سے کوئی ہندوستان کے طلسم میں گرفتار ہو جائے۔ ہم یہاں اسلام کے نور کے بیج کو ہرا بھرا کرنے آئے ہیں۔ ہم یہاں اُس خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ ہم یہاں کے لوگوں کو بتانے آئے ہیں کہ خدا پتھر کے نہیں ہوا کرتے۔ ہم اپنے رسولِ مقبول صلعم کا پیغام سنانے آئے ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب یہ پیغام مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا رہا، اسلام پھلتا پھولتا رہا۔ اگر بادشاہوں کا نشہ جب طاری ہوا تو یہ مشعل ٹمٹمانے لگی اور اس کے نیچے اندھیرا ہو گیا...

"ہندوستان میں بھی یہ مشعل آئی تھی۔ محمد بن قاسم نے اس سرزمین کو خدا کے نور سے منور کر دیا تھا۔ مگر یہاں کے آسمان نے وہ وقت بھی دیکھا کہ یہاں مسجدیں ویران اور اذانیں خاموش ہو گئیں۔ بت پرستوں نے مسلمانوں کو تلوار کی نوک پر ہندو بنانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ زمین تنگ ہو گئی۔ مسجدوں کی جگہ بت خانے اُبھر آئے۔ تلوار کے ساتھ دولت اور عورت کو بھی اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہی

دو چیزیں ہیں جو ایمان خرید لیا کرتی ہیں اور انہی دو چیزوں نے ہندوستان میں ایمان فروش پیدا کیے ہیں....

"اور بادشاہی کی ہوس نے ہمارے بھائیوں کو اندھا کر دیا ہے۔ کاشغر کے ایلک خان نے غزنی پر حملہ کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں اُس کے دوست کون ہیں۔ وہ سب ہمارے دشمن نہیں اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ میرے عزم اور میرے نظریات سے اچھی طرح آگاہ ہیں لیکن وہ اُن دھتکارے ہوئے لوگوں میں سے ہیں جن کے دماغوں، آنکھوں اور کانوں پر خدا نے مہریں لگا دی ہیں اور اُن کے لیے بخشش کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اپنی رعایا کو بتاتے ہیں کہ یہی اسلام ہے جس کے وہ پیروکار ہیں اور مذہب کے پردے میں اپنے تخت و تاج کی سلامتی کے لیے لوگوں کو خانہ جنگی پر اُکساتے اور بھائی کو بھائی کا دشمن بناتے ہیں......

"وہ اگر سچے اسلام کے شیدائی ہوتے تو میرا ساتھ دیتے اور ہندوستان کی طرف کوچ کرتے جہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات صرف اس لیے تنگ کیا جا رہا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ میری نظریں مستقبل میں بہت دور تک دیکھ رہی ہیں۔ اگر ہم نے اس خطے میں اسلام کو زندہ نہ کیا تو یہاں ہندوؤں کے ہاتھوں ہمیشہ اللہ کا نام لینے والوں کا قتلِ عام ہوتا رہے گا۔ انہیں مورتیاں اور بت پوجنے والوں سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انہیں ہم اپنے ملک میں لے چلیں لیکن یہ شکست اور پسپائی ہو گی اور اس اقدام سے اسلام کی سلطنت سکڑتی جائے گی۔ ہر ملک خدا کی سرزمین ہے، اور جو سرزمین خدا کی ہے وہاں اُس کی ذاتِ باری کے پرستاروں کا وجود لازمی ہے۔ اسلامی سلطنت کی کوئی سرحد نہیں۔ ہم ہندوستان کو اسلامی سلطنت میں شامل کریں گے یا اس کے کچھ حصے میں اپنی حکومت قائم کر کے اسے اسلام کا مستقر اور قلعہ بنائیں گے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم روزِ محشر خدا کے حضور سرخرو نہیں ہوں گے...

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے اپنے بھائی میرے راستے [illegible]

ہو گئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں غزنی سے زندہ واپس آسکوں گا یا نہیں۔ اگر میں نہ آسکا تو یہ آپ کا فرض ہوگا کہ میں نے جس مہم کا آغاز کیا ہے اُسے آپ سر کریں.... اگر آپ دنیاوی جاہ و حشمت میں پڑ گئے تو سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا.... بتوں کے آگے اپنے خدا کو شرمسار نہ کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس خطے میں صدیوں بعد اذانیں گرجنے لگی ہیں۔ ان اذانوں کو خاموش نہ ہونے دینا۔"

سلطان محمود غزنوی کی آواز آخر میں آکر رقت میں دب گئی۔ اُس نے کھانا نہ کھایا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اُس نے فوج کو کوچ سے روکا نہیں تھا۔ فوج دریا پار کر رہی تھی۔ اُسے بہت جلدی غزنی پہنچنا تھا۔

محمود غزنوی جن فوجی حکام اور اُمرا کو پیچھے چھوڑ گیا تھا، اُن میں نو مسلم نواسا شاہ بھی تھا۔ محمود غزنوی فارسی زبان میں بول رہا تھا، اس لیے ایک ترجمان نواسا شاہ کے پاس کھڑا ہو گیا تھا تاکہ وہ اُسے اُس کی زبان میں بتاتا جائے کہ سلطان کیا کہہ رہا ہے۔ جب سلطان چلا گیا تو سب وہاں سے شہر کی طرف چل پڑے۔ نواسا شاہ پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ساتھ کسی نے بات کرنے کی کوشش کی بھی تو اُس نے مسکرانے کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

لاہور میں اُس کی ماں، رانی پریم دیوی اپنے محل کے ایک کمرے میں اداس بیٹھی تھی۔ اُس کے خواب بھیرہ کے میدانِ جنگ میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے۔ اُس کا بیٹا بھیرہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ وہ تو راجکمار تھا۔ پریم دیوی کے آنسو بہنے لگے۔ اُس کا خاوند انند پال کشمیر بھاگ گیا تھا۔ وہ شاید اس لیے واپس نہیں آرہا تھا کہ محمود غزنوی لاہور پر حملہ کر کے قابض ہو چکا ہوگا۔ رانی پریم دیوی کو یہ غم کھا رہا تھا کہ اُس کا سوکن کا بیٹا ترلوچن پال باپ کی گدی کا جانشین ہوگا.... کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رانی نے دیکھا اُس کا سیناپتی راج گوپال آیا تھا۔

"... میرے راجکمار کی کیا خبر آئی ہے؟" رانی پریم دیوی نے پوچھا۔ "اُس سے

یہ مسلمان نہ جانے کیسے کیسے پیچ کام کرا رہے ہوں گے۔ اُسے انھوں نے قید خانے میں ڈال رکھا ہوگا۔ اُسے جانوروں جیسی خوراک دیتے ہوں گے۔"

اُس کے آنسو بہنے لگے۔ سندھیائی ہوئی آواز میں بولی — "وہ میرے بیٹے کو قتل کر چکے ہوں گے۔"

راج گوپال سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ شکست خوردہ سیناپتی (سپہ سالار) تھا۔ بھیرہ کی لڑائی سے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور لاہور پہنچا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں راج گوپال؟" رانی نے اُسے غصے سے کہا — "تم میرے بیٹے کو قید سے چھڑا نہیں سکتے؟ کیا تم اپنی فوج کے ایک سو آدمی راجکمار کے لیے قربان نہیں کر سکتے؟ کیا ہماری فوج میں راج دربار کی عزت پر قربان ہونے والے سپاہی نہیں ہیں؟ کیا وہ مسلمانوں کے بھیس میں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے جہاں میرا راجکمار قید ہے؟" اُس نے ذرا بلند زبان میں کہا — "کیا تم بھول گئے ہو کہ وہ مہاراج انند پال کا نہیں، تمہارا بیٹا ہے؟"

"میں کچھ بھی نہیں بھولا رانی!" راج گوپال نے کہا۔ "میں سب کچھ سوچ چکا ہوں۔ میں نے راجکمار کو بھیرہ سے اغوا کر لانے کے لیے آدمی تیار کر لیے تھے لیکن بہت بری خبر آئی ہے۔"

"کیا خبر آئی ہے؟" رانی پریم دیوی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سکھ پال اب سکھ پال نہیں رہا" — راج گوپال نے کہا۔ "وہ نواسا شاہ بن چکا ہے۔"

"کیا اُسے زبردستی...؟"

"ہاں رانی!" — راج گوپال نے کہا — "اُسے مسلمان بنا لیا گیا ہے اور محمود نے اُسے یہ انعام دیا ہے کہ اُسے بھیرہ کا امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ لاہور کی گدی کا جانشین نہیں بن سکا، بھیرہ کا حاکم بن گیا ہے۔"

"وہ مر جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا" — رانی نے آہ بھر کر کہا۔ "اُسے مر جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنا مذہب نہ چھوڑتا.... کیا پتہ نہیں چلا کہ اُس نے اپنی مرضی سے اپنا

مذہب چھوڑا ہے یا زبردستی اُسے مسلمان بنایا گیا ہے؟"

"اگر اُس پر زبردستی کی جاتی تو اُسے بھیرہ کا امیر نہ بنایا جاتا"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "وہ نوجوان ہے۔ مسلمانوں کے جھانسے میں آگیا ہے۔"

"یہ تمہارا پاپ ہے"۔۔۔ رانی پریم دیوی نے کہا۔۔۔ "تم اُسے قید میں چھوڑ کر خود بھاگ آئے تھے۔"

"کیا تم ساتھ نہیں تھیں؟"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "تم نے اپنی آنکھوں میدانِ جنگ دیکھا ہے۔ ہم پر دریا کی طرف سے جو حملہ ہُوا تھا، اس کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی۔ رانی! میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہمیں بھیرہ پر حملہ نہیں کرنا چاہئے۔ تمہارا خیال تھا کہ مسلمانوں کی آدھی فوج کٹ چکی ہے اس لیے مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری فوج پر مسلمانوں کی دہشت طاری ہے اور یہ پشاور سے بھاگی ہوئی فوج ہے۔ اس فوج کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارا راجہ بھگوڑا ہے۔ وہ ابھی تک اپنی راجدھانی میں واپس نہیں آیا۔"

"مجھے اس مہاراجہ کی رانی کہلاتے ہوئے شرم آتی ہے"۔۔۔ رانی نے کہا۔۔۔ "اگر وہ مر گیا تو میں چتا نہیں چڑھوں گی۔ میں ایک بھگوڑے خاوند کی چتا پر اپنے آپ کو نہیں جلاؤں گی۔"

"یہ میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "اگر مہاراج کے خاندان نے تمہیں زبردستی چتا چڑھایا تو میں تمہیں بچا کر اتنی دُور لے جاؤں گا جہاں ہم تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"تم بھی اتنے بہادر نہیں رہے کہ میں تمہارے بھروسے کوئی بات کر دوں"۔۔۔ رانی پریم دیوی نے آہ لی۔۔۔ "تم نے میری محبت کی بھی پرواہ نہ کی۔ میں اپنے مہاراجہ خاوند کو تمہاری خاطر دھوکہ دے رہی ہوں۔ کیا راج دربار کا کوئی آدمی خواہ وہ کتنے ہی اونچے رتبے کا ہو، ایک رانی کے کمرے میں اس طرح آسکتا ہے جس طرح تم آتے ہو؟ سینا پتی کو ہم اتنا بڑا آدمی نہیں سمجھا کرتے۔"

"کیا تم احسان جتا رہی ہو رانی؟"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "تم بھی بہت کچھ بھول

رہی ہو۔ میں نے تمہاری محبت کی خاطر یہ خطرہ مول لیا تھا کہ بھیرہ پر جا حملہ کیا اور ذلیل و خوار ہوا۔ تمہارے حکم سے فوج کو شہر سے باہر نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ مہاراج آ گئے تو میں انہیں کیا جواب دوں گا؟ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں زندہ رہی تو تم بھی زندہ رہو گے"۔۔۔ رانی نے کہا۔۔۔ "مہاراج کو میں جواب دوں گی۔ تم راجکمار سُکھ پال کو بھیرہ سے نکالنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے جس آدمی نے خبر دی ہے کہ سُکھ پال مسلمان ہوگیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ اُس نے اپنی مرضی سے اور خوشی سے اسلام قبول کیا ہے"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "اسی لیے اُسے بھیرہ کا امیر بنایا گیا ہے۔"

"اُسے اغوا کراؤ"۔۔۔ رانی نے کہا۔۔۔ "اُسے یہاں تک لے آؤ۔ اُس نے میرا دُودھ پیا ہے۔ میرے دودھ میں ملاوٹ نہیں تھی۔ اُسے ہندو ماں کا دودھ مسلمان نہیں رہنے دے گا۔ اُسے لاؤ۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ مہاراج مجھے اور تمہیں شکست معاف کر دیں گے، یہ بھی برداشت نہیں کریں گے کہ راجکمار مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اُن کا مذہب قبول کر کے انہی کا ہو کے رہ جائے۔ اگر میری اور اپنی خیر چاہتے ہو تو سُکھ پال کو بہلا پھسلا کر لاؤ یا اسے اغوا کر کے لاؤ۔ خود جاؤ۔ جان پر کھیل جانے والے فوجی تیار کرو۔ یہ کام کرنا ہے۔ وہ تمہارا خون ہے۔ وہ اُس عورت کا بیٹا ہے جس نے تمہاری خاطر اپنے خاوند کو دھوکہ دیا ہے... میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے میرے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ خاوند شکست کھا کر بھاگ گیا ہے اور بیٹا مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ میں پاگل ہوں۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔۔۔ "اپنے راجکمار کو میں خود لاؤں گی۔ نہ لا سکی تو وہیں مر جاؤں گی۔"

"یہ میرا کام ہے"۔۔۔ راج گوپال نے کہا۔۔۔ "اتنا مت تڑپو۔ میں انتظام کرتا ہوں۔ میں اُسے لے آؤں گا۔"

بھیرہ میں ایک سالار کے گھر میں محمود غزنوی کی فوج اور شہری انتظامیہ کے

چار پانچ حکام بیٹھے تھے۔

"ہم پر سلطان بڑی نازک ذمہ داری ڈال گئے ہیں۔" سالار نے کہا۔ "ہم نے لاہور کے جاسوسوں کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا ہے۔ راجہ انند پال ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ وہ ہمارے ساتھ ٹکر لینے کی تیاریاں کر رہا ہوگا۔"

"سب سے زیادہ نازک ذمہ داری تو یہ ہے کہ سلطان ایک نومسلم کو یہاں کا امیر مقرر کر گئے ہیں۔" نائب سالار نے کہا۔ "کیا ہمیں اس امیر پر اعتماد کرنا چاہیے؟"

"اگر آپ سانپ کی کینچلی بدل دیں تو وہ سانپ ہی رہے گا، اُس کی فطرت نہیں بدلے گی۔" شہری انتظامیہ کے ایک حاکم نے کہا۔ "آپ لوگ غزنی سے آتے ہیں۔ میں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ ہندو کو مسلمان بنا سکتے ہیں لیکن اُسے مسلمانوں کا دوست نہیں بنا سکتے۔ بھیرہ میں کئی ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن وہ عام اور بے ضرر لوگ ہیں۔ وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ میں تسلیم نہیں کر سکتا کہ ایک راجکمار جس کے دادا کو آپ نے شکست دی اور اس نے خودکشی کر لی اور جس کے باپ کو آپ نے شکست دی اور وہ ابھی تک روپوش ہے، اس راجکمار کے دل سے آپ انتقام کی آگ کس طرح سرد کر سکتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ محمود جیسے دانشمند سلطان نے کیا سوچ کر ایک ایسے نومسلم کو اتنا بڑا اعزاز دے دیا ہے۔"

"یہ نومسلم اپنی عادتیں کس طرح بدل سکے گا؟" ایک اور نے کہا۔ "یہ شراب کا عادی ہوگا۔ ان کے ہاں ہر رات ناچ گانے ہوتے ہیں، جوان لڑکیاں ان کی خدمت میں موجود رہتی ہیں۔ کیا یہ اتنی جلدی مومن بن گیا ہوگا؟"

"ہم اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" سالار نے کہا۔ "سلطان کا حکم ہے کہ امیر کی اطاعت کرو۔"

"لیکن اسلام کا حکم یہ ہے کہ امیر گناہ کرے یا غدار ثابت ہو تو اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دو۔" ایک اور حاکم نے کہا۔ "اور اُس کی جگہ اُسے دو جو مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے اس رتبے اور ذمہ داری کے اہل ہو۔"

"تو ہمیں نظر رکھنی پڑے گی کہ امیر نواسا شاہ ہمیں دھوکہ تو نہیں دے رہا۔" سالار نے کہا۔ "اُس کے حکم سے راجہ بجی رائے کی فوج کے تمام ہندو جنگی قیدیوں کو باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے میری موجودگی میں سلطان محمود کی وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے۔"

"ہندو سپاہی کیسے ہیں؟" ایک شہری حاکم نے پوچھا۔

"اچھے ہیں۔" سالار نے جواب دیا۔ "ہمارے سپاہیوں کے ساتھ مل کر اور اچھے ہو جائیں گے۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ کچھ فوج سلطان اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر انند پال نے حملہ کر دیا تو ہماری فوج اتنی تھوڑی ہے کہ مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ سلطان اجازت دے گئے ہیں کہ ہندوؤں کو فوج میں شامل کر لیا جائے اور ان کی تنخواہیں زیادہ مقرر کی جائیں اور انہیں مراعات بھی زیادہ دی جائیں۔"

یہ محفل کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہو گئی۔

نواسا شاہ نے اپنی عادتیں بدل لی تھیں۔ اُس نے کبھی شراب کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ مولوی عبداللہ قاسمی اُسے قرآن پڑھاتے اور معنی بھی سمجھاتے تھے۔ اُس نے نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا۔ ایک روز اُس نے اُن پانچ ہزار ہندوؤں کو ایک میدان میں لانے کا حکم دیا جو اُس وقت تک سلطان محمود کی فوج کا اہم حصہ بن چکے تھے۔

"میں تم میں سے کسی کو بھی نہیں کہوں گا کہ وہ اپنا مذہب بدل لے اور مسلمان ہو جائے۔" اُس نے ہندوؤں کے دستوں سے خطاب کیا۔ "مذہب تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اسلام قبول کر کے جو سکون پایا ہے وہ مجھے ہندو مت میں نہیں ملا تھا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تم لوگوں نے مسلمانوں سے کس طرح شکست کھائی ہے۔ تم قلعہ بند ہو کر بھی نہ لڑ سکے اور تم کھلے میدان میں بھی نہ لڑ سکے، حالانکہ مسلمان بہت دُور سے آئے تھے اور ان کے پاس نفری بھی کم تھی اور ساز و سامان بھی کم تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں یہاں سے کوئی

مدد نہیں ملے گی مگر انھوں نے فتح حاصل کرلی۔ یہ اللہ کی قوت ہے جو ہم میں سے کسی میں بھی نہیں تھی ....

"میں نے وہ قوت حاصل کرلی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اپنا مذہب بدلنے کے لیے کوئی نہیں کہے گا۔ یہ فیصلہ تم خود کرو۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس کا نمک کھایا ہو اُس کے ساتھ غداری نہ کرنا۔ میں نے تمہیں بہت بڑی غلامی سے بچایا ہے۔ تم جنگی قیدی ہو پھر غلام بنا لیے گئے۔ سلطان تمہیں غلاموں کی حیثیت سے غزنی لے جانا چاہتے تھے۔ بھیرہ سے ملتان تک کا سفر یاد کرو جب تم گھوڑوں اور بیلوں کی طرح رسد کی گاڑیاں دھکیلتے اور گھسیٹتے گئے تھے۔ تمہاری گردنوں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے وہ کڑے کٹوا کر تمہیں مویشی سے انسان بنایا ہے۔ تم سپاہی ہو جنگجو ہو۔ تمہاری عزت اسی میں ہے کہ تمہاری تلواریں تمہارے پاس ہوں۔ اپنی عزت کو قائم رکھنا تمہارا کام ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف ہو۔ کسی مسلمان کے خلاف کوئی شکایت ہو تو مجھے بتاؤ۔ اگر تم سچے ہندو ہو تو سچے بن کر دکھاؤ۔ میرا باپ مہاراجہ آنندپال ہم پر حملہ کرے گا۔ تم دیکھنا کہ میں اپنے باپ کے خلاف کس طرح لڑوں گا۔"

اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ کئی آوازیں سنائی دیں ___"ہم غداری نہیں کریں گے۔ ہم مسلمانوں پر ثابت کریں گے کہ ہندو دھوکہ نہیں دیا کرتے۔"

نواسا شاہ کے حکم سے ہر ہندو فوجی کو چاندی کے دس دس درہم انعام دیا گیا۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سکھ پال نے اسلام قبول کرنے سے پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ بھیرہ کا مندر ہندوؤں کی عبادت کے لیے محفوظ رہنے دیا جائے یا سلطان محمود نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مندر کو نہیں چھیڑا تھا۔ اُسے شاید اپنی فوج کی کمی کا احساس تھا اس لیے اُس نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا تھا۔ بہرحال بھیرہ کا مندر محفوظ تھا۔

اُس رات مندر میں چھ اجنبی پنڈت کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پنڈت انہیں کہ رہا تھا ___"قتل کرنا آسان ہے۔ وہ کبھی کبھی شہر سے باہر بھی جایا کرتا ہے۔ ایک تیر کافی ہے۔ اگر قاتل پکڑا گیا تو ہم اس ایک آدمی کی قربانی دے سکتے ہیں۔"

"ہم اُسے قتل کرنے نہیں آئے" ___ ایک اجنبی نے کہا۔ "اُسے اغوا کرکے لاہور لے جانا ہے۔ اس کی ماں اسے زندہ اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہے۔"

"میں بھی اُسے زندہ ہی دیکھنا چاہتا ہوں" ___ پنڈت نے کہا ___"لیکن ہندو کے روپ میں۔ میں اسے نواسا شاہ سے پھر سکھ پال بنانے کے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ اس نے اپنی فوج کی ہی توہین نہیں کی، اپنے مذہب کو ناپاک کر دیا ہے۔ ہم نے ہزاروں مسلمانوں کو ہندو بنایا ہے۔ اگر ہندو راجے مہاراجے مسلمان ہونے لگے تو یہ مندر کھنڈر بن جائیں گے اور دیوی دیوتاؤں کا ہم پر قہر نازل ہوگا۔"

"آپ ہماری رہنمائی کریں" ___ ایک اجنبی نے کہا ___"ہمیں بتائیں کہ سکھ پال کب شہر سے باہر نکلے گا یا اُسے شہر سے باہر نکالنے کا کوئی ذریعہ پیدا کریں ... کیا آپ اسے کسی جال میں لا سکتے ہیں؟"

پنڈت گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ___"ہاں میں ایک جال تیار کر سکتا ہوں۔ تم مندر میں ہی ٹھہرے رہو۔ یہاں تم پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ ایک دو دن انتظار کرو ... میں حیران ہوں کہ وہ اتنی جلدی اتنا پکا مسلمان کس طرح بن گیا ہے۔"

"پکے ذہن کا جوان آدمی ہے" ___ ایک آدمی نے کہا ___"مسلمانوں کے جھانسے میں آگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ محمود اسے یہاں کے ہندوؤں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرے گا ورنہ غزنی کا سلطان ایسی حماقت نہیں کر سکتا کہ کل جس نے اُس سے لڑ کر ہتھیار

ڈالے ہوں اور اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا ہو، اُسے محمود اتنے بڑے علاقے کا حکمران بنا دے۔ اپنے مذہب اور ملک کے لیے سُکھ پال کو یہاں سے غائب کرنا لازمی ہے خواہ ہماری جانیں ہی چلی جائیں۔

ان چھ آدمیوں کو راج گوپال اور راجہ انند پال کی رانی پریم دیوی نے سُکھ پال کے اغوا کے لیے بھیجا تھا۔ یہ لاہور کی فوج کے چنے ہوئے بہادر اور ذہین آدمی تھے۔ رانی نے انہیں سونے کی صورت میں انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہ کامیابی کی صورت میں انہیں دو راتیں راج محل میں رکھا جائے گا جہاں وہ ویسی ہی عیش و عشرت کریں گے جیسی ہمارا جے کرتے ہیں۔ انعام کے لالچ کے علاوہ ان چھ آدمیوں میں مذہب کا جنون پیدا کیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ہندو راجکمار کو مسلمانوں کے قبضے سے نہ چھڑا سکے تو دیوتاؤں کا قہر انہیں بھسم کر ڈالے گا۔

یہ چھ آدمی خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ درویشوں کے لباس میں بھیرہ میں داخل ہوئے اور رات کے اندھیرے میں مندر میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے پنڈت کو بتایا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ وہ نواسا شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اُسے اٹھا لے جانے کو تیار ہیں۔ پنڈت نے انہیں روک دیا تھا کیونکہ اس طریقے سے کامیابی کا کم اور مارے جانے کا خطرہ زیادہ تھا۔ پنڈت نواسا شاہ کو کسی پھندے میں لانے کی سوچ رہا تھا۔

دو تین روز بعد پنڈت کو پتہ چلا کہ امیر بھیرہ کہیں سے واپس آتے ہوئے مندر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ پنڈت مندر سے نکلا اور راستے میں کھڑا ہو گیا۔ نواسا شاہ گھوڑے پر سوار آ رہا تھا۔ دو گھوڑ سوار جو محافظ تھے، اُس کے آگے آگے تھے اور چار گھوڑ سوار اُس کے پیچھے تھے۔ پنڈت اور آگے ہو گیا۔ آگے والے محافظوں نے اُسے پیچھے ہٹ جانے کو کہا لیکن وہ نہ ہٹا۔ اس نے نواسا شاہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے پھر تعظیم میں جھک کر دوہرا ہو گیا۔ نواسا شاہ نے گھوڑا روک لیا۔ پنڈت کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ نواسا شاہ کو سُلطان محمود غزنوی نے خاص طور

پر کہا تھا کہ وہ چونکہ ہندوستانی ہے اور ہندو بھی رہا ہے اس لیے وہ یہاں کے لوگوں، خصوصاً ہندوؤں کی فطرت اور عادات سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ وہ بھیرہ اور گرد و نواح کے لوگوں سے ملتا ملاتا رہے اور ان کی شکایتیں سُنے اور انہیں ہر لحاظ سے مطمئن اور خوش رکھے تاکہ یہاں کے لوگ اپنے آپ کو غلام رعایا نہ سمجھیں۔

اسی ہدایت کے تحت نواسا شاہ باہر نکلا تھا۔ وہ وہاں کے کسانوں سے مل کر آ رہا تھا۔ پنڈت کو اُس نے راستے میں ہاتھ جوڑے کھڑا دیکھا تو وہ گھوڑے سے اتر آیا اور پنڈت سے پوچھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے؟

پنڈت نے اُسے دعائیں دے کر کہا۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے جو بہتر سمجھا وہ کیا ہے۔ ہم سلطان محمود غزنوی کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی قدر کی اور آپ کو یہاں کی حکمرانی عطا کر دی۔“

”اس کے علاوہ آپ کو کچھ کہنا ہے؟“ ۔ نواسا شاہ نے کہا۔ ”اپنی اور سلطان کی تعریفیں سُننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ اپنی کوئی شکایت، کوئی تکلیف، کوئی مسئلہ بیان کریں۔“

”کوئی شکایت نہیں“ ۔ پنڈت نے کہا۔ ”ایک عرض ہے۔ حضور ہر جگہ جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں کی مسجدوں میں بھی گئے ہیں لیکن آپ مندر کو بھول گئے ہیں۔ کبھی وہاں بھی آئیں۔“

”مندر کی مرمت کی یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟“

”نہیں حضور!“ ۔ پنڈت نے کہا۔ ”کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اسے شکایت کہیں، جو کچھ بھی کہیں، بات یہ ہے کہ شہر کے سرکردہ ہندو کہتے ہیں کہ امیر ہر جگہ جا کر لوگوں کی شکایتیں سنتے ہیں، مندر میں نہیں آتے۔ شاید ہمیں پسند نہیں کرتے۔“

”میں کسی روز آؤں گا“ ۔ نواسا شاہ نے کہا۔

”دن اور وقت بتا دیں“ ۔ پنڈت نے کہا۔ ”ہم آپ کے رتبے کے مطابق کوئی انتظام کر لیں گے۔ دست بستہ حاضر رہیں گے۔“

نواساشاہ نے سوچ کر تین روز بعد کا دن اور وقت بتا دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ پنڈت مندر میں گیا۔ لاہور سے آئے ہوئے چھ آدمی اس کے انتظار میں تھے۔ پنڈت نے انہیں بتایا کہ سکھ پال فلاں دن مندر میں آ رہا ہے اور وہ اس کے لیے جال تیار کرے گا۔

"لیکن تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑے گا۔" پنڈت نے کہا۔ "ہو سکتا ہے میں نے جو سوچا ہے، وہ میری امید کے مطابق پورا نہ ہو۔ میری ایک کوشش ہے۔ سکھ پال جوان آدمی ہے۔ میں ان مہاراجوں اور راجکماروں کی کمزوریوں اور عادتوں سے واقف ہوں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں مہاراجوں والی عیش و عشرت حرام ہے۔"

وہ دن آ گیا جس دن نواساشاہ کو مندر میں جانا تھا۔ مندر کے دروازے پر پنڈت نے پھولوں کے لمبے لمبے ہار لٹکا رکھے تھے۔ مندر کے ایک بڑے کمرے کو دلہن کے کمرے کی طرح سجایا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو تھی جو نشے کی کیفیت طاری کرتی تھی۔ پھل اور میوے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ چار نوعمر لڑکیاں کمرے میں کھڑی تھیں۔ نواساشاہ اس کمرے میں داخل ہوا تو لڑکیوں نے خوشنما ٹوکریاں اٹھائیں اور نواساشاہ کے قدموں میں پھولوں کی پتیاں ٹوکریوں میں سے نکال کر پھینکنے لگیں۔ ان لڑکیوں کے بال کھلے ہوئے اور ان کے عریاں کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جب ذرا سا جھک کر پھول نچھاور کرتی تھیں تو ان کے جسم پھولدار پودوں کی طرح لہلہاتے تھے۔ ان کے لباس عام ہندو لڑکیوں سے بہت مختلف تھے۔ وہ کسی اور ہی دیس کی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے لبوں پر تبسم تھا۔

نواساشاہ کی نظریں ان لڑکیوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ پنڈت نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ مہاراجوں اور راجکماروں کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اس نے اس راجکمار کی دکھتی رگ اپنے ہاتھ میں لینے کا اہتمام کر رکھا تھا اور یہ اہتمام اثر دکھا رہا تھا.... فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر مخمل کی چادریں بچھی تھیں۔ گول تکیے رکھے تھے۔ ان کے غلاف بھی مخمل کے تھے۔ مختصر یہ کہ اس کمرے میں وہی سج دھج تھی جو مہاراجوں کے خاص کمروں کی ہوا کرتی تھی۔

نواساشاہ ایک تکیے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک لڑکی نے جھک کر اس کے پاؤں پر عطر چھڑکا۔ اس نے نواساشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور لڑکی کے لبوں کا تبسم حجاب سے زیادہ نکھر آیا۔ اس شرمیلے تبسم نے نواساشاہ کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے جذبات کی دنیا میں زلزلے کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ دوسری لڑکیوں نے اس کے آگے پھلوں کی طشتریاں رکھیں۔

"حضور کو تو معلوم ہے کہ مندر میں ماس نہیں آ سکتا۔" پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ کے لیے گوشت کا انتظام کر بھی دیتے تو آپ اسے ہاتھ نہ لگاتے کیونکہ یہ مسلمانوں کی طرح ذبح کیا ہوا نہ ہوتا۔ آپ ہمارے ہاتھ کا پکا ہوا قبول بھی نہ کرتے۔ یہ پھل حاضر ہیں۔"

"آپ نے جو حاضر کیا ہے، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔" نواساشاہ نے کہا اور اس نے مسکرا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جس نے اس کے پاؤں پر عطر چھڑکا تھا۔

میزبانوں میں ایک تو پنڈت تھا اور چھ وہ آدمی جو اس کے اغوا کے لیے لاہور سے آئے تھے۔ وہ معزز اور رئیس ہندوؤں کے لباس میں تھے۔ ان کے علاوہ دو اور ہندو تھے جو بھیرہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ یہ سب نواساشاہ کے آگے بچھے جا رہے تھے۔

کمرے میں تاروں کا ترنم نہایت آہستہ آہستہ ابھرنے لگا۔ نواساشاہ نے چونک کر دیکھا۔ ایک لڑکی بربط پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے اپنی زبان کا ایک نغمہ چھیڑ لیا۔ اس کی آواز میں سوز تھا۔ وہ گنگنا رہی تھی جیسے وہ ندی کنارے تنہا بیٹھی ہو اور اسے یہ احساس نہ ہو کہ ارد گرد کوئی بھی نہیں۔ نواساشاہ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر سحر طاری ہوا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خمار نظر آنے لگا تھا۔

لڑکی کی آواز جس طرح آہستہ آہستہ ابھری تھی اسی طرح آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔ نواساشاہ کی نظریں لڑکی سے ہٹ نہ سکیں۔

"ہم نے آپ کو اس لیے نہیں مدعو کیا تھا کہ کوئی شکایت یا کوئی اپنی ضرورت آپ کی خدمت میں پیش کریں گے" — پنڈت نے کہا۔ "ہم اپنے انداز سے آپ سے اپنی عقیدت اور اعتماد کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں اپنا وفادار سمجھیں۔"

"آپ کا انداز بہت حسین ہے" — نواسا شاہ نے کہا۔ اس کا لہجہ اب مسلمانوں کے امیر کا نہیں، ایک راجکمار کا تھا۔ اُس نے کہا — "کیا یہ لڑکی اسی قسم کا ایک اور گانا سنا سکتی ہے؟"

وہ لڑکی ایک پیشہ ور گانے والی کی بیٹی تھی لیکن نواسا شاہ کو بتایا گیا کہ ایک شریف گھرانے کی بیٹی تھی، اور مندر کی داسی ہے۔ زیادہ تر بھجن گاتی ہے۔

لڑکی نے ستار کو چھیڑ کر ایک اور نغمہ شروع کیا۔ لڑکی کے گانے میں کوئی غیر معمولی کمال نہیں تھا۔ پنڈت نے ماحول ایسا طلسماتی بنا رکھا تھا کہ بھدی سی آواز بھی سریلی لگتی تھی۔ نواسا شاہ ایسا مسحور ہوا کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ پنڈت کے سوا تمام میزبان کمرے سے نکل گئے ہیں۔

لڑکی کی آواز خاموش ہو گئی تو نواسا شاہ تصوروں کی مترنم گونج میں کھویا سا۔ اچانک بیدار ہوا اور بولا — "باقی سب کہاں گئے؟"

"وہ آپ کی اس کیفیت میں مخل نہیں ہونا چاہتے تھے" — پنڈت نے کہا — "میں نے انہیں اشارہ کر کے اُٹھا دیا ہے۔"

پنڈت نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا اور چاروں لڑکیاں جھک کر اُلٹے قدموں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ نواسا شاہ دیکھتا رہ گیا۔

"یہ چلی کیوں گئی ہیں؟" — اُس نے تشنہ سی آواز میں پوچھا۔

"مسلمانوں کے ہاں یہ راگ رنگ حرام ہے" — پنڈت نے کہا — "میں نے انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو بلا لیتا ہوں۔"

"نہیں" — نواسا شاہ نے کہا — "یہ راگ رنگ حرام ہے۔"

"حضور!" — پنڈت نے کہا — "ایک بات کہوں۔ بُری لگے تو معاف کر دینا...... آپ نے دل سے نہیں کہا کہ یہ سب حرام ہے۔ اپنے دل پر جبر نہ کریں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ انسانوں کے دلوں کی بات اُن کی آنکھوں میں پڑھ لیا کرتا ہوں۔ آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اچھا کیا ہے۔ آپ کو اسلام کے اصولوں کی پابندی کرنی چاہیئے لیکن آپ جوان ہیں۔ اپنے دل پر پتھر نہ رکھیں، ورنہ آپ کا دل ان پابندیوں سے باغی ہو جائے گا اور آپ کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ اپنی عادتیں اور اپنی فطرت آہستہ آہستہ بدلیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یکلخت شراب بھی ترک کر دیں اور وہ عیش و عشرت بھی جس میں آپ جنمے پلے اور جوان ہوئے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس ماحول کو اور ان لڑکیوں کو دیکھ کر آپ دوراہے پر آ رکے ہیں۔ آپ کے اندر مسلمان اور ہندو کا تصادم ہو رہا ہے۔ یہ ہوتا رہے گا اور آہستہ آہستہ ختم ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مسلمان کو ہندو پر غالب آنے دیں لیکن ہندو کو راضی رکھ کر اس سے نجات حاصل کریں۔"

نواسا شاہ پنڈت کی باتوں کے حسین جال میں آ گیا تھا۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ اُس نے بے ساختہ کہا — "آپ کی باتیں میرے دل میں اتر رہی ہیں۔ صاف بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے آپ کے لیے یہ اہتمام صرف اس لیے کیا ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے" — پنڈت نے کہا — "آپ کی یہ ضرورت پوری ہونی چاہیئے لیکن چوری چھپے۔ میں نہیں چاہتا کسی کو پتہ چلے کہ آپ نے مندر میں اپنے محل کی راتوں کو تازہ کیا ہے۔ آپ کو سلطان نے جو رتبہ دیا ہے اس پر مجھے فخر ہے۔ میں آپ کی پردہ پوشی کروں گا۔ آپ کی مدد بھی کروں گا کہ آپ کی جذباتی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور آپ کو مسلمانوں کی طرف سے جو نازک ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس سے بھی آپ کوتاہی اور چشم پوشی نہ کر سکیں۔ پھر آپ آہستہ آہستہ ذہن سے عیش و عشرت کو نکالتے چلے جائیں۔"

نواسا شاہ جوان تھا۔ چار پانچ ماہ پہلے تک وہ محلات کی اُن عیاشیوں میں رہا تھا جنہیں جائز سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے مسلمان ہو کر اپنا دل مار لیا تھا۔ مولوی عبداللہ قاسمی اور امارت کے حکام نے اُسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نئی زندگی اور نئے مذہب کو خوشی قبول کر چکا تھا اور اُس نے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیئے تھے مگر پنڈت نے اُس کے اس [illegible] کو سراہتے ہوئے [illegible] سے

کے اندر ہندو راجکمار کو بیدار کر دیا۔ نواساشاہ نے اتنی حسین لڑکیوں کو، اُن کے تبسم اور اُن کے طلسماتی انداز کو دیکھا تو وہ ڈگمگانے لگا۔

"اگر میرے ماتحت حاکموں کو پتہ چل گیا تو میرا اعتماد ختم ہو جائے گا" — نواساشاہ نے کہا۔ "وہ مجھ پر الزام عائد کریں گے کہ میں ہندوؤں کے ساتھ مل گیا ہوں"

"کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا" — پنڈت نے اُسے اپنی زنجیروں میں اور زیادہ مضبوطی سے جکڑنے کے لیے کہا۔ "میں آپ کو ذمہ داریوں سے بھی نہیں ہٹنے دوں گا اور میں آپ کو اسلام سے بھی منحرف نہیں ہونے دوں گا، لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مسلمان اُمراء بھی چوری چھپے عیاشی کرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کی صرف ایک بیوی ہو۔ انہوں نے تین تین چار چار بیویاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ بیویاں بدلتے رہتے ہیں۔ جو پرانی ہو جاتی ہے اُس کی جگہ نئی لے آتے ہیں"

نواساشاہ کے چہرے پر رونق آتی جا رہی تھی۔ پنڈت نے زہر میں بجھا ہوا ایک اور تیر چلایا۔ اُس نے کہا "آپ اپنے جن ماتحت حاکموں کی بات کر رہے ہیں کبھی اُن کے گھروں میں جھانکیں۔ وہ اپنی بیویوں کو ساتھ نہیں لائے۔ یہاں اُن کی راتیں ہندو لڑکیوں کے ساتھ بسر ہو رہی ہیں۔ وہ شراب بھی پیتے ہیں، اور صبح جب آپ کے سامنے آتے ہیں تو پکے مسلمان ہوتے ہیں"

"میں انہیں روک سکتا ہوں" — نواساشاہ نے کہا۔ "مجھے سلطان نے کہا تھا کہ کسی کو عیش و عشرت میں نہ پڑنے دینا۔ کسی حاکم کا گناہ معاف نہ کرنا"

"اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ سازش کا شکار ہو جائیں گے" — پنڈت نے کہا — "یہ لوگ آپ پر ایسے الزام عائد کریں گے کہ سلطان محمود بھی چکرا جائے گا اور آپ کو اس جرم میں جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا کہ آپ نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور آپ اندر سے ہندو رہ کر سلطنت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔۔۔ آپ نوعمر ہیں۔ انسانی فطرت کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ انسان اپنے نفس کا غلام ہے۔ اس کی نفسیاتی ضروریات پوری نہ ہوں تو وہ اپنے روزمرہ فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ آپ اپنے

اوپر جبر نہ کریں۔ کبھی کبھار یہاں آ جایا کریں۔ مجھے آپ اپنا مخلص دوست پائیں گے"

"میں آیا ہوا تو ہوں" — نواساشاہ نے کہا۔

"نہیں" — پنڈت نے کہا — "باہر آپ کے محافظ کھڑے ہیں۔ آپ کے عملے کو معلوم ہے کہ آپ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک دو جاسوس بھی موجود ہوں۔ میں آپ کے خلاف کوئی بات نہیں ہونے دوں گا۔ اب آپ چلے جائیں۔ رات کو اس طرح یہاں آئیں کہ کوئی آپ کو باہر نکلتے اور یہاں آتے نہ دیکھ سکے۔ آپ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ یہاں سے آپ کو خیریت سے واپس لے جانا میرا کام ہے"

"یہ لڑکیاں موجود ہوں گی؟" — نواساشاہ نے کہا — "میں یہ گانا سننا چاہتا ہوں"

"آپ آئیں گے تو انہیں حاضر کر لیا جائے گا" — پنڈت نے کہا — "اور شراب وہ پیش کروں گا جس کی بو نہیں ہو گی۔ یہ شراب راجہ بجی رائے کے لیے قنوج سے آیا کرتی تھی"

"میں کل رات آؤں گا" — نواساشاہ نے کہا — "میں ضرور آؤں گا"

"وہ آئے گا" — پنڈت نے نواساشاہ کو اغوا کرنے والے چھ آدمیوں سے کہا — "مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ کچھ پڑھا، کچھ دیکھا ہے۔ نیکی اور گناہ کے درمیان باریک سی ایک لکیر ہے۔ انسان اس پر چلتا رہتا ہے۔ اُسے گناہ کی دعوت اور انگیخت نہ ملے تو اس لکیر سے اُس کا پاؤں نہیں پھسلتا۔ اگر پھسلے گا تو نیکی کی طرف گرے گا، اور اگر حسین اشتعال یا انگیخت مل جائے تو اسے گناہوں کی طرف گرا لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ہم اسی حربے سے گرا سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انہیں جیتی جاگتی عورت دے دی جائے، عورت کے صرف حسین تصور سے انہیں گمراہ کیا جا سکتا ہے اور ہم ایسا کریں گے"

"میں اُن والدین کی پوجا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی بیٹیاں آج مندر میں بھیج دی

تھیں۔ اپنے دھرم اور اپنے ملک کے لیے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے یہ بہت بڑی قربانی ہے جو کام ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کر سکتی ہے، وہ پورا لشکر نہیں کر سکتا... سکھ پال جوان ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس جادو سے بچ نہیں سکے گا جو میں نے اس کے لیے پیدا کیا تھا۔ آپ میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میں نے کمرے میں جو خوشبو چھوڑی تھی اس میں ایسا اثر ہے جو انسان کے نفس کو بیدار کر دیتا ہے۔ لڑکیوں نے اپنا اثر پیدا کیا اور اس اثر کو میری باتوں نے مکمل کیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے تمام حاکم چوری چھپے عیش کر رہے ہیں اور اُن کی راتیں ہندو لڑکیوں کے ساتھ گذرتی ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ امارت میں میرے جاسوس موجود ہیں جو وہاں معمولی معمولی نوکریاں کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ سلطان محمود نے عیاشی کے مرتکب ہر حاکم کے لیے ساری عمر کی سزائے قید مقرر کر رکھی ہے اور اُس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ جہاں کوئی گناہ ہو رہا ہو، اُسے اطلاع مل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان حاکموں پر مذہبی جذبات کا غلبہ ہے۔ انہوں نے بہت بڑی فتح حاصل کی ہے۔ انہوں نے ملتان میں قرامطیوں کو ختم کر کے ہندوستان میں اسلام کو پاک کر دیا ہے۔ انہوں نے راجہ بجی رائے جیسے کٹر ہندو اور جابر جنگجو کو ایسی شکست دی ہے کہ اُس نے اپنی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ اسے مسلمان خدائی معجزہ کہتے ہیں، اور یہ ہے بھی صحیح کہ جسے ہم دھرم اور مسلمان ایمان کہتے ہیں، اگر مضبوط ہو تو معجزے رونما ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایمان مضبوط ہے۔ اُن کے حاکم جو یہاں ہیں، وہ کوئی عیش و عشرت نہیں کرتے لیکن میں نے سکھ پال کو اُن کی جو تصویر دکھائی ہے، اس سے یہ جوان راجکمار پوری طرح میرے جال میں آ گیا ہے۔"

"آپ مسلمان حاکموں کو بھی ایسے ہی جال میں لا سکتے ہیں؟" ایک ہندو نے کہا۔

"میں یہ جال پھیلاؤں گا۔" پنڈت نے کہا۔ "ہماری بیٹیوں کو پرماتما نے حسن بھی دیا ہے اور یہ جذبہ بھی کہ مسلمان کو اس حسن سے گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ میری بوڑھی آنکھیں آنے والے وقت کو دیکھ رہی ہیں۔ مسلمان اس ملک پر غالب آ جائیں گے۔ محمود

اگر سارے ہندوستان کو فتح نہ کر سکا تو یہاں تک کسی نہ کسی خطے میں اسلامی سلطنت قائم کرے گا۔ مسلمانوں کو جنگ کے ذریعے شکست دینا اور انہیں ہندوستان سے نکالنا آسان نہیں ہوگا۔ اگر ہمارے آئندہ راجوں مہاراجوں اور پنڈتوں نے عقل سے کام لیا تو وہ مسلمانوں کی سلطنت کو اس حربے سے کمزور کر لیں گے جو میں نے سکھ پال پر استعمال کیا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے ذہنوں اور اُن کے ایمان پر ایسا حملہ کرنا ہوگا جسے وہ حملہ نہ سمجھیں، پیار اور محبت کا پیغام سمجھیں۔"

"ہمیں سکھ پال کی بات کرنی ہے۔" لاہور سے آئے ہوئے ایک ہندو نے کہا۔ "آنے والے وقت میں کیا ہوگا، وہ آنے والی نسلوں کا کام ہے۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ سکھ پال کو اغوا کر کے بھیرہ سے نکالنا ہے۔"

"وہ کل رات چوری چھپے آ رہا ہے۔" پنڈت نے کہا۔ "میری یہی کوشش تھی جو کامیاب ہو گئی ہے۔ آپ لوگ یہاں موجود ہوں گے۔"

اور پنڈت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کس طرح اُسے دبوچ لیں۔ رات کے وقت اُسے شہر سے نکالنا مشکل تھا، یہ کام دن کو کرنا تھا۔ کچھ بحث و مباحثے کے بعد انہوں نے سکیم تیار کر لی۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ بھیرہ شہر پر نیند کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ قصر امارت پر بھی خاموشی طاری تھی۔ اس عمارت میں جب راجہ بجی رائے کی گدی تھی تو یہاں کا دن سورج غروب ہونے کے بعد طلوع ہوا کرتا تھا۔ ساز و آواز اور تھرکتے ہوئے نسوانی جسموں سے جادو جاگ اُٹھتے تھے۔ شراب کا دور چلتا اور یہاں ساقی کی حکمرانی ہوتی تھی۔ اب یہ عمارت خاموش تھی۔ اس خاموشی میں ایک محافظ نواسا شاہ کی رہائش گاہ کے دروازے پر کھڑا تھا اور دو محافظ ارد گرد گشت کر رہے تھے۔ محافظ دستہ رات بھر مستعد رہتا تھا۔

نواسا شاہ اٹھا۔ اُس نے دریچے میں سے جھانکا۔ گشت کرنے والے دو محافظ ذرا آگے چلے گئے تھے۔ نواسا شاہ نے محسوس کیا کہ وہ ان سے نظر بچا کر نکل نہیں

سکے گا۔ دن بھر وہ امارت کے کاموں اور مسئلوں میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ وہ سوچ بھی نہ سکا کہ وہ رات چوری چھپے کس طرح نکل کر مندر میں جائے گا۔ رات کو نکلنے کا وقت آیا تو اسے خیال آیا کہ اس کی رہائش گاہ کے اردگرد محافظوں کا کھڑا پہرہ بھی ہے اور گشتی بھی۔

وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے کمرے کی تنہائی میں وحشت محسوس ہونے لگی۔ اس کے دماغ پر چار لڑکیاں اور وہ شراب سمائی ہوئی تھی جس کی بو نہیں ہوتی۔ وہ خوش تھا کہ شراب پی کر آئے گا تو کسی کو شراب کی بو نہیں آئے گی، مگر مندر تک پہنچنا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔

اسے مایوسی کی تاریکی میں ایک چمک سی دکھائی دی۔ اسے مولوی سعیداللہ قاسمی کے یہ الفاظ یاد آ گئے — "اسلام میں خلیفہ اور اس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے علاقوں کے امرا کی ذمہ داریاں بڑی ہی نازک اور صبر آزما ہوتی ہیں۔ وہ راتوں کو بھیس بدل کر گلی کوچوں میں پھرتے اور دیواروں سے کان لگا کر سنتے ہیں کہ قوم میں کوئی گھرانہ یا کوئی فرد کسی مصیبت میں تو مبتلا نہیں، اور کیا پوری قوم خلافت اور امارت سے مطمئن ہے؟"

نواسا شاہ اٹھا اور اس نے بھیس بدل لیا۔ وہ باہر نکلا اور دروازے پر کھڑے محافظ سے کہا کہ محافظ دستے کے کماندار کو بلاؤ۔ کماندار دوڑا آیا۔

"ہم شہر کی گشت کو جا رہے ہیں" — نواسا شاہ نے کماندار سے کہا۔

کماندار کے لیے امیر کا یہ اقدام حیران کن نہیں تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی روایت تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ کتنے امرا اس روایت پر عمل کرتے تھے۔ کماندار نے گشتی محافظوں کو بتا دیا کہ امیر محترم گشت کے لیے جا رہے ہیں۔

نواسا شاہ معمولی سا ایک چغہ پہن کر اور سر پر کپڑا لپیٹ کر چل پڑا اور قصر امارت کے صدر دروازے سے نکل گیا۔

وہ مندر کے دروازے پر جا رکا۔ ادھر ادھر دیکھا، اور دروازے میں داخل ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کس کمرے میں جانا ہے۔ ڈیوڑھی میں اس کے استقبال کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

اس نے تالی بجائی۔ اچانک پیچھے سے ایک آدمی نے اسے دبوچ لیا۔ ایک اور آدمی نے اس کی ٹانگیں بازوؤں میں جکڑ لیں۔ نواسا شاہ جوان اور تنومند آدمی تھا۔ اس نے جسم کی پوری طاقت صرف کر کے اپنے آپ کو پیچھے کو دھکا دیا اور پچھلے آدمی کے سہارے اگلے آدمی کو پاؤں سے دھکیلا۔ اس داؤ سے وہ آدمی جس نے اسے پیچھے سے دبوچا تھا، پیچھے کو گرا اور جس نے اس کی ٹانگیں پکڑی تھیں وہ دوسری طرف گرا۔

دو اور آدمی اس پر جھپٹے۔ نواسا شاہ دروازے سے باہر آ گیا اور اس نے پھرتی سے تلوار نما خنجر نکال لیا۔ ڈیوڑھی تاریک تھی۔ باہر سائے نظر آتے تھے۔ ستاروں کی روشنی کافی تھی۔ نواسا شاہ نے خنجر کا وار کیا اور ایک آدمی کی کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ سنائی دی۔ پھر کسی کی آواز آئی — "زندہ پکڑنا۔"

اور قریب سے ہی آواز آئی — "مشعل جلاؤ۔"

چقماق کا شرارہ چمکا اور تیل میں ڈوبی ہوئی مشعل کا شعلہ بھڑکا۔ پھر آواز سنائی دی۔

"کاٹ دو انہیں۔"

ایک آدمی زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ باقی تین پر چار آدمی تلواروں سے ٹوٹ پڑے۔ نواسا شاہ حیران و پریشان ہو کر ایک طرف کھڑا تھا۔ مشعل کے رقص کرتے شعلے میں اسے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔ اس پر حملہ کرنے والوں پر کس نے حملہ کیا تھا؟

"امیر محترم!" — ایک آدمی نے کہا — "آپ ٹھیک ہیں؟ زخمی تو نہیں؟"

تب اس نے پہچانا کہ یہ تو اس کے اپنے محافظ دستے کے جوان ہیں۔ اندر سے پنڈت دوڑا آیا۔ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر پوچھنے لگا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ چار ہندو زمین پر خون میں ڈوبے پڑے تھے۔

"آپ انہیں پہچانتے ہیں؟" — ایک محافظ نے پنڈت سے پوچھا — "انہوں نے امیر محترم پر حملہ کیا ہے۔"

"اوہ!" — پنڈت نے حیرت زدہ ہو کر نواسا شاہ کو دیکھا اور بولا — "امیر بصرہ!"

"... حضور! ادھر اور اس وقت کیسے آنکلے؟"

"میں گشت پر آیا تھا" — نواسا شاہ نے کہا — "مندر کے اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہوا ہی تھا کہ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"پاپی" — پنڈت نے حقارت سے کہا — "ملیچھ۔ اچھا ہوا مارے گئے۔ امیر مندر میں آئیں تو ہم ان کے قدموں میں پھول نچھاور کریں۔ ان اچھوتوں نے امیر پر حملہ کیا ہے؟" — اُس نے مشعل کی روشنی میں چاروں کے چہرے دیکھ کر کہا — "میں انہیں نہیں پہچان سکتا۔ یہ بھیرہ کے معلوم نہیں ہوتے۔"

نواسا شاہ نہیں چاہتا تھا کہ محافظ مندر کے اندر جائیں کیونکہ اُسے خیال تھا کہ اندر لڑکیاں ہوں شراب ہو گی مگر محافظوں کے کمانڈر کو اپنے فرائض کا احساس تھا۔ وہ نواسا شاہ کو بتلائے بغیر اندر چلا گیا۔ نواسا شاہ بھی گیا۔ کمروں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک کمرے میں دو آدمی تھے جو باہر مارے جانے والوں کے ساتھی تھے۔ پنڈت نے بتلایا کہ یہ پجاری ہیں۔

نواسا شاہ کا خیال تھا کہ وہ اکیلا مندر میں آیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گشت پر نکلا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا محافظ دستہ اس سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ کمانڈر عقلمند تھا۔ اُسے احساس تھا کہ امیر نو مسلم ہے اور ہندو اس پر قاتلانہ حملہ کریں گے چنانچہ نواسا شاہ رہائش گاہ سے نکلا تو کمانڈر چار محافظوں کو عام کپڑوں میں ساتھ لے کر نواسا شاہ کے پیچھے خاصا فاصلہ رکھ کر چلا گیا۔ یہ پانچوں دبے پاؤں چل رہے تھے تاکہ ان کے امیر کو بھی پتہ نہ چلے کہ اس کے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا کمانڈر کو خدشہ تھا۔ وہ بروقت مندر کے دروازے پر پہنچ گئے اور نواسا شاہ کی جان بچ گئی۔

دوسرے دن اس واقعہ کی تحقیقات ہوئی۔ پنڈت نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

لاہور کے راج محل میں رانی پریم دیوی سخت غصے کے عالم میں اپنے کمرے میں تیز تیز ادھر اُدھر چل رہی تھی۔ کمرے میں وہ دو آدمی کھڑے تھے جو اپنے چار ساتھیوں

کو بھیرہ کے مندر میں مروا کر وہاں سے آ گئے تھے۔ انہوں نے رانی کو تفصیل سے سنایا تھا کہ پنڈت نے سکھ پال کو پھانسنے کا کیا انتظام کیا تھا لیکن عین آخری لمحے ناکامی ہوئی۔

سیناپتی راج گوپال بھی وہاں موجود تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

"اس سے ظاہر ہوا کہ میرا بیٹا بھیرہ کا امیر ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کا قیدی ہے" — رانی پریم دیوی نے کہا — "میں اسے رہا کراؤں گی۔ اگر وہ وہاں رہنا چاہے گا تو بھی اُسے لے آؤں گی" — وہ اچانک گرج اٹھی — "نکل جاؤ یہاں سے .... دفع ہو جاؤ بزدلو!"

وہ دونوں آدمی باہر نکل گئے۔ راج گوپال وہیں کھڑا رہا۔ رانی نے اُسے دیکھا اور بولی — "تم میری محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ میرا ساتھ دو گے؟"

"تم کرنا کیا چاہتی ہو؟" — راج گوپال نے کہا — "اگر تم مجھے سزائے موت کی دھمکی دے کر کہو کہ میں بھیرہ پر حملہ کر دوں تو بھی میں صاف انکار کر دوں گا۔"

"سنو گوپال!" — رانی نے کہا — "غور سے سنو میں کیا کرنا چاہتی ہوں۔"

اُس کے دماغ میں جو آئی تھی، وہ اُس نے راج گوپال کو سنا دی،

دس پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ نواسا شاہ دن کے وقت فوج کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا۔ اُس کا راستہ ایک سیاہ کالے رنگ کے بوڑھے نے روک لیا۔ اس کے ساتھ اسی رنگ اور اسی عمر کی ایک عورت تھی۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر اور منہ پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دونوں کی کمریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بہت لمبی مسافت طے کر کے آئے لگتے تھے۔ نواسا شاہ نے گھوڑا روکا اور اُتر کر ان کے قریب چلا گیا۔

"بہت دور سے فریاد لے کر آئے ہیں" — بوڑھے نے تھکی ہوئی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا — "ہماری کہانی لمبی ہے۔ اپنے گھر میں آنے کی اجازت دیں۔ تنہائی میں عرض کریں گے۔"

نواسا شاہ نے اپنے محافظوں سے کہا کہ دونوں کو ساتھ لے چلو، ہم ان کی فریاد سنیں گے۔

نواساشاہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بڑھیا کو اُس کے کمرے میں داخل کیا گیا۔ نواساشاہ نے کہا۔ ”کہو کیا کہنا ہے؟“

بڑھیا اُس کے قریب چلی گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”کیا تو نہیں جانتا کہ ماں کو اپنے گمراہ بیٹے سے کیا کہنا ہوتا ہے؟“۔ نواساشاہ چونک اُٹھا۔ وہ رانی پریم دیوی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”مت نگاہیں پھیر۔ مت حیران ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھ۔ ماتا کی ماری ہوئی ماں کی آنکھوں میں دیکھ۔“

نواساشاہ کی نظریں ماں کی آنکھوں میں گرفتار ہو گئیں۔

”ماں نے تجھے کیوں جنا تھا؟“۔ رانی نے کہا۔ ”اس لیے کہ اپنے دلوا کے خون کا انتقام لے گا۔ اُن بتوں اور مورتیوں کی توہین کا انتقام لے گا جن کی بے حرمتی مسلمانوں نے کی تھی۔ تیرا باپ بھاگ کر کشمیر چلا گیا ہے، اور تو نے شکست کھا کر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ تو نے اپنے دادا کی طرح اور راجہ بجی رائے کی طرح خودکشی نہ کی۔ تو نے اپنے مذہب کے دشمن کا مذہب قبول کر لیا۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ تیری ماں کا رکھوالا کون ہے۔ اگر مسلمان لاہور پر حملہ کر دیں تو وہ مجھے بھی قیدی بنا لیں گے۔ ایک رانی مسلمانوں کی اس لیے قیدی اور باندی ہو گی کہ اُس کا بیٹا بے غیرت اور بزدل ہے۔ لالچی ہے۔ اُس نے اپنا دھرم عہدے اور رتبے کے عوض بیچ ڈالا ہے۔“

نواساشاہ کے منہ سے کئی بار نکل چکا تھا۔ ”ماں.... ماتاجی.... آپ —“ لیکن ماں کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ وہ بولتی جا رہی تھی اور نواساشاہ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ ماں نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ پنڈت اُسے پہلے ہی گمراہ کر چکا تھا۔ اُس رات کے بعد جس رات اُس پر حملہ ہوا تھا، وہ مندر میں دوبارہ جانے کی سوچ بھی نہیں سکا تھا۔ یہ ایک کانٹا تھا جو اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ پنڈت کی اِس بات کو اُس نے صحیح مان لیا تھا کہ مسلمان حاکم اور سالار وغیرہ چوری چھپے عیش و عشرت کرتے ہیں اور اُسے کہتے ہیں کہ اسلام میں یہ حرام ہے۔

اب ماں نے اس حلیے میں آ کر اُس کے جذبات کو ایسا ہلایا کہ اُسے چکر آنے

لگے۔ ماں نے اُسے نواساشاہ سے سکھ پال بنا دیا تھا۔ ماں کہہ رہی تھی۔ ”دیکھ، تیری رانی ماں کیا حال اور کیا صورت بنائے کھڑی ہے۔ پکڑی جائے تو یہاں تیری کوئی نہیں سنے گا.... اور سوچ کہ تجھے محمود یہاں کا حاکم کیوں بنا گیا ہے.... وہ تجھ سے ڈرتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ سکھ پال اتنا بہادر اور دانشمند ہے کہ غزنی کی فوج کو ملیامیٹ کر دے گا۔ تجھ سے بچنے کے لیے اُس نے تجھے سونے کے پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ تیری شکست تیرے کسی گناہ کی سزا ہے۔ ہوش میں آ سکھ پال! اپنے دیوتاؤں کے قہر سے ڈر۔“

”تمہارے ساتھ کون ہے ماں؟“

”سیناپتی راج گوپال“ — رانی نے جواب دیا — ”اسے بھی اندر بلا لو۔“

نواساشاہ نے دربان کو بلا کر کہا — ”اس بڑھیا کے ساتھ جو بوڑھا ہے، اُسے اندر بھیجو۔“

راج گوپال جھکا ہوا، کھانستا ہوا، اندر آیا اور نواساشاہ کو فرشی سلام کیا۔ دربان باہر نکل گیا تو نواساشاہ نے راج گوپال سے کہا۔ ”اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ.... ماں مجھے ہوش میں لے آئی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں رات کو یہاں سے نکل جاؤں گا۔ آپ دونوں واپس چلے جائیں۔“

”یہاں سے چوروں کی طرح نکل بھاگنا کوئی کمال نہیں“ — سیناپتی راج گوپال نے کہا۔ ”آپ راجپوت ہیں، راجکمار ہیں۔ اگر آپ ہمت کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے.... مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے حکم سے راجہ بجی رائے کی فوج کو سلطان کی فوج میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔“

رانی پریم دیوی اور راج گوپال بہت دیر بعد نواساشاہ کے کمرے سے نکلے۔ دربان اور محافظوں کو وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے اور تھکے ہوئے نظر آئے۔ کسی کو شک نہ ہوا کہ انہوں نے چہروں، گردن اور ہاتھوں پر ایسا محلول مل رکھا ہے جس سے اُن کے رنگ گہرے سانولے اور جلد بوڑھی نظر آتی ہے۔ وہ قصرِ امارت سے نکلے اور مندر میں چلے گئے۔ وہ رات انہوں نے پنڈت کے ساتھ گزاری اور اگلے روز لاہور کو روانہ ہو گئے۔

دو روز تک بھیرہ کی فضا میں پُراسرار سا ٹھہراؤ طاری رہا۔ تیسرے روز امیر بھیرہ نواسا شاہ نے فوج کے اعلیٰ حکام کو بلایا اور کہا کہ اپنی فوج میں جو چار ساڑھے چار ہزار ہندو ہیں، انہیں محاصرے میں لڑنے کا وہ تجربہ نہیں جو غزنی کی فوج کو ہے۔ کل تمام مسلمان فوج شہر سے باہر چلی جائے گی اور ہندو کمانڈر اور سپاہی شہر کے اندر رہیں گے۔ آپ لوگ باہر سے قلعہ توڑنے کی کوشش کریں گے اور ہم ہندوؤں کو سمجھائیں گے کہ قلعے کا دفاع کس طرح کیا جاتا ہے۔

اُسی رات نواسا شاہ نے سپہ سالار اور اُس کے نائب سالاروں کو اپنے ہاں بلایا۔ انہوں نے آکر دیکھا کہ محافظ دستہ جو مسلمان ہُوا کرتا تھا اس میں اب ہندو سپاہی ہیں۔ نواسا شاہ نے چند ایک محافظوں کو اندر بلا کر سالاروں اور اُس کے دونوں نائبوں کو گرفتار کرا لیا اور حکم دیا کہ انہیں قید خانے کی الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دو۔

اگلی صبح حکم کے مطابق فوج کی تمام تر مسلمان نفری باہر چلی گئی۔ نواسا شاہ کے حکم سے شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور ہندو نفری نے دیواروں پر جا کر مورچے سنبھال لیے۔ مسلمان اسے مشق اور تربیت سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے حکم کے مطابق قلعہ توڑنے کی جھوٹ موٹ کی نقل و حرکت کی۔ اوپر سے ہندو فوجیوں نے ان پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی نواسا شاہ نے دیوار سے بلند آواز سے بار بار اعلان کیا — "غزنی والو! زندہ رہنا چاہتے ہو تو غزنی واپس چلے جاؤ۔ میں نواسا شاہ نہیں سُکھ پال ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہندو ہوں۔ تمہارے تینوں سالار قید میں پڑے ہیں۔"

مسلمان فوج کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ مشہور مؤرخین، البیرونی، فرشتہ، گردیزی، عنصری اور عتبی کی تحریروں کے مطابق غزنی کے مسلمان فوجیوں نے بھاگ نکلنے کی بجائے لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں بتایا کہ سپہ سالار اور اُس کے نائبین کی غیر حاضری میں کمان کس نے سنبھالی۔ ہُوا یوں کہ مسلمانوں نے ایک قاصد ملتان کو دوڑا دیا۔ ان کے پاس رسد اور سامان کی کمی تھی، لیکن ان کے باوجود انہوں نے سُکھ پال کا چیلنج قبول کر لیا، اور للکار کر سُکھ پال کے اعلان کا جواب دیا۔ "اسے مکار

رہے! تو اپنی فوج سمیت ہمارا قیدی ہے۔ اگر شہر میں کسی مسلمان باشندے پر ہاتھ اٹھایا گیا تو بھیرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور ایک بھی ہندو زندہ نہیں رہے گا۔"

انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور دروازے توڑنے اور کہیں نقب لگانے کی کوشش شروع کر دی۔

غزنی کی طرف جانے والا قاصد بہت تیز تھا۔ پشاور تک اُس نے دو گھوڑے مسافروں سے چھینے۔ تھکے ہوئے گھوڑوں کو وہ چھوڑتا گیا۔ اُس نے آرام اور کھانے پینے کی پرواہ نہ کی۔ ملتان والا قاصد جلدی منزل پر پہنچ گیا اور وہاں سے کمک چل پڑی۔

غزنی میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ ایلک خان نے اس خوش فہمی میں غزنی پر فوج کشی کی تھی کہ سلطان محمود ہندوستان میں ہے اور غزنی میں فوج نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ بڑے تحمل سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اُسے گمان تک نہ تھا کہ سلطان محمود کا پیغام رسانی کا نظام اور اُس کی فوج کے کوچ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ وہ جیسے اُڑ کر آ گیا ہو۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود جب غزنی پہنچا تو ایلک خان نے یقین نہ کیا۔ محمود نے فوج کو آرام نہ کرنے دیا۔ سیدھا حملہ کر دیا۔

فرشتہ لکھتا ہے۔ "ایلک خان نے ترک امراء اور حکمرانوں کو مدد کے لیے بلا لیا۔ یہ محمود غزنوی کے خلاف متحدہ محاذ تھا۔ محمود غزنوی نے اپنی فوج کے ایک حصے کی کمان اپنے بھائی نصیر الدین یوسف کو دی اور اپنے مشہور سپہ سالار ابو عبداللہ الطائی کو اس کے ساتھ رکھا۔ دائیں بازو کی کمان آلتونتاش حاجب کے پاس اور بائیں بازو کی ارسلان جاذب کے پاس تھی۔ اس بازو میں افغان اور خلجی تھے....

محمود کے دشمن کا متحدہ محاذ کمزور نہیں تھا۔ ایلک خان نے اپنی قیادت میں سلطان محمود کی فوج کے قلب پر حملہ کیا۔ محمود گھوڑے سے کود کر اُترا اور سجدہ ریز ہو گیا۔ اُٹھ کر ہاتھ دعا کے لیے پھیلائے اور گھوڑے پر سوار ہونے کی بجائے ایک ہاتھی پر جا چڑھا۔

اس نے اپنی فوج کو اللہ کے نام پر للکارا۔۔۔ اُس نے پیادوں کے آگے ہاتھیوں کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ اس نے حملہ روکنے کے لیے حملہ بولنے کا حکم دے دیا۔ ہاتھیوں کے ساتھ گھوڑ سوار تھے۔ ایلک خان کی فوج اس ہلّے کے آگے ٹھہر نہ سکی۔

فرشتہ نے لکھا ہے "محمود کے ایک ہاتھی نے ایلک خان کے اُس محافظ کو جس نے اُس کا پرچم اٹھا رکھا تھا، سونڈ میں پکڑا اور دور اوپر کو اچھال دیا۔ محمود کے ہاتھیوں نے دشمن کو اس طرح کچلا جیسے پاؤں تلے ٹڈی دل کو مسل رہے ہوں۔"

دشمن کو گھیر لیا گیا تھا۔ محمود غزنوی نے اس کا تعاقب کیا اور چیدہ چیدہ امرا اور سالاروں کو پکڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

یہ اُس کے سجدے کا کرشمہ تھا کہ دشمن ختم ہو چکا تو بھیرہ کا قاصد اُس کے پاس یہ پیغام لے کر پہنچا کہ سکھ پال نے دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلطان محمود نے کوئی وقت ضائع نہ کیا اور بھیرہ کو کوچ کا حکم دے دیا۔

اُس کے پہنچنے تک مسلمان بھیرہ کا ایک دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ ملتان سے کمک آ گئی تھی۔ انہوں نے ہندو نفری پر جلدی قابو پا لیا اور سکھ پال کو بھی انہوں نے گرفتار کر لیا۔ سلطان محمود دل پر بڑا ہی ناگوار بوجھ لے کر آیا تھا، لیکن بھیرہ کی کیفیت دیکھ کر مسکرا اُٹھا۔ اُس نے سکھ پال کو بلایا اور اُسے اتنا ہی کہا۔ "میں تمہیں تمام عمر کے لیے قید میں ڈالتا ہوں۔ تمام عمر اپنے کیے کی سزا بھگتتے رہو۔"

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

دوسرا حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336 فیکس: 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(حصہ سوم، حصہ چہارم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)

عنایت اللہ

.....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد دوئم

(تیسرا اور آخری حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

34۔ اردو بازار، لاہور، فون :7232336 فیکس:7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب	....	....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا (جلد سوئم، جلد چہارم)
مصنف	....	عنایت اللہ
ناشر	....	گلفراز احمد علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہد نوید پرنٹرز، لاہور
سرورق	....	نفیس کیانی
سن اشاعت	....	جون 2008ء
قیمت	....	240/= روپے

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

فہرست

پیش لفظ

سلطان محمود غزنوی کے دور کی تاریخ ساز اور ولولہ انگیز کہانیوں کا تیسرا مجموعہ بعنوان ..... اور ایک بت شکن پیدا ہوا" پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں پانچ کہانیاں شامل کی گئی ہیں جو آپ کو اس دور میں لے جائیں گی جب ہندوستان کے میدانوں، وادیوں اور دریاؤں میں حق اور باطل کی تلواریں ٹکرا رہی تھیں اور بت خانوں میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ بتوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو غزنی کے گھوڑے روند رہے تھے۔

میں اس سلسلے کی پہلی جلد میں اُس بے انصافی اور دھاندلی کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں جو سلطان محمود غزنوی کے جہاد کی تاریخ کے ساتھ ہندو تاریخ نویسوں نے کی ہے۔ ایک دو مسلمان تاریخ نویسوں نے بھی ہندوؤں کا اثر قبول کر کے تاریخ اسلام کے اس بت شکن کو ڈاکو اور لٹیرا لکھا اور یہ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے کہ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے جہاد نہیں تھا۔ حقیقت اُن کتابوں میں ملتی ہے جو غیر جانبدار تاریخ دانوں نے اُس دور کے مؤرخوں کے حوالوں سے لکھی ہیں۔

یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح ہندوؤں نے بھی غزنی سے آنے والے حق کے طوفانوں اور بگولوں کو روکنے اور ان کی شدت کو ختم کرنے کے لیے اپنی حسین و جمیل بیٹیوں کو استعمال کیا تھا مگر ہندوستان کا حسن اور عیاری بت شکنوں کے عزم کو متزلزل نہ کر سکی۔

ہندو لڑکیوں کے حسن و جوانی اور عیاری نے اور شکست خوردہ راجوں اور مہاراجوں کی در پردہ اسلام کش سرگرمیوں نے ان کہانیوں کو جنم دیا ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ ہندوؤں اور یہودیوں کی اسلام کش سرگرمیاں آج بھی نہ صرف جاری ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ دلکش، طلسماتی اور تباہ کن ہو گئی ہیں۔ ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کے جذبۂ حریت کو مسخ کرنے کی پوری کوشش اس لیے کی ہے کہ آج کے مسلمان نوجوانوں میں غزنوی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

میں نے پاکستانی نوجوانوں میں غزنی کے بت شکن کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اُس دور کی تاریخ کو چھان مارا اور یہ کہانیاں اخذ کی ہیں۔ ان کہانیوں میں آپ کو تفریح طبع کا خاصا سامان بھی ملے گا جو تفریح کے ساتھ ساتھ ایمان کو تر و تازہ کر دے گا۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

قتل، قنوج اور ضرب کلیم

غزنی

کا شہر آج روسیوں اور افغان وطن پرستوں کا میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ افغانستان کی فوج کے افسر اور سپاہی فوج سے بھگوڑے ہو کر مجاہدین کے ساتھ مل رہے ہیں۔ روسی ٹینک افغانستان کے دیگر شہروں کی طرح غزنی میں بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ فضا سے روسی گن شپ ہیلی کاپٹر آگ برساتے ہیں۔ اگر افغانیوں نے غزنی کی عظمت کو یاد رکھا تو وہ روسیوں کے قدم اکھاڑ کر ہی دم لیں گے۔

غزنی کی عظمت صرف اس سے نہیں تھی کہ وہاں ایک بت شکن پیدا اور دفن ہوا تھا بلکہ اس شہر کی عظمت کے کچھ اور نشان بھی ہیں جن میں ایک مسجد ہے۔ محمود غزنوی نے اس مسجد کا نام عروس فلک رکھا تھا۔ اُس نے یہ مسجد متھرا کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی تھی۔ غزنی والے اس فتح پر جتنا بھی ناز کرتے کم تھا۔ متھرا ہندوؤں کا ویسا ہی مقدس شہر ہے جیسے ہمارے لیے مکہ اور مدینہ ہے۔ یہ ہری کرشن مہاراج کی جائے پیدائش ہے اور یہاں بے شمار مندر اور بے حد قیمتی بت تھے۔ محمود غزنوی جب متھرا کا بت خانہ توڑ کر واپس گیا تو اُس نے غزنی میں سنگ مرمر کی ایسی مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا جو حسن تعمیر میں یکتا ہو۔

دُور دُور سے معمار بلائے گئے جنہوں نے محمود غزنوی کے تخیل اور تصور سے زیادہ حسین جامع مسجد تعمیر کر دی۔ محمود نے اس کی چھت اور دیواروں میں جو بیل بوٹے کھدوائے، ان میں سونا اور چاندی پگھلا کر ڈالا۔ مسجد کے اندر بیش قیمت قالین بچھائے۔

میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھایا۔ پھر اس کے قریب ایک یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا جس میں کتابوں کے انبار لگا دیئے۔ کتابیں مختلف زبانوں کی تھیں۔ یونیورسٹی کا عجائب گھر بھی بنایا جس میں نادر اشیاء رکھیں۔ یہ مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا مرکز بن گئی۔ محمود نے یونیورسٹی کے علما، اساتذہ اور طلباء کے لیے کثیر رقم الگ کر دی۔

امرائے جب اپنے سلطان کا ذوق دیکھا تو انہوں نے اپنے لیے نہایت خوبصورت مکان اور دلکش مسجدیں تعمیر کرانی شروع کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں غزنی خوبصورت مکانوں، باغوں، مصنوعی چشموں اور حسین مسجدوں کا شہر بن گیا۔ آج غزنی اُن تعمیرات کے کھنڈروں کا شہر بن گیا ہے۔

جن فتوحات کی یاد میں محمود غزنوی نے ساڑھے نو سو سال پہلے یہ جامع مسجد اور یونیورسٹی تعمیر کی تھی، وہ فتوحات اُسے آسانی سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اس مسجد اور یونیورسٹی کی بنیادوں میں غزنی کے اُن ہزاروں مجاہدین کا خون شامل تھا جن کی لاشیں غزنی واپس نہیں لائی جا سکی تھیں۔ بلند شہر، متھرا، مہابن اور قنوج کے علاقے میں گنگا اور جمنا کے کنارے اُن شہیدوں کی قبروں کے نشان تو مٹ ہی گئے ہیں، ساڑھے نو سو برسوں میں اُن کی ہڈیاں بھی وہاں نہیں رہیں۔ انہوں نے جس طرح متھرا اور اس کے بعد قنوج فتح کیا تھا، اس کے پیچھے ایک ولولہ انگیز اور جذبات کو ہلا دینے والی داستان ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخر میں محمود غزنوی بلند شہر سے متھرا تک بگولے کی طرح پھر گیا تھا۔ نقشے پر دیکھیں تو اُس کی پیش قدمی اور فتوحات کی شکل بگولے کی سی بنتی ہے۔ اُسے اس ایک ہی حملے میں کئی بار دریائے گنگا اور جمنا عبور کرنے پڑے۔ جنگ کے مبصر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنے وطن سے تین ماہ کی مسافت جتنی دُور آ کر اتنی لڑائیاں لڑنا اور ہر لڑائی میں کامیابی حاصل کرنا معمولی دماغ اور جنگی فہم و فراست کے جرنیل کے بس کی بات نہیں تھی۔

متھرا بہت بڑا شکار تھا جسے وہ مار چکا تھا۔ ہندوستان کے اتنے بڑے بُت خانے میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ سلطان نے فوج کو متھرا میں آرام اور تنظیم میں رد و بدل کے لیے روک لیا۔ اُسے اب قنوج کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔ قنوج کے متعلق اُسے بتایا گیا

تھا کہ اس کی فتح آسان نہیں ہوگی۔ مہاراجہ قنوج کو دوسرے مہاراجوں کی نگاہ میں احترام حاصل تھا۔ وہ دانشمند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود غزنوی نے قنوج پر حملے سے پہلے فوج کو آرام دینے اور دستوں کو از سرِ نو منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اُس نے قنوج اور گرد و نواح میں اپنے جاسوس بھیج دیئے تھے۔ اُسے جو معلومات دی گئی تھیں، ان کے مطابق، قنوج کے راستے میں دو اور ریاستیں تھیں جن کے حکمران مہاراجے نہیں راجے تھے۔ ان میں ایک راجے چندا تھا اور دوسرا چاندل بھور۔ چھوٹے چھوٹے اور راجے بھی تھے اور یہ سب مہاراجہ قنوج راجیا پال کے اتحادی تھے۔

جاسوسوں نے جن مقامی باشندوں کو مخبر (ایجنٹ) بنایا تھا، ان کی زبانی پتہ چلا تھا کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نِڈر بھی اس خطے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے مہاراجوں اور رائیوں کو محمود غزنوی کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ وہ خود محمود غزنوی کے سامنے نہیں آسکتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باجگزار تھا اور اُس نے سلطان کے ساتھ جنگ نہ کرنے اور غزنی کی فوج کو ہر طرح کی مدد دینے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ سلطان محمود نے اُسے ڈھونڈنے اور اگر ممکن ہو سکے تو پکڑ لانے کے لیے آدمی بھیج رکھے تھے مگر اُس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

قنوج متھرا سے ڈیڑھ سو میل دور دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور متھرا دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر۔ اس طرح محمود غزنوی کو دو دریا عبور کرنے تھے مگر راستے میں جو راجے اور رائے قلعوں میں بیٹھے تھے، انہیں نہ تیغ کرنا ضروری تھا، ورنہ قنوج کو محاصرے میں لینے کی صورت میں یہ سب سلطان پر عقب سے حملہ کر دیتے۔ سلطان پیش قدمی جلدی کرنا بہتر سمجھتا تھا تاکہ قنوج کا دفاع زیادہ مضبوط نہ ہونے پائے۔

راستے میں جمنا کے بائیں کنارے برنج نام کا ایک مضبوط قلعہ اور چھوٹی سی ریاست تھی۔ اسے بھاون بھی کہتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ "برہمنوں کا قلعہ" کے نام سے مشہور تھا۔ قنوج اور منج کا درمیانی فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ منج ہندو راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ یہ لوگ غیر متمدن اور جنگ و جدال کے شیدائی تھے۔ ان کی عورتیں بھی بہادر اور

برقربانی دیے ڈال دیں۔ مہاراجہ قنوج کو منج کے راجپوتوں پر اعتماد تھا۔ اُس نے ان کے ساتھ دوستی اور جنگی تعاون کا معاہدہ کر رکھا تھا۔

ایک روز منج کے لوگ دریائے جمنا میں نہا رہے تھے۔ مردوں سے دُور عورتیں بھی دریا میں اُتری ہوئی تھیں۔ ہندوؤں کے لیے صبح دریا میں نہانا مذہبی فریضہ ہے۔

منج کا قلعہ دریا کے عین کنارے پر واقع تھا۔ اچانک عورتوں کی چیخ و پکار بلند ہوئی اور عورتیں کنارے کی طرف بھاگیں۔ مرد دوڑے آئے۔ وہ سمجھے کہ دریا سے شاید مگرمچھ یا کوئی اور آفت نکلی ہے مگر وہاں کچھ اور ہی نظر آیا۔ دریا میں لاشیں بہتی آرہی تھیں اور پانی کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔ پہلے چند ایک لاشیں نظر آئیں پھر دریا جیسے لاشوں کا دریا بن گیا ہو۔ دریا پر جو پنڈت اور دیگر مذہب پرست لوگ تھے، وہ ہاتھ جوڑ کر دوزانو بیٹھ گئے اور بھجن الاپنے لگے۔ اُن کے جسم کانپ رہے تھے اور اُن کے بھجن بھی کانپ رہے تھے۔

قلعے کی دیواروں پر کھڑے سنتریوں نے دیکھا تو اُن کی بھی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ راجپوت کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے لیکن وہ زندہ لوگوں سے نہیں ڈرتے تھے۔ اتنی زیادہ لاشیں کسی غیبی آفت کا پتہ دیتی تھیں۔ دریا سے جو پنڈت بھاگ آئے تھے انہوں نے مندر کے گھڑیال اور سنکھ بجانے شروع کر دیئے۔ سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ رائے چندر کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتا قلعے کی دیوار پر جا چڑھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے فوجی افسر اور درباری تھے۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟" اُس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔ "یہ متھرا اور مہابن کی لاشیں ہیں۔ کیا تم نے یہ خبر نہیں سُنی تھی کہ غزنی کے مسلمانوں نے متھرا پر قبضہ کر کے وہاں کے تمام مندر اجاڑ ڈالے ہیں؟"۔۔۔ قلعے کی دیوار سے اُسے وہ لوگ شہر کی جانب دوڑتے نظر آرہے تھے جو لاشوں کو دیکھ کر دریا سے بھاگے آرہے تھے۔

رائے چندر نے کہا۔۔۔ "دیکھو ان بزدلوں کو۔ لاشوں سے ڈر کر بھاگے آرہے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ یوں بزدلی دکھائی تو ہم سب کی لاشیں اسی طرح دریا میں بہیں گی۔

اور ہماری عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں ہوں گی۔"

مندر کی گھنٹیوں، گھڑیالوں اور سنکھوں کی آوازیں اور زیادہ بلند ہو گئی تھیں اور اب لوگ گلیوں میں بھی "ہرے رام، ہرے کرشن" کا بلند ورد کرنے لگے تھے۔ عورتیں بھی گلیوں میں نکل آئی تھیں۔ شہر کی یہ آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ رائے چندر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آخر وہ پھٹ کر بولا۔۔۔ "بند کرو یہ سنکھ اور گھڑیال۔ شہر میں یہ کیا ماتم ہو رہا ہے۔ راجپوت کس کی لاش پر رو رہے ہیں۔ پنڈتوں کو یہاں لے آؤ۔"

رائے چندر کے محافظ اور سپاہی دوڑ پڑے اور کچھ دیر بعد شہر پر سناٹا طاری ہو گیا۔

رائے چندر نیچے چلا گیا اور اپنے خاص کمرے میں جا بیٹھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو پنڈت آگئے اور ان کے ساتھ ہی ایک اور آدمی کو اندر لایا گیا جس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اُس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ رائے چندر کو بتایا گیا کہ یہ آدمی دریا سے زندہ نکالا گیا ہے۔ لکڑی کے ایک شہتیر کے سہارے تیرتا آرہا تھا۔ رائے چندر نے اُسے کہا کہ وہ سب کو بتائے کہ جن لاشوں کے ساتھ وہ تیرتا آیا ہے وہ کن لوگوں کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔

"یہ مہابن کی فوج کی لاشیں ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "اور میں مہابن کی فوج کا آدمی ہوں۔ ہمیں بتایا گیا کہ غزنی کی مسلمان فوج قلعوں پہ قلعے فتح کرتی آرہی ہے اور اس کا رُخ متھرا کی طرف ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مہابن کا جنگل کتنا گھنا اور کتنی دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے مہاراجہ کول چند نے تمام فوج اس جنگل میں پھیلا دی۔ تیر اندازوں کو درختوں پر چڑھا دیا۔ ہاتھیوں کو ایک طرف کھڑا کر دیا کہ حکم ملتے ہی مسلمانوں کو کچلنے کے لیے دوڑا دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کی فوج کو اسی جنگل سے گزرنا تھا۔ پھر میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کیا ہوا۔ جنگل کے اندر مسلمانوں کی بہت تھوڑی سی فوج آئی۔ ہماری فوج نعرے لگانے لگی۔۔۔ ایک کو بھی نہ جانے دو۔۔۔ ان کی لاشیں متھرا کے مندر کے سامنے جلائیں گے۔ جنگل کی تین طرفوں سے جیسے طوفان آگیا ہو۔ پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے مسلمان ہم پر ٹوٹ پڑے۔ جن ہاتھیوں کو مسلمانوں پر چھوڑنا تھا، وہ چنگھاڑتے اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ درختوں پر ہمارے جو تیر انداز تھے وہ تیر کھا کھا کر گرنے لگے۔

اُن کے تیروں سے مسلمان بھی مرے لیکن وہ خود بھی زندہ نہ رہے۔ درختوں سے اُن کی لاشیں گر رہی تھیں .....

"ہماری فوج بھاگ اٹھی۔ ہمارے پیچھے مسلمان جنگل کو صاف کرتے آ رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے درخت جڑوں سے اکھڑ رہے ہوں۔ آگے جمنا تھا۔ ہماری فوج جمنا میں کود گئی۔ زخمی بھی دریا میں اُتر گئے۔ مسلمان تیر انداز دریا کے کنارے سے ہم پر تیر برسانے لگے۔ وہ گھوڑے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑاتے اور ہم پر تیر چلاتے تھے۔ دریا میں چیخوں اور واویلے کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تیروں سے بچنے کے لیے جو ڈبکی لگاتے تھے وہ ڈوب جاتے تھے۔ تیر اندازوں نے کسی کو دوسرے کنارے پر بھی نہ جانے دیا۔ میں ایک لکڑی کے تختے پر تیرتا آیا ہوں۔ بے شمار آدمی بہت دُور آ کر بھی دریا سے نہ نکلے کہ مسلمان مار ڈالیں گے۔ یہاں آ کر میں نے باہر آنے کی جرأت کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ مہابن میں ہمارے بعد کیا ہُوا ہے۔"

"وہ میں بتاتا ہوں" ——— رائے چندا نے گرج کر کہا ——— "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ تمہارے راجہ کول چند نے اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ خودکشی کر لی ہے۔ اُس کے تمام ہاتھی مسلمانوں کے پاس ہیں، اور غزنی کے سلطان محمود نے متھرا کا بڑا مندر اور تمام چھوٹے مندر صاف کر دیئے ہیں۔ وہاں کے لوگ اب سنکھ اور گھڑیال نہیں اذانیں سنتے ہیں۔"

"ہرے رام۔ ہرے رام" ——— دونوں پنڈتوں نے کہا اور بڑا پنڈت بولا ——— "ان ملیچھ مسلمانوں پر ایسی آفت پڑے گی کہ ان کی بوٹیاں چیلیں، گدھ اور کتے کھائیں گے۔ کرشن واسدیو کا قہر ان کے بچوں کو بھی بھسم کر دے گا۔ مہاراج! ہر ہر مہادیو بہت بڑی قربانی مانگتے ہیں۔ اگر آپ قہر سے بچنا چاہتے ہیں تو ایک کنواری کی جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ میں آپ کو حساب کر کے بتاؤں گا کہ اور کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ آکاش پر ستاروں کی گردش کے راستے بدلے بدلے سے ہیں۔ یہ میں آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں۔ یہ نکھشتر چندرماں کا ہے مگھا، پوربا، پھالگنی، ہست، چترا، استری نکھتر اس چندرماں جل برجوں سے گزر رہا ہے۔ یہ سمے راج پاٹ کے لیے بہت بُرا

ہے۔ سورگ کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ملیچھ مکھیوں کی طرح مریں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں ہری کرشن واسدیو کا کرودھ شامل ہو گیا ہے۔ یہ سمے پُن اور پراپتھا کا ہے ..... ہم آپ کی جنم پتری پھر دیکھیں گے۔ اگر بلیدان میں دیر ہوئی تو ہندو دیویاں مسلمانوں کے بچے پیدا کریں گی۔ اپنی دیویوں کی کوکھ کو ملیچھوں کے بیج سے بچانے کے لیے اور انہیں پوتر رکھنے کے لیے ہمیں مہادیو کے چرنوں میں ایک سے زیادہ کنواریوں کا بلیدان دینا ہوگا۔"

رائے چندا کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اُس کی گھنی مونچھیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ پنڈتوں کو قہر کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پنڈت ابھی بول رہا تھا کہ رائے چندا پھٹ پڑا۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہوگا مندر میں ہوگا" ——— رائے چندا نے گرج کر کہا ——— "دو تین کنواریاں آپ کے حوالے کر دی جائیں گی اور آپ انہیں دس پندرہ روز اپنے پاس رکھیں گے پھر ان کی گردنیں کاٹ دیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بچہ بچہ باہر نکلے اور غزنی کے لٹیروں سے انتقام لے؟"

"چھی چھی چھی مہاراج!" پنڈت نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا ——— "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ دھرم کی یوں ہتیا نہ کریں۔ یہ برہمنوں کا قلعہ ہے اور برہمن بھگوان کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ جو ہم جانتے ہیں وہ آپ نہیں جانتے۔ آپ آکاش کے تاروں کے راستے نہیں روک سکتے۔ خون کا بلیدان ....."

"بلیدان، بلیدان" ——— رائے چندا نے گرج کر کہا ——— "خون کی قربانی صرف دو تین کنواریاں نہیں دیں گی۔ راجپوتوں کا بچہ بچہ اپنے خون کی قربانی دے گا۔ راجپوتوں کی ہر ایک کنواری خون کی قربانی دے گی... اور یاد رکھو پنڈت جی مہاراج! اس قلعے کا نام برہمنوں کا قلعہ ہے لیکن یہ قلعہ راجپوتوں کا ہے۔ راجپوت ایک ہی بات سمجھتے ہیں... دشمن کی موت یا اپنی موت .... راجپوت اپنی فتح پر اپنے مذہب کو بھی قربان کر دیا کرتا ہے۔"

"مہاراج!" ——— پنڈت نے کہا ——— "اپنی رعایا پر رحم کریں۔ میں جو کہتا ہوں

سن لیں۔ مذہب کی قربانی کی بات نہ کریں۔"

"ہمیں مذہب کی زنجیریں نہ ڈالو"۔۔۔ رائے چندا نے کہا ۔۔۔ "راجدھانی کی بے عزتی ہو رہی ہو، لوگ بھوک کے مر رہے ہوں، دنیا فنا ہو رہی ہو۔ آپ جیسے مذہبی پیشوا اپنا ہی راگ الاپتے رہتے ہیں۔ آپ کو میدان میں جا کر لڑنا نہیں پڑتا۔ مندر میں بیٹھے آپ کی پیٹ پوجا ہوتی رہتی ہے۔ آپ کو مٹھی چاپی کے لیے کنواریاں بھی ملتی رہتی ہیں۔"

"مہاراج!۔۔۔ پنڈت نے غصے سے کہا۔ "متھرا کی تباہی کی خبر سن کر اور دریا میں اتنی زیادہ لاشیں بہتی دیکھ کر آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ آپ میری نہیں، اپنے دھرم کی بے عزتی کر رہے ہیں۔"

"کونسے دھرم کی بات کر رہے ہیں آپ؟"۔۔۔ رائے چندا نے طنزیہ کہا۔۔۔ "کیا آپ نے سُنا نہیں کہ بلند شہر کے دس ہزار ہندو اپنے راجہ ہردت سمیت دھرم پر لات مار کر مسلمان ہو گئے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں انہوں نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا ہے؟"

"اپنی جانیں بچانے کے لیے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "وہ بزدل تھے۔ مسلمانوں کی تلواروں سے اور قید سے ڈر گئے۔"

"نہیں"۔۔۔ رائے چندا نے کہا۔۔۔ "انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دیوتاؤں کے بُت اور دیویوں کی مورتیاں نہ اپنے آپ کو بچا سکیں نہ کسی راجے کی پرجا کو۔"

وہاں رائے چندا کی جوان بہن شیلا کماری اور نوجوان بیٹی رادھا بھی موجود تھیں اور رادھا کی ماں بھی وہیں تھی۔ شیلا کماری نے پنڈت سے کہا۔۔۔ "کیا عورت مندر میں پنڈتوں کے ہاتھوں قربان ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟"

"اب کسی لڑکی کی جان کی قربانی نہیں دی جائے گی"۔۔۔ رائے چندا کی رانی لکشمی نے کہا۔۔۔ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو تباہی مچائی ہے وہ دیوتاؤں کا قہر ہے تو ہم اس قہر کا مقابلہ کریں گے۔"

دونوں پنڈت غصے میں کچھ بڑبڑاتے چلے گئے۔

رائے چندا کی بہن شیلا نے اُسے کہا۔۔۔ "بھیا! کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کو کسی طریقے سے قتل کر دیا جائے تو اس کے آئے دن کے حملے ختم ہو سکتے ہیں؟"

"ہمیں بہت کچھ سوچنا ہے میری بہن!"۔۔۔ رائے چندا نے کہا۔۔۔ "ہمارے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمود غزنوی کو جنگ میں قتل کرنا آسان نہیں اور اُسے دھوکے سے قتل کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میں سوچوں گا۔ سب سے پہلے ہمیں مہاراج قنوج کے پاس چلنا ہے۔ غزنی کا یہ سلطان متھرا میں نہیں بیٹھا رہے گا نہ وہاں سے ہی واپس جائے گا۔"

اُس نے حکم دیا کہ قنوج کو روانگی کا انتظام کیا جائے۔

فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ رائے چندا اپنی رانی لکشمی، بہن شیلا اور بیٹی رادھا کے ساتھ اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ فوجی مشیر اور افسر بھی تھے اور وزیر بھی ساتھ تھا۔ یہ قافلہ شام تک قنوج پہنچ گیا۔

اُسی رات رائے چندا نے مہاراجہ قنوج راجیا پال سے صورتِ حال سے متعلق بات چیت کر لی۔ راجیا پال نے اُسے کہا۔۔۔ "ہم اکٹھے کھلے میدان میں نہیں لڑ سکتے۔ میرے پاس مہابن اور متھرا سے جو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ کھلے میدان میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں قلعہ بند ہو کے لڑنا پڑے گا۔ مجھے نظر یہ آ رہا ہے کہ محمود آپ کا محاصرہ کرے گا۔ اُس کی دراصل نظر قنوج پر ہے۔ اگر اس نے آپ کا محاصرہ کیا تو میں باہر سے محاصرے پر حملے کر کے اُسے کمزور کرنے کی کوشش کروں گا، اور اگر وہ سیدھا قنوج پر آیا تو میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ اُس کے عقب پر حملے کرتے رہیں گے۔"

منج کا رائے چندا بہت بھڑکا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ منج کے راجپوت صحیح معنوں میں غیرت مند اور دلیر تھے۔ میدانِ جنگ میں ان پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی عورتوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ بہت حسین اور غیر معمولی طور پر

جرأت مند تھیں اور یہ قوم برہمنوں سے بہت مختلف تھی۔ رائے چندرا کا پنڈتوں اور
مذہب کو دھتکار دینا اُس کی حماقت نہیں بلکہ جرأت اور بے خوفی کی دلیل تھی۔
رائے چندرا کی بہن اور بیٹی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بہت ہی
خوبصورت تھیں۔ اُن کے حسن کے چرچے دُور دُور تک ہوتے تھے۔ قنوج کے
مہاراجہ راجیاپال کا بیٹا لکھمن پال رائے چندرا کی بہن شیلا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا
تھا مگر رائے چندرا نے شیلا کی شادی لاہور کے مہاراجہ بھیم پال "نڈر" کے بھائی
ترلوچن پال کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اگر محمود غزنوی حملہ نہ کر دیتا تو یہ
شادی ہو چکی ہوتی۔

رات کو جس وقت مہاراجہ راجیاپال اور رائے چندرا متھرا کی تباہی اور محمود غزنوی
کے متوقع حملے کی باتیں کر رہے تھے اور اُن کے مشیر اور وزیر مقابلے کے
منصوبے بنا رہے تھے، اُس وقت راجیاپال کا بیٹا لکھمن پال محل کے باغ کے
اندھیرے کونے میں کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دو عورتیں اس اندھیرے
کونے کی طرف اس طرح جا رہی تھیں جیسے سائے چل رہے ہوں۔ ذرا آگے جا
کر سائے رُک گئے۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا "آپ آگے چلی جائیں۔
راجکمار مل جائیں گے۔"

دوسری نے اُس کے ہاتھ میں سونے کا ایک سکہ دیتے ہوئے کہا "کسی کو
پتہ نہ چلے کہ میں یہاں آئی اور راجکمار لکھمن سے ملی تھی۔"

وہ رائے چندرا کی بہن شیلا تھی۔ لکھمن پال نے اپنی خاص ملازمہ کو بھیج کر شیلا کو
ایک تاریک گوشے میں بلایا تھا۔

شیلا اپنی ماں اور بھتیجی رادھا کو بتلائے بغیر محل آئی تھی۔ یہ سب رائے چندرا
کے ساتھ قنوج آئی تھیں۔

اُسے دیکھ کر لکھمن پال آگے بڑھا اور بولا "مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم آؤ
گی۔ میں یہاں سے تمہیں منج پیغام بھیجتا رہا ہوں اور تم ہر بار یہی جواب دیتی رہی
ہو کہ تمہیں میری محبت قبول نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟

میں جانتا ہوں تمہاری شادی مہاراجہ بھیم پال کے چھوٹے بھائی سے ہو رہی ہے۔
کیا تم یہ فیصلہ بدل نہیں سکتیں؟ کیا تمہیں وہی راجکمار پسند ہے؟"

"تم خوبصورت جوان ہو لکھمن!" شیلا نے کہا "میرا اپنا کوئی فیصلہ نہیں
لیکن اب میں سمجھنے لگی ہوں کہ تم میرے قابل نہیں۔ اُدھر غزنی کے مسلمان ہم پر
طوفان کی طرح آ رہے ہیں، متھرا اور مہابن کی تباہی کو میں نے جمنا میں بہتی ہوئی
ہزاروں لاشوں کی صورت میں دیکھا ہے۔ متھرا کے مندروں میں مسلمان اذانیں دے
رہے ہیں، وہ ہری کرشن واسدیو کا بُت اُٹھا لے گئے ہیں، بلند شہر کے دس ہزار
ہندو مسلمان ہو چکے ہیں اور تم مجھے حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔ کیا تم میں غیرت
نہیں؟ اب مسلمان قنوج اور منج کو فتح کرتے آ رہے ہیں۔"

"مجھ میں سب کچھ ہے۔" لکھمن پال نے کہا "مگر تمہاری محبت نے مجھے
پاگل کر رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم شادی کا فیصلہ بدل سکتی ہو اور
میرے ساتھ شادی کر سکتی ہو۔"

"میں کسی کو نہیں چاہتی۔" شیلا نے کہا "نہ مہاراجہ بھیم پال کے بھائی
کو نہ تمہیں۔ میں اُسی کو چاہنے لگوں گی جس کے ساتھ میری شادی ہو جائے
گی۔ .... لکھمن پال! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ محبت نہیں۔
تم میرا حسن اور میرا جسم چاہتے ہو۔ چند برسوں بعد جب میرے چہرے پر نوجوانی
کے آثار مدھم پڑنے لگیں گے تو تم ایک اور نوجوان لڑکی لے آؤ گے۔ تمہارے
باپ نے اس عمر میں میری عمر کی چمپا رانی سے شادی کی تھی۔ کہاں ہے چمپا رانی؟
متھرا کے قلعے میں غزنی کے ایک جاسوس کے ساتھ بھاگتے ہوئے ماری گئی۔
تم اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"پھر میرے بلانے پر کیوں آ گئی ہو؟" لکھمن پال نے پوچھا۔

"ایک شرط لے کر آئی ہوں۔" شیلا نے کہا "اگر پوری کر دو تو تمہاری بیوی
بن جاؤں گی۔ اگر میرا بھائی نہیں مانے گا تو وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے پاس
آ جاؤں گی۔"

"فوراً بتاؤ۔" لچھمن پال نے خوش ہو کر کہا۔ "جو کہو گی کر دکھاؤں گا۔"

"غزنی کے سلطان کو متھرا میں قتل کرنا ہے۔" شیلا نے کہا۔

"متھرا میں کیوں؟" لچھمن پال نے کہا۔ "میں اُسے میدان میں قتل کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں لا رکھوں گا۔"

"لچھمن!" شیلا نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم منج کی ایک راجپوت لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بھائی نے بتایا ہے کہ متھرا کے مندر میں تمام راجوں مہاراجوں نے واسدیو کے قدموں میں بیٹھ کر قسمیں کھائی تھیں کہ محمود کا سر اس بُت کے قدموں میں رکھیں گے اور اس کے خون سے کرشن مہاراج کے پاؤں دھوئیں گے۔ کہاں ہیں وہ راجے اور مہاراجے؟ سب بھاگ گئے، اور بلند شہر کے راجے ہردت نے اپنی دس ہزار فوج کی تلواریں محمود کے قدموں میں رکھ کر اُس کا مذہب قبول کر لیا۔ ہمارے ہری کرشن واسدیو کے قدموں تلے سے وہ چبوترا نکل گیا ہے جس پر اُسے پنڈتوں نے کھڑا کیا تھا۔"

"یہ مسلمان لٹیرے ہیں۔" لچھمن پال نے کہا۔ "انہیں سونا مندروں سے ملتا ہے، اس لیے مندر اُجاڑ جاتے ہیں۔"

"لچھمن! ہوش میں آؤ۔" شیلا نے کہا۔ "بھارت ماتا کی عزت کے محافظ صرف راجپوت ہیں اور میں ایک راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرے بھائی نے مجھے جس استاد کے حوالے کیا تھا وہ بہت دانشمند بزرگ ہے۔ میں نے پہلے پہل جب غزنی کے حملوں کے متعلق سنا تھا تو اپنے استاد سے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان لٹیرے ہیں اور لوٹنے آتے ہیں۔ میں نے اب متھرا کی تباہی کی خبر سنی تو بھی اس سے پوچھا تھا کہ مسلمان صرف لوٹنے آتے ہیں یا ہمارے علاقوں پر قبضہ کر لیں گے؟ .... اُس نے مجھے بتایا ہے کہ محمود غزنوی لٹیرا نہیں۔ وہ ہمارے مذہب کو ختم کرنے اور اپنا مذہب پھیلانے آیا ہے۔ استاد نے کہا ہے کہ لٹیرے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر محمود کو مذہب کی بجائے دولت سے دلچسپی ہوتی تو راجہ ہردت اپنی فوج کے ساتھ اُس کا مذہب قبول نہ کرتا ....

"اور میں نے استاد سے پوچھا تھا کہ مسلمان عورتیں کیسی ہوتی ہیں، کیا وہ ہندو راجپوتوں کی عورتوں کی طرح دلیر ہوتی ہیں؟ استاد نے بتایا ہے کہ وطن سے اتنی دور آ کر لڑنے اور فتح پانے والے سپاہیوں کی مائیں یقیناً دلیر ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں غیر مسلموں کے خلاف جنگ میں اپنے بیٹوں کو بھیج کر فخر کرتی ہیں .... لچھمن! تم جنہیں لٹیرا کہہ رہے ہو وہ کسی معمولی قوم کے لوگ نہیں۔ میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی قوم کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہندو راجپوت عورت مسلمان عورت سے زیادہ دلیر ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نہیں مانو گے تو میں فوج کے کسی سپاہی کو ساتھ لے لوں گی اور محمود غزنوی کو قتل کروں گی۔ اگر میں زندہ رہی تو اپنا آپ ہمیشہ کے لیے اس سپاہی کے حوالے کر دوں گی.... کہو، تم محمود کو قتل کرو گے؟"

"تمہاری خاطر تمہاری شرط پوری کروں گا۔"

"میری خاطر نہیں۔" شیلا نے کہا۔ "اپنے دھرم اور اپنے دیس کی خاطر.... اگر پیٹھ دکھا جاؤ گے تو میں، میری بھتیجی رادھا اور تمہاری بہنیں مسلمانوں کے خیموں میں ہوں گی اور وہ مسلمان بچوں کو جنم دیں گی۔"

"میں محمود کو قتل کروں گا۔"

"متھرا میں۔" شیلا نے کہا۔ "وہ مر گیا تو اُس کی فوج بیکار ہو جائے گی۔ وہ متھرا سے آگے نہ آئے۔ تم برہمن ہو۔ برہمن کو اپنے مذہب کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ میری رگوں میں راجپوت کا خون ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ میرے دل میں تمہاری وہ محبت نہیں جو تم اپنے دل میں بٹھائے ہوئے ہو، لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ محمود کو قتل کر دو تو ساری عمر تمہاری غلام رہوں گی۔"

"اور اگر میں مارا گیا؟"

"تو تمہاری چتا پر کھڑی ہو کر زندہ جل جاؤں گی۔"

لچھمن اور شیلا دربان کے روکنے کے باوجود اُس کمرے میں داخل ہو گئے جس میں قنوج کا راجہ جیا پال اور منج کا راجہ چندرا اپنے مشیروں، وزیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ بیٹھے

محمود غزنوی کو ہندوستان سے نکالنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ راجپا پال نے دونوں کو دیکھ کر کہا کہ وہ چلے جائیں۔

"ہم اسی کام کے لیے آئے ہیں جس پر آپ غور کر رہے ہیں"۔ بھیمن پال نے کہا — "بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی سوچا ہے اسے ذرا الگ رکھ دیں... کیا آپ نے یہ سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان کو متھرا میں قتل کیا جا سکتا ہے؟ اس کے قتل سے اس کی ساری فوج آپ کی قیدی ہوگی"۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ راجپا پال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ہم نے ابھی یہ نہیں سوچا"۔ رائے چندا نے کہا — "اس کام کے لیے بہت دلیر اور بڑے ہی عقلمند آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

"اور ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو محمود غزنوی کو اپنا ذاتی دشمن سمجھیں"۔ بھیمن پال نے کہا "کرائے کے قاتل یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرائے کے قاتل وہاں جا کر مسلمانوں سے انعام و اکرام لے لیں اور انہی کے ہو کے رہ جائیں۔ یہ کام کوئی راجکمار کر سکتا ہے"۔

"ایسا راجکمار کون ہو سکتا ہے"؟ راجپا پال نے پوچھا۔

"وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے"۔ بھیمن پال نے کہا "وہ میں ہوں... بھیمن پال"۔

رائے چندا نے مہاراجہ راجپا پال کے کندھے پر ہاتھ مار کر بھیمن پال سے کہا "راجکمار! تم نے اپنے باپ کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اُسے تمہارے ساتھ بھیجتا"۔

"ہاں بھیمن!" — اس کے باپ راجپا پال نے کہا — "اگر تم یہ کام کر سکو تو غزنی کا سب بھی مر جائے گا اور ہماری فوج کی لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی"۔

"کیا آپ اس کام کو آسان سمجھتے ہیں؟" — ایک بوڑھے فوجی مشیر نے کہا "کیا آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ لڑکا متھرا جائے گا اور غزنی کے سلطان کے دل میں خنجر اتار کر اسی طرح واپس آ جائے گا جس طرح یہ اب کھڑا ہے؟"

"میں بھارت ماتا پر اپنی جان قربان کرنے کا عہد کر چکا ہوں"۔ بھیمن پال نے کہا۔

"اور غزنی کا سلطان یہ عہد کر کے آیا ہے کہ یہاں کسی مندر کو اور کسی مہاراجے کی راجدھانی کو سلامت نہیں رہنے دے گا"۔ بوڑھے مشیر نے کہا "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محمود غزنوی کے بازو بڑے لمبے ہیں۔ ہماری کوئی بات اور کوئی حرکت اُس سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ جس محافظ کو ہم اپنا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے رہے ہیں اور جو راج محل کے اُن رازوں سے بھی واقف تھا جن سے راجکمار بھی واقف نہیں ہوتے، وہ غزنی کا جاسوس تھا"۔

"اس کے باوجود میں اُسے قتل کرنے جاؤں گا"۔ بھیمن نے کہا "مجھے ایسے کام کا کوئی تجربہ نہیں۔ مجھے بتا دیں کہ ایسے کام کس طرح کیے جاتے ہیں"۔

اس کے باپ مہاراجہ راجپا پال نے اس بوڑھے فوجی اور اپنے وزیر سے کہا کہ وہ بھیمن کو محمود غزنوی کے قتل کے لیے تیار کریں۔ اس نے کہا "میں اپنے بیٹے کو اپنے دھرم اور دھرتی پر قربان کرتا ہوں"۔

"سب سے پہلے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ تمہارا مقابلہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ساتھ ہے"۔ دوسرے دن وہ تجربہ کار بوڑھے بھیمن پال کو بتا رہے تھے "محمود غزنوی صحیح معنوں میں جنگجو ہے اور اس کے سامنے جنگ کا ایک مقصد ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب لایا ہے۔ اسے میدان میں شکست دینا آسان نہیں۔ اس کی عقل تک ہمارے مہاراجے نہیں پہنچ سکتے... اور اُس تک اس طرح نہیں پہنچ سکتے کہ اُسے جا ملو اور قتل کر دو۔ صرف ایک بات یاد رکھو۔ مذہب کا کوئی کتنا ہی پابند کیوں نہ ہو، وہ ہوتا انسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری مرد ہے۔ تم ایک بہروپ میں متھرا جاؤ گے....

"بہروپ یہ ہوگا کہ تم قنوج کے جنگلوں میں بسنے والے ایک قبیلے کے سردار ہو۔ قبیلہ جنگجو ہے اور اُس کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ ہے۔ تم کہو گے کہ مہاراجہ قنوج نے اس قبیلے کو غزنی کی فوج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کر لیا ہے مگر تم جو اس قبیلے کے سردار ہو مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے۔ اس کی بجائے تم راجہ بردت کی طرح اپنے تمام قبیلے سمیت مسلمان ہونا چاہتے ہو۔ یاد رکھو راجکمار! تمہیں سلطان محمود تک کوئی

نہیں جانے دے گا۔ تم کہو گے کہ ایک دو راز کی باتیں ہیں جو تم صرف سلطان کو بتانا چاہتے ہو۔ اس کے باوجود تمہیں سلطان سے نہ ملنے دیں تو کہنا سلطان خفیہ طریقے سے قتل ہو جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔"

"آپ نے عورت کا ذکر کیا تھا" بھیمن پال نے کہا ۔۔۔ "اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"تمہارے ساتھ کم از کم دو نہایت خوبصورت اور جوان عورتیں ہونی چاہئیں" ۔۔۔ استاد نے کہا ۔۔۔ "انہیں بیٹیاں ظاہر کرو گے" ۔۔۔ اُس نے رازداری سے کہا ۔۔۔ "اگر یہ عورتیں عقل مند ہوں تو سلطان کی فوج کے سالاروں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتی ہیں۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ سلطان بھی ان عورتوں پر فریفتہ ہو جائے گا۔ اگر وہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کو کہے تو مان جانا۔ ان کے پاس زہر ہونا چاہیئے جو وہ اُسے شربت یا شراب میں پلا سکتی ہیں۔ ہم تمہیں ایسی دو جوان لڑکیاں دے دیں گے۔ تمہیں جنگلی قبیلے کے سرداروں جیسا لباس پہنائیں گے۔"

فوجی مشیر اور وزیر نے جو جاسوسی اور جنگ کا تجربہ رکھتا تھا، بھیمن پال کو عملی تربیت دینی شروع کر دی کہ وہ محمود غزنوی کو کس طرح قتل کرے گا اور وہاں سے کس طرح نکلے گا۔

"ایک عورت میں خود ہوں گی اور دوسری میری بھتیجی رادھا ہوگی" ۔۔۔ راجے چندا کی بہن شیلا بھیمن پال سے کہہ رہی تھی۔ بھیمن پال اُسے رات کو ملا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ اُس کے استادوں نے اُسے کس طرح تیار کیا ہے اور کہا ہے کہ دو جوان اور خوبصورت عورتوں کا ہونا لازمی ہے۔ شیلا نے رادھا کو بھی بلا لیا اور اُسے بتایا کہ وہ کیا فیصلہ کر چکی ہے اور بھیمن پال کس کام کے لیے جا رہا ہے۔ رادھا نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔ تینوں راجے چندا کے پاس چلے گئے .... وہ کچھ ہچکچایا۔

"یہاں لڑکیوں کو مندروں میں قربان کر دیا جاتا ہے" ۔۔۔ رادھا نے کہا۔ "آپ

خود کہتے ہیں کہ انسانی قربانی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دونوں جو قربانی دینے جا رہی ہیں، اس سے آپ کو بہت کچھ حاصل ہوگا۔ اگر بھیمن پال کے ساتھ کوئی اور عورتیں گئیں تو وہ اسے دھوکہ دے سکتی ہیں۔"

شیلا اور رادھا کا حُسن اور ان کے جسموں کی دلکشی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ ان کی بہادری پر بھی کسی کو شک نہیں تھا۔ ان میں عقل بھی تھی اور وہ محمود غزنوی کے قتل کو اپنا ذاتی فرض سمجھتی تھیں۔ دونوں نے اپنے باپ اور بھیمن پال کو مجبور کیا کہ وہ اُس کے ساتھ چلی جائیں۔

ان سب کے لیے ایسے جنگلی قبیلے کا لباس تیار کیا گیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ان کے ساتھ دو قابل اعتماد اور دلیر فوجیوں کو ان کے نوکروں اور محافظوں کے لباس میں تیار کیا گیا۔ شیلا اور رادھا کو ایسا لباس پہنایا گیا جس میں اُن کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر تک اور کندھے اور سینے اور پیٹ کا کچھ حصہ اور بازو ننگے تھے۔ اُن کے بال کھول دیئے گئے۔ اس لباس میں اُن کا جسمانی حسن اور دلکشی ایسی نکھری کہ دیکھنے والے اُن سے نظریں نہیں ہٹا سکتے تھے۔ بھیمن پال بھی جنگلی لباس میں نیم عریاں تھا۔ اُس کا گورا جسم تنومند اور بہت خوبصورت لگتا تھا۔

انہیں محمود غزنوی کو دینے کے لیے جو تحفے دیئے گئے ان میں دو انسانی کھوپڑیاں، دو چیتوں کی کھالیں، اس علاقے کے دو زندہ ہرن اور سونے کا ایک چھوٹا سا بت تھا جس کا اوپر کا دھڑ انسان کا اور باقی دھڑ گھوڑے کا تھا۔ اس کے متعلق انہیں سلطان محمود کو یہ بتانا تھا کہ وہ اس بت کی پوجا کیا کرتے ہیں مگر اب مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔

رات کو یہ قافلہ گھوڑوں پر سوار ہو کر قنوج سے نکلا۔ انہیں مہابن کے جنگل کے قریب جا کر دریائے جمنا پار کرنا تھا جو قنوج سے تقریباً ایک سو پچیس میل دور تھا۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان دو خچروں پر لدا ہوا تھا۔ انہیں مہابن کے جنگل میں سے گذر کر متھرا تک پہنچنا تھا۔

سلطان محمود غزنوی ابھی متھرا میں تھا۔ یہ جگہ اُسے بہت ہی اچھی لگی تھی۔ متھرا مندروں کا شہر تھا۔ مسلمان سپاہی مندروں کو آگ لگا رہے تھے۔ بڑے مندر کے صحن میں جو ہندوؤں کے کرشن مہاراج کی جائے پیدائش تھا، فوجی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ وہاں کے ہندو ایسے گئے گذرے بھی نہیں تھے کہ اپنے مذہب اور دیوتاؤں کی توہین برداشت کر لیتے۔ انہوں نے غزنی کے چند ایک فوجیوں کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا تھا اور تخریبی کاروائیاں بھی کی تھیں۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ شہر کو کھنڈر بنایا جائے اور اسے انسانوں کو زندہ رہنے کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ شہر جل رہا تھا اور محمود غزنوی اپنی فوج کو قنوج کی طرف پیشقدمی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے فوج کا خطیب اور بڑے دستوں (ڈویژنوں) کے امام جو غزنی سے ہمیشہ فوج کے ساتھ آیا کرتے تھے، بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ اُس کے سالار، نائب سالار اور کماندار بھی تھے۔

"ہم قنوج کی طرف پیشقدمی کرنے والے ہیں"۔ سلطان محمود غزنوی نے کہا ——— آپ کو اس علاقے کا نقشہ دکھانے اور اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے کچھ اہم باتیں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اتنی بڑی فوج کو اکٹھا کر کے خطاب نہیں کر سکتا۔ آپ سب اپنے سپاہیوں تک میرا پیغام لفظ بہ لفظ پہنچا دیں۔ خطیب اور امام نماز کے بعد سب کو میرا پیغام سنائیں۔ انہیں بتائیں کہ یہ جنگ میری نہیں، ان کی ذاتی نہیں، یہ خدا اور رسولؐ کی جنگ ہے۔ ہم یہاں کفر کے اُس فتنے کو ختم کرنے آئے ہیں جس کے متعلق خدا کا حکم ہے کہ اُس وقت تک لڑو جب تک کفر کا فتنہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اگر میں ہندوستان میں بار بار نہ آتا تو یہ ہندو غزنی کو فتح کر کے خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہے ہوتے۔ اُدھر یہودیوں اور عیسائیوں کا فتنہ ہے۔ ہم ایک طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کے بُت خانے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے اسے دارالاسلام بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے....
مجھے اپنی سلطنت کی توسیع کا کوئی لالچ نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے لاہور کے مہاراجوں کو کتنی بار شکست دی ہے مگر اس خطے کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا....
"ساری فوج سے کہہ دو کہ ہم وطن سے دُور صرف خدائے ذوالجلال کے بھروسے پر آئے ہیں اور خدا صرف اس لیے ہماری مدد کر رہا ہے کہ ہم اُس کا عظیم پیغام اور ایمان ساتھ لائے ہیں۔ اگر مجھے دولت اور زر و جواہرات کا لالچ ہوتا تو میں بار بار یہاں نہ آتا۔ ایک ہی بار لوٹ مار کر کے غزنی میں تخت پر بیٹھ کر عیش کرتا مگر میں ہر بار یہاں خودکشی کرنے آتا ہوں۔ ہر بار توقع ہوتی ہے کہ زندہ واپس نہیں جا سکوں گا لیکن خدا مجھے ہر بار نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ خدا مجھ سے ہی اس عظیم مقصد کی تکمیل کرانا چاہتا ہے جس کے لیے ہم ہندوستان میں آتے ہیں۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ قنوج میں مجھے قتل کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ میں کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے قتل ہو سکتا ہوں لیکن مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ میرے اندر سے آواز آ رہی ہے کہ میں قتل نہیں ہوں گا۔ یہ آواز خدا کی ہے....

"ساری فوج کو ایک بار پھر بتا دو کہ جہاد نماز سے افضل ہے۔ اسلام کا یہ نظریہ یاد رکھو کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور تمہارے سامنے سانپ آ جائے تو نماز چھوڑ دو اور سانپ کو مار دو۔ میں آپ کو نماز چھوڑنے کا مشورہ نہیں دے رہا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف نماز سے خدا کی خوشنودی حاصل کر لے گا تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ جب تک آپ اس سانپ کو نہیں ماریں گے جس کا نام ہندو ہے، آپ خدا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں آپ کو آج بتا دیتا ہوں کہ اس ملک میں اگر ہندوؤں کو بالادستی حاصل رہی تو وہ مسلمانوں کے لیے زندگی جہنم بنائے رکھیں گے۔ یہ ملک مسلمانوں کی قتل گاہ بنا رہے گا۔ اپنے سپاہیوں کو بتائیں کہ تمہیں اپنے ان ساتھیوں کے خون کا خراج ادا کرنا ہے جو یہاں شہید ہوئے ہیں اور ان کی لاشیں اپنے وطن واپس نہیں جا سکیں گی...

"میں اپنی فوج کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا یہ خطہ جہاں ہم بیٹھے ہیں بڑا ہی دلفریب ہے۔ یہاں کے لوگ بھی حسین اور دلفریب ہیں۔ میں خود اس علاقے سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ گنگا اور جمنا نے مل کر اس خطے کو جو حسن اور دلکشی بخشی ہے، یہ انسانوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ تم نے یہاں کی عورتیں دیکھی ہیں۔ میں ان کے حسن میں خطرے دیکھ رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا کوئی عسکری اس جادو کا شکار ہو جائے۔ اپنے

اور عورت کا سکرطاری کرنے والے کو کبھی فتح نصیب نہیں ہوتی۔ ہر فوجی کو، خواہ وہ سالار ہے یا سپاہی، خبردار کر دو کہ کسی نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی تو میں اُسے فوراً خدا کے پاس پہنچا دوں گا تاکہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے۔ میرے پاس ایسے آدمی کے لیے سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں۔"

سلطان محمود نے خطیب اور اماموں کو رخصت کر دیا اور سالاروں اور دیگر کمانداروں کے سامنے متھرا سے قنوج تک کا نقشہ پھیلا کر بتلانے لگا کہ پیشقدمی کا راستہ کون سا ہو گا۔ اُسے جاسوسوں نے مکمل معلومات دے دی تھیں۔ جاسوسوں کے علاوہ اُس کے اپنے کماندار بھیس بدل کر قنوج تک ہو آئے تھے۔

"راستے میں مُنج کا قلعہ آئے گا" — سلطان محمود نے کہا — "یہ راجپوتوں کا شہر ہے اور یہ راجپوت بہت دلیر ہیں۔ لڑنے میں ہندوستان کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہمیں سب سے پہلے انہیں ختم کرنا ہے، ورنہ یہ ہمیں اُس وقت پریشان کریں گے جب ہم قنوج کو محاصرے میں لے لیں گے ... جاسوسوں نے تصدیق کر دی ہے کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اسی علاقے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے چھوٹے بڑے راجوں مہاراجوں کو میرے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ اُس کے بھائی بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ بھیم پال کو زندہ پکڑنا ہے۔ کچھ اس قسم کی اطلاع بھی ملی ہے کہ اُس کی فوج بھی اِدھر آ رہی ہے۔ ہمیں ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا۔"

سلطان محمود نے ساتویں روز متھرا سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے کمک کے لیے کچھ دستے متھرا میں رہنے دیئے اور جنگ میں نام پیدا کرنے والے دستوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔

یہ طلوعِ آفتاب کا وقت تھا۔ سورج اُبھرتا آ رہا تھا۔ مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا لکھمن پال ایک خیالی جنگلی قبیلے کے سردار کے بھیس میں، شیلا، رادھا اور دو مددگار نوجوانوں کے ساتھ مہابن کے جنگل کے سامنے والے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تیسری رات یہاں پہنچے اور رات یہاں ہی گزاری تھی۔ دسمبر، جنوری کے دن تھے۔ سردی سخت تھی، ان

ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ رات کو یہاں پہنچے تھے اور دیکھ نہیں سکتے تھے کہ یہ دریا کا ایسا کنارہ ہے جو ایک جگہ سے اتنا اندر کو آ گیا ہے کہ جھیل بنا ہوا ہے اور یہ جھیل مگرمچھوں کا مسکن ہے۔ اگر سردی اتنی زیادہ نہ ہوتی تو مگرمچھ انہیں زندہ نہ رہنے دیتے۔

یہاں قریب کہیں سے انہیں دریائے جمنا پار کرنا تھا۔ لکھمن پال اور شیلا جاگ اُٹھے۔ رادھا اور اُن کے دو ساتھی جو تجربہ کار اور دلیر فوجی تھے، ابھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ لکھمن پال نے شیلا سے کہا کہ وہ اکیلا کچھ دُور آگے جائے گا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ دریا پر کشتی راں مل جاتے ہیں جو اُجرت پر دریا پار کرا دیتے ہیں۔ وہ چلا تو شیلا بھی کچھ دُور تک اُس کے ساتھ چل پڑی۔ یہ علاقہ گھنا جنگل تھا۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ رات کو وہ یہ علاقہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ انہیں سوائے درختوں، جھاڑیوں اور کہیں کہیں ٹیلوں ٹیکریوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں چپ چاپ جا رہے تھے۔

"تم اتنے خاموش کیوں ہو لکھمن؟" — شیلا نے رُک کر پوچھا — "ایسی خاموشی خوف کی علامت ہوتی ہے۔"

"خوف نہیں شیلا!" — لکھمن بھی رُک گیا اور شیلا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولا — "میں کچھ سوچ رہا ہوں ... تم بہت ہی خوبصورت ہو۔ تمہیں احساس نہیں کہ اس جنگلی لباس میں تم کتنی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔ میرے استاد نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ انسان اپنے قدرتی رنگ میں رہے تو اُس کی صحت اور اُس کے چہرے کی رونق بڑھاپے میں بھی ماند نہیں پڑتی۔ جی میں آتی ہے ہم اسی جنگلے اور اسی بھیس میں خون خرابے کی دُنیا سے دُور اسی جنگل میں رہیں ... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہارے بال اس قدر ریشمی اور اتنے دلکش ہیں۔ میں تمہاری کس کس چیز کی تعریف کروں۔"

شیلا پر جیسے کچھ اثر ہی نہ ہوا ہو۔ وہ اُسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ لکھمن پر جیسے نشہ طاری ہو گیا ہو۔ وہ شیلا کی طرف بڑھا اور بازو یوں پھیلا دیئے جیسے حُسن کے اس شاہکار کو بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا ہو مگر شیلا پیچھے ہٹ گئی۔

"ہوش میں آؤ لکھمن!" — شیلا نے دھیمی مگر پُرعزم آواز میں کہا — "جاگو۔ یاد کرو ہم اِدھر کیوں آئے ہیں۔ اپنی مردانگی اور جرأت پر عورت کے حسن اور جسم کو غالب نہ آنے دو۔ یہ موت ہے

کھیلنے آئے ہیں۔"

"میں ہوش میں ہوں راجکماری!" لچھمن نے کہا۔ "جانتا ہوں کہ ہم موت سے کھیلنے آئے ہیں مگر ڈرتا ہوں کہ تمہارے جل پریوں جیسے اس جسم کے ساتھ مسلمان کھیلیں گے۔"

وہ اچانک بے تاب ہو گیا اور بولا ۔۔۔ "تم یہیں رہو۔ میں اکیلا مَتھرا جاؤں گا۔ غزنی کے سلطان کے سامنے جا کر اُسے کوئی دھوکہ دیئے بغیر قتل کر دوں گا۔ تم اور رادھا واپس چلی جاؤ۔ میں تمہارے لیے مر جاؤں گا.... لیکن ایک بار شیلا! صرف ایک بار.... ذرا سی دیر کے لیے میرے بازوؤں میں آ جاؤ۔ میں ڈر رہا ہوں۔ اپنی موت سے نہیں، میں اُس وقت سے ڈر رہا ہوں جب وہ مجھے پکڑ کر قتل کر دیں گے اور تمہیں اور رادھا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"لچھمن!" ۔۔۔ شیلا نے گرج کر کہا۔ "چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنا آپ تم سے بچا نہیں رہی۔ میں تم سے دُور نہیں ہٹ رہی۔ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں مگر اب نہیں۔ اگر ایک بار میرے ننگے بازو تمہارے عریاں کندھوں سے چھو گئے تو تم بھول جاؤ گے کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ میرے چہرے میں غزنی کے سلطان کو دیکھو۔ میری آنکھوں میں اپنی عزت کو دیکھو.... جاؤ! چلے جاؤ۔ کوئی کشتی دیکھو۔ ہمیں جمنا پار جانا ہے۔"

لچھمن پال گٹھے ہوئے جسم کا جنگجو جوان تھا۔ اُس کا سراپا بتا رہا تھا کہ تلوار کا دھنی ہے۔ اُس نے شیلا کو نظر بھر کر دیکھا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ "میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں بھارت ماتا کو مایوس نہیں کروں گا.... میں کشتی کا بندوبست کر کے ابھی آیا۔" ۔۔۔ اور وہ دوڑ پڑا۔ شیلا اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ جنگل کی جھاڑیوں نے لچھمن کو اُس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تو بھی وہ اُدھر ہی دیکھتی رہی۔

اپنے قریب شیلا کو کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے اطمینان سے گھوم کر دیکھا۔ اس غیر آباد جنگل میں کون ہو سکتا تھا۔ غزنی کی فوج وہاں سے بیس پچیس میل دور مَتھرا میں تھی۔ یہاں کوئی اور انسان نہیں ہو سکتا تھا، مگر وہ ایک انسان تھا جو آنکھیں پھاڑے ہوئے اُسے دیکھتا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ داڑھی تھی۔

اُس کا لباس اس خطے کے لوگوں جیسا تھا۔ وہ سراپا ہندوستانی تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا اور پُرشباب تھا۔ وہ شیلا کے قریب آ کر رکا۔

"شیلا؟" ۔۔۔ اُس آدمی نے پوچھا ۔۔۔ "مجھے دھوکہ تو نہیں ہو رہا؟ تم مُنج کے راجے چندا کی بہن نہیں ہو؟.... تم جنگل کی مٹی نہیں ہو۔ میں تمہیں کل سے چھپ چھپ کر دیکھتا آ رہا ہوں۔ یہ لچھمن ہے نا جو ابھی تمہارے پاس کھڑا تھا؟ مہاراجہ قنوج کا راجکمار؟"

"اور تم کون ہو؟" ۔۔۔ شیلا نے سرگوشی میں پوچھا۔

اُس آدمی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو داڑھی اُس کے ہاتھ میں آ گئی۔ شیلا کے سامنے ایک جوان چہرہ آ گیا جو لچھمن پال کی طرح خوبرو تھا اور شباب سے دمک رہا تھا۔ عمر لچھمن جیسی تھی۔

"اوہ!" ۔۔۔ شیلا نے مسکرا کر کہا۔ "ترلوچن پال! تم یہیں ہو ابھی؟.... تمہیں یہیں ہونا چاہیئے۔"

"مگر تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیئے۔" ۔۔۔ ترلوچن پال نے کہا۔ "میں چند روز پہلے تمہارے بھائی سے ملنے گیا تھا تو تمہارے ساتھ بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں اُس وقت دیکھا تھا جب تم اپنے بھائی کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ اگر میں چند روز پہلے تمہیں مُنج میں نہ دیکھتا تو میں اس حلیے میں تمہیں نہ پہچان سکتا۔ تمہارے گورے چٹے کندھوں پر بکھرے ہوئے یہ چمکیلے بھورے بال دیکھ کر اس بیابان میں تمہیں کوئی کسی بڑی خوبصورت لڑکی کی بھٹکتی ہوئی رُوح سمجھے گا اور کوئی تمہیں جنگل کی شہزادی کہے گا۔ میں کل سے چھپ چھپ کر تمہیں دیکھتا آ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں غزنی کی فوج کی اگلی پیش قدمی دیکھ رہا ہوں۔ مہاراج بھیم پال یہاں سے تھوڑی ہی دُور ہیں.... تمہارے ساتھ راجکماری رادھا ہے.... لیکن یہ کیا حُلیہ بنا رکھا ہے؟ تم لوگ کہیں بھاگے جا رہے ہو؟"

وہ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نِڈر کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال تھا۔ شیلا کی شادی اُسی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ بھیم پال نِڈر بھی یہیں کہیں موجود ہے اور اُس کے بھائی بھی اس کے ساتھ ہیں اور وہ یہاں راجوں

مہاراجوں کو سلطان کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال بہروپ میں مُنج بھی گیا تھا اور قنوج بھی۔ اس سلسلے میں گھومتے پھرتے اُسے شیلا کا یہ عجیب و غریب قافلہ نظر آگیا۔ وہ چھپ کر اُن کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر صبح بھیمن اور شیلا کو یہاں دیکھا۔ بھیمن چلا گیا اور شیلا اکیلی رہ گئی۔

ترلوچن پال سے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قافلہ کہاں جا رہا ہے۔ شیلا نے اُسے بتایا کہ وہ سلطان محمود کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

"کیا تمہارا بھائی رائے چندرا اپنی بہن اور بیٹی سے لڑنا چاہتا ہے؟" ترلوچن نے کہا۔ "راجپوتوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وہ مسلمانوں سے ڈر گیا ہے؟ ہم اُسے یقین دلا چکے ہیں کہ اگر محمود نے اُسے شکست دے دی تو ہم اس کی شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ابھی اپنی فوج سامنے نہیں لائے۔ ہم نے یہ سوچا ہے کہ سلطان محمود یہاں لڑ لڑ کر اور قلعے فتح کر کر کے تھک جائے اور اس کی فوج کمزور ہو جائے تو ہم اس پر حملہ کر کے اُسے ختم کر دیں گے۔ بے شک ہم سلطان کے باجگزار ہیں لیکن ہم موقع کی تلاش میں ہیں۔ اُسے قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اُسے قتل کرنا ہی ہے تو بھیمن پال جائے۔ اس کے ساتھ دو آدمی ہیں۔ تم اور رادھا یہیں سے واپس چلو۔"

شیلا نے اُسے بتایا کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اور رادھا کس طرح سلطان محمود اور اس کے سالاروں کو دھوکہ دیں گی۔ ترلوچن پال نے اُسے کہا کہ سلطان اتنی جلدی دھوکے میں نہیں آئیں گے البتہ وہ خود ہی دھوکے میں آ کر غزنی پہنچا دی جائیں گی اور انہیں رقاصہ بنا دیا جائے گا یا سالاروں کی داشتائیں بنی رہیں گی۔ شیلا نے اُسے راجپوتی غیرت یاد دلائی۔ اپنا عزم بتایا مگر ترلوچن پال کی غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی ہو رہی ہے وہ اتنے بڑے خطرے میں جائے۔

"پھر میری جگہ تم جاؤ۔" شیلا نے اُسے غصے سے کہا۔ "تم بزدلوں اور چوروں کی طرح جنگلوں میں بھیس بدل کر مارے مارے پھر رہے ہو۔ تم غزنی کے باجگزار ہو تو یہ

بھی تمہاری بزدلی کا ثبوت ہے۔ تم مسلمانوں سے ڈرتے ہو۔ سلطان نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال رکھیں۔ اپنی فوج کو یہاں لاؤ اور سلطان کو للکار کر کہو کہ تم اُسے باج نہیں دو گے۔ یہاں متھرا کے مندر تباہ ہو گئے۔ تم وہاں مسلمانوں کی اذانیں سن رہے ہو مگر تمہاری غیرت سو رہی ہے اور تم دوسروں کو بھڑکاتے پھر رہے ہو۔ میری غیرت مجھے گھر سے نکال لائی ہے۔"

"تم میری ہونے والی بیوی ہو۔" ترلوچن پال نے غصے سے کہا۔ "میری منگیتر ہو۔ میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔"

"میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں۔" شیلا نے کہا۔ "میں اُس کی بیوی بنوں گی جو سلطان محمود کو قتل کرے گا، اور وہ بھیمن پال ہو گا۔ وہ مارا گیا تو محمود میرے ہاتھوں قتل ہو گا۔ رادھا کے ہاتھوں قتل ہو گا۔ اس مسلمان کی جان اب میری مٹھی میں ہے۔" اُس نے مٹھی بند کر کے اور دانت پیس کر کہا۔ "میرے یہ ہاتھ مہندی سے نہیں محمود کے خون سے لال ہوں گے۔ منج کی کوئی راجپوت لڑکی کسی مسلمان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ تمہارے باپ دادا تھے جنہوں نے غزنی والوں سے شکست پہ شکست کھائی اور تم خزانہ باج میں لٹا رہے ہو۔ یہ میرے بھائی کا فیصلہ تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہو گی۔ میرا فیصلہ سن لو ترلوچن! مجھے تم جیسے بزدلوں سے نفرت ہے۔ عورت راجپوت کی ہو یا راج مزدور کی، وہ بھڑک اٹھے تو دریاؤں کو آگ لگا دیتی ہے ... میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میرا ساتھ بھیمن سے ہے۔ یہاں نہیں تو آکاش پر ہماری شادی ہو گی اور تم اِن جنگلوں میں بھٹکتے پھرو گے۔"

"تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اُٹھا کر نہیں لے جا سکتا؟" ترلوچن پال قہر سے اُس کی طرف لپکا۔

شیلا پیچھے کو دوڑی۔ ترلوچن اُس کی طرف دوڑا۔ شیلا ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلی گئی۔ ترلوچن پال اُس طرف گیا تو اُسے شیلا ایک درخت کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ وہاں درخت زیادہ تھے اور دریا باہر کو آیا ہوا تھا۔ یہ جھیل سی بنی ہوئی تھی۔ ترلوچن پال نے شیلا کو ایک بار پھر کہا کہ وہ اُس کے پاس آ جائے۔ شیلا نے للکار کر کہا۔ "ہمت ہے تو مجھے پکڑ لو۔ میں تمہارے پاس اس لیے نہیں آؤں گی کہ تم مرد ہو اور میں عورت ہوں۔ سلطان محمود سے

پہلے میں تمہیں قتل کردوں گی۔"

وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگی۔ ترلوچن پال وہیں کھڑا اسے کہہ رہا تھا — "تم کسی کو قتل نہیں کرسکو گی۔ میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔"

وہ اور پیچھے ہٹ گئی۔ ترلوچن پال نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "آگے کو بھاگ آؤ شیلا! پیچھے نہ جانا۔"

"میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی" — شیلا نے کہا۔

وہ سمجھ نہ سکی کہ ترلوچن اُسے کتنے بڑے خطرے سے خبردار کر رہا ہے۔ ترلوچن پال ایک بار پھر چلایا مگر بے سود۔ ایک گرمچھ جو قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا، شیلا کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اُدھر گرمچھ آگے بڑھا۔ اِدھر سے شیلا نے بے خبری میں ایک اور قدم پیچھے ہٹایا تو گرمچھ نے اُسے کمر سے دانتوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ شیلا کی چیخیں اس قدر بلند اور ہولناک تھیں کہ رادھا جو اُس سے دُور سوئی ہوئی تھی جاگ اُٹھی۔ اُس نے دیکھا کہ لچھمن پال بھی نہیں، شیلا بھی نہیں۔ اُس نے دونوں فوجیوں کو جگایا اور اُن کے ساتھ اُدھر کو دوڑی جدھر سے چیخیں سنائی دی تھیں۔

ترلوچن پال ایک جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ لچھمن پال کے دونوں فوجی وہاں پہنچے تو ایک سیٹی سنائی دی جو ترلوچن نے منہ میں انگلی رکھ کر بجائی تھی۔ کہیں سے دو تیر آئے، لچھمن پال کے دونوں ساتھی ایک ایک تیر سے اوندھے ہو گئے۔ یہ ترلوچن پال کے اُن دو محافظوں کے تیر تھے جو کہیں چھپے ہوئے تھے۔ رادھا نے نہ دیکھا۔ اُسے ندی کے کنارے ایک گرمچھ نظر آیا جس کے منہ میں شیلا چیخ چلا رہی تھی اور گرمچھ ایسے گز گز لمبے جبڑے اچھال اچھال کر اُسے نگل رہا تھا۔ رادھا کو چکر آنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ شیلا کا صرف ایک بازو گرمچھ کے منہ سے باہر رہ گیا تھا اور اُس کے ریشم جیسے بال بھی نظر آ رہے تھے۔ رادھا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ترلوچن پال رادھا کی طرف بڑھا تو اُسے اپنے ایک محافظ کی آواز سنائی دی — "اٹھکارا! مسلمان فوجی آ رہے ہیں۔"

ترلوچن پال وہاں سے پیچھے ہٹا اور غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غزنی کے چار گھوڑسوار

وہاں آ گئے جہاں سے ترلوچن پال بھاگا تھا۔ انہیں دُور گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ یہ ترلوچن پال اور اُس کے ساتھیوں کے گھوڑے تھے جنہیں وہ دُور کہیں چھوڑ آئے تھے۔ اگر ترلوچن پال کے محافظ غزنی کے فوجیوں کو نہ دیکھ لیتے تو انہیں بہت بڑا شکار مل جاتا۔ ترلوچن پکڑا جاتا تو اس سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ بھیم پال نڈر کہاں ہے۔

لچھمن پال کشتی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔

غزنی کے ان فوجیوں میں ایک نائب سالار تھا اور باقی تین اُس کے دستوں کے کماندار تھے۔ وہ متھرا سے آئے تھے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا تھا۔ چونکہ کچھ روز بعد پیش قدمی ہونے والی تھی اس لیے نائب سالار دریا اور اس سے آگے کا جائزہ لے رہا تھا اور اس علاقے میں متھرا کے دفاع کے لیے دو تین چوکیاں بھی قائم کرلی تھیں۔ وہ جب دریا کی بنائی ہوئی جھیل کے قریب آئے تو انہیں ایک لڑکی بے ہوش پڑی نظر آئی۔ ذرا پرے انہیں ایک گرمچھ دکھائی دیا جو آدھا پانی میں تھا۔ اُس کے منہ سے لٹکتا ہوا ایک بازو نظر آ رہا تھا اور منہ سے لمبے لمبے بال بھی لٹک رہے تھے۔ نائب سالار نے ایک اور گرمچھ دیکھا جو بے ہوش رادھا کی طرف آ رہا تھا۔

نائب سالار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اُس کے کمانداروں نے بھی گھوڑے دوڑائے۔ دونوں گرمچھ پانی میں غائب ہو گئے۔ نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ یہ کوئی بہت خوبصورت جنگلی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے اُٹھا لے چلو۔ رادھا کو ایک گھوڑے پر ڈال لیا گیا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید اس کے ساتھ کے کوئی لوگ کہیں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ انہیں دو لاشیں دکھائی دیں۔ دونوں میں ایک ایک تیر اُترا ہوا تھا۔ انہیں ایک جگہ پانچ گھوڑے، دو خچر اور دو ہرن کھڑے نظر آئے۔ زمین پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ سامان کی تلاشی لی گئی۔ اس میں سے ہتھیار اور سونے کے بے شمار سکے برآمد ہوئے۔ کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو شک پیدا کرتی تھیں۔

نائب سالار پرانا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو جو ابھی تک بے ہوش تھی، غور سے دیکھا اور کہا کہ یہ لڑکی جنگلی نہیں ہو سکتی۔ اُس نے رادھا کو گھوڑے سے اُتروا کر منہ

میں پانی ٹپکایا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی وہ اُٹھ بیٹھی اور یہ دیکھے بغیر کہ اُس کے پاس کون کھڑا ہے، اُس نے اُٹھ کر چلانا شروع کر دیا۔

"شیلا! بھیم پال!" — وہ دوڑ پڑی — "راجکمار! کہاں ہو؟"

نائب سالار نے اُسے پکڑ لیا اور پوچھا کہ وہ کونسے راجکمار کو بلا رہی ہے۔ رادھا اس قدر حواس باختہ تھی کہ اُس کے منہ سے نکل گیا "قنوج کا راجکمار بھیم پال! تم نے اُسے دیکھا ہے؟" — وہ چونک پڑی اور اُس نے لب و لہجہ بدل کر اداکاری شروع کر دی — "میں قنوج کے قریب کے ایک جنگل کے قبیلے کی لڑکی ہوں۔ ہم غزنی کے سلطان کے پاس سلمان ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔"

"قبیلے کا نام کیا ہے؟" — نائب سالار نے پوچھا — "اور وہ جنگل قنوج سے کتنی دور ہے؟"

لڑکی گھبرا گئی۔ اُسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہر قبیلے کا نام بھی ہوتا ہے۔ اُس نے جنگل کے متعلق بتایا تو نائب سالار نے کہا — "دیکھو لڑکی! میں غزنی کا رہنے والا ہوں اور تمہاری زبان بول رہا ہوں۔ اس سے سمجھ لو کہ میں تمہارے علاقے سے واقف ہوں۔ میں قنوج کے ارد گرد کا علاقہ دیکھ آیا ہوں۔ وہاں کوئی ایسا جنگل نہیں ہے جس میں اتنا خوبصورت قبیلہ رہتا ہو جتنی خوبصورت تم ہو۔"

لڑکی کا راجپوتی خون جوش میں آ گیا۔ اُس نے نائب سالار اور کمانداروں کو للکارنا شروع کر دیا — "خبردار میرے قریب نہ آنا۔ میں زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

نائب سالار نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا — "تم خوش قسمت ہو کہ میرے ہاتھ آئی ہو۔ تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو اور تم نے لباس ایسا عریاں پہن رکھا ہے کہ اس جنگل میں جس کسی کے ہاتھ آ جاؤ، وہ تمہیں اپنی بیٹی اور بہن نہیں کہے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری نیت میں فتور نہیں آئے گا، اور اگر تم مجھے جھانسے دیتی رہو گی تو میں تمہیں ان تینوں کے حوالے کر کے خود چلا جاؤں گا۔ انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو تو بتا دو کہ تم لوگ کون ہو اور راجکمار بھیم پال کہاں ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔"

رادھا اپنے قافلے کے سامان کی طرف دوڑی۔ سب اُسے دیکھتے رہے۔ اُس نے

سامان سے چھوٹی سی ایک ڈبیہ نکالی۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے ڈبیہ کھولنے اور دوسری طرف دوڑنے لگی۔ اُسے پکڑ لیا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے ڈبیہ چھین کر نائب سالار نے اُس سے پوچھا — "یہ زہر ہے نا؟ ... بیوقوف لڑکی! تمہارا تڑپنا اور بھاگنا بیکار ہے۔ تم ہماری قیدی ہو۔ تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔" نائب سالار کے حکم سے اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا جس کی لگام ایک کماندار کے ہاتھ میں تھی۔

بھیم پال مایوس واپس آ رہا تھا۔ اُسے الگ تھلگ کوئی کشتی نہ ملی۔ وہاں بڑی کشتیاں تھیں جو بہت سے مسافروں کو پار لے جاتی تھیں۔ وہ گھوڑوں یا ذخیروں کو بھی پار لے جانا چاہتا تھا۔ ان کے لیے کشتی نہیں مل رہی تھی۔ وہ جھیل سے ذرا ہٹ کر گزرا تو اُسے خشکی پر ایک مگرمچھ نظر آیا جو ایک انسان کو نگل رہا تھا۔ مگرمچھ شکار کو کھانے کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ پہلے اسے نگل کر جان سے مار دیتا ہے پھر اسے خشکی پر اُگل کر اس کے گلنے سڑنے کا انتظار کرتا ہے۔ جب لاش یا کسی جانور کا مردار گل کر نرم ہو جاتا ہے تو اُسے نگل لیتا ہے۔

شیلا کو نگلنے کے بعد مگرمچھ خشکی پر آ کر اُسے اُگل رہا تھا۔ بھیم پال نے دیکھا کہ لاش کے لمبے لمبے بال تھے اور لباس ...! اُس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ شیلا کی لاش ہے۔ اُس نے ٹیکری پر چڑھ کر دیکھا تو اُسے لاش کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ اتنے میں ایک اور مگرمچھ دوڑتا آیا اور لاش کو منہ میں لینے لگا۔ لاش کا مالک مگرمچھ اُس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر ان میں لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر ایک نے شیلا کی ایک ٹانگ منہ میں لے لی اور دوسری ٹانگ دوسرے نے منہ میں جکڑ لی۔ انہوں نے زور لگایا تو لاش سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ بھیم پال کی طرف تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس میں تو اب اُدھر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ دو مگرمچھوں نے لاش کی ٹانگوں کو اپنی اپنی طرف کھینچا تو لاش کے دو حصے ہو گئے۔

بھیم پال آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹیکری کی دوسری طرف اُترا تو اُسے اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں نظر آئیں۔ وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اُسے رادھا کی چیخ نما آواز سنائی دی — "بھیم پال!" — اُس نے اُدھر دیکھا تو سُن ہو کے رہ گیا۔ رادھا غزنی کے فوجیوں کے قبضے

میں تھی۔ بھیمن نے بھاگ نکلنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے نائب سالار کی آواز سنائی دی۔ "گھوڑے سے تیز نہیں بھاگ سکو گے لڑکے! اِدھر آؤ۔ زندہ رہو گے۔"

اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ واپس چلو۔ وہ بھیمن پال کو اپنے ساتھ لے کر سب سے پیچھے رہا۔ اُس نے کہا۔ "اس لڑکی نے سب کچھ بتا دیا ہے اس لیے ہم اسے پوری عزت کے ساتھ متھرا لے جا رہے ہیں۔ تم اس کے ساتھ رہنا اور دیکھنا کوئی مرد اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن اس کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا کچھ سچ بولو گے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو تم شاید تصور میں نہیں لا سکو گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ دیکھو یہ لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو یہ تین فوجی اس لڑکی کو اس طرح عزت سے متھرا نہ لے جاتے۔ بولو راجکمار! مجھے بتاؤ کہ قنوج کا راجکمار اس عجیب سے حلیے میں یہاں کیوں آیا ہے؟"

"اگر آپ ہم دونوں کو چھوڑ دیں تو میں آپ کو اتنا معاوضہ دوں گا جتنا آپ کہیں گے" — بھیمن پال نے کہا — "آپ چاروں میرے ساتھ قنوج چلیں۔ میں آپ کے گھوڑے سونے سے لاد دوں گا۔"

"اگر ہمیں انعام کا خیال ہوتا تو یہ اتنی حسین لڑکی بہت بڑا انعام ہے جو ہم نے لیا ہے" — نائب سالار نے کہا — "اور تمہارے سامان سے سونے کے بے شمار سکے بھی ملے ہیں جو ہم چاروں آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔ تم مجھے قنوج لے جانا چاہتے ہو ہم وہاں سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے ہم خود اپنے گھوڑے سونے سے لاد لیں گے۔ میں تو تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔ سچ بولو اور انعام میں اپنی جان اور یہ لڑکی لے جاؤ۔"

وہ چلتے گئے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا۔ وہ جنگلوں میں سے گزرے۔ ویرانوں میں سے گزرے۔ سورج غروب ہو گیا تو تاریکی میں چلتے رہے۔ راستے میں ذرا آرام کے لیے رُکے۔ کسی نے بھی رادھا کے ساتھ بات نہ کی۔ رات خاصی گزر چکی تھی جب یہ قافلہ متھرا کے قریب پہنچ گیا۔

بھیمن پال کے ساتھ تمام راہ نائب سالار نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے بھیمن سے ایک ہی بار کہا تھا کہ وہ سچ سچ بتا دے کہ یہاں کیوں آیا ہے۔ بھیمن پال نے انعام پیش کرنے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن جب یہ ٹولہ متھرا میں داخل ہونے لگا تو بھیمن پال نے لپک کر نائب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں سچ بولوں گا" — اُس نے کہا — "یہیں سُن لیں۔۔۔۔ میں آپ کے سلطان کو قتل کرنے آیا تھا" — اور اُس نے اپنا تمام تر منصوبہ سنا دیا، مگر یہ نہ بتا سکا کہ شبلا گرکھ کے پیٹ میں کیسے پہنچی اور اس کے دو ساتھیوں کو تیروں سے کس نے ہلاک کیا ہے۔ اُس نے کہا — "میں نے آپ کی سزا سے ڈر کر اعتراف نہیں کیا۔ میں آپ چاروں کے اخلاق سے متاثر ہو کر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کے سامنے سچ بولوں۔ آپ نے میرا اتنا بڑا انعام ٹھکرا دیا۔ ہم نے سارا دن اجاڑ بیابان میں سفر کیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی سفر کیا ہے۔ مجھے یہ خطرہ پریشان کرتا رہا کہ آپ اس لڑکی کو خراب کریں گے مگر آپ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ آپ کے قبضے میں اتنی حسین لڑکی ہے جو غزنی نے بھی پیدا نہ کی ہوگی۔ آپ نے تمام راستے ہمارے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کی فتح کا راز کیا ہے۔ اب مجھے سچ بولنے کا انعام دیں۔۔۔۔ انعام صرف اتنا ہے کہ مجھے بے شک جلاد کے حوالے کر دیں لیکن اس لڑکی کو اس کے ماں باپ کو واپس کر دیں۔ اس کی دلیری اور جرأت دیکھیں۔ اگر آپ واقعی جنگجو ہیں تو ایک جنگجو باپ کی غیرت مند بیٹی کو اس کی دلیری کا خراج دیں۔ یہ کنواری لڑکی ہے۔"

"اس کا فیصلہ سلطان محمود کریں گے" — نائب سالار نے کہا — "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ لڑکی کنواری رہے گی اور مجھے اُمید ہے کہ تمہیں جلاد کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔"

"تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم تمہیں جلاد کے حوالے نہیں کریں گے" — سلطان محمود نے بھیمن پال کی زبانی وہی کہانی جو اُس نے نائب سالار کو سنائی تھی، سن کر اُسے کہا — "ہم تم جیسے بیٹوں اور اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ سزائے موت تو بہت بڑی بات ہے، ہم تمہیں طعنہ بھی نہیں دیں گے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم غیرت مند

دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں۔ مجھے قتل کرنے کی تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تمہارے کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔"

محمود غزنوی نے اپنے ترجمان سے کہا "اس شہزادے سے کہو کہ لڑکی کے باپ سے کہے کہ میں نے منج کے راجپوتوں کی غیرت اور جرأت کی بہت باتیں سُنی ہیں لیکن غیرت والوں کی بیٹیاں یوں ننگی ہو کر اپنے دشمن کے لیے حسین دھوکہ بن کے اُس کے پاس نہیں جلایا کرتیں .... اور اس شہزادے سے کہو کہ اپنے باپ سے کہہ دے کہ ہم آ رہے ہیں اور وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے سامنے آئے .... اور اس شہزادے سے کہو کہ ہم لسے یرغمال کے طور پر رکھ سکتے تھے مگر ہم اوچھے نہیں۔ ہم اپنی شرطیں میدانِ جنگ میں منوایا کرتے ہیں۔"

ترجمان نے کھیمن پال کو بتایا کہ سلطان کیا کہہ رہے ہیں۔

"اور ہم اس شہزادے سے کوئی فوجی راز بھی نہیں لیں گے" — سلطان محمود نے کہا — "اسے کہو کہ ہم قنوج کے اندر اور باہر سے واقف ہیں۔ ہماری آنکھیں قنوج کے قلعے کے اندر ہیں۔"

کھیمن پال سلطان محمود کے چہرے پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔ وہ حیرت کے عالم میں تھا۔ رادھا بھی حیران تھی کہ سلطان محمود اُن کی قسمت کا کیا فیصلہ کر رہا ہے۔

"تم دونوں اپنے اپنے باپ سے کہنا کہ لڑے بغیر قلعے ہمارے حوالے کر دیں" سلطان محمود نے کہا اور ترجمان نے اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا — "اگر ہم نے قلعے لڑ کر لیے تو تم دونوں کے باپوں کا انجام بہت بُرا ہوگا۔"

سلطان محمود غزنوی نے حکم دیا — "ان دونوں کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ آؤ۔ انہیں عزت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے خنجر انہیں دے دو۔"

کھیمن پال اور رادھا کچھ دیر محمود غزنوی کے چہرے پر نگاہیں باندھے دیکھتے رہے۔ انہیں جب وہاں سے چلنے کو کہا گیا تو کھیمن پال نے سلطان کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ رادھا سلطان کو حیرت سے دیکھتی رہی۔

دونوں کو فوج کے دس بارہ سپاہیوں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ ان کا ایک کمانڈر

بھی ساتھ گیا۔ بڑی لمبی مسافت کے بعد وہ رادھا کو منج کے قلعے سے کچھ دور اور کھیمن پال کو قنوج کے قریب چھوڑ کر واپس آ گئے۔

کھیمن پال مایوسی اور شکست خوردگی کے عالم میں اپنے باپ مہاراجہ راجیا پال کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اُسے بتایا کہ اُس پر کیا گذری ہے۔

"میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ غزنی کے سلطان سے آپ شکست کھائیں گے" — کھیمن پال نے اپنے باپ سے کہا — "آپ اسے شکست نہیں دے سکتے پتا مہاراج! میں نے غزنی کے اس سلطان کی آنکھوں میں جادو کا اثر دیکھا ہے۔ اس کی فوج کے حاکم کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی فتح کا راز کچھ اور ہے۔ کون رادھا جیسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اور اپنے دشمن کے بیٹے کو اس طرح رہا کرتا ہے؟"

کھیمن پال نے اپنے باپ کو سارا واقعہ سنایا۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ قنوج کے مہاراجہ راجیا پال پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ اس نے خفیہ طور پر اپنا تمام خزانہ قنوج سے دُور پہاڑی علاقے میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔ اُسی رات خزانہ ایسے طریقے سے قلعے سے نکلنے لگا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا۔

رادھا جب اپنے باپ رائے چند کو بتا چکی تھی کہ اُسے اور کھیمن پال کو سلطان نے کس طرح رہا کیا ہے تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے کہا کہ راجپوت اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔

سلطان محمود غزنوی نے کچھ دستے متھرا میں رہنے دیئے اور باقی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس نے متھرا کے قریب سے دریائے جمنا پار کیا اور دریا کے ساتھ ساتھ منج کا رُخ کر لیا جہاں راجپوت زندگی اور موت کا آخری معرکہ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ سلطان کو جاسوسوں نے بتایا تھا کہ غزنی کی فوج کا صحیح مقابلہ منج میں ہوگا۔ وہاں عورتیں بھی لڑنے اور مرنے کے لیے تیار تھے۔

خدا جو دل میں اُتر گیا

قنوج

کے گرد و نواح میں جنگل تھا جو کہیں کہیں بہت گھنا ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں پہاڑیاں اور چٹانیں بھی تھیں۔

قنوج دریائے گنگا کے کنارے پر واقع تھا۔ قلعہ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اس کی ایک طرف دریا تھا جس کا پانی (مورخوں کے الفاظ میں) قلعے کی ایک دیوار کو دھوتا رہتا تھا یہ اپنے زمانے کا مشہور قلعہ تھا۔ مضبوط بھی تھا اور دور دور تک احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی متھرا سے کوچ کر کے منج کی طرف پیشقدمی کر رہا تھا۔ قنوج وہاں سے ایک سو پچیس میل دور تھا۔ قنوج سے چار پانچ میل دور جنگل میں جہاں آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا، دو آدمی گڈریوں کے لباس میں ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ رات یہیں گذار لیتے ہیں۔

"آج تیسرا دن ہے ہم قنوج کے قریب سے ہو آئے ہیں" ــــ ایک نے کہا ــــ "ہمیں قنوج کی یا کسی اور ہندو مہاراجے کی فوج نظر نہیں آئی۔ کیا قنوج کی فوج اُس وقت باہر آئے گی جب ہماری فوج قریب آجائے گی؟"

"ہمیں اپنی فوج کے آنے تک اسی علاقے میں رہنا ہے طلال بھائی!" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "یا ہم اُس وقت واپس جائیں گے جب ہمیں قنوج کی فوج نظر آجائے گی۔ سلطان کو بتایا گیا ہے کہ وہ جب منج کا محاصرہ کرے گا تو قنوج کی فوج عقب سے حملہ کرے گی۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہماری فوج کا مقابلہ منج اور قنوج کے

درمیان ہو گا۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ قنوج کی وہ فوج کہاں ہے جسے ہماری فوج پر عقب سے حملہ کرنا ہے ... معلوم ہوتا ہے تم تنگ آگئے ہو۔"

"نہیں صالح!" ــــ طلال نے کہا ــــ "میں اتنی جلدی تنگ آنے والا نہیں۔ میرا خیال ہے مہاراجہ قنوج باہر آکر لڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ ایسی جرأت کرے گا یا نہیں" ــــ صالح نے کہا ــــ "ہم دونوں غزنی کی فوج کی وہ آنکھیں ہیں جنہیں سلطان محمود کو بتانا ہے کہ جنگل صاف ہے یا یہاں کوئی خطرہ ہے۔"

"آؤ پھر یہیں سو جائیں" ــــ طلال نے کہا ــــ "سردی تو بہت ہے لیکن رات گذر جائے گی۔"

طلال ابراہیم اور صالح بروک ہندوستانی مسلمان تھے۔ صالح بروک اُن عربوں کی نسل سے تھا جو محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور یہیں آباد ہو گئے تھے اور طلال ابراہیم کے آباؤ اجداد کا مذہب کچھ اور تھا۔ وہ محمد بن قاسم کے دورِ حکومت میں مسلمان ہوئے تھے۔ اب ہندوستان میں محمود غزنوی کی جنگی مہمات اور بت شکنی کا سلسلہ شروع ہوا تو غزنی کی فوج کو انٹیلی جنس کے لئے ہندوستان کے مسلمان باشندوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ عام قسم کی فوجی بھرتی نہیں تھی کہ ہر اُس جوان کو بھرتی کر لیا جاتا جو تیغ زنی اور گھوڑسواری کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ جاسوسی کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو دماغی لحاظ سے غیر معمولی طور پر تیز اور ذہین تھے اور جو اداکاری کی مہارت رکھتے تھے اور جو کئی کئی روز تک ہر قسم کے موسمی حالات میں جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں تندرست رہنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ دیکھی جاتی تھی کہ ان کا کردار پختہ ہو اور لالچ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو، اسے قبول نہ کریں۔ ان میں بندروں کی پھرتی، گھوڑے کی طاقت، عقاب کی نظر اور چیتے کی جھپٹ کا ہونا بھی لازمی تھا۔ بنیادی ضرورت ایمان کی تھی۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جذبہ موجود تھا۔ ہندوستان بے شمار راجوں مہاراجوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ سب ہندو تھے، اور وہ مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

جب سے سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے تھے، ہندوؤں نے ہر مسلمان کو غزنی کا جاسوس سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں کے مسلمان غزنی کی فوج کی مدد اور راہنمائی کرتے تھے اور کئی ایک باقاعدہ مخبر (انٹیلی جنس ایجنٹ) بن گئے تھے مگر ان میں کوئی ایسا بھی نکل آتا تھا جو اپنے نفس کے دھوکے میں یا ہندوستان کے بچھائے ہوئے دلکش جال میں آجاتا تھا۔

طلال ابراہیم اور صالح بردک سلطان محمود کی انٹیلی جنس کے مخبر تھے۔ سلطان محمود کو متھرا میں بتایا گیا تھا کہ اُس نے جس آسانی سے متھرا فتح کر لیا ہے، اتنی آسانی سے قنوج کا قلعہ سر نہیں کر سکے گا اور جب دریائے جمنا کے کنارے پر واقع منج نام کے قلعے کا محاصرہ کرے گا تو قنوج کی فوج اُس پر عقب سے حملہ کرے گی اور اُسے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں لڑنا پڑے گا جس میں اُس کی شکست کا امکان زیادہ ہے۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال اندر اس علاقے کے کم و بیش راجے اور مہاراجے کو سلطان محمود کے خلاف اتحاد پر قائل کر رہا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ اپنی فوج بھی لے آیا ہو گا۔

سلطان محمود کی فوج مسلسل لڑ لڑ کر تھک چکی تھی۔ فوج کی نفری زخمی اور شہید بھی ہوئی تھی اور یہ فوج اپنے مستقر غزنی سے تین ماہ کی مسافت جتنی دور تھی۔ وہ بہت بڑے خطرے میں آ گیا تھا۔ جاسوسوں کی رپورٹوں کے مطابق اسے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان ہندوؤں کی کثیر تعداد اور تازہ دم فوج کے خلاف لڑنا تھا۔ اُس نے متھرا سے کوچ کیا تو طلال ابراہیم اور صالح بردک کو چند روز پہلے قنوج کے گرد و نواح میں بھیج دیا گیا تھا کہ وہ ہندوؤں کی فوجوں، خصوصاً قنوج کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر فوراً اطلاع دیں۔

دونوں کو اس علاقے میں عرب اور خانہ بدوش گڈریوں کے بھیس میں گھومتے پھرتے تین دن ہو گئے تھے۔ انہوں نے بلند درختوں اور پہاڑیوں پر بھی چڑھ کر دیکھا تھا۔ انہیں کسی فوج کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے دریائے گنگا کو بھی دیکھا تھا۔ انہیں فوج کی کوئی کشتی نظر نہیں آئی تھی۔ ان دونوں میں طلال ابراہیم

کچھ اکتایا سا لگ رہا تھا۔ عربی نسل کا صالح بردک پہلے روز کی طرح تر و تازہ تھا۔ وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نومبر کا مہینہ تھا اور اس علاقے میں سردی خاصی زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ چٹان پر ایسی جگہ لیٹ گئے جہاں سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے اوٹ موجود تھی۔

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا جب صالح بردک کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کچھ آوازوں سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ جس چٹان پر سوئے ہوئے تھے اس کے نیچے اُن کے قریب ہی سے کچھ لوگ گزر رہے تھے۔ گھوڑوں کے ٹاپو بھی سنائی دے رہے تھے۔ صالح کو روشنی بھی نظر آئی۔ وہ کروٹ بدل کر پیٹ کے بل ہو گیا اور چند گز آہستہ آہستہ رینگ کر آگے ہو گیا جہاں سے اُسے اپنے نیچے ایک عجیب قافلہ گزرتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے دو آدمی مشعلیں اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے درمیان ایک تنومند آدمی تھا۔ اُس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ پنڈت ہے۔ اس کے پیچھے پانچ خچریں جا رہی تھیں جو ایک دوسری کے پیچھے بندھی ہوئی تھیں۔ اگلی خچر کی لگام پنڈت کے ہاتھ میں تھی۔ سب سے آخری خچر کے ساتھ ایک لمبی رسی بندھی ہوئی تھی۔ خچروں کے پیچھے سات آٹھ آدمی تھے۔ ہر ایک نے یہ رسی پکڑ رکھی تھی اور ایک ہاتھ اپنے سے اگلے آدمی کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ عجوبہ یہ تھا کہ پنڈت کے سوا ہر آدمی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ اندھوں کی طرح آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ مشعلوں والے آدمیوں کی بھی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

پنڈت تھوڑے تھوڑے وقفے سے کہتا جا رہا تھا — "چلے چلو، میں دیکھ رہا ہوں۔ راستہ صاف ہے" — یہ عجیب و غریب قافلہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ خچروں پر بکریوں کے بکس لدے ہوئے تھے۔ صالح بردک رینگ کر اپنے ساتھی طلال ابراہیم تک آیا۔ اُسے جگایا اور اُس کے کان میں سرگوشی کی کہ رینگ کر اُس کے ساتھ آئے۔ اب دونوں نے اندھوں کا یہ قافلہ دیکھا۔ انہیں کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ کیا ہے۔

چالیس پچاس گز آگے جا کر قافلہ رُک گیا۔ وہاں ایک اور چٹان دیوار کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ طلال اور صالح چٹان کے اوپر اوپر دبے پاؤں چلتے وہاں تک چلے

گئے جہاں قافلہ رُکا تھا۔ دونوں وہاں چٹان پر ایک درخت کی اوٹ میں لیٹ گئے۔ قافلہ اس چٹان اور ساتھ والی عمودی چٹان کے درمیان رُکا ہُوا تھا۔ مشعلوں کے شعلے بہت بڑے تھے۔ طلال اور صالح کو وہاں دوسری چٹان میں ایک خلا نظر آیا جو نیچے سے اوپر تک چلا گیا تھا۔ خلا یا شگاف اتنا فراخ تھا کہ ایک خچر اس میں سے آسانی سے گذر سکتی تھی۔

پنڈت نے ایک مشعل بردار کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور بولا — "سب یہیں کھڑے رہو۔ میں واپس آکر تمہیں آگے لے جاؤں گا"۔ پنڈت شگاف میں چلا گیا اور بائیں کو چٹان کی اوٹ میں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد نظر آیا۔ مشعل کی روشنی میں اس شگاف میں سے پیچھے چٹان کی دیوار نظر آئی۔ پنڈت وہاں کہیں غائب ہو گیا۔ مشعل کی روشنی بھی کہیں گم ہو گئی۔ تھوڑے سے وقت بعد اُس کی مشعل پھر نظر آئی۔ وہ شگاف سے باہر آ گیا۔

"کوئی آدمی اپنی آنکھوں کی پٹی میں سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے"— پنڈت نے کہا — "کسی نے پٹی ہٹانے کی کوشش کی تو اس کی سزا موت ہوگی"۔

ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں۔ پنڈت ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر ان سے خچروں سے بکس اُتروانے لگا۔

ایک مشعل اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ دوسرے مشعل برداروں کو اُس نے اپنی ضرورت کے مطابق کھڑا کر دیا تھا۔ یہ اندھے بکس اُٹھا کر چلتے تھے۔ بعض گر بھی پڑتے تھے اور غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کرتے کرتے خچروں سے بکس اُتر کر چٹان کے اندر چلے گئے۔ خچریں باہر کھڑی رہیں اور تمام آدمی اندر چلے گئے۔ انہیں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ مال و دولت تھا جو یہاں چھپایا جا رہا تھا، مگر ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں کیوں بندھی ہوئی تھیں؟

"یہ آدمی ڈاکوؤں کا سردار ہے"— طلال ابراہیم نے کہا — "اور یہ باقی آدمی بیگار میں پکڑے ہوئے ہیں"۔

"شاید اس کا گروہ مزید لوٹ مار کے لیے چلا گیا ہوگا"۔

"صالح!"— طلال نے کہا — "اگر یہ لوگ یہاں پہرہ نہ بٹھائیں تو اس مال سے ہم کچھ حصہ جو ہم اٹھا سکتے ہیں، اُڑا کر لے جا سکتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے؟"

"ہوش میں آؤ طلال!"— صالح بردک نے کہا — "ان خزانوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں وہ فرض ادا کرنا ہے جس کے لیے ہمیں یہاں بھیجا گیا ہے"۔

"میں فرض کو نہیں بھول رہا"— طلال نے کہا — "رات تو ہمیں یہیں گذارنی ہے۔ ہم کوئی کام نہیں کر رہے۔ جو کام ہوگا صبح ہوگا۔ بات کر رہا ہوں کہ یہ لوگ اگر چلے جائیں تو ہم غار کے اندر چلے جائیں گے۔ اندر کوئی نہیں ہوگا۔ کوئی ہوتا تو وہ بھی بکس اندر لے جانے کے لیے باہر آتا"۔

"ہم اندر نہیں جائیں گے"— صالح نے کہا — "لوٹے ہوئے خزانوں کو دل سے اُتار دو۔ خزانے اور عورت کی کشش نے بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں۔ دل سے طمع نکال دو"۔

"تم پتھر ہو"— طلال نے جھنجھلا کر کہا — "تم پاگل ہو"۔

صالح بردک کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ مشعلیں باہر آ گئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ آدمی جو پنڈت لگتا تھا اور باقی سب آدمی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئے۔ پنڈت ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر خچروں تک لایا۔ اُس نے انہیں خچروں پر سوار کرا دیا۔ خچریں تھوڑی تھیں اور آدمی زیادہ۔ ایک ایک خچر پر پنڈت نے دو دو آدمی سوار کرا دیئے اور ان کے لگام ایک دوسری خچر کے پیچھے باندھ کر خود اگلی خچر کی لگام پکڑ لی اور پیدل چل پڑا۔

وہ جب دور نکل گئے تو طلال نے ایک بار پھر صالح سے کہا کہ چلو دیکھتے ہیں کیا ہے مگر صالح نے اُسے سختی سے منع کر دیا اور اُسے یہ بھی کہنا پڑا کہ طلال نے اگر یہ ضد جاری رکھی تو صالح اُسے قتل کر دے گا۔ طلال ابراہیم ہنس پڑا اور دونوں پھر سو گئے۔ رات تھوڑی رہ گئی تھی۔

ابھی صبح دُھندلی تھی جب یہ پنڈت مہاراجہ قنوج راجیا پال کی خواب گاہ کے دروازے پر جا کھڑا ہُوا۔ یہ مہاراجہ کے جاگنے کا وقت نہیں تھا مگر خواب گاہ کی خادمہ

جو باہر کھڑی تھی، پنڈت کو دیکھتے ہی اندر چلی گئی اور باہر آ کر پنڈت سے کہا کہ اندر چلا جائے۔ وہ دروازے میں داخل ہوا تو شکنتلا رانی اندر سے نکلی۔ شکنتلا تیس سال سے کم عمر کی چھوٹی رانی تھی۔ بڑی رانی لکشمی کی عمر چالیس سال سے خاصی اوپر ہو گئی تھی۔ شکنتلا بہت خوبصورت اور بڑے ہی دلکش جسم کی عورت تھی۔ وہ خواب گاہ سے نکلی تو یوں چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ آنکھیں نیم وا تھیں اور قدم بے خیالی میں اُٹھ رہے تھے۔ اس کے جسم سے جہاں مدہوش کر دینے والے عطر کی خوشبو آ رہی تھی وہاں شراب کی بُو بھی تھی۔

مہاراجہ راجیاپال نے پنڈت سے کہا کہ دروازہ بند کر کے اُس کے قریب بیٹھ جائے۔

"رات خزانے کی آخری کھیپ وہاں پہنچا دی گئی ہے" — پنڈت نے کہا۔

"کیا اُن تمام آدمیوں کو قید میں ڈال دیا گیا ہے جنہوں نے یہ بکس غار میں رکھے تھے؟" — مہاراجہ قنوج نے پوچھا۔

"انہیں قید میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں" — پنڈت نے کہا۔ "پھر بھی آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی ہے۔ ان سب کو قید میں ڈال دیا گیا ہے اور میں نے قید خانے والوں سے کہہ دیا ہے کہ ان سب کو نہایت اچھی خوراک دی جائے اور انہیں ہر طرح سے آرام اور عزت سے رکھا جائے۔"

"پنڈت جی مہاراج!" — مہاراجہ راجیاپال نے کہا — "اب صرف آپ ہیں جو خزانے کے راز سے واقف ہیں۔ آپ کو یہ احساس تو ہو گا کہ میں نے آپ کی کتنی عزت افزائی کی ہے۔ اپنی فوج کے سینا پتی تک کو اس راز میں شریک نہیں کیا اور آپ یہ بھی سوچیں کہ شکنتلا رانی سے مجھے کتنا پیار ہے مگر میں نے اسے بھی نہیں بتایا کہ میں تمام تر خزانہ قلعے سے کہیں اور منتقل کر چکا ہوں۔"

"مہاراج کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیئے" — پنڈت نے کہا — "میں آپ کا خزانہ اُس روز سے اس غار میں لے جا رہا ہوں جس روز سے یہاں اطلاع پہنچی ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے متھرا پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور اب اُس کا رُخ قنوج کی طرف ہے۔ آپ خود جا کر وہ جگہ دیکھ آئے ہیں جو میں نے اس پہاڑی کے اندر بنوائی ہے۔ راج محل میں بھی کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ ایک رات آپ میرے ساتھ وہاں گئے تھے .... آج میں نے آپ کے زر و دولت کی آخری کھیپ بھی اُس جگہ پہنچا دی ہے۔"

"اُس کی حفاظت کا انتظام مکمل ہو گیا ہے؟"

"اتنا مکمل کہ اب آپ بھی وہاں اکیلے جائیں تو شاید وہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے" — پنڈت نے کہا — "وہاں پہرے پر کوئی ایک بھی انسان نہیں — سانپ پہرہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے ایک بات اور کہنی ہے" — مہاراجہ نے کہا — "اگر یہ راز فاش ہو گیا تو وہ دن آپ کی زندگی کا آخری دن ہو گا، اور اگر اس سے پہلے میری موت آ گئی تو آپ کو میرے ساتھ مرنا ہو گا۔"

پنڈت کے ہونٹوں پر طنز آلود مسکراہٹ آ گئی۔ بولا — "زر و جواہرات کا نشہ اتنا بُرا ہوتا ہے کہ انسان درندہ بن جاتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ جو دولت میرے پاس ہے اس کے سامنے ہیروں اور سونے کی چمک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میرے بھجن، میری پراتھنا اور ہری کرشن کے چرنوں میں راتوں کو جاگنا وہ دولت ہے کہ آپ جیسے مہاراجے اور ان کی فوجیں مجھے چیونٹیوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ کو اپنا رازدان بنایا ہے" — مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔

تمام مؤرخین نے جن میں محمد قاسم فرشتہ اور البرونی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ محمود غزنوی کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا مقابلہ قنوج میں ہو گا۔ قنوج کے حکمران خاندان کے متعلق سلطان محمود نے ایسی باتیں سنی تھیں کہ اُس پر عجیب سی قسم کی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ غزنی سے اُسے کمک ملنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایسی چالیں سوچتا رہتا تھا جن سے قنوج کی فوج کو شکست دے سکے۔ متھرا میں اُس نے اپنی فوج

کو بہت آرام دے لیا تھا مگر سالاروں اور نائب سالاروں کو اُس نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ اپنی فوج کا مورال بلند کرنے کے لیے اُس نے اماموں کے ذریعے تمام فوج کو پیغام بھی دیا تھا۔

یہ اُس کے جذبے کا جنون اور عزم کی پختگی تھی کہ وہ یکے بعد دیگرے اتنے قلعے سر کر کے اور اتنے معرکے لڑ کر بھی آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر قنوج کے متعلق اُسے جو رپورٹ ملی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ مہاراجہ قنوج راجیاپال نے اپنا خزانہ قنوج سے کسی پہاڑی علاقے میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی پے بہ پے فتوحات اور اس کی برق رفتار یلغار کو دیکھ کر راجیاپال حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا۔ قنوج کے بڑے مندر کا پنڈت اُسے لڑنے کے لیے تیار کر رہا تھا مگر اُس کے پاس نہ لڑنے کی ایک وجہ اور بھی تھی جو اُس نے پنڈت کو نومبر ۱۰۱۸ء کی اس صبح اپنی خواب گاہ میں بتائی۔

"مہاراج کا خزانہ محفوظ ہو گیا ہے" ۔۔۔ پنڈت اسے کہہ رہا تھا ۔۔۔ "اب آپ سلطان محمود کا مقابلہ جم کر کریں، ورنہ قنوج کا مندر بھی مسجد بن جائے گا۔ یہ نہ بھولیں کہ جنہیں مسلمان بُت کہتے ہیں وہ ہمارے بھگوان ہیں۔ ان کی جو توہین ہو چکی ہے وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ دیوی دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکیں گے۔"

مہاراجہ نے پنڈت کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور دھیمی سی آواز میں بولا ۔۔۔ "جنہیں آپ دیوی دیوتا کہتے ہیں یہ دراصل بُت ہی ہیں۔ اگر ان میں قہر برسانے کی طاقت ہے تو اپنی بے عزتی کی سزا مسلمانوں کی فوج کو کیوں نہیں دیتے؟ وہ مسجدوں میں اذانیں دینے والوں پر بجلی بن کر کیوں نہیں گرتے؟"

"مسلمانوں کی فوج دراصل دیوتاؤں کا قہر ہے جو اس دیس کے اُن مہاراجوں پر پڑ رہا ہے جو اپنے مذہب کی توہین کرا رہے ہیں" ۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "مگر آپ مذہب کی بجائے اپنے خزانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ غزنی کا سلطان خزانے لوٹ کر غزنی لے جانے کے لیے آیا ہے" ۔۔۔

مہاراجہ راجیاپال نے کہا ۔۔۔ "وہ قنوج کا خزانہ نہیں لے جا سکے گا۔ وہ مجھے قید نہیں کر سکے گا۔ وہ یہاں پاگلوں کی طرح ہمارا خزانہ ڈھونڈتا رہے گا۔ اُسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اُسے میں بھی نہیں ملوں گا۔ میں وہاں ہوں گا جہاں اُس کی پوری فوج بھی مجھے نہیں ڈھونڈ سکے گی۔"

"اُسے مندر مل جائیں گے" ۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "وہ مندروں کو اجاڑے گا اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں گے۔ مہاراج! زر و جواہرات کے پیار نے آپ کو بزدل بنا دیا ہے۔ آپ غزنی کے سلطان کو دھوکہ دینے کی سوچ رہے ہیں مگر یہ بزدلی ہے۔ آپ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اپنی فوج کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتے کہ جب آپ یہاں سے چوری چھپے بھاگ کر کہیں چلے جائیں گے تو آپ کی فوج اور رعایا کے دل میں آپ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے گی ..... میں بھگوان کے نام پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیں۔ قنوج کا بچہ بچہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف آگ کے بگولے بنانا میرا کام ہے۔"

"مجھے سوچنے دیں" ۔۔۔ مہاراجہ راجیاپال نے کہا ۔۔۔ "مجھے سوچنے دیں" ۔۔۔ وہ پریشان ہو گیا اور بے چینی کے عالم میں کہنے لگا ۔۔۔ "میں نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں آپ کو ہر ایک بات نہیں بتا سکتا۔"

پنڈت کے جانے کے بعد مہاراجہ قنوج راجیاپال نے اپنی فوج کے سینیر کمانڈروں کو بلایا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یہ بظاہر بزدلی ہے کہ میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کروں گا، لیکن میں نے سوچا ہے کہ میں غائب ہو جاؤں گا۔ یہ محمود کے لیے بہت بڑی چوٹ ہو گی۔ وہ قنوج میں پاگلوں کی طرح سر پٹختا پھرے گا۔ وہ ابھی یہاں سے جائے گا نہیں۔ اس کا مقابلہ ابھی کسی نے بھی نہیں کیا۔ اُسے ہر جگہ آسان فتح حاصل ہوئی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ لڑا لڑا کر اور پیش قدمی کرتے کرتے اُس کی طاقت بہت کم ہو جائے گی۔ میں اس عرصے میں دوسرے مہاراجوں

کو ساتھ ملا کر بڑی زبردست فوج بنالوں گا۔ پھر بھی قنوج سلطان محمود اور اس کی فوج کا قبرستان بن جائے گا۔"

وہ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ نہ کرنے اور غائب ہو جانے کے حق میں جواز پیش کر رہا تھا مگر اس کے فوجی کمانڈروں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ اپنے مہاراجہ کے فیصلے کو پسند نہیں کر رہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ سب بت بنے سنتے رہے۔

"کیا آپ سب کو میرا فیصلہ منظور ہے؟" ۔۔۔ اس نے سب سے پوچھا۔

"ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے" ۔۔۔ اس کے سیناپتی (کمانڈر انچیف) نے کہا ۔۔۔ "مگر ہم میں سے کوئی بھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ نہیں لڑے گا۔ مہاراج! یہاں سوال آپ کے یہاں رہنے یا غائب ہو جانے کا نہیں۔ یہاں مسئلہ مذہب کا ہے۔ اس جنگ کا تعلق براہِ راست مذہب سے ہے۔ اگر ہندو راجے یوں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تو سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا۔"

مہاراجہ راجیا پال نے ایک کاغذ کھول کر اپنے سیناپتی کو دے کر کہا ۔۔۔ "یہ سب کو پڑھ کر سناؤ۔"

یہ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کا خط تھا جو اس نے منج کے رائے چندر کو لکھا تھا۔ رائے چندر نے یہ خط قنوج کے مہاراجہ راجیا پال کو بھیج دیا تھا۔ بہت سے مؤرخوں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق مہاراجہ بھیم پال نڈر نے رائے چندر کو لکھا تھا:

"سلطان محمود ہندوستان کے حکمرانوں کی طرح نہیں۔ وہ سیاہ فام آدمیوں کا سردار نہیں۔ اس کا نام سن کر ہی فوجیں اس کے آگے بھاگ اٹھتی ہیں۔ اس کے گھوڑے کی لگام آپ کے گھوڑے کی لگام سے زیادہ مضبوط ہے۔ وہ تلوار کے ایک ہی وار سے مطمئن نہیں ہوا کرتا اور وہ سلسلۂ کوہ میں سے صرف ایک پہاڑی نہیں لیا کرتا۔ اگر آپ اس سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں چھپ جائیں۔"

رائے چندر نے یہ خط اس پیغام کے ساتھ مہاراجہ راجیا پال کو بھیج دیا تھا کہ وہ لڑ کر مرنے کو ترجیح دے گا۔ اس نے یہ خط مہاراجہ راجیا پال کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کر لے۔

"میں جانتا ہوں غزنی کا سلطان محمود قنوج کو کھنڈر بنا دے گا" ۔۔۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا ۔۔۔ "لیکن یہی کھنڈر اس کی قبر بنیں گے اور ان کھنڈروں سے نیا قنوج ابھرے گا جو ہندو مت کا محافظ ہوگا ۔۔۔۔ میں آپ سب کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ فوج کو پتہ نہ چلے کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

تمام کمانڈر سر جھکائے ہوئے باہر نکل گئے۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے پنڈت عبادت میں مصروف تھا۔ یہ وقت اس کی عبادت کا نہیں تھا لیکن مہاراجہ قنوج کے فیصلے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے اب یہی نظر آرہا تھا کہ سلطان محمود آئے گا اور اس مندر کو اجاڑ کر اس کے دیوتاؤں کے بت توڑ دے گا۔ پنڈت اس وقت سے ڈر رہا تھا اور دیوتاؤں سے کہہ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قنوج سے دور ہی فنا کر دیں۔ وہ رو بھی رہا تھا اور بڑی درد ناک آواز میں بھجن گا رہا تھا۔ اس کا دروازہ کھلا مگر وہ عبادت میں اتنا محو تھا کہ اسے پتہ نہ چل سکا کہ اس کے قریب کوئی آکے بیٹھ گیا ہے۔ وہ اس وقت چونکا جب اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے دیکھا۔ اس کے قریب مہاراجہ قنوج کی چھوٹی رانی شکنتلا بیٹھی تھی۔

"آپ؟" ۔۔۔ پنڈت نے حیران ہو کے پوچھا ۔۔۔ "اس وقت؟ ۔۔۔۔ وہ سنبھل گیا اور بولا ۔۔۔ "پہلے دیوی کے چرنوں میں ماتھا رگڑیں۔"

رانی شکنتلا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ پنڈت نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس کی۔ ایک اس لیے کہ وہ شکنتلا رانی تھی اور دوسرے اس لیے کہ شکنتلا کے حسن میں جادو کا اثر تھا۔ پنڈت کا دل اس سوال سے بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ رانی اس وقت مندر میں کیوں آئی ہے؟ وہ عبادت کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے آئی ہے۔

"آپ کے چہرے پر گھبراہٹ کیوں آگئی ہے؟" ۔۔۔ رانی شکنتلا نے کہا ۔۔۔ "کیا مجھ

جیسی خوبصورت عورت پہلے نہیں دیکھی! ... کیا میں اُن کنواریوں کے مقابلے میں کچھ نہیں جنہیں آپ منتخب کر کے اپنے پاس رکھا کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ بتایا کرتے ہیں کہ یہ کنواریاں اب پاک ہوگئی ہیں"؟

"آپ اپنا مطلب بیان کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا" ــــ پنڈت نے کہا ــ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں"

"مہاراج!" ــــ شکنتلا نے کہا ــ "اگر ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دیں تو دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان دیوتاؤں کی جو دو دن کے مہمان ہیں؟ ہری کشن واسدیو نے مسلمانوں کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ کنواریوں کی قربانی کہاں گئی؟ اُن معصوموں کا خون کس کھاتے میں گیا؟"

"کیا آپ مجھے مہاراج کی طرح مذہب سے گمراہ کرنے آئی ہیں؟"

"نہیں" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــ "میں آپ کو مہاراجہ بنانے آئی ہوں ... مجھے صرف یہ بتا دیں کہ خزانہ کہاں ہے۔ مجھے وہاں لے چلیں۔ ہم دونوں، میں اور آپ خزانہ لے کے کہیں چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو قنوج کی گدی پر ہی بٹھا دوں"

"کیسا خزانہ؟" ــــ پنڈت نے کہا ــ "میں خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتا"

"میں جانتی ہوں آپ اپنا عہد پورا کر رہے ہیں" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "لیکن آپ کو مجھے اس راز میں شریک کرنا پڑے گا۔ مجھے مذہب سے اور دیوتاؤں کے قہر سے نہ ڈرانا۔ مذہب کو میں ایک فریب کے سوا کچھ نہیں سمجھتی۔ میں صرف خزانہ حاصل کرنے نہیں آئی۔ آپ کو بھی ساتھ لے جانے آئی ہوں"

"مذہب کوئی سا بھی ہو، مذہب کو فریب سمجھنے والے اس دنیا میں کبھی سُکھی نہیں رہے" ــــ پنڈت نے کہا ــ "غزنی کا سلطان کیوں فتح پہ فتح حاصل کرتا جا رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ اُسے اپنے مذہب سے اتنا پیار ہے کہ وہ سارے ہندوستان کو مسلمان بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں ہمارے مذہب کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے"

"ہمارا مذہب نفرت کے قابل نہیں تو اور کیا ہے؟" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــ "مہاراج! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ مجھے کیسی باتوں سے خزانہ کہیں لے جا کر چھپا رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس راز سے آپ اور مہاراجہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ اگر آپ نے میری راہنمائی نہ کی تو آپ کو بہت بڑا نقصان ہوگا"

"کیا آپ اپنے خاوند کو دھوکہ دینا چاہتی ہیں؟"

"مہاراجہ کسی ایک عورت کا خاوند نہیں ہوتا" ــــ شکنتلا رانی نے کہا ــ "آج رات وہ کسی اور کا خاوند ہے، اس لیے آپ کے پاس آنے کا موقع مل گیا ہے۔ مہاراجہ اُس وقت تک میرا خاوند ہے جس وقت تک میرا حسن و جوانی قائم ہے ... مہاراج! انسان جب تخت پر بیٹھ کر سر پر سونے کا تاج سجا لیتا ہے تو اُس کے اندر انسانی جذبات مر جاتے ہیں۔ وہ محبت اور خلوص سے خالی ہو جاتا ہے۔ مہاراجہ کو صرف خزانے سے محبت ہے۔ اسے ایسا کوئی غم نہیں کہ غزنی کے فوجی مجھے اور مجھ جیسی تمام جوان اور خوبصورت عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ اپنے خزانے کو بچانا چاہتا ہے۔ اُسے آپ کا اور آپ کے دیوتاؤں کا کوئی خیال نہیں۔ آپ اپنا خیال کریں اور آپ میری طرف دیکھیں"

"میں اس کے باوجود آپ کو خزانے کا راز نہیں دوں گا" ــــ پنڈت نے کہا۔

"پھر آپ اغوا ہو جائیں گے" ــــ شکنتلا رانی نے کہا ــ "آپ میری آنکھ کے اشارے پر قتل ہو جائیں گے، لیکن میں آپ کو قتل نہیں کراؤں گی۔ آپ کی دونوں آنکھیں نکلوا کر اور آپ کے جسم کی کھال کہیں کہیں سے کاٹ کر آپ کو جنگل میں پھینکوا دوں گی۔ اُس موت کو تصور میں لائیں جو آپ کو بڑی آہستہ آہستہ اس دنیا سے اٹھائے گی۔ اُس اذیت کا تصور کریں جو آپ کو آہستہ آہستہ تڑپا تڑپا کر پیاسا مارے گی۔ آپ کے زخموں پر مکھیاں بیٹھیں گی اور چیونٹیاں چڑھیں گی۔ ہو سکتا ہے گدھ آپ کو زندہ ہی نوچنے لگیں"

پنڈت اس طرح چپ چاپ سن رہا تھا جیسے اُس کی زبان گنگ اور اُس

کے جسم کی طاقت سلب ہو گئی ہو۔ شکنتلا رانی کی آنکھوں کی چمک جس میں حسن کا سحر تھا،
اب ایک چڑیل کی آنکھیں بن گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ، دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔
"اور اگر میں نے آپ پر رحم کیا تو میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گی"۔ شکنتلا رانی
نے کہا ۔۔۔ "میں مہاراجہ سے کہوں گی کہ آپ نے مندر میں بلا کر مجھ پر دست درازی
کی ہے۔ میں گواہ بھی لے آؤں گی۔ میں اپنے جسم پر اپنے ہی ناخنوں سے خراشیں ڈال
کر کہوں گی کہ یہ آپ کے ناخنوں کی خراشیں ہیں۔ مہاراجہ آپ کی نہیں سنیں گے۔ وہ جانتے
ہیں کہ ان مندروں میں کیا ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہر پنڈت اور ہر سادھو عورتوں
کا شکاری ہے ۔۔۔۔ پھر آپ کو جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ موت آپ کے لیے
آسان ہو گی"۔

پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ بولا ۔ "میں تمہیں خزانے تک لے جاؤں گا
۔۔۔۔ کب چلو گی؟"

"ابھی" ۔۔۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔۔ "لیکن یاد رکھیں کہ مہاراجہ تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ
کا انجام وہی ہو گا جو میں آپ کو سنا چکی ہوں۔ میں دس آدمی اور دس عورتیں مہاراجہ کے
سامنے کھڑی کر کے ان سے کہلواؤں گی کہ آپ نے خزانے کا لالچ دے کر مجھے اپنے
ساتھ بھاگ چلنے کو کہا تھا اور میں آپ کو موقع پر گرفتار کرانے کے لیے خزانے تک ساتھ
چل گئی تھی"۔

"خزانہ اٹھوانے کے لیے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہے" ۔۔۔ پنڈت نے کہا
۔۔۔ "یہ انتظام خفیہ طریقے سے کیسے ہو گا؟"

"میں آج رات صرف جگہ دیکھنا چاہتی ہوں" ۔۔۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔۔ "سارا انتظام
میرا ہو گا اور خفیہ ہو گا اور آپ کو میں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ دھوکہ نہیں ہو
گا"۔

پنڈت اٹھ کھڑا ہوا۔

طلال ابراہیم اور صالح برک نے رات چٹان پر گزاری تھی۔ صبح ہوئی تو طلال نے
کہا کہ وہ اس شگاف کے اندر جانا چاہتا ہے۔ صالح نے اسے کہا کہ سب سے پہلے

انہیں وہ کام کرنا چاہیے جس کے لیے وہ ادھر آئے ہیں مگر طلال کی ضد کام کر گئی۔ پنڈت
ان آدمیوں کو جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جس شگاف میں لے گیا تھا، دن
کی روشنی میں ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے چٹان نے عجیب سی شکل اختیار کر
لی تھی۔ عمودی اور خاصی اونچی دیوار سی تھی۔ اس میں شگاف ایسے تھا جیسے کنوئیں کی دیوار
ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اس میں سے پیچھے کی چٹان جو کنوئیں کی تھی نظر آ رہی تھی۔

طلال اور صالح اس کے اندر چلے گئے۔ یہ ایک وسیع کنواں تھا جو قدرت نے
زمین پر بنایا تھا۔ چٹان میں پتھر بھی تھے مٹی بھی۔ اوپر کے درخت جھک کر اس پر
سایہ کیے ہوئے تھے۔ دیواروں میں بھی درخت تھے جو اوپر جانے کی بجائے زمین
کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ ان کے سائے نے اندھیرا سا کر رکھا تھا۔ اس کنوئیں کی
جگہ میں پانی کھڑا تھا جو پانی کم اور دلدل زیادہ تھی۔ اس کے کناروں اور چٹان کے
درمیان چلنے کے لیے تھوڑا سا خشک راستہ تھا۔ طلال اور صالح اس راستے پر چلتے چلتے
آگے گئے تو سامنے والی چٹان کے دامن میں مٹی کی ایک ٹیکری تھی۔ پنڈت کے آدمی
یہیں کہیں غائب ہو گئے تھے۔

دونوں ٹیکری پر چڑھے تو انہیں چٹان میں ایک دہانہ نظر آیا جو جھکے ہوئے ایک
درخت اور جھاڑی نما درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ دہانے میں چلے گئے۔ اندر کمرے کی
طرح کا غار تھا جس میں آسانی سے کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ یہ گول سا کمرہ تھا۔ اندر اندھیرا
اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں نے بہت ٹٹولا مگر وہاں مٹی اور پتھروں کے سوا
کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک جگہ ایک اور دہانہ کھلا ہوا تھا جو دراصل سرنگ تھی۔ یہ
اس قدر اندھیری تھی کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اندر کیا ہے۔

"اگر تم اکیلے یہاں رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو" ۔۔۔ صالح برک نے طلال ابراہیم سے
کہا ۔۔۔ "میں جا رہا ہوں"۔

طلال بے دلی سے باہر کو چل پڑا۔ وہ بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ
وہ اپنے فرض کو بھول چکا ہے۔ جنگل کا یہ گوشہ کچھ پُراسرار اور خوفناک سا تھا۔ صالح برک
طلال کو اپنے ساتھ لے گیا اور دونوں پانچ چھ میل دور ایک چٹان پر چڑھ گئے جہاں سے

انہیں قنوج کا قلعہ اور شہر نظر آ رہا تھا۔ وہاں انہیں کوئی فوجی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"سلطان منبج کے قریب پہنچ چکا ہو گا" — صالح نے کہا۔ "اور ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"ہم دو آدمی پیدل کتنے علاقے کو دیکھ سکتے ہیں؟" — طلال نے کہا — "ہو سکتا ہے قنوج کی فوج رات کو کسی اور راستے سے منبج کے قریب چلی گئی ہو۔"

"ہر جگہ ہمارے آدمی موجود ہیں" — صالح نے کہا۔ "میں یقین سے کہتا ہوں کہ قنوج سے فوج باہر نہیں نکلی۔"

وہ سارا دن گھومتے پھرتے رہے اور رات اُسی جگہ چلے گئے جہاں گزشتہ رات سوئے تھے۔ صالح نے طلال سے کہا تھا کہ وہ ساری رات وہاں گزاریں گے۔ آدھی رات تک سوئیں گے۔ پھر قنوج کے قریب چلے جائیں گے کیونکہ فوج کی نقل و حرکت کی توقع رات کو ہی کی جا سکتی تھی۔

دونوں اُسی جگہ چٹان کے اُوپر لیٹ گئے۔ وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ لیٹتے ہی سو گئے۔

آدھی رات سے ذرا پہلے صالح بروک کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اُس نے طلال ابراہیم کو جگایا۔ گھوڑے قریب آ رہے تھے۔ ذرا دیر بعد روشنی نظر آنے لگی۔

"ہمارا کام ہوتا نظر آ رہا ہے" — صالح نے کہا۔ "یہ آوازیں دو یا تین گھوڑوں کی ہیں۔ فوج آ رہی ہو گی۔"

دونوں پیٹ کے بل رینگ کر آگے ہو گئے جہاں سے وہ کسی کو نظر آئے بغیر نیچے دیکھ سکتے تھے۔ انہیں دو گھوڑے آتے دکھائی دیئے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی۔ وہ قریب آئے تو طلال نے کہا — "یہ کل رات والا آدمی معلوم ہوتا ہے، اور دوسری عورت ہے۔"

"لعنت بھیجو" — صالح نے کہا — "ان کا فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

وہ سوار کنواں نما چٹان کے شگاف میں اُترے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر گھوڑے اندر لے گئے — ایک تو پنڈت تھا اور دوسری شکنتلا رانی تھی — وہ اندر جا کر غار کے دہانے کے سامنے والی ٹیکری کے قریب رکے اور گھوڑوں سے اُتر کر ٹیکری پر جا چڑھے اور غائب ہو گئے۔

"میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ چل کے دیکھتے ہیں یہ ہے کیا" — طلال نے صالح سے کہا — "یہ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ تم نے عورت دیکھی ہے۔ یہ کوئی معمولی سی قسم کی عورت نہیں۔ شہزادی معلوم ہوتی ہے۔"

صالح بروک کو نہ پنڈت کے ساتھ دلچسپی تھی نہ عورت کے ساتھ لیکن طلال ابراہیم اتنی تیزی سے چٹان سے اُتر گیا کہ صالح اُسے روک نہ سکا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دونوں نے کپڑوں کے اندر ایک ایک تلوار اور ایک ایک خنجر چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے تلواریں نکال لیں اور اندھیرے میں دلدل کے کنارے کنارے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اندر سے روشنی آ رہی تھی۔ پنڈت اور شکنتلا رانی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اُن کے سوا یہاں کوئی اور انسان موجود ہے۔ ان کی باتیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔

"رانی!" — پنڈت کہہ رہا تھا — "خزانہ یہاں ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ واپس چلی جاؤ۔"

"یہاں تو کچھ بھی نہیں" — رانی نے کہا — "کیا خزانہ اس فرش کے نیچے ہے؟"

"اور اب میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں" — پنڈت نے کہا — "تم نے مجھے دھمکیاں دی تھیں اور مجھے بھیانک انجام سے ڈرایا تھا۔ اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تمہاری لاش ایسی جگہ چھپاؤں گا کہ کسی کو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔"

"ہوش میں آؤ پنڈت!" — رانی شکنتلا نے کہا — "کیا اس تنہائی میں آپ مجھ جیسی عورت کو رُوں ٹھکرا سکیں گے؟ ...."

"پنڈت جی مہاراج! میں پھر کہتی ہوں کہ اپنے آپ کو فریب نہ دو۔"

"مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ رانی!" — پنڈت کی آواز سنائی دی — "کسی کو

مدد کے لیے بلانا چاہتی ہو تو پورے زور سے چیخو۔"

"نہیں مہاراج!" شکنتلا کی التجا سنائی دی۔ "خنجر نہ نکالو۔ ایک بار پھر میری بات سن لو۔"

ایسی آوازیں آئیں جیسے پنڈت نے شکنتلا کو پکڑ لیا ہو۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے اس وسیع غار میں بھاگ رہی ہو۔

پنڈت اُسے پکڑنے کو دوڑ رہا تھا۔ مشعل کا ڈنڈا زمین میں گڑا ہوا تھا۔ کمرہ نما غار روشن تھا۔ پنڈت رانی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے رک گیا اور غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ شکنتلا رانی نے بھی اُدھر دیکھا اور رُک گئی ــــ غار کے دہانے میں دو آدمی جو لباس سے خانہ بدوش گڈریے لگتے تھے، ہاتھوں میں تلواریں لیے کھڑے تھے۔ پنڈت اور شکنتلا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ طلال اور صالح بھی خاموشی سے کھڑے رہے۔

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" پنڈت نے سنبھلتے ہوئے بڑے رعب سے کہا۔ "چلے جاؤ۔ یہاں ہمارے بہت سے آدمی ہیں۔ تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"خنجر پھینک دو" طلال ابراہیم نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ اور دونوں آگے آئے، "اور ہمیں بتاؤ کہ یہاں کیا ہے اور یہاں کیا کر رہے ہو۔"

پنڈت کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا ــــ "ہم مسافر ہیں۔ قنوج جا رہے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ باہر ہمارے گھوڑے کھڑے ہیں۔ یہاں رات گزارنے کے لیے رک گئے ہیں۔"

صالح بروک ۔۔۔ وہیں کھڑا تھا۔ طلال نے آگے بڑھ کر پنڈت کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اپنی تلوار کی نوک پنڈت کی شہ رگ پر رکھ کر پوچھا ــــ "سچ بتاؤ یہاں کیا ہے۔ ہم خود بھی ڈھونڈ سکتے ہیں لیکن اس صورت میں تم زندہ نہیں رہو گے اور یہ عورت ہمارے قبضے میں ہو گی" ــــ اُس نے شکنتلا کی طرف دیکھ کر کہا ــــ "اپنا انجام سوچ لو۔"

"یہاں خزانہ ہے۔" شکنتلا رانی نے کہا۔ "میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گی۔ لے کر چلے جانا۔"

"ہاں!" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "یہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں خزانہ ہے۔"

"کہاں سے آیا ہے خزانہ؟" ــــ طلال نے پوچھا ــــ "اور تم دونوں کون ہو؟" ....

"میں قنوج کے بڑے مندر کا پنڈت ہوں اور یہ مہاراجہ قنوج کی رانی ہے" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "اگر تم انعام وصول کرنا چاہتے ہو تو میں دے دوں گا مگر تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔"

"یہ فیصلہ ہم خود کریں گے کہ ہم چلے جائیں گے یا یہیں رہیں گے" ــــ طلال نے کہا ــــ "تم یہ بتاؤ کہ خزانہ کہاں ہے؟"

"آؤ" ــــ شکنتلا رانی نے مسکرا کر طلال کا بازو پکڑا اور اُسے غار کے دہانے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی ــــ "میں تمہیں بتاتی ہوں کہ خزانہ کہاں ہے۔"

طلال اُس کے ساتھ چل پڑا۔ صالح بروک نے اُسے روکا مگر طلال نے اُس کی ایک نہ سنی اور شکنتلا رانی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ صالح فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ وہ پنڈت کو اکیلے چھوڑنے میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ آدمی قریب ہوں اور یہ انہیں بلا لے۔ وہ طلال کو شکنتلا جیسی حسین عورت کے ساتھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ شش و پنج میں پڑا ہوا پنڈت کے سامنے کھڑا رہا۔ اسے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ اُس کا ساتھی اگر زندہ واپس آ گیا تو اُس پر اس عورت کا جادو سوار ہو چکا ہو گا۔

شکنتلا اور طلال کچھ دیر بعد واپس آئے۔ طلال کا چہرہ اور اُس کی چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ بالکل بدل گیا ہے اور اپنے فرض کو وہ دل سے اتار چکا ہے۔ اس نے آتے ہی پنڈت سے کہا کہ وہ بتا دے کہ خزانہ کہاں ہے۔

صالح بروک نے گرج کر کہا ــــ "طلال! باہر نکلو یہاں سے!"

طلال نے صالح کی طرف دیکھا پھر پنڈت اور شکنتلا رانی سے کہا "تم دونوں وہاں دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ" اور وہ صالح کو ان سے دور لے گیا۔ کہنے لگا ــــ "میری بات غور سے سنو صالح بروک! میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کر رہا۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں دے رہا۔ یہاں سے ہم دونوں کو کچھ وصول ہو جائے تو کیا بُرا ہے؟"

"طلال!" ــــ صالح نے کہا ــــ "تمہارے جسم سے مجھے اس ناپاک عورت کی بو

آرہی ہے۔ عورت میں صرف یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ عورت ہے اور مرد کا مرد ہونا اس کی کمزوری ہے۔ میں جانتا تھا وہ تمہیں باہر کیوں لے گئی تھی۔ تم کہتے ہو کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے؟ .... ہمارے درمیان ایک عورت اور سونے کے چند ایک ٹکڑے آ گئے تو ہم دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ سلطان محمود غزنوی کی فتح اور شکست کا انحصار ہم دونوں پر ہے۔"

"غور سے سنو صالح بھائی!" — طلال نے کہا۔ "ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ غزنی والے ہمیں کیا دیتے ہیں؟ کیا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا اتنا سا ہی معاوضہ ہونا چاہیے جو ہمیں غزنی کی فوج سے ملتا ہے؟"

"ہم نے جو فرض اپنے ذمے لیا ہے اس کا معاوضہ خدا دے گا" — صالح بول کر نے کہا۔ "تم اپنے آپ کو غزنی کی فوج کا ملازم نہ سمجھو۔ ہم اسلام کے مجاہدین ہیں۔"

"اتنا خزانہ نہ چھوڑو صالح!"

"اپنا حلف یاد کرو" — صالح نے کہا۔ "ہم نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر حلف اٹھایا تھا کہ جان پر کھیل کر فرض ادا کریں گے اور دھوکہ نہیں دیں گے اور ہمارے قدموں میں خزانے رکھ دیئے گئے تو بھی قبول نہیں کریں گے اور ایمان کے پکے رہیں گے .... طلال! موت کا کوئی بھروسہ نہیں کب آ جائے۔ یہ خزانے دنیا میں دھرے رہ جائیں گے۔"

"مجھے آزما لینا" — طلال نے کہا۔ "تم یہیں رہو۔ مجھے یہاں سے کچھ وصول کر لینے دو۔"

طلال نے پنڈت سے کہا — "اٹھو اور مجھے خزانے تک لے چلو۔"

"ہاں مہاراج!" — شکنتلا رانی نے بھی پنڈت سے کہا — "اب ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

پنڈت نے اٹھ کر غار کی دیوار پر ایک جگہ انگلی رکھی اور طلال اور صالح سے کہا — "دونوں تلواریں برچھیوں کی طرح یہاں مارو۔"

صالح کھڑا رہا۔ طلال نے آگے بڑھ کر اس جگہ تلوار ماری تو تلوار نصف سے زیادہ اندر چلی گئی۔ اُس نے صالح کو بلایا۔ صالح نے کہا — "مجھے تمہارے خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں" — اُس نے تلوار اُس کی طرف پھینک کر کہا — "یہ لو۔ اپنے ہاتھ سے کر دو جو کرنا ہے۔"

پنڈت نے تلوار اُٹھالی اور طلال کی تلوار کے قریب دیوار میں اتار دی اور بولا — "اب تلواروں کو دائیں طرف دباؤ۔"

دونوں نے تلواریں ایک طرف دبائیں تو مٹی کا ایک گول اور بہت بڑا توے سا جو گول سل کی شکل کا تھا، آہستہ آہستہ دیوار سے الگ ہونے لگا۔ اس سے پہلے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ سل نما تودہ یہاں ہے۔ زور لگانے سے یہ باہر کو گر پڑا اور ایک سرنگ کا دہانہ نظر آنے لگا۔

"رانی! اس سرنگ میں داخل ہو جاؤ" — پنڈت نے شکنتلا سے کہا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "تم بھی اندر چلے جاؤ۔ میں مشعل لے کر تمہارے پیچھے آؤں گا" — اُس نے صالح سے پوچھا — "اور تم؟"

صالح نے سر ہلا کر کہا "نہیں" — اور پنڈت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

شکنتلا رانی جھک کر تیزی سے سرنگ میں داخل ہو گئی۔ اُس کے پیچھے طلال بھی اندر چلا گیا۔ پنڈت نے انہیں کہا کہ وہ اندھیرے سے نہ گھبرائیں۔ آگے بڑھتے جائیں۔ صالح کا خیال تھا کہ پنڈت مشعل اٹھا کر اُن کے پیچھے جائے گا مگر پنڈت نے مشعل کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد سرنگ کے اندر بڑی زور کی سرسراہٹ پھر دھماکہ سنائی دی اور اس کے فوراً بعد شکنتلا رانی کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ پنڈت نے صالح کی طرف دیکھا اور اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔ اندر سے طلال کی آواز آئی — "صالح! نکالو یہاں سے مجھے۔"

صالح دوڑ کر آگے بڑھا تو پنڈت نے راستے میں آ کر اُسے روک لیا۔ بولا — "تم نے کہا تھا کہ تمہیں خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ تم یہیں رہو۔ تم جیسے آدمی کو زندہ رہنا چاہیے۔"

سرنگ کے دُور اندر سے شکنتلا رانی اور طلال ابراہیم کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کنوئیں میں چیخ چلا رہے ہوں۔ صالح بروک حیرت زدہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ چپ چاپ پنڈت کو دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے پنڈت سے پوچھا کہ وہ دونوں کیوں چلا رہے ہیں۔ پنڈت نے فرش میں گری ہوئی مشعل اُٹھائی اور صالح سے کہا کہ وہ اُس کے پیچھے رہے۔ وہ خود مشعل آگے کر کے سرنگ میں چلا گیا۔ صالح اُس کے پیچھے گیا۔ پندرہ بیس قدم آگے جا کر پنڈت رُک گیا اور صالح سے کہا کہ وہ اُس کے پہلو میں آ جائے اور اس سے آگے ذرا سا بھی نہ بڑھے۔

پنڈت نے مشعل نیچے کر دی۔

صالح بروک نے آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں ایک کنواں تھا جو دراصل بڑا گہرا گڑھا تھا۔ اس میں سے شکنتلا رانی اور طلال کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو دبتی جا رہی تھیں۔

"چلو۔ اب یہاں سے نکل چلو"— پنڈت نے صالح سے کہا۔

وہ سرنگ سے نکلے تو پنڈت فرش پر بیٹھ گیا اور بولا —"میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ آؤ دوستوں کی طرح باتیں کریں"۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟"— صالح نے پوچھا —"تم نے تو انہیں خزانہ نکالنے کے لیے اندر بھیجا تھا؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو"— پنڈت نے صالح بروک سے پوچھا —"اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم مسلمان ہو اور تم ہندوستان کے مسلمان ہو اور تم غزنی کی فوج کے جاسوس ہو..... کیا میں نے غلط کہا ہے؟"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے"— صالح نے کہا —"اب آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

"جس گہرے گڑھے میں یہ دونوں گرے ہیں ان میں ہندوستان کے سب سے زیادہ زہریلے سانپ ہیں جو ان دونوں کو ختم کر چکے ہیں"— پنڈت نے کہا —"یہ گڑھا میں نے کھدوایا تھا اور اس میں سانپ بھی میں نے ہی چھوڑے تھے۔ اس گڑھے کے اُوپر میں نے سرکنڈے رکھوا کر اوپر مٹی ڈلوا دی تھی۔ اگر یہ دونوں مشعل لے کر جاتے تو بھی گڑھے میں گرتے کیونکہ مٹی انہیں پتہ نہ چلنے دیتی کہ نیچے سرکنڈے اور ان کے نیچے

زہریلی موت ہے۔"

"خزانہ کہاں ہے؟"

"اسی جگہ ہے"— پنڈت نے کہا —"اگر اسی سرنگ سے خزانے تک پہنچنا ہو تو گڑھے پر لکڑی کا تختہ رکھ کر اُس پر چل کے آگے جانا ہو گا۔ ایک راستہ محفوظ بھی ہے۔"

"مجھے راستہ نہ بتاؤ"— صالح نے کہا —"ورنہ میں اپنے راستے سے بھٹک جاؤں گا۔"

"غور سے سنو میرے دوست!"— پنڈت نے کہا —"میں تمہیں بڑے کام کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میں طمع نہیں۔ کہتے ہیں کہ جہاں خزانہ دفن ہوتا ہے وہاں سانپ ضرور ہوتا ہے جو خزانے کی رکھوالی کرتا ہے ..... یہ بالکل غلط ہے۔ کہنے والوں نے یوں کہا تھا کہ خزانہ زہریلے سانپ کی طرح زہریلا ہوتا ہے۔ جس نے خزانہ حاصل کر لیا وہ سانپ بن جاتا ہے۔ وہ اس ڈر سے کہ کوئی اُس سے خزانہ چھین نہ لے وہ ہر کسی کو ڈستا پھرتا ہے۔ میرے دوست! تم ابھی جوان ہو۔ تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ میرا تجربہ ہے کہ جس کے دل میں زر و جواہرات کا پیار پیدا ہوا وہ انسان نہیں رہا۔ اس گڑھے میں جو سانپ ہیں وہ انسان کے گناہ ہیں۔ ان میں ایک کا نام حرص ہے۔ دوسرے کو ہوس کہتے ہیں۔ تیسرے کو ریاکاری کہہ لو۔ ہر سانپ ایک گناہ ہے۔ یہ سارے سانپ انسان کے اردگرد اور پاؤں کے نیچے رینگتے رہتے ہیں۔ انسان مذہب سے منحرف ہو کر جب یہ سوچ لیتا ہے کہ اُسے سونا اور ہیرے مل گئے تو وہ دنیا کو زیر کر لے گا تو وہ عقل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ ذرا سا اشارہ ملنے پر وہ دوڑ پڑتا اور اُس گڑھے میں جا گرتا ہے جہاں اُس کے گناہ اُسے ڈس لیتے ہیں۔ یہ خزانہ میں بھی نکال سکتا تھا۔ میرے سوا اس کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ جس کا یہ خزانہ ہے اُسے بھی معلوم نہیں۔ لیکن جب سے یہ راز میرے سینے میں آیا ہے، میں رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتا ہوں کہ میں گمراہ نہ ہو جاؤں۔"

"اگر تمہارا مذہب سچا ہوتا تو کبھی گمراہ نہ ہوتے"— صالح نے کہا —"مجھے دیکھو۔ تم نے بتا دیا ہے کہ سانپوں والے کنوئیں پر تختہ رکھ کر خزانے تک جا سکتے ہیں مگر مجھے اس خزانے

کا ذرا سا بھی خیال نہیں آرہا۔ میری نظر اپنے فرض پر ہے اور میری ایک بات غور سے سُن لو پنڈت! میں اپنا فرض تم سے پورا کرا دوں گا۔ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اور خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا رکھی ہے کہ اپنے فرض پر خزانے اور اپنی جان قربان کر دوں گا۔ تمہاری جان میری مٹھی میں ہے۔ اگر تم نے مجھے ان سوالوں کے جواب نہ دیئے جو میں پوچھوں گا تو میں تمہیں سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دوں گا۔"

"کیا تم اپنے آپ کو اس قدر بہادر اور عقل مند سمجھتے ہو؟" — پنڈت نے کہا۔

صالح ہنس پڑا مگر اُس کی ہنسی فوراً بجھ گئی۔ پنڈت نے بجلی کی سی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں مشعل لے لی تھی اور اُس کے دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ مشعل کا ڈنڈا تلوار سے زیادہ لمبا تھا۔ پنڈت اتنی تیزی سے اٹھا تھا کہ صالح کو ہلنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

"تمہارے پاس تلوار ہے" — پنڈت نے اُسے للکارا — "آؤ، تم اپنا فرض ادا کرو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔"

صالح بروک تلوار سونت کر اُس کی طرف بڑھا اور اُس نے جب وار کیا تو پنڈت نے جلتی ہوئی مشعل اتنی آگے کر دی کہ صالح کا چہرہ جھلسنے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پنڈت نے چلا کر کہا — "بچو میرے وار سے" — صالح اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت نے کہا — "میں تمہیں لڑنے کا پورا موقع دوں گا۔ اپنا فرض ادا کر لو۔"

صالح بروک نے پینترا بدل کر حملہ کیا مگر پنڈت اس کے ہر وار سے پہلے مشعل آگے کر دیتا تھا۔ صالح نے مشعل پر وار کرنے شروع کر دیئے مگر پنڈت نے ہر وار سے مشعل بچا لی۔ وہ ابھی حملہ نہیں کر رہا تھا۔ صالح وار پہ وار کیے جا رہا تھا۔ اُس کے دو تین وار غار کی دیوار پر پڑے۔ اچانک پنڈت نے اُس پر تابڑ توڑ وار شروع کر دیئے۔ صالح نے ہر وار تلوار پر روکا مگر مشعل اُسے پیچھے ہٹا رہی تھی۔ پنڈت نے ایک وار ایسا کیا کہ صالح کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ تلوار اُٹھانے لگا تو پنڈت کا ایک اور وار بچانے کے لیے بیٹھ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُس کے چہرے کے قریب کی تو صالح پیچھے ہٹا۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ وہ اُس سرنگ

میں چلا گیا ہے جو سانپوں والے کنوئیں تک جاتی ہے۔

"دیکھو تم کہاں ہو" — پنڈت نے کہا۔ "تمہارے پیچھے بھی موت ہے آگے بھی موت ہے۔ کہو زندگی چاہتے ہو یا موت؟"

"میں خزانے کے لیے نہیں مر رہا" — صالح بروک نے کہا۔ "دشمن سے لڑتے ہوئے مر رہا ہوں۔ مجھے یہی موت چاہیئے۔ آگے آؤ پنڈت۔ نہتا لڑوں گا۔"

پنڈت نے ہنس کر کہا — "باہر آجاؤ۔ تم نہیں مرو گے" — اور پنڈت سرنگ سے باہر نکل گیا۔

صالح بروک شکست خوردہ سا ہو کے سرنگ سے باہر آیا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈا زمین میں گاڑ دیا اور تلوار پھینک کر بیٹھ گیا۔ اُسے جیسے خطرہ نہیں تھا کہ صالح اس پر حملہ کرے گا۔

"بیٹھ جاؤ" — اُس نے صالح سے کہا۔

"تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟" — صالح نے باوقار لہجے میں پوچھا — "مجھے دھکیلتے ہوئے سانپوں کے کنوئیں میں کیوں نہ گرنے دیا؟"

"کیونکہ میرے دل نے تمہیں پسند کیا ہے" — پنڈت نے کہا — "تم میری طرح فرض شناس ہو اور تمہارے دل میں اپنے مذہب کا احترام ہے، زر و جواہرات کا لالچ نہیں۔ مجھے جنگ و جدل سے نفرت ہے۔ میں مذہب کا پرستار ہوں لیکن سپاہی ہوں۔ تم نے دیکھ لیا ہے ... تم نے جس طرح خزانے کو ٹھکرایا ہے اس کا میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔"

"اگر تم مجھے انعام دینا چاہتے ہو تو وہ چیز دو جو میں مانگوں" — صالح نے کہا — "مجھے اس خزانے میں سے ذرا سا بھی انعام نہیں چاہیئے جو تم نے یہاں چھپا رکھا ہے۔"

"بولو کیا مانگتے ہو؟" — پنڈت نے کہا۔

"قنوج کی فوج سلطان محمود سے کہاں لڑے گی؟" — صالح نے پوچھا — "قلعے میں محصور ہو کر یا باہر آکر؟"

"سنو میرے مسلمان دوست!" — پنڈت نے کہا — "ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مجھے تمہیں ایسی کوئی بات نہیں بتانی چاہیئے جو میرے ملک کے نقصان کا اور سلطان محمود کی فتح کا باعث بنے لیکن میں صرف اس لیے تمہیں کام کی ایک بات بتا دیتا ہوں کہ تم ایمان اور اخلاق کے پکے ہو اور تمہیں اپنے فرض کے ساتھ پیار ہے۔ میں تمہیں بہت بڑا انعام دے رہا ہوں۔ یہیں سے واپس چلے جاؤ اور اپنے سلطان سے کہنا کہ قنوج کا رُخ نہ کرے۔ ہمارا مہاراجہ عہد کر چکا ہے کہ وہ سلطان کو قنوج میں زندہ جلائے گا اور وہ گنگا اور جمنا کے درمیان کا یہ علاقہ غزنی کی فوج کا قبرستان بنا دے گا۔"

"کیا تمہارے مہاراجہ کے پاس اتنی طاقتور فوج ہے؟" صالح بروک نے پوچھا۔

"جب کوئی فوج اپنے دشمن کو فنا کرنے کا تہیہ کر لیتی ہے تو وہ اپنی طاقت اور تعداد کو نہیں دیکھا کرتی" — پنڈت نے کہا — "قنوج کی فوج کا ہر ایک سپاہی غزنی کے سلطان سے ہر اُس مندر کی توہین کا انتقام لینے کے لیے تیار ہو چکا ہے جو اُس نے یہاں آکر اجاڑا ہے ... لیکن میرے دوست! مہاراجہ قنوج اکیلا نہیں۔ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نند کی فوج بھی پہنچ گئی ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا" — پنڈت نے کہا — "میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنے سلطان کو جا کر خبردار کر دو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں انعام دے گا۔ اُسے بتاؤ کہ اس جنگل میں اُس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ اُس کی فوج کا وہی انجام ہوگا جو مہابن کی فوج کا اُس کی فوج کے ہاتھوں ہوا تھا۔ مہابن کی فوج جمنا میں ڈوب گئی تھی۔ اب غزنی کی فوج کو اس دریا میں ڈوبنا ہے۔ بھیم پال نند کی فوج کے علاوہ یہاں ایک فوج اور بھی ہے۔ یہ متھرا، بلند شہر، مہابن وغیرہ کی شکست خوردہ فوجوں کے بھاگے ہوئے سپاہی ہیں جو قنوج میں آئے تو ان کی ایک فوج بنالی گئی۔ یہ لوگ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ تمہارے سلطان کو قنوج کے محاصرے کا موقع ہی نہیں ملے گا... اور میرے دوست! حقیقت یہ ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کا مقابلہ کہیں بھی نہیں ہوا اگر

اب اُس کی اپنی فوج مقابلے کے قابل نہیں رہی۔ ہمارے مہاراجوں نے اُسے موقع دیا ہے کہ وہ قنوج کے جال تک آجائے۔ وہ آرہا ہے۔ جاؤ اور اُسے روک دو۔ اُسے کہو کہ انسانوں کا ناحق خون بہانے اور پردیسی سپاہیوں کو یہاں لا کر مروانے سے باز آجاؤ اور یہاں زندہ جلنے کی بجائے غزنی جا کر بادشاہوں کی طرح مرو۔"

وہ باہر نکل آئے۔ باہر دو گھوڑے کھڑے تھے۔ پنڈت نے صالح بروک سے کہا کہ ایک گھوڑا شکنتلا رانی کا ہے جو اندر مری پڑی ہے اس لیے یہ گھوڑا صالح لے جائے۔

اگلے روز پنڈت مہاراجہ قنوج راجیا پال کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے مہاراجہ کو بتایا کہ اُس کی چہیتی رانی شکنتلا کو غزنی کھا گیا ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے اُس کی کالی کی موت کا واقعہ سنایا۔ مہاراجہ پر جیسے اس کا کچھ اثر نہ ہوا ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اُس نے پنڈت کو خراج تحسین پیش کیا۔

"میں نے ایک اور کارنامہ کر دکھایا ہے" — پنڈت نے مہاراجہ سے کہا — "رانی کے ساتھ غزنی کے ایک جاسوس کو بھی سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور ایک اور جاسوس کو دھوکہ دے کر زندہ رکھا اور یہ بتا کر واپس جانے دیا ہے کہ اپنے سلطان سے کہہ دے کہ قنوج کا رُخ نہ کرے" — پنڈت نے صالح بروک کو جو کچھ بتایا تھا وہ مہاراجہ راجیا پال کو سنا دیا اور کہا — "میں نے آپ کی عزت کی خاطر، آپ کو فتح دلانے کی خاطر اور اس مندر کی عزت کی خاطر جھوٹ بولا ہے۔ میرے جھوٹ کو سچ ثابت کر دیں۔ غزنی کو ذہن سے اُتار دیں۔ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ میں نے سلطان محمود پر دہشت طاری کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ اپنی کچھ فوج باہر بھیج دیں۔ لڑیں، مہاراج! لڑیں۔"

"مہاراج!" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "آپ نے سلطان محمود کو اس کے ایک جاسوس کے ذریعے یہ غلط اطلاع دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے" — اُس نے وہی خط جو بھیم پال نند نے رائے چندرا کو لکھا اور رائے چندر نے راجیا پال کو بھیج دیا تھا، پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت خط پڑھ چکا تو مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "یہ اُس

بھیم پال کا خط ہے جو اپنے آپ کو نندہ کہلاتا ہے۔ وہ انہی علاقوں میں ہے۔ اُس کا بیٹا ترلوچن پال بھی یہیں ہے مگر وہ ہمیں فوجی مدد دینے کی بجائے غزنی کے سلطان کے خلاف اُکسا رہے ہیں اور ڈرا بھی رہے ہیں۔"

"اس خط سے نہ ڈریں مہاراج!" — پنڈت نے کہا۔

"اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔" مہاراجہ قنوج نے کہا — "تم نے محمود کو جھوٹی اطلاع بھجوا دی ہے کہ گنگا اور جمنا کے درمیان اُس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ اب دیکھنا وہ اپنی فوج کو یہاں کس ترتیب سے لائے گا۔ وہ کوچ کی ترتیب میں نہیں آئے گا۔ اُس کی فوج کے بازو پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اُس کی پوری فوج آگے نہیں آئے گی۔ آپ نہیں جانتے پنڈت جی مہاراج! سلطان محمود وہ چیتا ہے جس کی موجودگی کا آپ کو اُس وقت پتہ چلتا ہے جب آپ کی گردن اُس کے دانتوں میں آ چکی ہوتی ہے اور اُس کے پنجے آپ کے جسم میں اُتر چکے ہوتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ اُس نے درخت پر سے حملہ کیا ہے یا گھاس میں سے۔"

مہاراجہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُسے بتایا گیا کہ قاصد آیا ہے۔ مہاراجہ نے اُسے فوراً بلا لیا۔ قاصد نے اطلاع دی کہ سلطان محمود مُنج کو محاصرے میں لے رہا ہے۔

"کیا ایسا امکان ہے کہ ہم پیچھے سے محاصرے پر حملہ کریں تو مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟" — مہاراجہ نے پوچھا۔

"نہیں" — قاصد نے کہا — "مسلمانوں کی فوج کا ایک حصہ مُنج کو محاصرے میں لے رہا ہے اور اُس کے بہت سے گھوڑسوار دستے قنوج اور مُنج کے درمیانی علاقے میں اس حالت میں خیمہ زن ہو گئے ہیں کہ انہوں نے خیمے نہیں گاڑے، وہ پڑاؤ کیے ہوئے ہیں لیکن تیاری کی حالت میں ہیں۔ ہر سوار رات کو اپنے گھوڑے کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جنگلی لوگوں کے بھیس میں دیکھا ہے کہ مسلمان فوج کے آدمی دور دور تک گشت کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے اونچے درختوں اور اونچی چٹانوں پر بھی غزنی کے فوجی دیکھے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر اپنی فوج مُنج کی مدد کے لیے بھیجیں تو غزنی والے

اسے راستے میں ہی روک لیں گے۔" مہاراجہ قنوج نے کہا۔

"مجھے بتلایا گیا ہے کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ مُنج کی طرف اپنی فوج کو بھیجنے کی کوشش نہ کریں۔" قاصد نے کہا۔

"سُن لیا آپ نے پنڈت جی مہاراج!" — مہاراجہ نے کہا اور اپنی فوج کے کمانڈروں کو بُلا لیا۔ وہ آئے تو مہاراجہ نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا — "اگر آپ قنوج کو بچانا چاہتے ہیں تو دیکھیں کہ مُنج کے راجپوت لڑتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اگر وہ محاصرے میں جم جائیں اور باہر آ کر لڑنے کی کوشش کریں تو انہیں مدد دو۔ اگر نہیں تو قنوج کو بچانے کی کوشش کرو۔"

دسمبر ۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے مُنج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ مُنج کے راجپوت اپنی آن پر جان دینے والے جنگجو ہیں اور انہیں تہِ تیغ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اُس نے جو محاصرہ کیا وہ سطحی تھا۔ قلعے کے پیچھے دریائے جمنا تھا۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ محاصرے پر قنوج کی فوج حملہ کرے گی۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج کے بہت سے سوار دستے قنوج اور مُنج کے درمیان پھیلا دیئے تھے۔

اُس نے جب سطحی محاصرہ مکمل کر لیا تو صابح بروک وہ غلط اطلاع لے کر پہنچ گیا جو اُسے قنوج کے پنڈت نے دی تھی۔ سلطان محمود کو بتایا گیا کہ ایک جاسوس یہ اطلاع لایا ہے۔ سلطان نے اُسی وقت متھرا کو ایک قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ جو فوج وہ متھرا چھوڑ آیا ہے اُس کے آدھے دستے فوراً مُنج آ جائیں اور تمام ہاتھی ساتھ بھیجے جائیں۔ اُس وقت تک اُس کے پاس کم و بیش ساڑھے تین سو جنگی ہاتھی تھے۔

جب یہ کمک آ گئی تو سلطان محمود نے انہیں اُن دستوں سے بھی آگے قنوج کی طرف بھیج دیا جو قنوج اور مُنج کے درمیان تیاری کی حالت میں موجود تھے۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملوں میں مُنج کے محاصرے کا ذکر نہیں ملتا۔ تفصیلات میں جائیں تو تھوڑا سا ذکر آ جاتا ہے لیکن مُنج کے محاصرے اور معرکے میں سلطان محمود کو اس قدر زور صرف کرنا پڑا تھا جو متھرا، بلند شہر، مہابن اور آسی کی فتوحات کو ملا کر بھی صرف نہیں

ہُوا تھا۔ مُنج کے راجپوتوں کا یہ عالم تھا کہ فوجی اور شہری میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ نوعمر لڑکے بھی اپنے شہر کو بچانے کے لیے نکل آئے تھے۔

مشہور مورخ عُطبی نے مُنج کے راجپوتوں کے متعلق لکھا ہے — "وہ بے مہار اور خودسر اونٹوں کی طرح اور ہار نہ ماننے والے شیطانوں کی طرح لڑے۔"

سلطان محمود محاصرے کی کمان خود کر رہا تھا۔ وہ جدھر سے اپنے جیش دروازے توڑنے کے لیے یا دیوار میں کہیں سرنگ لگانے کے لیے آگے بھیجتا تھا، اُن پر تیروں اور برچھیوں کی بوچھاڑیں آنے لگتی تھیں۔ غزنی کے تیراندازوں نے آگے بڑھ کر قلعے کی دیواروں سے تیر اور برچھیاں برسانے والوں پر اتنی ہی تعداد اور شدت سے تیر چلائے لیکن راجپوت تیر کھا کر زخمی ہوتے اور گرتے تھے اور اُن کی جگہ فوراً دوسرے آدمیوں سے پُر ہو جاتی تھی۔ قلعے کی دیواروں سے یہ للکار بار بار سنائی دیتی تھی "محمود! واپس چلے جاؤ۔ مسلمانو! تم اپنے قبرستان میں آئے ہو" — اور اس للکار کے ساتھ گالی گلوچ بھی سنائی دے رہی تھی۔

"یہ قلعہ آسانی سے نہیں ٹوٹے گا" — سلطان محمود نے کہا "ہمیں کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

محاصرے کا پہلا دن گذر گیا اور سلطان محمود کی فوج کو خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ قلعے کے اندر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اور بچے بھی تیر کمانوں، برچھیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ شہری رائے چندا کے محل کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ انہیں باہر جا کر مسلمان فوج پر حملے کی اجازت دی جائے۔ رائے چندا ایسا اناڑی نہیں تھا۔ وہ شہریوں کو نہ قلعے کی دیواروں پر جانے دے رہا تھا نہ انہیں باہر نکلنے کی اجازت دے رہا تھا۔

"لڑائی اس جوش سے نہیں لڑی جاتی جس میں عقل نہ ہو" رائے چندا نے اپنے ہزارہا شہریوں سے کہا۔ "مُنج کو آخر تم ہی بچاؤ گے۔ تم نہیں جانتے کہ غزنی کی فوج چوروں اور ڈاکوؤں کا گروہ نہیں۔ یہ ایسی فوج ہے جس کے آگے قلعے کانپ کانپ کر گرتے جاتے ہیں۔ تمہاری فوج قلعے کو بچا رہی ہے۔ اگر دشمن اندر آ گیا تو مُنج کی آبرو تمہارے ہاتھ میں

ہوگی۔ ہم مُنج اپنے دشمن کو اس طرح نہیں دیں گے جس طرح اُن بزدلوں نے متھرا اُسے دے دیا اور ہری کشن واسدیو کا ہتیا چار کرایا ہے۔"

ہجوم گرجنے لگا "ہم انتقام لیں گے ..... ہمیں باہر جانے دو۔"

رائے چندا نے ہجوم میں سے بہت سے جوان آدمی الگ کر لیے اور یہ بتا کر کہ انہیں جان کی بازی لگانی ہے، اپنے ساتھ رکھ لیا۔

رائے چندا کے محل کی عورتیں بھی مسلح ہو گئی تھیں اور وہ شہر کی عورتوں کو لڑنے مرنے کے لیے منظم کر رہی تھیں۔ صرف ایک عورت تھی جو خاک و خون کے اس ہنگامے سے لاتعلق تھی۔ وہ رائے چندا کی بیٹی رادھا تھی۔ پہلے سُنایا جا چکا ہے کہ رادھا اور رائے چندا کی بہن شیلا مہاراجہ قنوج کے بیٹے بھیم پال کے ساتھ سلطان محمود کو متھرا میں قتل کرنے کے لیے گئی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اپنے غیر معمولی حُسن و جوانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے گئی تھیں۔ وہ ایک خیالی جنگلی قبیلے کے لباس میں تھیں جس میں وہ نیم عُریاں تھیں۔

اس طرح ان کے حُسن کی دلکشی اور زیادہ طلسماتی اور خطرناک ہو گئی تھی مگر راستے میں ایک گرمچھ نے شیلا کو نگل لیا۔ رادھا نے شیلا کو گرمچھ کے منہ میں اس طرح دیکھا کہ شیلا کا ایک بازو، چہرے کا کچھ حصہ اور ریشم کے تاروں جیسے بال نظر آ رہے تھے۔

پھر یوں ہُوا کہ متھرا میں مقیم غزنی کی فوج کا ایک نائب سالار دو کمانداروں کے ساتھ اس علاقے میں گشت پر آ نکلا۔ اُس نے بھیم پال اور رادھا کو پکڑ لیا اور دونوں کو متھرا لے گیا۔ رادھا جیسی نوجوان، دلکش اور نیم عُریاں لڑکی کیسے توقع رکھ سکتی تھی کہ نائب سالار اور دو کماندار اُسے بیٹی کا درجہ دیں گے۔ پھر وہ متھرا، اس تلخ سوچ میں پہنچی تھی کہ دل میں وہ نہ جانے کیسے وحشی آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے گی اور نہ جانے اس کا انجام کیسا بھیانک ہوگا۔ اُسے غزنی کے مسلمانوں کے متعلق بچپن سے یہی کچھ بتایا جاتا رہا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے وحشی اور مردوں کے لیے آدم خور ہوتے ہیں۔

رادھا نے کبھی مسلمان نہیں دیکھا تھا۔ اس خطے میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ سلطان محمود مندروں کے بُت توڑ کر پھینک دیتا اور مندر اجاڑ دیتا ہے تو رادھا کو یقین آ گیا تھا کہ مسلمان واقعی جنگلوں اور غاروں میں رہنے والی کوئی قوم ہے

جس کے ہاں مذہب کا وجود ہی نہیں وہ صرف ہندومت کو مذہب سمجھتی تھی اور وہ عزت اور آبرو کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی جانتی تھی لیکن اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے وہ اپنی آبرو کو ایک جائز ذریعہ سمجھتی تھی اگر وہ جب مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو کسی نے اسے اتنا بھی نہ کہا کہ تم بہت خوبصورت لڑکی ہو۔ نائب سالار اور کمانداروں نے متھرا تک کے ایک دن اور آدھی رات تک کے سفر میں اُسے ایک قیدی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُس کے ساتھی، قنوج کے راجکمار کھیمن پال نے نائب سالار کو سونے کے وہ تمام سکے پیش کیے تھے جو اُس کے پاس تھے لیکن نائب سالار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

اور جب رادھا اور راجکمار کو سلطان محمود کے سامنے لے گئے تھے تو سلطان کا چہرہ دیکھ کر رادھا کے دل میں نفرت کا طوفان اُٹھ آیا تھا۔ اُسے کسی اور سلوک کی توقع تھی لیکن سلطان نے اُسے کہا تھا — "ہم اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں ہم غیرت مند دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں" — اور رادھا کو سلطان کے یہ الفاظ آج جب اس نے منج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا تھا، بہت یاد آ رہے تھے۔ "مجھے قتل کرنے کی تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تمہارے دیوتا کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔"

اس کے بعد سلطان محمود نے حکم دیا تھا — "ان دونوں (رادھا اور کھیمن) کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ آؤ۔ انہیں عزت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے خنجر انہیں دے دو۔"

سلطان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں کو شاہی مہمانوں کی طرح اُن کے شہروں کے مضافات میں چھوڑ آئے تھے۔

رادھا نے اپنے باپ رائے چندر کو کسی اور جذبے سے بتایا تھا کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو قتل نہیں کر سکی اور پکڑی گئی تھی اور مسلمانوں نے اور اُن کے سلطان نے اُسے بیٹی کا درجہ دے کر عزت سے واپس کر دیا ہے۔ اُس نے باپ کو وہ تمام باتیں

بتائی تھیں جو سلطان محمود نے اُسے اور کھیمن پال سے کہی تھیں مگر اُس کا باپ اُس کے تاثر کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اُس نے کہا تھا — "ہم اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔"

رادھا راجکماری تھی، معمولی لڑکی نہیں تھی مگر وہ ایسے محسوس کرنے لگی جیسے آسمان سے گر کر زمین پر آ پڑی ہو۔ وہ بہت شوخ اور بڑی ہی دلیر لڑکی تھی مگر اُس پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ راج محل میں، راج دربار میں اور فوجی حلقوں میں اب منج کے دفاع اور سلطان محمود کو شکست دینے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ غزنی کی فوج کسی بھی روز متوقع تھی۔ رائے چندر لڑائی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مندروں میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی تھی اور لوگوں کو بڑی خونریز جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ عورتوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ رائے چندر کی داشتاؤں نے بھی لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ صرف رادھا تھی جو ان سرگرمیوں سے الگ تھلگ چپ چاپ لیٹی رہتی یا قلعے کی دیوار پر جا کر متھرا کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

ایک روز وہ دیوار پر کھڑی اُفق پر نظریں گاڑے ہوئے تھی کہ اُس نے اپنے آپ سے کہا — "وہ اُدھر سے آئیں گے۔ معلوم نہیں کب آئیں گے؟"

"کون آئیں گے؟" — اُس کے قریب سے کسی نے پوچھا۔

"مسلمان" — اُس نے کہا۔ "غزنی والے" — اور وہ چونک کر چپ ہو گئی۔

اُس نے دیکھا۔ اُس کے پاس ایک رشی کھڑا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہی تھی۔ رشی کے رتبے اور درجے سے واقف تھی۔ وہ بڑے مندر کے پنڈت کے درجے کا آدمی تھا۔ اپنے مذہب کا عالم ہونے کے علاوہ علیل روحوں کا علاج اپنے کسی خاص عمل سے کرتا تھا۔ آسیب اور بدروحوں سے نجات دلاتا تھا۔ پنڈت بھی اُسے جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے مگر اُسے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر رادھا کو غصہ آ گیا۔

"کیا راجکماری مسلمانوں کا انتظار کر رہی ہے؟" — رشی نے پوچھا۔

"میری تنہائی میں آپ نے کیوں آ دخل دیا ہے؟" — رادھا نے غصے کو دباتے

ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہماری راجکماری کی روح پر ایسا آسیب سوار ہو گیا ہے جو ہمارے سوا کوئی نہیں نکال سکتا"۔۔۔ رشی نے کہا۔۔۔ "مجھے مہاراج (رائے چند) نے کہا ہے کہ جب سے آپ متھرا سے آئی ہیں، آپ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں راجکماری! مسلمان بھیڑیے ہیں۔ ماس کھانے کو یہاں آجاتے ہیں۔ آپ کتنا ہی پردہ کیوں نہ ڈالیں، میں جانتا ہوں کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ سونے، ہیروں اور عورتوں کے بھوکے ہیں۔ انہی کی تلاش میں آتے ہیں"۔

"یہ جھوٹ ہے"۔۔۔ رادھا نے بھڑک کر کہا۔ "انہوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو آپ بتا رہے ہیں۔ وہ عورتوں کے شکاری نہیں۔ میں نے غزنی کے سلطان کے دربار میں ایک بھی عورت نہیں دیکھی۔ عورتیں میرے باپ جیسے مہاراجوں کے درباروں میں ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے جوان اور خوبصورت لڑکیاں کھڑی مورچھل ہلاتی رہتی ہیں۔ ان کی خدمت گار جوان لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں سُلاتی اور لڑکیاں جگاتی ہیں۔ مسلمان بھیڑیے نہیں، انسان ہیں۔ انہوں نے ہمارا دیا ہوا سونا بھی ٹھکرا دیا تھا"۔

رشی دانشمند آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو روکنے ٹوکنے کی بجائے اُس کے ساتھ پیار سے ایسی باتیں کیں کہ اُس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور اُس کے دل پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی باتوں کا اثر تھا کہ وہ رشی کے ساتھ چل پڑی۔

رشی ہر روز رادھا کے پاس جانے لگا۔ بہت دیر اُس کے پاس بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ رادھا پر واقعی مسلمانوں کا آسیب سوار ہو گیا ہے اور اُس کے ساتھ ایک دہشت ہے جو اُس کے ذہن کو گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ رادھا نے رشی کو یہ دہشت تفصیل سے بتائی۔ وہ ہر رات خواب میں ایک مگرمچھ دیکھتی تھی جس کے منہ میں شیلا ہوتی تھی اور مگرمچھ کے منہ سے خون ٹپک رہا ہوتا تھا۔ رادھا ڈر کر جاگ اٹھتی تھی اور اس کا جسم سردی کے باوجود پسینے میں نہا

جاتا تھا۔

رشی اُس کی یہ دہشت باتوں سے ہی دور کر سکتا تھا۔ وہ اس کوشش میں مصروف رہا مگر رادھا کی جسمانی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا باپ رائے چند! جنگ کی تیاری کی وجہ سے ذاتی طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اُس نے راجکماری کے علاج کا حکم دے دیا تھا۔ رشی کے علاوہ نامی گرامی وید اُس کا علاج کر رہے تھے مگر اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اُس نے دوائیاں کھانے سے انکار کر دیا اور رشی کو اُس نے ہمراز بنا لیا۔

"رشی جی!"۔۔۔ ایک روز رادھا نے اُسے کہا۔ "مسلمانوں کے سلطان نے مجھے کہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی تمہارے دیوتا کرشن واسدیو اور برہما دیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔۔۔ میں نے اُس کا ہر ایک لفظ سچا دیکھا ہے۔ کیا وہ مگرمچھ مسلمانوں کا خدا ہے جس نے راستے میں آکر شیلا کو کھا لیا تھا اور ہمارے دو آدمی معلوم نہیں کس کے تیروں سے مر گئے اور ہم پکڑے گئے؟ ۔۔۔ میں نے ہری کرشن کی جنم بھومی کو اُجڑا ہوا دیکھا ہے۔ بت ٹوٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ یہی ہیں نا ہمارے دیوتا اور ہمارے بھگوان! اگر ان میں کوئی طاقت ہوتی تو مسلمان فنا ہو چکے ہوتے"۔

رشی نے اُسے ہندومت کی کرامات کا قائل کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور اپنے مذہب کی وہ روایتیں سنائیں جنہیں انسانی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ ان کے مقابلے میں اُس نے مسلمانوں کو جھوٹا اور لٹیرا کہا اور اسلام کو بے بنیاد مذہب قرار دینے کی پوری کوشش کر ڈالی۔

"مگر میں نے جو دیکھا ہے اسے میں کس طرح جھٹلا سکتی ہوں؟"۔۔۔ رادھا نے کہا۔۔۔ "کھیمن پال میرے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے مسلمانوں کی فتح کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان میں عورت اور شراب نہیں دیکھی۔ ہم وہاں سے صبح کے وقت چلے تھے۔ مجھے اور کھیمن کو انہوں نے بہت سویرے جگا دیا تھا۔ باہر ابھی دھندلکا گہرا تھا۔ کسی انسان کی بڑی ہی سُریلی آواز اُبھری جس کا اثر میرے دل پر ہونے لگا۔ میں نے اپنے پہرہ دار سے پوچھا کہ یہ کونسی غزنی کی زبان

میں گا رہا ہے؟ اُس نے بتایا کہ یہ اذان ہے۔ یہ ہمارے خدا کے الفاظ ہیں۔ میں ایک بھی لفظ نہ سمجھ سکی مگر اس آواز نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ متھرا میں مسلمانوں کی جتنی فوج تھی ایک میدان میں صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ ایک آدمی ان کے آگے کھڑا ہو گیا اور وہ کبھی جھکتے کبھی ماتھے زمین سے لگا لیتے۔ پہرہ دار نے مجھے بتایا کہ یہ ان کی عبادت ہے۔ رشی جی! عبادت کا یہ طریقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے پہرہ دار سے پوچھا کہ یہ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان کے سامنے کوئی بت نہیں، کوئی مورتی نہیں .... پہرہ دار نے کہا کہ ہم جس کی عبادت کرتے ہیں وہ ہمارے دلوں میں ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے وہ خدا ہے۔ اُس نے ہمیں فتح دی ہے۔ ہم جب اُس کی عبادت سے منہ پھیر لیں گے اور اُس کے احکام نہیں مانیں گے تو ہم ہر میدان میں شکست کھائیں گے۔"

رشی سُن سُن کر بے چین ہوتا جا رہا تھا اور رادھا بولے جا رہی تھی — "میں نے پہرہ دار سے پوچھا کہ تمہارا سلطان تو عبادت نہیں کرتا ہو گا۔ وہ تو سلطان ہے۔ پہرہ دار نے کہا کہ سُلطان عبادت میں موجود ہے۔ وہ سپاہیوں میں کہیں پیچھے ہو گا۔ وہ سپاہیوں کی طرح خدا کے آگے جھکتا اور سجدہ کرتا ہے۔ عبادت کے وقت وہ سلطان نہیں ہوتا.... رشی جی! ہمارے پتا جی مہاراج کبھی مندر میں جاتے ہیں تو مندر سے سب کو نکال دیا جاتا ہے.... سچا کون ہے رشی جی؟ کیا ہمارا خدا نہیں ہوتا؟"

رشی نے بتانا شروع کیا کہ ہندومت میں خدا کا تصور کیا ہے لیکن رادھا نے اُسے روک دیا اور بولی— "کیا مگر کچھ خدا ہے؟ .... نہیں۔ مگر مجھے ہر رات ڈر لگتا ہے میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے۔"

"مہاراج!"— رشی نے رائے چندا سے کہا— "راجکماری پاگل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے متھرا میں مسلمانوں نے اسے کوئی ایسی چیز پلا دی ہے جس کا اثر ابھی کم نہیں اُترا۔ یہ بیماری میرے علم اور میرے عمل سے باہر ہے۔ وہ اپنے مذہب سے منحرف ہو چکی ہے۔ اب تو وہ کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی ہے۔ بعض اوقات بولتے بولتے چپ ہو جاتی ہے اور بڑی زور سے چیخ مار کر اپنے چہرے کو ہاتھوں سے یا کپڑے سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اکثر یہی رٹ لگائے رکھتی ہے— 'میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے'— یہ مسلمانوں کا اثر ہے۔"

"اسے اسی حال میں رہنے دو"— رائے چندا نے کہا— "میں سلطان محمود کا سر کاٹ کر اس کے سامنے رکھوں گا تو اس کے دل سے مسلمانوں کا خدا نکل جائے گا۔ مجھے ابھی کوئی فرصت نہیں رشی جی! غزنی کی فوج بہت قریب آ گئی ہے۔"

اگلے ہی روز غزنی کی فوج نے منج کو محاصرے میں لینا شروع کر دیا اور پھر راجکماری رادھا کی کسی کو ہوش اور فکر ہی نہ رہی مگر رادھا کے کان میں جب یہ خبر پڑی کہ اس کا قلعہ محاصرے میں آ گیا ہے تو اس نے اٹھ کر بازو پھیلا دیئے اور بلند آواز سے بولی — "وہ آ گئے ہیں۔ سلطان آ گیا ہے۔ دروازے کھول دو۔ میری عزت اور غیرت کے رکھوالے آ گئے ہیں۔"

اس وقت ایک وید اور دو خدمت گار عورتیں وہاں موجود تھیں۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیئے۔ رادھا باہر کو دوڑی تو اُسے پکڑ لیا گیا۔ رائے چندا وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس کی ماں کو بلایا گیا۔ وہ بھی محاصرے کی وجہ سے گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو وید سے کہا کہ اسے کوئی ایسی دوائی دے دو جو اسے بے ہوش کر دے، پھر جوں ہی ہوش میں آئے اسے پھر بے ہوش کر دیا جائے۔

رادھا کو پکڑ لیا گیا اور وید نے اُس کے منہ میں دوائی ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد رادھا کا جسم بے حس ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

محاصرے کا پہلا دن گزر گیا۔ سلطان محمود نے رات کو بھی آرام نہ کیا۔ وہ قلعے کے پیچھے چلا گیا جدھر دریا تھا۔ پانی قلعے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بہتا تھا۔ سلطان نے اپنے سالاروں سے کہا کہ ہر پیادہ دستے سے دو دو چار چار جانباز قسم کے سپاہی منتخب کریں اور ان کا ایک الگ جیش بنا کر اسے محفوظہ (ریزرو) میں بھیج دیا جائے۔

دوسرے دن غزنی کی فوج نے ایک بار پھر قلعے کے بڑے دروازے پر حملہ بولا مگر اوپر سے راجپوتوں نے تیر اور برچھیاں پھینک کر غزنی والوں کو بہت نقصان پہنچایا مگر

سلطان محمود نے حملے جاری رکھے۔ قلعہ ڈیڑھ میل لمبا تھا۔ سات روز تک غزنی کی فوج نے پورا زور صرف کر دیا مگر ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آٹھویں روز کی شام گہری ہو چکی تھی۔ سلطان نے اس جانباز جیش کو ساتھ لیا جو اس نے تیار کروایا تھا۔ اس کی نفری تین سو سے کچھ زیادہ تھی۔

"غزنی اور اسلام کی آبرو تم سے جان کی قربانی مانگ رہی ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے رات کی تاریکی میں اس جیش کے جوانوں سے کہا۔۔۔ "اگر تم میں سے کوئی بھی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تو اسے اجازت ہے کہ اپنے دستے میں واپس چلا جائے۔ مجھے تم میں سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلے گا کہ کون چلا گیا ہے۔ میرے مجاہدو! خدا کے سوا آج کی رات تمہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ روزِ محشر بھی تمہیں صرف خدا پہچانے گا"۔۔۔ سلطان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔۔۔ "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم سب میرے ساتھ ہو؟"

کئی آوازیں سنائی دیں۔۔۔ "ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔۔۔۔ ہم جانیں قربان کرنے کے لیے آپ کے ساتھ آئے ہیں۔۔۔۔ ہم سلطان کے حکم کے منتظر ہیں"۔

"آج رات تم خدا کے حکم سے لڑو گے"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔۔۔ "آج تمہیں اس کفرستان میں خدا کا نام بلند کرنا ہے۔۔۔۔ اس قلعے کی ایک دیوار دریا میں ہے۔ تمہیں نقب لگانے اور سرنگ کھودنے والے اوزار دیئے جا رہے ہیں۔ تم میں سے پچاس آدمی دریا میں اتر کر دیوار کو نیچے سے توڑیں گے۔ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اس موسم میں پانی گہرا نہیں ہوا کرتا۔ ٹھنڈا ہوتا ہے، اور جو تیرنا نہیں جانتا وہ دریا میں نہ اترے۔ خطرہ یہ ہے کہ دشمن نے تمہیں دیکھ لیا تو اوپر سے تیروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دے گا۔ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گا کہ قلعے کی دیوار کتنی چوڑی ہو گی۔ اگر تم نے دیوار کی نصف چوڑائی میں سرنگ لگا لی تو باقی کام آسانی کر لے گا"۔

سلطان محمود نے پچاس جانباز الگ کر لیے۔ لڑائی کا زور تھم گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے فضا تیروں سے خالی ہو گئی تھی۔ قلعے کی دیواروں پر اور برجوں میں کچھ سرگرمی تھی۔ سلطان محمود قلعے سے تقریباً پون میل دور تھا۔ اس نے جانبازوں کو خدا حافظ کہا

اور انہیں ہدایات دے کر دریا کے کنارے کنارے قلعے کی طرف روانہ کر دیا۔

راجپوتوں کو دریا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ غزنی کے پچاس جانباز بہت بڑا خطرہ بن کر دریا کی طرف سے سرنگ لگانے جا رہے تھے۔ وہ اونچی گھاس اور درختوں کی اوٹ میں چلتے چلتے دیوار سے کچھ دور سے ہی دریا میں اتر گئے۔ ان کے پاس اوزاروں کے علاوہ ہتھیار بھی تھے۔ دریا کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور کنارے کے ساتھ ساتھ کمر تک گہرا تھا۔ ذرا پرے زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ جانباز ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے پانی میں چلتے جا رہے تھے۔

وہ دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ یہ دیوار عمودی نہیں، کچھ ڈھلانی تھی۔ اس سے راجپوتوں کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ نیچے دیکھ سکتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر اندھیرے میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پچاس جانبازوں نے پانی میں کھڑے ہو کر اوزاروں سے دیوار کے پتھر نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ کام خاموشی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اوزاروں کی آواز اوپر دیوار تک جاتی تھی۔ سلطان محمود نے اس آواز کو دبانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ دریا کی دیوار کے ساتھ والی دیوار کی طرف اس کے حکم سے دف اور نقارے بجائے جانے لگے۔ نفیریاں بجنے لگیں اور سپاہیوں نے نعرے لگانے اور غل غپاڑہ بپا کرنا شروع کر دیا۔ دیوار کے اوپر راجپوت اس طرف اکٹھے ہو گئے۔ یہ غل غپاڑہ بجنے کا ہی ہو سکتا تھا۔

جانباز اطمینان سے پتھر نکالتے رہے۔ انہوں نے اتنے پتھر نکال لیے کہ آگے دیوار کی مٹی آ گئی۔ اس کی کھدائی مشکل نہیں تھی۔ مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ دریا بھی سرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔ سرنگ فراخ اور بلند تھی۔ پچاس آدمی کھدائی کر رہے تھے اس لیے کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ آگے پھر پتھر آ گئے۔ جانبازوں کے پاس بڑے مضبوط اور موزوں اوزار تھے۔ ان سے پتھر نکلتے آ رہے تھے۔ سرنگ کم و بیش پندرہ قدم لمبی ہو گئی تھی۔ آخر وہ پتھر دیوار سے ہٹا جس کے ہٹنے سے قلعے کے اندر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جانبازوں نے تیزی سے بہت سے پتھر نکال دیئے اور وہاں اتنا بڑا

دہانہ بن گیا جس میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر گزر سکتا تھا۔ دریا کا پانی قلعے کے اندر جانے لگا۔

قلعے میں کسی نے پانی دیکھ لیا اور اُس نے شور مچا دیا۔ جانباز اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ پیچھے کو چل پڑے مگر راجپوت بھی جانباز تھے۔ وہ مشعلیں اٹھائے دوڑے آئے۔ بہت سے برچھیوں اور تلواروں کے ساتھ آئے۔ غزنی کے جانباز تیرکی سے باہر نکل آئے۔ راجپوت ان کے پیچھے آئے۔ دریا میں خونریز معرکہ لڑا گیا۔ اندر سے کئی مشعلیں سرنگ کے راستے باہر آگئی تھیں۔ ان کی روشنی میں دوست اور دشمن کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود کی نظر انہی جانبازوں پر تھی۔ اُس نے ان کی خبر لینے کے لیے دو تین آدمی آگے بھیج دیے تھے۔ ان آدمیوں نے آکر اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دریا میں بیشمار مشعلیں نظر آ رہی تھیں جیسے دریا میں تیر رہی ہوں۔ اُس نے کم و بیش تین سو سپاہیوں کو دریا میں اتار دیا اور مشعل بردار بھی ساتھ بھیج دیے۔

"معلوم ہوتا ہے میرے جانبازوں نے دیوار میں نقب لگا لی ہے" — سلطان محمود نے اپنے سالار سے کہا — "اندر سے اسی راستے دشمن باہر آیا ہو گا۔ جاؤ دیکھو اور مجھے بتاؤ۔"

دریا کا پانی قلعے کے اندر جا رہا تھا اور سرنگ میں سے راجپوت باہر آ رہے تھے۔ لاشیں اور زخمی دریا میں بہتے جا رہے تھے۔ مشعلوں کے شعلے دریا پر ناچ رہے تھے۔ سلطان محمود نے بہت سوچا کہ وہ اس سرنگ سے اپنا ایک دستہ قلعے میں داخل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اُسے سرنگ کھودنے والے ایک زخمی نے جو دریا سے نکل آیا تھا، بتایا کہ سرنگ سے اندر جانے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ بہت نقصان ہو گا۔ سلطان نے حکم دے دیا کہ دریا سے اپنے آدمی واپس بلا لیے جائیں۔

وقائع نگاروں نے محاصرے کا جو روز بروز کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، وہ بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ غزنی کے مجاہدین نے خون کی بے دریغ قربانی دے کر دیواروں میں دو جگہ نقب لگائی مگر منج کے راجپوتوں نے بہادری کے ایسے مظاہرے کیے کہ سلطان محمود غزنوی عش عش کر اُٹھا۔ بجائے اس کے کہ غزنی کے دستے ٹوٹی ہوئی دیواروں سے

اندر جاتے، اندر سے راجپوت باہر آتے اور غزنی کی فوج پر حملے کرتے تھے۔ ان میں سے جو زندہ رہتے وہ پھر اندر چلے جاتے تھے۔ انہوں نے یہاں تک کیا کہ دروازہ کھول کر نکلے ہوئے سیلاب کی طرح آئے اور اس انداز سے لڑے کہ پھر واپس چلے جائیں۔

"یہ لوگ جتنے بہادر ہیں اتنے ہی احمق ہیں"۔ سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا — "انہیں موقع دو کہ اسی طرح حملے بولتے رہیں۔ یہ اپنی طاقت تیزی سے ضائع کر رہے ہیں۔"

اس دوران رادھا کو مسلسل بے ہوشی میں رکھا گیا۔ وہ ہوش میں آتی تھی تو نحیف آواز میں کہتی تھی — "خدا میرے دل میں اتر آیا ہے" — اُسے وید بے ہوشی کی دوائی پلا دیتا تھا۔

مؤرخوں کے مطابق محاصرے کے اکیسویں روز سلطان محمود نے حکم دیا کہ قلعے کی دیواروں کے شگافوں پر شدید ہلہ بول کر اندر جانے کی کوشش کی جائے اور جونہی راجپوت باہر آنے کے لیے کوئی دروازہ کھولیں، حملہ کر کے دروازے کو کھلا رہنے دیا جائے۔

اکیسویں روز کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ راجپوت اپنی طاقت کم کر چکے تھے۔ جب غزنی کی فوج نے شگافوں پر اور ایک دروازے پر ہلہ بولا تو راجپوت گھبرا گئے۔ مسلمان قلعے میں داخل ہو گئے مگر نفری تھوڑی تھی۔ راجپوتوں نے لڑنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے بعض نے اپنے کنبوں (عورتوں اور بچوں) کو اپنے گھروں میں بند کر کے گھروں کو آگ لگا دی اور بال بچوں سمیت زندہ جل گئے۔ جس راجپوت کو کہیں کوئی ہندو عورت نظر آئی اسے قتل کر دیا۔ منج کے کئی سپاہیوں نے قلعے کی اتنی اونچی دیواروں کے اوپر سے چھلانگیں لگا دیں اور مر گئے۔

جب سلطان محمود قلعے میں داخل ہوا اُس وقت منج جل رہا تھا اور اس آگ میں راجپوت جل رہے تھے۔ یہ اجتماعی خودکشی تھی۔ صرف محل محفوظ تھا۔ وہاں گئے تو جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انہیں راجپوتوں نے خود قتل کیا تھا۔ داشتاؤں اور ناچنے گانے والیوں کے سینوں میں بھی خنجر اور تلواریں اُتری ہوئی تھیں۔ مرد بھی مرے پڑے تھے۔ رائے چندا اور رانی کی لاشیں خواب گاہ میں پلنگوں پر پڑی تھیں۔

غزنی کے آدمی محل کے ہر کمرے میں گئے۔ صرف ایک کمرہ باہر سے بند تھا۔ کھول کر اندر گئے تو پلنگ پر رادھا پڑی تھی۔ اُسے بھی مُردہ سمجھا گیا مگر اُس نے آنکھیں کھولیں اور ساد ٹھکتی آواز میں بولی "خدا میرے دل میں اُتر آیا ہے"۔ قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ زخمی نہیں بیمار ہے۔ اُس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا "تم مسلمان سپاہی ہو؟ ... تمہارا سلطان کہاں ہے؟ اُسے بلاؤ۔ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں اُس کے خدا کا نام لے کر مر رہی ہوں۔ میں اُس کے ہاتھ چوم کر مروں گی۔"

سب اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک لڑکی کے لیے سلطان محمود کو نہیں بُلایا جا سکتا تھا۔ رادھا نے مایوسی سے سب کو دیکھا اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ مر چکی تھی۔

مُنج کے بعد سلطان محمود کو قنوج کی طرف پیشقدمی کرنی تھی مگر اُسے ایسی اطلاعیں مل رہی تھیں جو دھوکہ معلوم ہوتی تھیں۔ صالح بروک نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا اصل مقابلہ قنوج کے گرد و نواح میں ہو گا مگر بعد کی اطلاعیں یہ تھیں کہ قنوج تک کے علاقے میں کسی فوج کا نام و نشان نہیں۔ مُنج میں سلطان بہت نقصان اُٹھا چکا تھا۔ وہ فوری طور پر پیشقدمی کے قابل نہیں تھا۔ ایک روز اُسے سالاروں نے مشورہ دیا کہ پیشقدمی کا حکم دے دیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ بھیم پال ننڈر اپنی فوج لے کر آ جائے۔

سلطان محمود نے پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصّہ دریائے جمنا کے کنارے اور دوسرا دریائے گنگا کے کنارے جا رہا تھا۔ ہراول بڑا مضبوط تھا۔ اس کے پیچھے سلطان محمود تھا اور یہی فوج کا بڑا حصّہ تھا۔ ایک حصّہ بہت پیچھے آ رہا تھا جس کی حیثیت محفوظہ کی تھی۔ ترتیب کوُچ کی تھی جنگ کی نہیں تھی۔

سلطان محمود ۲۰ دسمبر ۱۰۱۸ء (۸ شعبان ۴۰۹ھ) قنوج پہنچا۔ اُس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا مگر مزاحمت بڑی کمزور تھی۔ سلطان اسے دھوکہ سمجھا۔ اُس نے اپنے عقب کی حفاظت کا بندوبست کر لیا اور اُس نے دیکھ بھال کے لیے دور دُور تک سوار بھیج دیئے۔ اُسے ہر لمحہ توقع تھی کہ عقب سے حملہ ہو گا مگر محاصرے کے دوسرے ہی دن قنوج والوں نے قلعے پر سفید جھنڈا لہرا دیا۔

سلطان محمود نے سب سے پہلے ایک سوار دستے کو اندر بھیجا۔ اس کے پیچھے دو اور دستے گئے اور جب دیکھا کہ اندر امن و امان ہے تو وہ خود اندر گیا۔ قنوج کی فوج کے کمانڈروں سے اُسے پتہ چلا کہ مہاراجہ راجیا پال اپنے خاندان سمیت محاصرے سے پہلے ہی کہیں بھاگ گیا تھا۔ سلطان محمود نے ہندو کمانڈروں سے پوچھا کہ خزانہ کہاں ہے۔ تلاش کے باوجود وہاں کچھ بھی نہ ملا۔ سلطان نے محل کو زمین سے ملا دیا اور مندروں میں جا کر تمام بُت توڑ کر باہر پھینک دینے کا حکم دے دیا۔

صالح بروک نے بڑے مندر کے پنڈت کو پکڑ لیا۔ پنڈت سے خزانے کے متعلق پوچھا گیا۔ اُس نے کہا "آپ کے اس آدمی کو معلوم ہے خزانہ کہاں ہے مگر اب وہاں کچھ نہیں ہو گا۔ مہاراجہ سب کچھ ساتھ لے گیا ہے۔"

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے "سلطان محمود کی یہ فتح معمولی نہیں تھی کہ ہندوستان کے وسط میں افغانی گونج اُٹھیں۔"

بلاساغون کی سمن تاشش

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں متھرا سے قنوج
۱۰۱۹ء (۴۱۰ ہجری) تک کو تہہ تیغ کر کے غزنی میں داخل ہوا۔ اُس کی
سلطنت میں پہلے ہی اطلاع پہنچ چکی تھی کہ سلطان کئی ایک راجوں مہاراجوں سے ہتھیار
ڈلوا کر واپس آ رہا ہے۔ لوگ اپنے فاتح سلطان کے راستے میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے
لگا رہے تھے۔ فوج نعرے لگا رہی تھی۔ عورتیں منڈیروں پر کھڑی اپنی فوج کی بلائیں لے رہی
تھیں۔ لوگ جب اُن پچپن ہزار ہندو قیدیوں کو اور تین سو پچاس ہاتھیوں کو دیکھتے تھے
جو سلطان محمود ہندوستان سے لایا تھا تو وہ خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔ غزنی کا بچہ
بچہ سلطان محمود کے راستے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ داد و تحسین اور نعروں کا شور زمین و
آسمان کو ہلا رہا تھا۔

متعصب مؤرخین اور بعد کے تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزنی پہنچ کر سلطان محمود
نے حکم دیا کہ وہ جو مال و دولت ہندوستان سے لایا ہے، وہ محل کے باہر کھول کر رکھا
جائے۔ جب زر و جواہرات اور درہموں کے انبار اُس کے سامنے رکھے گئے تو غرور
اور تکبر سے اُس کی گردن تن گئی۔

یہاں تک تو حقیقت ہے کہ اُس نے تمام تر مالِ غنیمت اپنے محل کے باہر رکھوا
کر دیکھا تھا لیکن اُس دَور کے مبصروں نے جن میں الزمخشاری اور ابوعبداللہ یاقوت خاص
طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمود نے جب اپنی سلطنت کے عوام کا اس قدر
پُرجوش خیر مقدم اور اُن کی بے تابیاں دیکھیں تو اُس نے حکم دیا کہ وہ تمام زر و جواہرات
اور خزانے ان لوگوں کے سامنے رکھ دو جو ہم ہندوستان سے لائے ہیں اور انہیں بتا دو

کہ یہ مال تمہارا ہے، یہ تمہارے خزانے کا مال ہے جو تم پر خرچ کیا جائے گا۔
اور اُس نے یہ بے بہا خزانہ قوم کی بہبود اور ذہنی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔
اُس نے سنگِ مرمر کی ایک جامع مسجد اور اس کے ساتھ ایک یونیورسٹی کی تعمیر کا حکم دیا۔
مسجد کا نام عروسِ فلک رکھا گیا۔ یہ تھی بھی دلہن۔ اس کی تعمیر کے لیے دُور دُور سے معمار بلائے
گئے۔ دیواروں اور چھت میں جو بیل بوٹے کھدوائے گئے ان میں سونا اور چاندی
پگھلا کر ڈالی گئی۔ میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھایا گیا۔ مسجد کے اندر نہایت دلکش اور
قیمتی قالین بچھائے گئے۔ یونیورسٹی کو سلطان محمود نے اپنی نگرانی میں مثالی دارالعلوم بنایا۔
اس میں اس نے مختلف زبانوں کی کتابیں جمع کر دیں۔ مکمل ہو کر جامع مسجد اور یونیورسٹی علم و فن
کا ایسا مرکز بن گئی جس کی مثال کم از کم عالمِ اسلام میں نہیں ملتی تھی۔ دُور دُور سے علماء
اور اساتذہ بلائے گئے جن کے لیے اُس نے کثیر رقم وقف کر دی۔ طلباء کے لیے
بھی بے اندازہ رقم الگ کر دی گئی جو انہیں وظیفوں کی صورت میں ملتی تھی۔
محمد قاسم فرشتہ اور البیرونی لکھتے ہیں کہ جامع مسجد اور یونیورسٹی متھرا اور قنوج کی فتح کی
یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی تھیں۔ تاریخ نویسوں نے سومنات کو زیادہ اہمیت دی ہے
لیکن سلطان محمود کی نگاہ میں متھرا زیادہ اہم تھا کیونکہ متھرا ہندوؤں کے ہری کرشن کی
جائے پیدائش ہے اور ہندوؤں کے ہاں متھرا کو وہی درجہ حاصل ہے جو مسلمانوں کے ہاں
مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو حاصل ہے۔
سلطان محمود جو مالِ غنیمت لایا تھا اس میں سونے اور چاندی کے تئیس لاکھ درہم
تھے۔ ہیرے جواہرات اور سونے کے ٹکڑوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ پچپن ہزار ہندو قیدی
اور ساڑھے تین سو ہاتھی تھے۔ گھوڑوں اور تلواروں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔ مشہور مؤرخ
محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے تین عجیب چیزیں لایا تھا۔ ان
میں ایک ہاتھی تھا، ایک فاختہ اور ایک پتھر۔
یہ ہاتھی اُسے متھرا سے قنوج کی طرف پیشقدمی کے دوران اس طرح ملا تھا کہ
جمنا کے دائیں کنارے پر اسائی نام کی ایک ریاست تھی جس کا حکمران چندر رائے
تھا۔ سلطان کو اُس کے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ چندر رائے کے پاس ایک ہاتھی ہے

بڑی جسامت کا ہے جو ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس ہاتھی کی خوبی صرف یہی نہیں تھی کہ اُس کی جسامت غیر معمولی تھی بلکہ وہ اس لیے بھی ملک بھر میں مشہور تھا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں میں دہشت اور تباہی پھیلا دیتا تھا اور دوسرے ہاتھیوں کی طرح تیر یا برچھی کھا کر پیچھے کو نہیں بھاگتا تھا۔ نڈر ہاتھی تھا۔

سلطان محمود نے اسائی کو اسی ہاتھی کے لیے محاصرے میں لے لیا تھا۔ یہ چھوٹی سی ریاست تھی۔ سلطان محمود نے چندر رائے کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنا ہاتھی دے دے تو بڑی آسان شرائط پر محاصرہ اُٹھا لیا جائے گا۔ چندر رائے نے جواب بھیجا کہ یہ ہاتھی مجھے اپنی راجدھانی اسائی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں اس ہاتھی سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ پھر یوں ہوا کہ دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ اس دوران یہی ہاتھی شاہانہ چال چلتا سلطان محمود کے پاس آ گیا۔ اس کے ہودے میں اس کے جنگجو سواروں کی لاشیں پڑی تھیں جن کے جسموں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ ہاتھی کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

سلطان محمود کے حکم سے ہاتھی کو پکڑ لیا گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہاتھی اپنے آپ آ گیا۔ سلطان محمود نے بے ساختہ کہا — "یہ ہاتھی مجھے چندر رائے نے نہیں خدا نے دیا ہے" — چنانچہ سلطان نے اس کا نام خداداد رکھ دیا۔

فرشتہ کے مطابق، سلطان محمود ہندوستان سے ایک پرندہ لایا تھا جو فاختہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسے قدرت نے یہ خوبی عطا کی تھی کہ اس کا پنجرہ جس مکان یا محل میں رکھا ہوتا وہاں کوئی کسی کو زہر نہیں دے سکتا تھا۔ مکان یا محل کے کسی بھی کمرے میں کتنا ہی چھپا کر کسی کو زہر دیا جاتا تو یہ پرندہ پنجرے میں بُری طرح پھڑپھڑاتا تھا جیسے پنجرہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی دوران اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ لوگ فوراً چوکنے ہو کر ہر جگہ جا کر دیکھتے کہ کون کسے زہر دے رہا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے یہ پرندہ تحفے کے طور پر خلیفۂ بغداد القادر باللہ کو بھیج دیا تھا۔

فرشتہ نے ہی متعدد مورخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان

سے ایک پتھر لایا تھا جس میں یہ خوبی تھی کہ اسے پانی میں ڈبو کر اس سے ٹپکتے قطرے زخم پر ڈالنے سے زخم بہت جلدی ٹھیک ہو جاتا تھا۔

سلطان محمود نے اپنا چھوٹا سا قافلہ شیخ ابوالحسن خرقانی کے آستانے سے کوئی ایک میل دُور روک لیا اور وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس قدر معمولی کہ اُسے نہ جاننے والوں کو شک تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ سلطان محمود ہے جس نے سارے ہندوستان پر لرزہ طاری کر رکھا ہے۔ اُس نے اپنے محافظوں کو وہیں رُکے رہنے کو کہا اور خود پیدل چل پڑا۔ اپنے پیر و مرشد کے سامنے وہ شاہانہ شان و شوکت سے کبھی نہیں گیا تھا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کے ہاں جا کر اُس نے اُن کے ہاتھ چومے اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"وہ وقت یاد کرو جب تم ہندوستان سے شکست کھا کر آئے تھے" شیخ خرقانی نے کہا — "تم دل برداشتہ تھے۔ تمہاری فوج کٹ گئی تھی۔ تمہاری ہمت ٹوٹ گئی تھی اور یہاں تمہارے دشمن تمہیں لاش سمجھ کر تمہارے اوپر گدھوں کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاؤ گے۔ فتح اور شکست خدا کے اختیار میں ہے۔ ہارتے وہ ہیں جو شکست کو تسلیم کر لیتے ہیں اور شکست کو وہی تسلیم کرتا ہے جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے ....

"تم شہیدوں کے خون کی قیمت ادا نہیں کر سکتے محمود! ان کی قدر کر سکتے ہو اور یہ تمہارا فرض ہے۔ یاد رکھو، تم اگر انہیں بھول گئے جو نعرے لگاتے اور سینہ تانے تمہارے ساتھ گئے تھے مگر واپس نہیں آ سکے تو اس کی سزا اس دنیا میں پاؤ گے۔ وہ تمہارے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے لڑے تھے"

"میں نے اُن کی یاد میں ایک جامع مسجد اور ایک دارالعلوم کی تعمیر کا حکم دے دیا ہے" — سلطان محمود نے کہا — "اور اُن کی یادگار کے طور پر مینار بھی تعمیر کروا رہا ہوں۔ شہیدوں کے بچوں کو دارالعلوم میں مفت تعلیم اور وظیفہ ملا کرے گا"

"اور غور سے سُنو محمود!" — شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا — "غزنی کے گرد [illegible] تمہارے

استقبال اس طرح کیا ہے جیسے تم آسمان سے اُترے ہو۔ میں سُن چکا ہوں کہ عورتوں نے تمہاری راہ میں اور تمہارے اُوپر پھُول پھینکے تھے۔ شاعروں نے تمہاری مدح میں شعر کہے اور گویّوں نے گیت گائے ہیں۔ دربار میں لوگوں نے تمہارے ہاتھ چُومے اور تمہیں ساری دنیا کا فاتح کہا ہے.... تم شاید نہیں سمجھ سکے کہ جنہیں تم نے پھول سمجھا ہے وہ کانٹے تھے جو تمہاری راہ میں بکھیرے گئے تھے، اور وہ مدح سرائی جو شاعروں اور گویّوں نے کی، وہ شہد میں ملا ہُوا زہر ہے جو تمہیں پلایا گیا۔ اگر آج تمہارا تختہ اُلٹ جائے تو یہی لوگ نعرے لگائیں گے کہ محمود اسی قابل تھا۔ اس میں سلطان بننے کی اہلیت نہیں تھی۔ وہ پھر اُس کے گُن گائیں گے جو تمہارے تخت پر بیٹھا ہوگا....

"خوشامدی درباری تخت و تاج کی دیمک ہوتے ہیں۔ وہ دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ تم نے غزنی کے اکابرین اور امراء اور رتبوں والوں کو جب ضیافت دی تھی تو تم بھُول گئے تھے کہ تمہاری سلطنت میں اُس رات لاکھوں انسان رُوکھی سُوکھی کھا کر سو گئے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے پیٹ میں اُس شام ایک نوالہ بھی نہیں گیا تھا۔ خوشامدیوں نے تمہیں یہ تاثر دیا تھا کہ رعایا خوشحال ہے اور وہ تمہارے گیت گا رہی ہے... محمود! اپنے آپ کو اپنی روح کے آئینے میں اور اپنی رعایا کو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ اُس آئینے میں نہ دیکھو جو تمہیں درباری ٹولہ دکھایا کرتا ہے۔ تم تنہا اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں۔ تم قوم کا عکس ہو۔ اپنے آپ کو اس عکس میں گُم کر دو۔ سلطانی اور عیّاری ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ خوشامدی اور عہدوں کے بھوکے لوگ سلطان سے عیّاری کرتے ہیں اور سلطان قوم سے عیّاری کرتا ہے۔ یوں سمجھو کہ گناہ اور نیکی کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں، اور جو سلطان اپنی آنکھوں پر خوشامدیوں کی پٹی باندھ لیتا ہے اور کانوں میں مدح سرائی کا سیسہ پگھلا کر ڈال لیتا ہے وہ خدا کے نزدیک سب سے بڑا گنہگار ہے....

"آج تمہیں خدا نے جو طاقت اور جو جاہ و حشمت عطا کی ہے، یہ تم سے چھن بھی سکتی ہے۔ خوشامدیوں کے نعروں کی نسبت رعایا کی آہیں عرش تک جلدی پہنچتی ہیں۔ ہندوستان کی فتوحات نے تمہاری رعایا میں اضافہ کر دیا ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں

بڑھ گئی ہیں.... کہیں ایسا نہ ہو کہ سونے چاندی کے انبار تمہیں اندھا کر دیں۔ جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ اللہ کی امانت ہے۔ خزانہ تمہاری ملکیت نہیں۔ مالِ غنیمت تمہاری ملکیت نہیں۔ محل کی سازشوں سے نکلو اور نظر دشمن پر رکھو۔ تمہیں فتح مبارک ہو۔ میں تصوروں میں وہ اذانیں سُن رہا ہوں جو بُت خانوں میں گونج رہی ہیں۔ تمہیں پھر وہاں جانا ہے۔ سانپ کا سر ابھی کچلا نہیں گیا۔ میں آنے والے وقت کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر ہندومت کا سر کچلا نہ گیا تو یہ مذہب مسلمانوں کو ڈستا ہی رہے گا.... جاؤ محمود! اگلی جنگ کی تیاری کرو۔"

"پیرومرشد!" سلطان نے سر اٹھا کر کہا۔ "میری روح کو اسی روشنی کی ضرورت تھی جو آپ نے عطا کر دی ہے۔ میرے دل میں کوئی وہم اور کوئی شک نہیں۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ میری عمر کفر کے خلاف لڑتے گزرے گی۔ مجھے پریشانی صرف یہ ہے کہ میری اپنی قوم کے حکمران میرے دشمن ہیں۔ ہم خانہ جنگی میں بہت خون بہا چکے ہیں۔"

"ایک فرق دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔" شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "ایک دشمن تمہاری سلطنت کے ہیں۔ وہ تم سے تخت و تاج چھیننا چاہتے ہیں اور ایک دشمن وہ ہیں جو اسلام کو کمزور کر رہے ہیں۔ انہیں ملحد کہتے ہیں۔ اپنے ذاتی دشمن اور اپنے مذہب کے دشمن میں تمیز کرو۔ کسی کو اس لیے قید میں نہ ڈال دو کہ وہ تمہارے جاہ و حشمت کا منکر ہے۔ اگر تمہارا اپنا بیٹا، اپنی بیٹی اور اگر تمہارا سگا بھائی بھی اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے تو اُسے جینے کے حق سے محروم کر دو۔ کاشغر کا حکمران قادر خان اور اس کے پڑوسی ابو منصور ارسلان خان اور توغان خان تمہاری سلطنت پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ وہ خانہ جنگی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ عالمِ اسلام کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ انہیں عیسائی مدد اور ہوا دے رہے ہیں۔ اگر یہ سر اُٹھائیں تو انہیں کچل دو لیکن کچلنے سے پہلے انہیں موقع دو کہ وہ سمجھ سکیں کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔"

سلطنتِ غزنی کے مسلمان دشمنوں کا مختصر سا پس منظر یہ ہے کہ ایلک خان ترکستانی اور گرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا کر سلطان محمود غزنوی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ آپ اس سلسلے میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ کئی بار سلطان محمود کو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ ایلک خان مر چکا تھا۔ اب اُس کا بھائی ابو منصور ارسلان خان الاصم تخت نشین تھا۔ اسے الاصم اس لیے کہا جاتا تھا کہ کانوں سے بہرہ تھا۔ کاشغر کا حکمران قادر خان تھا اور اس کے پڑوس میں توغان خان کی ریاست تھی۔ یہ دراصل ریاستیں نہیں امارتیں تھیں جو خلافتِ بغداد کے تحت تھیں مگر خلافت کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ خلیفہ القادر باللہ عباسی تھا جو خود اقتدار پرست تھا۔ وہ ایک ریاست کا حکمران بھی تھا۔ وہ سلطان محمود کے خلاف خانہ جنگی کو دوبارہ ہوا دیتا رہتا تھا۔

سلطان محمود متھرا سے قنوج تک فتح کر کے واپس آیا تو ایک رات قادر خان ابو منصور ارسلان خان کے محل میں بیٹھا تھا۔ قادر خان کی ایک جوان بیٹی اختی بھی اُس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ رات کو جب قادر خان اور ابو منصور خاص کمرے میں بیٹھے رازونیاز کی باتیں کر رہے تھے، قادر خان کی بیٹی اختی اور ابو منصور کی جوان بیٹی سمن تاش باغ میں ٹہل رہی تھیں۔ رات خاموش تھی۔ صرف ایک آواز تھی جو اس سکوت میں تیر رہی تھی۔ یہ تاروں کا ایک ساز تھا جس کے ساتھ کوئی دھیمے دھیمے گنگنا رہا تھا۔ ساز و آواز میں سوز تھا اور ایسا تاثر کہ جذبات پر وجد طاری ہوا جا رہا تھا۔

وہ نابینا موسیقار تھا۔ ابو منصور کے دربار کا مغنی تھا۔ سمن تاش نے اُسے باغ کے کسی گوشے میں بٹھا رکھا تھا اور وہ خود اختی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ نابینا مغنی کی عمر بیس برس سے ذرا ہی زیادہ تھی۔ ڈیڑھ ایک سال سے ابو منصور کے دربار میں تھا۔ سمن تاش کو موسیقی سے دلی لگاؤ تھا۔ ایک روز یہ نابینا محل کے باغ کے قریب آ گیا اور اس نے تاروں کو چھیڑ دیا۔ سمن تاش کے کانوں میں آواز پڑی تو اُس نے اُسے اندر بلا لیا۔ ابو منصور نے اُس سے ایک ہی نغمہ سنا تو اُس نے مغنی کو ہمیشہ کے

لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ ابو منصور کو اپنی بیٹی سمن تاش سے بہت پیار تھا۔ سمن تاش نابینا مغنی کو اپنے کمرے میں بھی بلا لیا کرتی تھی۔

"سمن!" — اختی نے جذباتی سی آواز میں کہا — "کتنی پیاری آواز ہے۔ خمار سا طاری ہونے لگا ہے۔"

"یہ موسیقار نابینا ہے" — سمن تاش نے کہا — "آنکھوں کے نور سے محروم پیدا ہوا تھا مگر خدا نے قدرت کی ساری نغمگی اس کی آواز میں سمو دی ہے۔ ابا اجازت نہیں دیں گے۔ میں اس مغنی کو سلطان محمود کے دربار میں لے جانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیوں؟" — اختی نے رک کر پوچھا — "سلطان محمود کے دربار میں کیوں؟ تمہارا اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"جو ایک مسلمان کا ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے" — سمن تاش نے کہا — "میں اس نابینا موسیقار کے ساز اور اس کی آواز سے سلطان محمود کی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے سنا نہیں وہ ہندوستان میں کتنے بت خانے توڑ آیا اور کتنے مہاراجوں سے ہتھیار ڈلوا آیا ہے؟"

"اس کی تمہیں کیا خوشی ہے؟" — اختی نے پوچھا — "سلطان محمود ہمارے اور تمہارے خاندان کا دشمن ہے۔ وہ جو ہاتھی، گھوڑے، جنگی قیدی اور اسلحہ لایا ہے، وہ سب ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ تم شاید اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف نہیں ہو۔"

"میں اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف ہوں، اسی لیے سلطان محمود کی معتقد ہوں" — سمن تاش نے کہا — "وہ ہمارا دشمن نہیں بلکہ ہم دونوں کے خاندان اُس کے دشمن ہیں۔ وہ اسلام کا علمبردار ہے۔ بت شکن ہے۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ اُس نے ہندوستان میں کتنے مہاراجوں کو شکست دی ہے لیکن وہاں حکومت کرنے کے لیے تخت پر نہیں جا بیٹھا۔"

"اس کی وجہ یہ ہے سمن! کہ وہ زر و جواہرات اور مال و دولت کی خاطر ہندوستان جاتا ہے" — اختی نے بڑے پیار سے کہا — "اب کے وہ دو مہاراجوں کے جواہرات، زر و سیم اور ہاتھی لاد کر لایا ہے۔ اُس نے سارا کا سارا مالِ غنیمت اپنی فوج میں تقسیم کیا ہے؟"

وہ ہمیں اپنا غلام بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"میں تو اُس کی لونڈی بننے کو تیار ہوں" — سمن تاش نے کہا۔

"تم میں خاندانی غیرت نہیں رہی" — اختشی نے کہا — "تم ایلک خان کی بھتیجی ہو جو سلطان محمود کے خلاف لڑ رہا ہے۔ تمہیں ابا نے کچھ بتایا نہیں؟"

"چچا ایلک خان سلطان محمود کے خلاف لڑ رہا ہے اور ہر میدان میں شکست کھا کر بھاگ رہا ہے" — سمن تاش نے کہا — "مجھے میرے ابا کیا بتا سکتے ہیں؟ .... وہ بہرے ہیں۔ ان کے کانوں میں حق کی آواز نہیں پہنچتی۔ وہ اسی کو سچ سمجھتے ہیں جو ان کے کانوں میں ڈالا جاتا ہے۔"

"کیا تم اپنے باپ کو احمق سمجھتی ہو سمن؟" — اختشی نے کہا — "معلوم ہوتا ہے خدا نے تمہیں عقل اور غیرت کی جگہ بھی حسن ہی دے دیا ہے۔ کم از کم غزنی اور خراسان میں تم جیسی خوبصورت لڑکی کوئی نہیں ہوگی لیکن تم عقل سے عاری ہو۔"

"مگر میرے اتالیق عقل سے عاری نہیں" — سمن تاش نے کہا — "تم نے میرے سفید ریش، عمر رسیدہ اتالیق کو دیکھا ہے۔ وہ علم اور تجربے کا سمندر ہیں۔ وہ مجھے میرے خاندان کی تاریخ سنا چکے ہیں۔ انہوں نے میرے ابا کے متعلق کہا تھا کہ ان میں تدبر نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ان کی مجبوری ہے کہ وہ بہرے ہیں سن نہیں سکتے۔ اتالیق نے کہا کہ جو کوئی تخت پر بیٹھ کر سر پر تاج رکھ لیتا ہے وہ بہرہ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سن رہا ہے مگر سچ اور حق بات سننے کے لیے اس کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ دیکھ سکتا ہے مگر اسے حقیقت نظر نہیں آتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا دماغ سوچ رہا ہے مگر دماغ پر کسی اور کا آسیب سوار ہوتا ہے ....

"اختشی! میرے اتالیق نے کہا تھا کہ تمہارے باپ کا بڑا بھائی ایلک خان بہرہ نہیں تھا۔ خدا نے اُسے عقل و دانش سے نوازا تھا مگر اُس نے اپنے دماغ پر غزنی کو فتح کرنے اور سلطان محمود کو قید یا قتل کرنے کا بھوت سوار کر لیا۔ اُس کے جو کان سن سکتے تھے وہ بند ہو گئے۔ آنکھیں جو دیکھ سکتی تھیں اندھی ہو گئیں اور عقل پر سلطانی کی ہوس کا پردہ پڑ گیا۔ ایسے حکمران کو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ تمہارے چچا ایلک خان نے بھی اپنی رعایا سے جھوٹ بولے۔ اپنے دوستوں سے جھوٹ بولے۔ مسجدوں میں جھوٹ بولے۔ قرآن ہاتھ میں لے کر جھوٹ بولے۔ اپنی فوج کو اور اپنی رعایا سے کہا کہ سلطان محمود لٹیرا ہے اور وہ اپنی سلطنت کو وسیع کر رہا ہے۔ ایلک خان نے جھوٹی غیرت کی قسمیں کھائیں اور اپنی فوج کو بھڑکا کر بھائی کو بھائی سے لڑا دیا۔ اسلام کی عسکری قوت کمزور ہو گئی اور کفار کے ہاتھ مضبوط ہو گئے ....

"میرے اتالیق نے مجھے بتایا کہ سلطان محمود اگر سلطنت کی وسعت کی خواہش رکھتا تو اُس کے پاس اتنی فوج ہے کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور ترکستان کے خوانین کو اپنا مطیع بنا چکا ہوتا لیکن اُس کی نظر کچھ اور دیکھ رہی ہے۔ اُس کا جنون کچھ اور ہے۔ محمد بن قاسم نے ہندوستان میں جو اسلام پھیلایا تھا اُس پر ہندو مت کے سائے پڑ گئے ہیں۔ سلطان محمود کو خواب میں بشارت ہوئی تھی کہ ہندوستان میں اسلام کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کو روشن کرے۔ اُس کے پیر و مرشد شیخ ابوالحسن خرقانی ہیں جو غیب دان تو نہیں لیکن علم و فضل اور ایمان کی روشنی انہیں وہ سب کچھ دکھا دیتی ہے جو بے سمجھ اور کم عقل انسانوں کو نظر نہیں آتا۔ شیخ خرقانی نے سلطان محمود سے کہا ہے کہ کفر کا اور اپنی قوم میں غداروں کا خاتمہ کرو ....

"میرے اتالیق نے کہا کہ جب بھائی بھائی سے لڑتا ہے تو ان کے خون کے قطروں سے زمین کانپ کانپ جاتی ہے۔ آسمان آنسو بہاتا اور فرشتے روتے ہیں۔"

"سمن تاش!" — اختشی نے سامنے آکر اپنے ہاتھوں میں اُس کے گال تھام لیے اور بولی — "تم نے پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس عمر میں ایسی سنجیدہ باتیں تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں، اور تمہارا اتالیق تمہیں کتنی غلط باتیں بتا رہا ہے۔ وہ تمہیں اسی عمر میں درویش بنا رہا ہے۔ ایسی خوبصورت رات، ایسا وجد آفریں نغمہ، تم کتنی بدذوق ہوتی جا رہی ہو سمن!"

"روح کو جب روشنی مل جائے اختشی!" — سمن تاش نے کہا — "میں بدذوق نہیں۔ یہ نابینا موسیقار میرے ذوق کی بدولت درباری رتبہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ میں نے روح کی جس روشنی کی بات کی ہے وہ مجھے اپنے اتالیق اور اس موسیقار

کے نغموں سے مل رہے ہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اس کے ساز کے تار کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کے ترنم میں مجھے ایک پیغام سنائی دیتا ہے۔"

"کیا ہے وہ پیغام؟"

"معلوم نہیں" — سمن تاش نے کہا — "میں ابھی سمجھی نہیں۔"

نابینا موسیقار تاروں پر آہستہ آہستہ مضراب چلا رہا تھا اور وہ خوابناک آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لگتا ہے اُس کی آواز ساز کی آواز، لگتا ہے ساز کی آواز اُس کی آواز لگتی تھی۔ دونوں لڑکیاں ٹہلتے ٹہلتے اُس کے قریب آگئیں۔ موسیقار پر بےخودی طاری تھی اور وہ جیسے کسی اور کی موجودگی سے بےخبر تھا۔

"کیا تم اپنے ابا حضور کو قائل کر سکتی ہو کہ سلطان محمود اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا" — اختی نے پوچھا — "اور کیا تمہارے ابا مان جائیں گے کہ سلطان محمود کی جنگیں اسلام کی خاطر ہیں؟"

"انہیں منوانے کی مجھے کیا ضرورت ہے؟" — سمن تاش نے کہا — "وہ سلطان محمود کے خلاف ہو سکتے ہیں، اُس کے خلاف لڑیں گے نہیں۔ ان کے دل میں دشمنی موجود ہے۔ وہ سلطان کے خلاف لڑیں گے بھی نہیں اور اس کی مدد بھی نہیں کریں گے۔"

"میں تمہیں راز کی ایک بات بتاؤں؟" — اختی نے کہا — "تمہارے ابا حضور سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"وہ ایسی جرأت نہیں کریں گے۔"

"وہ ایسی جرأت کا اظہار کر چکے ہیں" — قادر خان کی بیٹی اختی نے کہا — "میرے ابا اسی مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ وہ تمہارے ابا کے ساتھ اسی سلسلے میں بات کر رہے ہیں۔"

"میں انہیں روکوں گی" — سمن تاش نے تڑپ کر کہا۔

"ہوش میں آؤ سمن!" — اختی نے قدرے غصیلی آواز میں کہا — "ترکستان کی بیٹیاں اتنی بےغیرت نہیں ہوا کرتیں۔ تم ذہنی طور پر غزنی والوں کی غلام بن گئی ہو۔"

نابینا موسیقار کے ساز کے تار اتنی زور سے جھنجھنائے جیسے اُس کا ہاتھ کانپ گیا ہو اور مضراب بےقابو ہو گیا ہو۔ تار خاموش ہو گئے۔ مغنی کی آواز رات کے سکوت میں تحلیل ہو گئی۔

"سلطان محمود بہت بڑی طاقت بن گیا ہے" — اختی کہہ رہی تھی — "اب وہ تمام ترکستان پر اسی طرح حملہ اور قبضہ کرے گا جس طرح اُس نے خوارزم پر کیا تھا۔ کیا تم بھول گئی ہو کہ اب خوارزم شاہ کون ہے؟ .... الطنطاش! ... اور اُس کا نائب سلطان محمود کا مشہور سالار ارسلان جاذب ہے۔ یہ دونوں غزنی کے قصاب ہیں۔ انہوں نے ہر اُس آدمی کو قتل کرا دیا ہے جن کے متعلق انہیں شک تھا کہ غزنی کے وفادار نہیں۔"

"ہم دونوں کے والد کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"خراسان پر حملہ" — اختی نے کہا — "پیشتر اس کے کہ سلطان محمود کو اطلاع ملے، خراسان ہمارے قبضے میں ہو گا۔"

"اور جب سلطان محمود جوابی حملہ کرے گا تو اس کا مقابلہ کون کرے گا؟"

"میرے ابا قادر خان، تمہارے ابا ابو منصور اور بخارا کے امیر الپتگین کا بھائی توغان خان" — اختی نے جواب دیا — "ترکستان کے تمام امرا کو ایک محاذ پر اکٹھا کیا جا رہا ہے۔"

سمن تاش ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں بچپن کا انداز تھا لیکن اس ہنسی میں طنز تھی۔ اُس نے کہا — "کیا چوہے اور چھپکلیاں مل کر ایک شیر کا مقابلہ کر سکتی ہیں؟"

"اگر شیر زندہ ہی نہ رہا تو؟" — اختی نے کہا۔

"زندہ نہ رہا تو؟" — سمن تاش نے حیران سا ہو کے کہا۔

"اُسے خراسان پر حملے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا" — اختی نے کہا اور چونک کر بولی — "تمہارا موسیقار سو گیا ہے یا چلا گیا ہے؟"

رات کی خاموشی میں ساز کی مدھم دھیمی، لرزتی کانپتی آواز اُبھرنے لگی اور اس کے ساتھ نابینا مغنی کی آواز کی دبی دبی میٹھی میٹھی گونج سنائی دینے لگی۔

"یہ خاموش کیوں ہوگیا تھا؟" — اختی نے پوچھا — "یہ ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہوگیا تھا۔"

"ایک اندھے موسیقار سے اتنا خوف؟" سمن تاش نے کہا — "اسے موسیقی کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہیں۔"

اختی سمن تاش کو بازو سے پکڑ کر پرے لے گئی اور بولی "تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ سلطان محمود کے جاسوس اور مخبر ہر جگہ موجود ہیں۔ میرے ابا اپنے ہاں غزنی کے دو جاسوسوں کو پکڑ کر جلاد کے حوالے کر چکے ہیں۔ جاسوس تمہارے ہاں بھی موجود ہیں۔"

"آنکھوں سے محروم، موسیقی میں ڈوبا ہوا انسان جاسوس نہیں ہو سکتا" — سمن تاش نے کہا — "تم مجھے بتاؤ کہ سلطان محمود کو کب اور کس طرح قتل کیا جائے گا؟"

"اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا" — اختی نے کہا — "سمن تاش! تمہارا اتالیق بھی غزنی کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، ورنہ ترکستان کے اتنے بڑے دشمن کو وہ اسلام کا علمبردار نہ کہتا۔ اگر تم اپنے ابا کی زندگی چاہتی ہو تو اتالیق کی باتوں کو سچ ماننا چھوڑ دو۔ یہ خرانٹ بڈھا تمہیں گمراہ کر رہا ہے۔"

سمن تاش کی زبان جیسے گنگ ہو گئی ہو۔ اختی بولتی رہی اور وہ سنتی رہی۔

"اختی!" — سمن تاش اکتائے ہوئے اور کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی — "ہمیں چلنا چاہیے.... تم چلو۔ میں موسیقار کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑنے جا رہی ہوں۔"

"کسی ملازم کو اس کے ساتھ بھیج دو" — اختی نے کہا — "تم خود کیوں جاؤ گی؟"

سمن تاش نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ موسیقار کی طرف چل پڑی۔

نابینا موسیقار کو محل کے قریب ہی مکان دیا گیا تھا۔ سمن تاش اس کا ہاتھ پکڑے اسے اس کے کمرے میں لے گئی۔ راستے میں وہ کچھ بھی نہ بولی۔ موسیقار کے کمرے سے نکلنے لگی تو موسیقار نے اسے رک جانے کو کہا۔

"آپ شہزادی ہیں، میں آپ کا خادم ہوں" موسیقار نے بڑے اداس لہجے میں کہا — "ایک بات کہوں تو برا نہ ماننا شہزادی!... مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"خان قادر خان کی شہزادی نے مجھے جاسوس کہا تھا" موسیقار نے کہا — "کہتی تھی کہ میں آپ دونوں کی باتیں سننے کے لیے خاموش ہوگیا تھا... سمن شہزادی! مجھے بادشاہوں اور سلطانوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے دنیا کبھی ختم نہ ہونے والی تاریکی اور آوازیں ہیں۔ اسے میں اپنے نغموں سے روشن رکھتا ہوں۔"

"نہیں" سمن تاش نے کہا — "اس نے تمہیں جاسوس نہیں بلکہ یہ کہا تھا کہ دھیمے سُروں میں بجتے بجتے تمہارے ساز کے تار بڑی زور سے جھنجھنائے تھے اور تم خاموش ہوگئے تھے۔ اسے شک ہوا تھا کہ تم ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہوگئے تھے۔"

"قادر خان کی شہزادی کے منہ سے سلطان محمود کے قتل کی بات نکلی تو میرا ہاتھ کانپ گیا اور مضراب بے قابو ہو کر تاروں کو جا لگا" — نابینا مغنی نے کہا — "اور میری زبان کانپ کر خاموش ہوگئی۔"

"اگر سلطان محمود قتل ہو جائے تو کیا قیامت آ جائے گی؟" — سمن تاش نے پوچھا۔

"سلطان ہو یا سپاہی کسی کو قتل نہیں ہونا چاہیے" — مغنی نے کہا — "اور میں جانتا ہوں کہ آپ سلطان محمود کو پسند کرتی ہیں۔ اگر وہ قتل ہو جائے تو مجھ پر وہی قیامت آئے گی جو آپ پر ٹوٹے گی۔ آپ کی طرح میں بھی سلطان محمود کو اسلام کا علمبردار اور پاسبان سمجھتا ہوں۔"

"لیکن یہاں کسی کے ساتھ اس کے حق میں کوئی بات نہ کرنا" — سمن تاش نے کہا۔

"اسے کون قتل کرے گا؟" — موسیقار نے پوچھا — "اسے کب قتل کیا جائے گا؟"

"میں ابھی ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی" — سمن تاش نے کہا — "تم اب آرام کرو۔"

"ذرا رک جاؤ شہزادی!" موسیقار نے کہا — "میں آرام نہیں کر سکوں گا۔ میں سو نہیں سکوں گا۔"

"تم کر بھی کیا سکتے ہو" — سمن تاش نے کہا "تم خانہ جنگی نہیں روک سکتے۔ تم غزنی کے سلطان کو قاتلوں سے نہیں بچا سکتے۔"

"اگر آپ مجھے کچھ بتا سکیں تو میں غزنی جا کر سلطان محمود کو قبل از وقت خبردار کر سکتا ہوں۔"

سمن تاش نے ہنس کر کہا "تم بہت جذباتی ہو۔ تم غزنی کیسے جاؤ گے؟"

"مجھے جانا پڑا تو چلا جاؤں گا" — مغنی نے کہا "یہاں میرے کچھ شاگرد بھی ہیں۔ جسے کہوں گا وہ چلا جائے گا۔"

"کیا تم اس معاملے میں سنجیدہ ہو؟" — سمن تاش نے کہا "جو کہہ رہے ہو وہ کر کے دکھا سکتے ہو؟"

"آپ راز کی بات بتا دیں۔ باقی کام میں کسی سے کروا لوں گا" — موسیقار نے کہا "شہزادی سمن! میں نے سلطان محمود کے متعلق اپنی رائے آپ کی رائے سن کر دی ہے۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہمارے درمیان یہ باتیں ہوئی ہیں" — سمن تاش نے کہا۔

"ماں!" — سمن تاش نے اپنی ماں سے جا کر کہا — "کیا ابا حضور اپنے خاندان کی روایت کو مرنے نہیں دیں گے؟"

"کیسی روایت بیٹی؟"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کاشغر کا خان کیوں آیا ہے؟" — سمن تاش نے کہا — "خراسان پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ قادر خان ہمارے ابا کو بھی ایلک خان کے راستے پر لے جا رہا ہے۔ ہمارے خاندان کے ابھی پہلے زخم نہیں بھرے ... کیا آپ انہیں روک سکتی ہیں؟"

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور سمن تاش کا باپ، ابو منصور ارسلان خان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت اونچی آواز میں سنتا تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو دیکھ کر رک گیا اور انہیں بڑی غور سے دیکھنے لگا۔ سمن تاش کی ماں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"تم دونوں کے چہرے بتا رہے ہیں کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے" — ابو منصور نے کہا۔

سمن تاش کی ماں نے ابو منصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا "آپ ہمارے چہرے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ہماری آنکھوں میں جھانکیں تو آپ کو اسلام کے سپاہیوں کی خون چکاں لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔ آپ کو اسلام کا پرچم خاک و خون میں پڑا دکھائی دے گا ... میری آنکھوں میں دیکھیں۔ آپ کو ایک ہی مذہب کے ماننے، ایک ہی خدا اور ایک رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے ایک دوسرے کا خون بہاتے نظر آئیں گے۔"

"خاموش ہو جاؤ" — ابو منصور نے گرج کر کہا "تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی ہے!"

"جیسے اُس وقت جرأت ہوا کرتی تھی جب میں جوان تھی" — سمن تاش کی ماں نے کہا "میرے جسم میں دلکشی تھی اور چہرے کا حسن تر و تازہ تھا۔ آج میری جگہ پانچ جوان لڑکیوں نے لے لی ہے۔ خدا نے آپ کے کان بند کر رکھے ہیں اور عقل پر پانچ لڑکیاں قابض ہو گئی ہیں۔ آپ سوچ نہیں سکتے، سمجھ نہیں سکتے کہ ان میں دو لڑکیاں جو تحفے کے طور پر آئی ہوئی ہیں وہ کس نے کس نیت سے بھیجی ہیں۔"

"لیکن جو اختیار تمہیں حاصل ہے وہ میں نے کسی اور کو نہیں دیا" — ابو منصور نے کہا "تم نہیں جانتیں کہ ہم نے سلطان محمود پر یہ ظاہر نہ کیا کہ ہم زندہ ہیں اور ہم میں طاقت ہے تو وہ ہمیں خوارزم کی طرح نگل جائے گا۔ جانتی ہو وہ کتنا طاقتور ہو گیا ہے؟"

"آپ کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ آپ کو نگلنے کے لیے طاقتور ہوا ہے؟" — سمن تاش نے اُس کے دوسرے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا "یہ وہم ترکستانیوں کو ہو گا۔ وہ آپ کو استعمال کر رہے ہیں۔"

"قادر خان پر مجھے بھروسہ ہے" — ابو منصور نے کہا "میں اُس کی بات رد نہیں کر سکتا۔"

"کیونکہ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لایا ہے" — اس کی بیوی نے کہا "اور یہ لڑکی جس طرح آپ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور جس ناز و انداز سے آپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی وہ میں دیکھ رہی تھی۔ کیا آپ ایک لڑکی کی خاطر اپنی فوج کو غزنی والوں سے ذبح کرا دیں گے؟"

"خانہ جنگی سے آپ نے پہلے لیا حاصل کیا ہے؟" — سمن تاش نے کہا۔

"آپ کا بھائی ایلک خان ایک ذہین ہوتے ہوئے اور مغرور حکمران کی زندگی بسر کرتا رہا" — اُس کی بیوی نے کہا — "اُسے شکست دے کر بھی سلطان محمود نے اُس کی ریاست پر قبضہ نہیں کیا تھا۔"

ابو منصور کے ایک کان کے ساتھ اُس کی بیوی نے منہ لگا رکھا تھا اور دوسرے کان کے ساتھ اُس کی بیٹی سمن تاش نے۔ وہ اسے چلا چلا کر سمجھا رہی تھیں کہ وہ دوسروں کے کہنے میں نہ آئے۔ وہ بولنے لگتا تھا تو بیوی یا بیٹی اُسے ٹوک دیتی تھی۔

"خدا کے لیے میری سنو" — اُس نے گرج کر کہا — "میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک طرف سلطان محمود ہے اور دوسری طرف قادر خان اور توغان خان۔ اگر میں ان کا ساتھ نہیں دیتا تو مجھے ان دونوں سے خطرہ ہے اور اگر میں ان کا ساتھ دیتا ہوں تو سلطان محمود سے دشمنی مول لیتا ہوں۔"

"تو سلطان محمود سے دوستی کر لیں" — اُس کی بیوی نے کہا۔

"میں خاندانی دشمنی کو دوستی میں نہیں بدل سکتا" ابو منصور نے بھڑک کر کہا — "میں سلطان محمود سے اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لوں گا .... اور اب میں کس طرح پیچھے ہٹ سکتا ہوں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ منصوبہ طے ہو چکا ہے۔"

"جس میں سلطان محمود کا قتل بھی شامل ہے" — سمن تاش نے طنزیہ کہا۔

ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور سمن تاش نے دھیمی سی آواز میں ماں سے کہا کہ اپنا رویہ بدل لو اور ان سے معلوم کرو کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔ ابو منصور غصے سے پھنکار رہا تھا۔

"اگر آپ نے منصوبہ بھی تیار کر لیا ہے تو ہم آپ سے یہی کہیں گی کہ آپ پیچھے نہ ہٹیں" — سمن تاش کی ماں نے کہا — "ہم آپ کی حوصلہ افزائی کریں گی ..... آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے، ہمیں بھی بتا دیں تاکہ ہم بھی منصوبے کی کامیابی کے لیے کچھ کریں۔"

ابو منصور ارسلان کی باچھیں کھل گئیں اور اُس نے خراسان پر اپنی، قادر خان اور توغان خان کی متحدہ فوج کے حملے اور سلطان محمود کے قتل کا منصوبہ پوری تفصیل سے سنا

دیا۔

اگلی صبح قادر خان رخصت ہو رہا تھا۔ سمن تاش نے نابینا موسیقار کو اپنے کمرے میں بلا رکھا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں راز کی بات بتا دوں تو تم غزنی تک پہنچا سکتے ہو" — سمن تاش نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم پر اعتبار کس طرح کر سکتی ہوں اور دوسرے یہ کہ غزنی پیغام لے کر کون جائے گا۔"

"میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں جس سے میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں قابلِ اعتبار آدمی ہوں" — نابینا مغنی نے کہا — "اگر آپ کا ایمان وہی ہے جو میرا ہے تو آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے .... آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ غزنی کون جائے گا۔ ایک گھوڑے کا انتظام کریں اور گھوڑے کی باگ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں گا۔ میں بہت دن غائب رہوں گا پھر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

سمن تاش نے قرآن پاک اٹھایا اور چوم کر موسیقار کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ موسیقار نے بھی قرآن کو چوما۔

"یہ قرآن پاک ہے" — سمن تاش نے کہا — "قسم کھاؤ کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔"

"نہیں شہزادی!" — موسیقار نے کہا — "میں قسم نہیں کھاؤں گا۔ قسم کھا لینے سے کسی کی روح کا آئینہ شفاف نہیں ہو جایا کرتا۔ سب سے زیادہ اور بڑی قسمیں بے ایمان اور بددیانت آدمی کھایا کرتے ہیں۔ یہ قرآن پاک میرے ساتھ رہے گا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ واپس آؤں گا تو آپ کو لوٹا دوں گا .... آدمی کب بھیجا جائے؟"

"ابھی" — سمن تاش نے کہا — "تمہارا آدمی ابھی روانہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے" — نابینا مغنی نے کہا — "آپ گھوڑا لائیں اور بتائیں کہ پیغام کیا ہے۔"

"تمہارے آدمی کو سلطان محمود کے پاس جانا ہے" — سمن تاش نے کہا — "اُسے کہنا کہ قادر خان، توغان خان اور ابو منصور مل کر خراسان پر حملہ کرنے والے ہیں اور آپ کے قتل کا منصوبہ بھی تیار ہے۔ سلطان سے کہنا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ ایک بیٹی اپنے

باپ کے خلاف محاذ میں شامل ہو سکتی ہے لیکن مجھے آپ پہلے اسلام کی بیٹی سمجھیں، اس کے بعد مجھے اپنی بیٹی سمجھیں اور اس کے بعد میں اس باپ کی بیٹی ہوں جسے اپنے مذہب کی بجائے اپنا تخت و تاج پیارا ہے۔ سلطان سے کہنا کہ میں جانتی ہوں کہ یہ تینوں مل کر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ انہیں ایک ہلے میں صاف کر دیں گے لیکن جو کشت و خون ہو گا، اسے تصور میں لائیں۔ غزنی، خراسان، خوارزم، بلخ اور بخارا کی وہ مائیں جن کے جوان بیٹے آپس میں لڑ کر مارے گئے تھے، آج بھی اُسی طرح روتی ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کی لاشیں دیکھ کر روئی تھیں۔ ان کی آہوں اور فریادوں سے زمین و آسمان کانپ رہے ہیں....

"غزنی کے سلطان سے کہنا کہ میرا باپ قادر خان اور تغان خان سے خائف ہے۔ آپ میرے باپ کو صلح اور دوستی کا پیغام بھیج کر اس کے دل سے یہ خوف نکال سکتے ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھتے ہوئے نوجوانوں کو کٹ مرنے سے بچائیں۔ مجھے اپنے یتیم ہو جانے کا کوئی غم نہیں ہو گا۔ میری ماں کو بیوہ ہو جانے کا رنج نہیں ہو گا۔ غم اور رنج ہو گا تو یہ کہ جنہیں کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہونا تھا وہ خانہ جنگی میں کٹ مرے اور کفر کے ہاتھ مضبوط ہوئے.... کیا تم یہ ساری باتیں یاد رکھ سکو گے؟ جس طرح میں بتا رہی ہوں اسی طرح اُس آدمی کو بتا سکو گے جو غزنی جا رہا ہے؟"

"اسی طرح بتاؤں گا" ــــ نابینا موسیقار نے کہا ــــ "اور وہ سلطان محمود کو اسی طرح سنائے گا۔"

"نہیں" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "تم موسیقی میں ڈوبے ہوئے انسان میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکو گے۔ تم اپنی دنیا میں گم رہنے والے انسان اس دنیا کو نہیں جانتے جس میں انسان اپنی بادشاہی کی خاطر بے گناہ انسانوں کا خون بہا دیتا اور رعایا پر مذہب کا جنون طاری کیے رکھتا ہے۔"

"سمن شہزادی!" ــــ نابینا موسیقار نے کہا ــــ "الفاظ کے بھنور سے باہر آؤ۔ مجھے بتاؤ کہ سلطان تک اور کیا پیغام پہنچانا ہے۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں اور میں سب کچھ سمجھا سکتا ہوں۔"

"تو چلے جاؤ" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "سلطان محمود سے کہنا کہ میرے باپ کو دوستی کا پیغام بھیجو اور اسے یقین دلاؤ کہ غزنی کی فوج اسے قادر خان اور تغان خان سے بچائے رکھے گی۔"

ایک گھوڑا شہر میں سے گزر رہا تھا۔ اس کی باگیں پکڑے ہوئے ایک نابینا دوسرے ہاتھ میں لاٹھی اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے گھوڑے کے ساتھ ساز بندھا ہوا تھا اور اُس نے اپنے کندھے سے کمان اور ترکش بھی لٹکا رکھا تھا۔ اُسے بہت کم لوگ جانتے تھے اور جو اُسے نابینا مغنی کے نام سے جانتے تھے وہ اسے دیکھ کر ہنس پڑتے تھے کہ اندھا ترکش اور کمان لیے جا رہا ہے۔

گھوڑا شہر کے دروازے سے نکل گیا۔ وہ نابینا موسیقار تھا۔ وہ گھوڑے سے آگے آگے پیدل چل رہا تھا۔ شہر سے کچھ دور جا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اُس نے لاٹھی پھینک دی اور ذرا آگے جا کر اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا لیکن اُس نے گھوڑے کو سرپٹ نہ دوڑنے دیا۔ سوار اندھا تھا مگر وہ خود اعتمادی سے سواری کر رہا تھا اور گھوڑا صحیح راستے پر جا رہا تھا۔

پندرہ سولہ میل بعد وہ جنگل شروع ہو گیا جو امراء وزراء کی شکارگاہ تھی۔ وہاں اونچی نیچی ٹیکریاں اور کھڈ نالے بھی تھے۔ اس علاقے کے ہرن مشہور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا چلا جا رہا تھا کہ ایک ہرن سامنے سے دوڑتا گزرا۔ ہرن کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ اُس کے پہلو میں دو تیر اترے ہوئے تھے۔ نابینا موسیقار نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ ہرن کے تعاقب میں کچھ گھوڑے دوڑے آ رہے تھے لیکن وہ دور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا ہرن کے قریب پہنچ رہا تھا۔ موسیقار نے کندھے سے کمان اتاری اور ترکش سے تیر نکال کر ہرن پر تیر چلایا۔ تیر ہرن کی پچھلی ٹانگ میں اتر گیا اور ہرن کی رفتار بالکل ختم ہو گئی۔ وہ رکا اور بیٹھ گیا۔

موسیقار نے اس کے قریب جا گھوڑا روکا اور اُدھر دیکھنے لگا جدھر سے ہرن کے تعاقب میں گھوڑے دوڑے آ رہے تھے۔ وہ بہت سے سوار تھے۔ نابینا موسیقار

ہرن کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے اُس کے قریب آ رُکے۔ تب اُس نے سواروں کو دیکھا۔

"میں نے آپ کے ہرن کو گرا لیا ہے"۔ نابینا موسیقار نے سواروں سے کہا اور وہ گھبرا گیا۔ اُس نے سواروں کو پہچان لیا تھا۔

سوار بھی اُسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ ان میں ایک قادر خان تھا اور اُس کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر اُس کی بیٹی اختی سوار تھی۔ باقی سب قادر خان کے مشیر اور محافظ تھے۔ قادر خان اُسی روز ابو منصور سے رخصت ہوا تھا اور راستے میں اس نے شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس ہرن کو ایک تیر اُس کا اور دوسرا اختی کا لگا تھا۔ تیسرا تیر نابینا موسیقار نے چلا کر ہرن کو گرا دیا۔

"کیا تم نابینا مغنی نہیں ہو جس نے ہمیں ابو منصور ارسلان کے ہاں نغمے سنائے تھے؟" — قادر خان نے پوچھا۔

اُس کا ساز گھوڑے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اختی نے اپنا گھوڑا موسیقار کے گھوڑے کے قریب کر کے اُس کی زین کے ساتھ ساز والا بندھا ہوا تھیلا کھول لیا۔ موسیقار بُت بن گیا۔ تھیلے میں سے ساز نکالا گیا۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ یہ وہی نابینا موسیقار ہے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ جاسوس ہے"۔ قادر خان کی بیٹی اختی نے کہا — "کیا کوئی اندھا تیر سے ہرن کو نشانہ بنا سکتا ہے؟"

قادر خان نے تلوار نکال کر کہا۔ "سچ بتاؤ تمہاری اصلیت کیا ہے؟"

قادر خان کے محافظ ابھی اس کا گھیراؤ کرنے کے لیے ہلے ہی تھے کہ موسیقار نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا شاہی اصطبل کا تھا۔ اشارہ ملتے ہی سرپٹ دوڑ پڑا۔ قادر خان نے حکم دیا "پکڑو اسے"۔ محافظوں نے اُس کے پیچھے گھوڑے ڈال دیئے مگر موسیقار بہت فاصلہ لے گیا تھا اور وہ ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ محافظ اُس پر تیر نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ اُس کے تعاقب میں رہے۔

موسیقار بڑا اچھا سوار تھا۔ اُس نے گھوڑے کو سست نہ ہونے دیا۔ گھوڑا گھر پھلانگتا جا رہا تھا۔ بہت دُور جا کر موسیقار نے پیچھے دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے

والے بہت دُور تھے۔ انہوں نے مایوس ہو کر تعاقب ترک کر دیا اور واپس چلے گئے۔

ابو منصور کو اطلاع ملی کہ قادر خان جو رخصت ہو گیا تھا، واپس آ گیا ہے۔ ابو منصور دوڑا باہر آیا۔ قادر خان نے اُسے بتایا کہ اس کے دربار کا نابینا مغنی نابینا نہیں اور وہ بھاگ گیا ہے۔

"وہ سلطان محمود کا جاسوس ہے"۔ قادر خان نے کہا۔ "ہماری رات کی باتیں سن گیا ہو گا"۔

"رات کو وہ اس کمرے کے قریب بھی نہیں تھا جس میں ہم باتیں کر رہے تھے" — ابو منصور نے کہا۔ "ہم معلوم کریں گے وہ رات کہاں تھا"۔

"مجھے آپ کی بیٹی پر شک ہے" — قادر خان کی بیٹی اختی نے کہا۔ "وہ سلطان محمود کی شیدائی ہے اور یہ موسیقار اُس کا منظورِ نظر تھا۔ مجھے آپ کی بیٹی کے بوڑھے اتالیق پر بھی شک ہے کہ وہ غدار ہے"۔

ابو منصور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سمن تاش سلطان محمود کے خلاف لڑائی کے سخت خلاف ہے۔ اس کے اتالیق کے متعلق اُسے معلوم نہیں تھا۔ قادر خان اور اختی ابو منصور کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ اتالیق اور اپنی بیٹی کے خلاف کچھ کرے مگر ابو منصور اپنی بیٹی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی دونوں کو بلا لیا گیا۔ جب سمن تاش سے یہ کہا گیا کہ نابینا موسیقار نابینا نہیں تھا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔

"سنو بوڑھے!" — قادر خان نے اتالیق سے کہا۔ "تم جس کا نمک کھاتے ہو اُسی کے خلاف غداری کرتے ہو۔ اگر بتا دو کہ وہ موسیقار یہاں سے کیا خبر لے گیا ہے تو ہم تمہیں بخش دیں گے ورنہ بہت بُری موت مرو گے"۔

"خبردار!" — سمن تاش اپنے اتالیق کے سامنے کھڑی ہو گئی اور قادر خان سے کہا — "اگر میرے اتالیق کی کسی نے توہین کی تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہاں کیا ہو گا۔ ہم کاشغر کے غلام نہیں"۔

"ایک طرف ہو جاؤ سمن!" — اتالیق نے قادر خان سے کہا۔ "ایک ذرا سے

مطلے کی بادشاہی تمہیں خدا نہیں بنا سکتی۔ میں سلطان محمود کا حامی نہیں حق کا حامی ہوں۔ میں موسیقار کو اندھا سمجھتا رہا۔ میں تم سب کو اندھا سمجھتا ہوں۔ اگر وہ اندھا غزنی کا جاسوس تھا تو وہ آنکھوں کا اندھا تھا۔ روح کا اندھا نہیں تھا۔ اُس کے اندر ایمان کی روشنی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کیا خبر لے گیا ہے لیکن میں یہ کہنے سے بالکل نہیں ڈروں گا کہ وہ اگر جاسوس تھا تو پکا مسلمان تھا۔"

قادر خان نے ابو منصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا۔ "اس بڈھے کو قید خانے میں ڈال دیں۔ یہ ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔"

ابو منصور نے اتالیق کی طرف دیکھا۔ اُسے شاید یاد آ گیا ہو گا کہ یہ بزرگ صورت انسان جو عمر کی آخری منزل کے قریب پہنچ چکا تھا، اُس کے باپ کا بھی اتالیق تھا۔ اُس کا اتالیق بھی یہی تھا اور اب اس کی بیٹی بھی اس سے تعلیم و تربیت حاصل کر رہی تھی۔

"آپ اس کا حکم مانیں گے یا اپنے خدا کا؟" بزرگ اتالیق نے کہا۔ "اگر آپ کو دنیا عزیز ہے تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ شکست آپ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"اگر آپ معایا کی بغاوت برداشت کر سکتے ہیں تو اتالیق کو قید میں ڈال دیں" — سمن تاش نے اپنے باپ کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا اور وہ باہر نکل گئی۔

"قادر خان!" — ابو منصور نے کہا۔ "میں نے آپ کے ساتھ دوستی کا اور فوجیں اکٹھی استعمال کرنے کا معاہدہ کیا ہے آپ کی اطاعت قبول نہیں کی۔ مجھے اتنا کمزور نہ سمجھیں کہ میں آپ کے حکم کا پابند ہو جاؤں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ سلطان محمود سے ڈرتے ہیں" — قادر خان نے کہا۔ "کیا آپ کو یقین نہیں آیا کہ میں اور توغان خان آپ کے ساتھ ہیں؟"

"سلطان محمود کا نہیں" — ابو منصور نے کہا۔ "میرے دل میں خدا کا کچھ خوف ابھی باقی ہے۔ مجھ پر بادشاہی کا نشہ ابھی اتنا سوار نہیں ہوا کہ میں نے جس کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت پائی ہے اُسے قید میں ڈال دوں .... آپ چلے جائیں اور اس یقین کے ساتھ جائیں کہ میں سلطان محمود کے ساتھ جنگ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

اُس نے اتالیق کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اتالیق باوقار چال چلتا باہر نکل گیا۔

"سلطان محمود کو اُس کے جاسوس کیا خبر دیں گے؟" — ابو منصور نے کہا — "یہی کہ ہم خراسان پر حملہ کریں گے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ جانتا ہے ہم اُس کے دشمن ہیں۔ اُس نے خراسان کے دفاع کا انتظام کر رکھا ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ تیاری میں زیادہ وقت نہ لگائیں۔"

قادر خان رخصت ہو گیا۔ اتالیق سمن تاش کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ موسیقار نابینا نہیں تھا۔ سمن تاش نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے نابینا ہی سمجھتی رہی ہے اور سلطان محمود کو اُسی نے پیغام بھجوایا ہے لیکن موسیقار نے کہا تھا کہ وہ کسی اور کو بھیجے گا۔

"آنے والی تباہی کو خدا ہی روک سکتا ہے۔" — اتالیق نے کہا۔

"میں نے یہی پیغام بھجوایا ہے کہ تباہی کو روکو" — سمن تاش نے کہا۔ "اگر ضرورت پڑی تو میں خود غزنی چلی جاؤں گی، خواہ مجھے کیسی ہی سزا بھگتنی پڑے۔"

بزرگ اتالیق نے سمن تاش کو جو تعلیم دی تھی وہ رنگ دکھا رہی تھی۔ سمن تاش نڈر اور بے خوف ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جوان آدمی جو ابو منصور کے محل میں جھکا جھکا، مرا مرا، اُداس اُداس سا نابینا موسیقار بنا ہوا تھا وہ خراسان کے پہاڑوں، چٹانوں اور جنگلوں کو چیرتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن تنی ہوئی اور سینہ پھیلا ہوا تھا۔ گھوڑے کو آرام دینے کے لیے وہ اس کی رفتار کم کر دیتا اور بڑی پُرسوز آواز میں گانے لگتا۔ گھوڑا یوں چلا جا رہا تھا جیسے اُس کی آواز سے مسحور ہو کر چلا جا رہا ہو۔ اُسے اب پکڑے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ غزنی کی سلطنت میں داخل ہو چکا تھا۔ غزنی ابھی دور تھا۔

اُس نے چوکیوں پر دو گھوڑے بدلے اور خود آرام نہ کیا۔ اسے وقت کا بھی احساس نہ تھا۔ دن تھا یا رات، وہ چلتا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کون سے دن کا سورج غروب ہو رہا تھا جب اُسے غزنی کی مسجدوں کے مینار دکھائی دینے لگے۔

اور وہ جب اپنے سالار کے پاس پہنچا اُس وقت رات تاریک ہو چکی تھی۔ اُس

نے سالار کو بتایا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ سلطان محمود نے حکم دے رکھا تھا کہ باہر سے کوئی جاسوس خواہ آدھی رات کو واپس آئے، اُسے اُسی وقت جگا لیا جائے۔ موسیقار کو جس کا نام ابی ظفر تھا، دیکھتے ہی اور اس کی مختصر سی بات سن کر سالار اُسے سلطان محمود کے پاس لے گیا۔

ابی ظفر نے پہلے تو یہ بتایا کہ وہ نابینا موسیقار بن کر ابومنصور ارسلان خان کے محل میں درباری حیثیت پا رہا ہے۔ اس طرح اُسے ابومنصور کے دربار کے علاوہ اُس کے گھر تک بھی رسائی حاصل رہی ہے۔

اُس نے سلطان محمود کو پوری رپورٹ دی کہ کاشغر کا قادر خان اور بلخ کا تونمان خان ابومنصور کی فوج کو ساتھ ملا کر خراسان پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور سلطان کے قتل کا منصوبہ بھی بن چکا ہے۔

"ابومنصور ارسلان خان غزنی کے ساتھ خاندانی دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے" — ابی ظفر نے سلطان کو بتایا — "لیکن قادر خان اور تونمان خان نے اُسے اتنا خائف کر دیا ہے کہ وہ اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہے۔ اگر آپ اُسے فوجی تحفظ مہیا کر دیں تو وہ شاید اُن دونوں کے محاذ سے الگ ہو جائے گا۔"

"اُس کے سالاروں کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"سالار ترکستانی عورتوں کے طلسم میں گرفتار ہیں" — ابی ظفر نے بتایا — "قادر خان نے انہیں بڑی ہی حسین اور جوان عورتوں کے جال میں پھانس رکھا ہے۔ وہ ابومنصور کو یہی ایک مشورہ دیئے چلے جا رہے ہیں کہ سلطان محمود پر فوری وار نہ کیا گیا تو وہ چھوٹی چھوٹی امارتوں اور ریاستوں کو نگل جائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سلطان محمود ہندوستان سے تو فاتح بن کر آیا ہے لیکن ان فتوحات نے اُسے فوجی لحاظ سے بہت کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے چپکے سے بہت جلدی خراسان پر حملہ کر کے ایک مضبوط مستقر بنا لیا جائے اور وہاں سے چھوٹے پیمانے کے حملے جاری رکھے جائیں۔"

"ابومنصور کی فوجی طاقت میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا ایلک خان کے وقت جتنی تعداد ہے؟"

"سلطانِ غزنی!" — ابی ظفر نے جواب دیا — "ابومنصور نے اس نفری کی کمی پوری

کر لی ہے جو ایلک خان نے ہماری فوج کے ہاتھوں مروائی تھی ..... میں ابومنصور کی بیٹی سمن تاش کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ، اُس کا بزرگ آتالیق اور اُس کی ماں آپ کی پرستار ہیں۔ ماں بیٹی ابومنصور کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ آپ کے خلاف میدان میں نہ آئے ..... سمن تاش بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ میں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ میں سلطان محمود کی لونڈی بن کر اس کے پاس رہنے کو تیار ہوں۔"

"کیا اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"نہیں" — ابی ظفر نے جواب دیا اور سمن تاش نے اُسے جو پیغام دیا تھا وہ اُس نے سلطان محمود کو سنا دیا۔ سلطان محمود گہری سوچ میں کھو گیا۔

سلطان محمود نے ابی ظفر کو انعام و اکرام دے کر فارغ کر دیا اور اُسی وقت اپنے ایک جوان بیٹے مسعود کو بلایا اور اُسے کہا کہ اُسے ابومنصور ارسلان خان کے پاس جانا ہو گا اور اُسے قائل کرنا ہو گا کہ وہ غزنی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اُسے یقین دلانا ہے کہ اگر وہ دوستی کا معاہدہ کرتا ہے تو اُسے سلطنتِ غزنی کی طرف سے فوجی تحفظ ملے گا۔ سلطان محمود نے مسعود بن محمود کو بہت سی ہدایات دیں اور اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کون کون جا رہا ہے۔

مسعود دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ دو مشیر تھے۔ دونوں فوجی تھے اور بیس گھوڑ سواروں کا محافظ دستہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بارہ تیرہ دنوں کی مسافت تھی۔ مسعود کے ساتھ تحفوں اور سامان کے لیے اونٹوں کا پورا قافلہ تھا۔ ابومنصور کی امارت میں پہنچ کر مسعود شہر سے کچھ دور خیمہ زن ہوا اور اُس نے ابومنصور کے ہاں اپنا ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ سلطان محمود کا بیٹا مسعود آپ سے ملنے اور کچھ ضروری امور طے کرنے آیا ہے۔

ابومنصور دوسرے دن شاہانہ شان و شوکت سے مسعود کے پاس آیا۔ تحائف کا تبادلہ ہوا اور مسعود نے اُسے سلطان محمود کا پیغام دیا۔

"میں آپ کے باپ کی تعریف کرتا ہوں کہ اُس کے مخبر بہت ہوشیار ہیں" — ابومنصور

نے کہا۔ ”اُس کے اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔“

”اگر کوئی بہرہ ہمارے ساتھ دوستی کر لے تو وہ سننے کے قابل ہو جاتا ہے“۔۔۔۔ مسعود نے طنزیہ کہا۔ ابومنصور بہرہ تھا اور بہت اونچی آواز میں اُس کے کان میں بولتے تھے تو وہ سنتا تھا۔

”شہزادے!“۔۔۔ ابومنصور نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں باپ نے تیغ زنی سکھا دی ہے، زبان کا استعمال نہیں سکھایا۔ میں اُس اندھے کی بات کر رہا ہوں جو اندھا نہیں تھا لیکن میرے دربار میں بڑی کامیابی سے نابینا موسیقار بنا رہا۔ اسی نے تمہارے باپ کو یہ خبر دی ہے کہ ہم سلطنتِ غزنی کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں، اس لیے تم دوستی کا پیغام لے کر آئے ہو۔“

”محترم!“ ۔۔۔ مسعود نے کہا۔ ”میں پیغام لے کر آیا ہوں درخواست نہیں .... اور میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کون سے نابینا موسیقار کی بات کر رہے ہیں جو ہمارا مخبر تھا۔ میں آپ کے ساتھ سیدھی سی بات کرنے آیا ہوں کہ آپ اگر اپنی امارت کو زندہ و سلامت رکھنا چاہتے ہیں تو قادر خان اور تو غان خان کی دوستی ترک کر دیں۔ آپ تینوں کی فوج چھ سو ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اپنے بڑے بھائی ایلک خان کا انجام آپ کو یاد ہو گا۔“

”کیا آپ انہیں دھمکیاں دینے آئے ہیں؟“ ۔۔۔ ابومنصور کے ساتھ آئے ہوئے ایک سالار نے کہا۔ ”کیا آپ ہمیں اس قدر کمزور سمجھتے ہیں کہ ہم مرعوب ہو کر آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے؟“

ابومنصور چونکہ بہرہ تھا، اس لیے وہ اپنے سالار کی بات نہ سن سکا۔ مسعود نے سالار سے بات کی تو ابومنصور وہ بھی نہ سُن سکا۔ وہ دونوں کو باری باری دیکھتا اور سمجھتا تھا کہ یہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

”کچھ مجھے بھی بتاؤ“۔۔۔ ابومنصور نے اپنے سالار سے کہا۔ ”تم لوگ کیا بات کر رہے ہو؟“

”یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کا شہزادہ بلخ والوں کی دوستی سے باز نہ آئے تو ہم آپ

پر حملہ کر کے آپ کو تباہ و برباد کر دیں گے۔“

ابومنصور نے مسعود کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ”دیکھو شہزادے! اگر تم ہمیں دھمکی دے کر ہمارے ساتھ دوستی کرنے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ اور اپنی فوج کے ساتھ آنا۔“

مسعود نے ابومنصور کے کان میں بلند آواز سے کہا۔ ”اگر حکمران بہرہ اور سالار جھوٹا ہو تو ملک اور رعایا کا خدا ہی حافظ ہے۔ محترم! آپ کا سالار جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کچھ اور کہا تھا۔ اگر سالار حکومت کے کاروبار میں اسی طرح دخل اندازی کرنے لگیں تو حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔“

کچھ دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ مسعود نے ابومنصور کو اس حد تک قائل کر لیا کہ اُس نے کہا۔ ”آپ چند دن یہاں رہیں۔ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ اتنے دن آپ شکار کھیل سکتے ہیں۔ آپ کے آرام کا، کھانے اور دل بہلانے کا پورا انتظام کیا جائے گا۔“

محل کے باورچی اور ملازم آ گئے اور انہوں نے مسعود اور اس کے تمام آدمیوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام سنبھال لیا۔ ایک روز مسعود خیمہ گاہ سے ذرا ہٹ کر اکیلا ہی ٹہل رہا تھا کہ محل کا ایک ملازم جو خیمہ گاہ کے انتظام کے لیے آیا تھا، مسعود کے قریب آیا اور رازداری سے کہا۔ ”کل شکار کے لیے جائیں۔ ابومنصور ارسلان خان کی بیٹی سمن تاش آپ کو جنگل میں ملے گی۔“

”مجھے جنگل میں قتل کیا جائے گا یا خیمے میں؟“ مسعود نے پوچھا۔

”آپ کے محافظ آپ کے ساتھ ہوں گے“۔۔۔ ملازم نے کہا۔ ”آپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔“

ابی ظفر نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ سمن تاش اپنے باپ کے خلاف ہے۔ سلطان محمود نے مسعود کے ساتھ سمن تاش کا ذکر ویسے ہی کیا تھا۔ ایک شہزادی کا اپنے باپ کے خلاف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ امارت کی فوج پر ایک شہزادی کا حکم

نہیں چل سکتا تھا۔ مسعود نے سمن تاش کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اب ایک ملازم نے اُسے کہا کہ شہزادی سمن تاش اُسے جنگل میں ملے گی تو اُس نے اسے دھوکہ نہ سمجھا۔

دوسرے دن وہ شکار کو چلا گیا۔ وہ اپنے مشیروں کو ساتھ نہ لے گیا۔ پانچ چھ محافظوں کو اُس نے اس طرح ساتھ لیا کہ انہیں اپنے اردگرد پھیلا دیا تاکہ کسی طرف سے بھی کوئی اس پر قاتلانہ حملہ نہ کر سکے۔ وہ گھوڑے پر سوار کمان میں تیر ڈالے اِدھر اُدھر دیکھتا جنگل میں بڑھتا گیا۔ جنگل گھنا ہوتا گیا اور ہری بھری سرسبز چٹانیں بھی آ گئیں۔ اُسے اپنے محافظوں کے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک جگہ تو بہت ہی خوشنما تھی۔ چوڑے پتوں والی بیلیں گھم گھتا ہو کر درختوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ مسعود کو وہاں ایک جوان لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس کے قریب ایک گھوڑا کھڑا تھا اور لڑکی کے کندھے کے ساتھ کمان لٹک رہی تھی۔ ترکش گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھی تھی۔ لڑکی کا چہرہ جس قدر دلنشیں تھا اتنا ہی سنجیدہ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اُس کا یہ انداز پُر اسرار سا لگتا تھا۔ مسعود نے پندرہ بیس قدم دُور گھوڑا روک لیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"اگر آپ مسعود بن محمود ہیں تو گھوڑے سے اُتر کر آگے آ جائیں"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "آپ کے لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ میں سمن تاش ہوں"۔

مسعود گھوڑے سے اُتر کر اُس کے قریب چلا گیا۔ سمن تاش نے اُسے گھاس پر بٹھا لیا۔

"مجھے ایک جوان لڑکی کے بلانے پر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا"۔۔۔ مسعود نے کہا۔۔۔ "لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ سلطان غزنی کی حامی ہیں"۔

"آپ کو غلط بتایا گیا ہے"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میں سلطان غزنی کی نہیں سلطانِ دو جہاں کی پرستار ہوں۔ میں اُس رسول ﷺ کی غلام ہوں جو سلطانِ غزنی کا بھی رسول ﷺ ہے۔ میں اس اصول کی حامی ہوں کہ ایک رسول ﷺ کا کلمہ پڑھنے والوں کو ایک دوسرے کا خون نہیں بہانا چاہیے"۔

"اور اگر ایک بھائی تخت و تاج کی طمع سے اپنے بھائی کا خون بہانے کے لیے تیار ہو جائے تو اُس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اُسے جینے کا کوئی حق نہیں"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "اُس کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے"۔

"ان میں ایک تو تمہارا باپ ہے"۔۔۔ مسعود نے کہا۔۔۔ "میرا یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے خلاف جہاد فرض ہو جانے تک نوبت نہ آئے۔۔۔ کیا تم اپنے باپ کو اس اصول کا پابند نہیں کر سکتیں جس کی تم قائل ہو؟"

"نہیں"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میرا باپ انہی ایمان فروشوں میں سے ہے جن کے خلاف جہاد فرض ہے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے خلاف ہو سکتی ہے لیکن میں جس جذبے کے تحت اپنے باپ کے خلاف ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پیشتر اس کے کہ قادر خان اور توغان خان کی فوجیں یہاں آ جائیں اور ہماری فوج کے ساتھ مل کر ایک طاقتور فوج بن جائیں، آپ ہمارے شہر کو محاصرے میں لے کر اس پر قبضہ کر لیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ خون خرابہ کم ہوگا۔ ہماری فوج آپ کی فوج کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اگر آپ کا مقابلہ تین فوجوں سے ہوا تو دونوں طرف ایک ہی قوم کا اتنا ہی خون بہہ جائے گا جتنا پہلی خانہ جنگیوں میں بہہ چکا ہے"۔

"سلطان جو ہندوستان پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے ہیں، ایسا کبھی نہیں کریں گے کہ کسی مسلمان امارت یا ریاست پر چڑھ دوڑیں"۔۔۔ مسعود نے کہا۔۔۔ "ہمارا مقصد قبضہ کرنا نہیں، عالمِ اسلام کو کفر کے خلاف ایک عسکری قوت بنانا ہے۔ اگر ہمیں آپ کی امارت پر قبضہ کرنا ہوتا تو سلطان مجھے دوستی کا پیغام دے کر نہ بھیجتے"۔

"میرے ابا دوستی نہیں کریں گے"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "انہوں نے آپ کو دوستی کرنے کے لیے کہا ہے لیکن وہ ان سالاروں اور مشیروں کے قبضے میں ہیں، جو قادر خان کے ہی دلکش جال میں آئے ہوئے ہیں۔ وہ کانوں سے بہرے ہیں۔

وہ وہی بات سُن سکتے ہیں جو اُن کے کان میں کہی جائے۔"

سمن تاش چپ ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر ایک طرف دیکھا جیسے کسی شکاری کو گھنی جھاڑیوں میں کسی شکار کی حرکت نظر آ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مسعود کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور درخت کے پیچھے کر دیا۔ وہاں بیلیں دیواروں کی طرح درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ سمن تاش نے مسعود سے کہا ——

"یہاں سے ہلنا نہیں۔ ادھر اُدھر دیکھتے رہنا۔" اور وہ خود بیلوں میں غائب ہو گئی۔

مسعود حیران و پریشان وہاں کھڑا رہا۔ وہ کسی پھندے میں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے قریب ہی اُسے کمان میں سے تیر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ فوراً بعد ایسی کسی کی کرناک آہ سنائی دی۔ مسعود نے منہ سے سیٹی بجائی تو اُس کے تین چار محافظ جو سیٹی سن سکے تلواریں سونتے اُس کے پاس آ گئے۔ اُس نے سامنے والی سرسبز چٹان پر ایک آدمی کو کھڑے دیکھا جس کے کندھے میں تیر اُترا ہوا تھا۔ سمن تاش نے سامنے آ کر مسعود سے کہا ——"میرے ساتھ آؤ۔"

مسعود اپنے محافظوں کے ساتھ اُس چٹان پر گیا جہاں اُس نے وہ آدمی دیکھا تھا جس کے کندھے میں تیر اُترا ہوا تھا۔ وہ آدمی بیٹھ گیا تھا اور کراہ رہا تھا۔ سمن تاش نے خنجر نکال کر اس کی نوک اُس زخمی کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"سچ بتا دو تو تمہیں گھوڑے پر اُٹھا لے جاؤں گی اور یہ تیر نکلوا کر زخم کا علاج کرا دوں گی" —— سمن تاش نے اُسے کہا ——"جھوٹ بولو گے تو درخت کے ساتھ باندھ جاؤں گی۔ سوچ لو کہ تم کیسی موت مرو گے۔"

زخمی نے رحم طلب نگاہوں سے پہلے سمن تاش کو پھر مسعود کو دیکھا اور بولا ——"سلطان محمود کے بیٹے کو قتل کرنے آیا تھا۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سلطان محمود کا بیٹا یہی ہے؟" —— سمن تاش نے پوچھا۔

"مجھے دکھایا گیا تھا" —— زخمی نے کہا ——"میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ وہ بھاگ گیا ہے۔"

"یہ کس کا انتظام ہے؟"

"خانِ کاشغر قادر خان کا" —— زخمی نے کہا ——"اور اُس نے آپ کے والد امیر محترم ابو منصور ارسلان خان سے بات کر لی تھی۔"

"انہوں نے کیا کہا تھا؟" —— سمن تاش نے پوچھا۔

"آپ کے والد محترم نے کہا تھا کہ میں نے سلطان محمود کے بیٹے کو اپنے جواب کے انتظار کے لیے روک لیا ہے۔ تم لوگ اپنا کام کر سکتے ہو۔ وہ شکار کے لیے ضرور جائے گا۔ اسے ایک دو ایسے ملازم دو جو تمہیں قبل از وقت بتا سکیں کہ وہ شکار پر جا رہا ہے۔"

"اسے گھوڑے پر ڈالو اور لے چلو" —— سمن تاش نے مسعود کے ایک محافظ سے کہا اور مسعود سے کہا ——"میں نے آپ کو یہی بات بتانے کے لیے یہاں بلایا تھا کہ آپ یہاں انتظار نہ کریں اور اپنی حفاظت کا انتظام بڑا سخت رکھیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے چٹان پر پودوں کی اوٹ میں اس آدمی کو ہلتا جُلتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس کی کمان بھی تھوڑی سی نظر آ گئی تھی۔ اس جگہ شاہی خاندان کے سوا کوئی بھی شکار کے لیے نہیں آ سکتا۔ میں نے بیلوں کے پیچھے چھُپ کر اس پر تیر چلایا تھا۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟" —— مسعود نے پوچھا۔

"آپ واپس چلے جائیں" —— سمن تاش نے کہا ——"مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہماری ملاقات میدانِ جنگ میں ہو گی؟"

"کیا تم مجھے میدانِ جنگ میں ملو گی؟"

"شاید" —— سمن تاش نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آنسو کیوں؟"

"میں پاگل ہوں" —— سمن تاش نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ ذرا سی خاموشی کے بعد اُس نے مسعود کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور جھنجھلا کر کہا ——"کیا میں پاگل نہیں ہوں مسعود؟ کیا میرا اتالیق پاگل ہے؟ فریب کاروں کی بستی میں سچ کی بات کہنے والوں کو پاگل کہا کرتے ہیں۔ میری شادی ایک ایسے شہزادے کے

ساتھ ہو گی جو سراب بنتا ہے اور جسے احساس ہی نہیں کہ قوم اور مذہب کی کیسا ذمہ داریاں ہیں جو اُس پر عائد ہوتی ہیں"۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کمان تھی اور دوسرے ہاتھ میں خنجر۔ اُس نے دونوں ہتھیار آگے کر کے پُرجوش آواز میں کہا —
"میری شادی ان سے ہو چکی ہے۔ یہ میرے سہاگ کی دو نشانیاں ہیں۔ کمان اور خنجر۔ عورت مرد کی تفریح اور نمائش کی چیز نہیں۔ کمان اور خنجر عورت کا زیور ہے"۔

"تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" — مسعود نے کہا۔ "جس کے ہاتھ میں کمان اور کندھے کے ساتھ ترکش لٹک رہی ہو، اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آیا کرتے ... سمن! کیا ہمیں یہیں کھڑے رہنا چاہئیے؟"

"نہیں" — سمن تاش نے کہا — "آپ چلے جائیں .... آپ غزنی چلے جائیں۔ آپ کو اُس جاسوس نے جو یہاں نابینا موسیقار بن کے آیا تھا، بہت کچھ بتا دیا ہوگا۔ اُس نے آپ کے والدِ محترم تک میرا پیغام پہنچا دیا ہوگا"۔

"ہم اُسی سے پوچھ لو" — مسعود نے اپنے ایک محافظ سے کہا — "ابی ظفر کو بلاؤ"۔

ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا چٹان پر آ گیا۔ وہ بھرے بھرے چہرے والا تنومند جوان تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر مسعود تک گیا تو اُس کی چال سے جیسے چٹان ہل رہی تھی۔

"انہیں پہچانتے ہو ظفر؟" — مسعود نے سمن تاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

ابی ظفر سمن تاش کو دیکھ کر مسکرایا۔ سمن تاش بھی مسکرا دی۔

"میں نے تمہیں مشکل سے پہچانا ہے" — سمن تاش نے اُسے کہا — "اپنے سلطان تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

"لفظ بہ لفظ" — ابی ظفر نے جواب دیا۔

"یہ ہمارا بڑا ہی کامیاب جاسوس ہے" — مسعود نے کہا — "یہ محافظ دستے کا آدمی نہیں۔ اسے میں اپنی راہنمائی کے لیے ساتھ لایا ہوں .... اور سمن! اُس زخمی کو کہاں لے گئے ہیں؟"

"میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ اُسے اپنے باپ کے پاس لے جاؤں یا جراح کے

پاس" — سمن تاش نے جواب دیا — "میں جا رہی ہوں۔ معلوم نہیں کہاں ملاقات ہوگی۔ ہوگی یا نہیں۔ آپ کو دوستی کے پیغام کا جواب مل گیا ہے۔ آپ آج ہی روانہ ہو جائیں"۔

سمن تاش ہرن کی طرح کودتی پھلانگتی چٹان سے اُتر گئی۔ مسعود اُسے دیکھتا رہا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور شہسوار کی طرح ایڑ لگا کر جنگل میں غائب ہو گئی۔ جب تک اُس کے گھوڑے کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی مسعود اُدھر ہی دیکھتا رہا۔

"آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ لڑکی اپنے [illegible] کی اتحاد کے متعلق کس قدر جذباتی ہے" — ابی ظفر نے کہا — "میں نے اس کے ساتھ بہت وقت گزارا ہے۔ اسے جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لڑکی غزنی کی سلطنت کے لیے بہت بڑی قربانی دے گی"۔

مسعود کی ذہنی کیفیت بدل گئی۔ اُس نے اپنے محافظوں سے کہا —
"میرے ساتھ چلو" — اور وہ چٹان سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کے تمام محافظ اُس کے پاس آ گئے تو اس نے شہر کا رُخ کر لیا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ تیر کے زخمی کو جس گھوڑے پہلے جایا جا رہا تھا وہ ابھی شہر میں داخل ہی ہُوا تھا۔ سمن تاش کا گھوڑا اس سے آگے نکل گیا تھا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔ مسعود نے حکم دیا کہ اس زخمی کو محل میں لے چلو۔

ابو منصور ارسلان خان اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ مسعود بن محمود اطلاع دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے مسعود کا ایک محافظ اندر داخل ہوا۔ اُس نے کندھے پر ایک زخمی کو اٹھا رکھا تھا جس کے کندھے میں ایک تیر اُترا ہوا تھا۔ مسعود کے اشارے پر محافظ نے زخمی کو فرش پر لٹا دیا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے مسعود بن محمود؟" — ابو منصور نے پوچھا۔

"یہ آپ کا وہ جواب ہے جو آپ نے میرے دوستی کے پیغام کا دیا ہے" — مسعود نے کہا — "میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ آپ نے مجھے زیادہ دن

استفسار نہیں کرایا۔"

ابومنصور اُٹھ کھڑا ہُوا اور غصّے میں بولا۔"یہ سب کیا ماجرا ہے؟ کیا سلطان محمود نے اپنی اولاد کو دربار کے آداب نہیں سکھائے ؟"

"نہیں" ـــــ مسعود نے ابومنصور کے قریب کھڑے ایک سالار سے کہا۔"اپنے آقا کے کان میں کہئے کہ کفار اور ایمان فروشوں نے ہمارے باپ کو اتنی فرصت نہیں دی کہ دربار میں بیٹھتا اور اپنی اولاد کو دربار کے آداب سکھاتا۔ ہم میدانِ جنگ میں تیروں کی بوچھاڑوں میں پل کر جوان ہوئے ہیں"۔

ابومنصور نے اپنے سالار کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سالار نے اُس کے کان میں مسعود کے الفاظ دہرائے۔ ابومنصور نے مسعود کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔"ہندوستان کے ہیروں اور زروجواہرات نے اس لڑکے کا دماغ خراب کردیا ہے۔ یہ ہمیں اپنے باپ کے جنگی ہاتھیوں سے ڈرانے آیا ہے"۔

"اپنے آقا کے کان میں کہئے" ـــــ مسعود نے کہا۔"طاقت ہاتھیوں کی نہیں ایمان کی ہوتی ہے۔ ہم اپنے تمام ہاتھی آپ کو دے دیتے ہیں مگر آپ ہمیں شکست نہیں دے سکیں گے۔ اپنے مہمان کو چوری چھپے قتل کرانے والے میدان میں بڑی جلدی پیٹھ دکھا جاتے ہیں"۔

جب ابومنصور کے کان میں مسعود کے الفاظ پہنچے تو وہ بیٹھ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ مسعود دربار سے نکل گیا۔

"حکومت کا نشہ ہی ایسا ہے کہ عقل پر سیاہ کالا پردہ پڑ جاتا ہے" ـ سلطان محمود نے اپنے بیٹے مسعود سے ابومنصور کی ملاقات اور قاتلانہ حملے کی کوشش کی تفصیلات سن کر کہا ـــ "میں نے دوستی کا پیغام بھیج کر اپنا فرض ادا کردیا ہے۔ اب میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ البتہ میرے دل پر ایک بوجھ آپڑا ہے۔ قنوج کا مہاراجہ راجیاپال بھاگ گیا تھا۔ اُس نے اپنا خزانہ پہلے ہی کہیں غائب کردیا تھا۔ مجھے خزانے کی ضرورت نہیں۔ قنوج کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ اب ہندوستان

سے اطلاع آئی ہے کہ راجیاپال قنوج میں ہمارے حاکموں کو پیغام بھیج رہا ہے کہ اُس کی جان بخشی کی جائے اور وہ غزنی کا باجگزار رہے گا مگر لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر دوسرے شکست خوردہ مہاراجوں کو ساتھ ملا کر راجیاپال کو خوفزدہ کررہا ہے اور ہمارے خلاف فیصلہ کُن جنگ کے لیے فوجیں اکٹھی کررہا ہے۔

"مجھے فوراً وہاں چلے جانا چاہیئے مگر میں کاشغر اور بخارا کے ساہیوں کا سر کچلنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ابومنصور کی بیٹی نے تمہیں کہا ہے کہ ہم اُس کے باپ پر حملہ کریں۔ ہم قوم کی اس بیٹی کی خواہش پوری کردیں گے اور ہمارے لیے یہ جنگی اقدام اس لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ یہ لوگ عیسائیوں کے زیرِ اثر ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر انہوں نے خراسان پر حملہ کیا تو منہ کی کھائیں گے، لیکن خطرہ یہ ہے کہ عیسائی ان لوگوں کے ہاں اپنے اڈے بنالیں گے۔ ہماری جنگ اسلام کی مخالف قوتوں کے ساتھ ہے..... میرا خیال ہے کہ ابومنصور اور قادر خان خراسان پر حملے کا منصوبہ تو بنا سکتے ہیں، حملے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ تاہم ہمیں تیار رہنا چاہیئے"۔

سلطان محمود کا یہ خیال غلط نکلا۔ کوئی دو ماہ بعد اُسے اطلاع ملی کہ کاشغر، بخارا اور بلاساغون کی فوجیں بلخ کی سمت بڑھی آرہی ہیں۔ بلاساغون ابومنصور ارسلان کا دارالحکومت تھا۔ سلطان محمود نے پہلے ان تینوں کے اتحاد کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اُسے جب ان کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ پریشان سا ہوگیا۔ کاشغر، بخارا اور بلاساغون خراسان کی سرحد سے بہت دُور پہاڑی علاقے میں واقع تھے اور ایک دوسرے سے بھی دور تھے۔ خراسان تک کی مسافت خاصی دشوار تھی۔ راستے میں ایک بڑا دریا بھی تھا۔

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں فوجیں بہت عرصے سے جنگ کی تیاریاں کررہی ہیں" ـــ سلطان محمود نے اپنے سالاروں اور مشیروں سے کہا ـــ "اتنی دشوار پیش قدمی تیاری کے بغیر نہیں کی جاسکتی"۔

سلطان غزنی نے شاید اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ قادر خان راستے میں بہتی

قبائل کو مالِ غنیمت کا لالچ دے کر اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلا کر اپنے ساتھ ملاتا چلا آ رہا ہے۔ یہ قبائل وحشی، خونخوار اور جنگجو ہیں۔ ان کا اپنا ہی بنایا ہوا کوئی مذہب ہے۔"

"مجھے معلوم ہے" — سلطان محمود نے کہا — "اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں انہیں بلخ سے کچھ دور میدانی علاقے میں لا کر لڑاؤں گا۔ ان قبائل سے میں واقف ہوں۔ وہ جنگجو اس لیے ہیں کہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور وہ صرف پہاڑیوں میں لڑ سکتے ہیں۔ اُن کے گھوڑے بھی سنگلاخ وادیوں میں بھاگنے دوڑنے کے عادی ہیں۔"

غزنی سے بلخ تک کا فاصلہ بھی خاصا زیادہ تھا۔ سلطان محمود نے ابل ظفر (نابینا موسیقار) کی اطلاع پر پہلے ہی خراسان کی فوج کو بلخ سے کچھ دور جمع ہو کر تیاری کی حالت میں رہنے کا حکم بھیج دیا تھا۔ وہاں ہاتھیوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ سلطان محمود نے غزنی سے تین سو ہاتھی اس حکم سے بلخ کو روانہ کر دیئے کہ بہت تیز رفتار سے جائیں۔

صرف دو مؤرخوں نے اس جنگ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک عطبی ہے اور دوسرا ابن الاثیر۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں سلطان محمود اپنی جنگی طاقت کی نمائش پر زیادہ توجہ دے رہا تھا تاکہ اس کے دشمن اور پہاڑی قبائل مرعوب ہو جائیں اور آئندہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔

قادر خان، تُوغان خان اور ابو منصور کی فوجیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے لیے رسد کی کمی نہیں تھی۔ پہاڑی قبائل ان کی بہت مدد کر رہے تھے۔ دونوں مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ قبائل سرپٹ دوڑتے گھوڑوں سے تیر اندازی کے ماہر تھے اور لڑائی میں بھی بھاگتے دوڑتے لڑا کرتے تھے۔ سلطان محمود کے دشمنوں کو ان کی اسی مہارت اور لڑنے کے انداز پر ناز تھا۔ تینوں فوجوں کی اپنی نفری بھی بہت تھی۔ مؤرخوں کے اندازے کے مطابق سلطان محمود کی فوج بھی اتنی ہی

تھی۔ اس کے پاس ہاتھی تھے جو اس کے دشمنوں کے پاس نہیں تھے۔ اس کے علاوہ سلطان کے پاس تقریباً چار سو رتھ تھے جو اس نے ہندوستان کی شکست خوردہ فوجوں سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان کے استعمال کا قائل نہ تھا لیکن قبائلیوں سے لڑنے کے لیے اُس نے رتھوں کا استعمال ضروری سمجھا۔

یہ ہلکی قسم کے رتھ تھے۔ ہر رتھ کے آگے ایک گھوڑا جوتا جاتا اور اس میں دو آدمی ہوتے تھے۔ دونوں لڑاکے ہوتے تھے۔ ایک گھوڑے کو ہانکتا اور دوسرے کے پاس پھینکنے والی برچھیاں اور تیر و کمان ہوتے تھے۔ سلطان محمود نے رتھوں کے دو دستے تیار کر رکھے تھے اور اب اُس نے دونوں دستوں کو بلخ پہنچنے کا حکم دے دیا تھا۔

مؤرخوں اور اُس دور کے جنگی مبصروں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی فوج ٹریننگ اور میدانِ جنگ میں ڈسپلن اور دستوں کے باہمی ملاپ کے لحاظ سے ایک عمدہ فوج تھی۔ نہایت دشوار صورتِ حال میں بھی دستوں میں بھگدڑ اور انتشار پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس معرکے میں سلطان کو اپنی یہ کمزوری پریشان کر رہی تھی کہ اُس کی فوج کی تقریباً نصف نفری ہندوستان میں شہید ہو گئی تھی۔ اس کی کمی کسی حد تک اُس نے اُن ہندو دستوں سے پوری کر لی تھی جنہیں وہ جنگی قیدی بنا کر لاتا رہا تھا۔ ان ہندوؤں کو اُس نے اپنی فوج کی بجائے بہتر اور زیادہ مراعات دے رکھی تھیں۔ ان میں سے ہندو اکثر اسلام قبول کرتے رہتے تھے۔ ان دستوں کو وہ ہندوستان نہیں لے جاتا تھا۔

جب سلطان محمود بلخ پہنچا تو اُس نے آرام کیے بغیر دستوں کی تقسیم کا کام شروع کر دیا مگر اُس سے یہ ضروری کام دلجمعی سے نہ ہو سکا کیونکہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن ترمذ کے مقام پر دریائے آکسس پار کر رہا ہے۔ یہ مقام بلخ سے تقریباً پچاس میل دور تھا۔ سلطان محمود کو سالاروں نے مشورہ دیا کہ دریا پار کرنے کے دوران ہی حملہ کر دیا جائے لیکن سلطان نے کہا کہ انہیں اطمینان سے گذر

آنے دو۔ اس کے بعد دریا ہمارا دوست ہوگا۔ سلطان محمود کو اس اطلاع سے یہ اطمینان ہُوا کہ دشمن کا رخ بلخ کی طرف ہے۔

سلطان محمود نے ہاتھیوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک حصّے کو بلخ سے پانچ چھ میل دُور دائیں اور دوسرے حصّے کو اتنی ہی دُور بائیں جاکر دریا کی طرف چلے جانے کو کہا۔ ان کے ساتھ اُس نے ایک ایک سَو رتھ اور ایک ایک دستہ پیادوں کا بھیج دیا۔ انہیں سلطان کے حکم کا انتظار کرنا تھا اور ان کے لیے اہم حکم یہ تھا کہ وہ دشمن کو نظر نہ آئیں۔

چوتھے روز دشمن کا ہراول نظر آیا۔ سلطان محمود کو اطلاع ملی تو وہ اٹھا اور قبلہ رُو ہوگیا۔ اُس نے دو نفل ادا کیے اور دعا کے بعد پہلا حکم یہ دیا کہ دشمن کے ہراول پر ایک بھی تیر نہ چلے۔ وہ حکم دے ہی رہا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن کا ایک جاسوس پکڑ لائے ہیں۔ اس کے حکم پر جاسوس کو اس کے سامنے لایا گیا۔

"ہاں سلطان!" — جاسوس نے کہا — "میں بلاساغون کا جاسوس ہوں لیکن میں ایک خبر دینے آیا ہوں، کچھ معلوم کرنے نہیں آیا۔"

"کیا خبر ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے فرزند مسعود کے لیے ہے" — جاسوس نے کہا — "آپ انہیں ذرا جلدی بلالیں۔"

مسعود کو بلایا گیا تو جاسوس نے سلطان محمود کی موجودگی میں بتایا کہ اُسے ابو منصور کی بیٹی سمن ... نے اس زبانی پیغام کے ساتھ بھیجا ہے — "میں نے تمہیں کہا تھا کہ میدانِ جنگ میں ملاقات ہوگی۔ میں اُن مستورات کے ساتھ آگئی ہوں جو میرے ابا اور اس کے سالاروں وغیرہ کی بیویاں اور داشتائیں ہیں۔ ہماری فوجوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہماری فوج دائیں پہلو پر ہے۔ بخارا کی فوج بائیں پہلو پر اور درمیان میں قادر خان کی فوج ہے۔ قبائلیوں کو تینوں فوجوں کے ساتھ تقسیم کردیا گیا ہے۔ میرے ابا اپنی فوج کی کمان خود کر رہے ہیں۔ آپ کے والدِ محترم بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری ترتیب جان کر اپنی فوج کی تقسیم کس طرح کریں گے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ ہماری طرف تم آنا۔ میں کوشش کروں گی کہ تم تک زندہ پہنچ سکوں۔ زندہ نہ رہی تو خدا حافظ!"

جاسوس نے کہا — "آپ مجھے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ شہزادی نے کہا تھا کہ واپس نہ آنا۔"

"سنو مسعود!" — سلطان محمود نے جاسوس کو باہر نکال کر مسعود سے پوچھا — "کیا یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں اس طرف نہیں بھیجوں گا۔"

"معاملہ جذباتی ہے لیکن ذاتی یا سفلی جذبات کا نہیں" — مسعود نے جواب دیا — "آپ مجھے اُسی طرف بھیجیں۔ میں اس لڑکی کی بجائے اس کے باپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس پیغام کو دھوکہ نہ سمجھیں۔ آپ کو اس لڑکی کے متعلق ابی ظفر بھی بتا چکا ہے اور میں نے بھی آپ کو بہت کچھ بتایا ہے۔"

پانچویں صبح کا سورج سرخ رنگ کی گرد میں اس طرح چھپا ہُوا تھا کہ چمکتے ہوئے گولے کی طرح نظر آتا تھا۔ الیاس بن اسعد کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں فوجیں اللہ اکبر کے نعرے لگا رہی تھیں اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں۔ دشمن اسی ترتیب میں آرہا تھا جو سمن تاش نے بتائی تھی۔ گھوڑسوار قاصدوں کی سرپٹ بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اُن کی اطلاعوں سے دشمن کی ترتیب کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود اس کے مطابق قاصدوں کو پیغام دے رہا تھا۔ قادر خان کی فوج درمیان میں اور خاصی پیچھے تھی۔ توغان خان اور ابو منصور دائیں اور بائیں بلخ سے چند میل دُور چلے آرہے تھے۔ یہ گھیرے کی ترتیب تھی۔ وہ بلخ کو اور سلطان محمود کی فوج کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

سلطان محمود نے مسعود کو اُس طرف بھیج دیا تھا جدھر ابو منصور کی فوج تھی۔ جدھر سے توغان کی فوج آرہی تھی اُدھر سلطان نے ایک اور تجربہ کار سالار بھیج دیا تھا۔ دشمن کی تینوں فوجوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو میل کا فاصلہ

تھا۔ ان خالی جگہوں میں سلطان محمود کے دستے جا رہے تھے۔ ہاتھی، رتھ اور پیادہ دستے پہلے ہی اُس طرف نکل گئے تھے۔ اس سے سلطان نے دشمن کے لیے یہ صورت پیدا کر دی کہ توغان خان اور ابومنصور کی فوجیں دائیں بائیں سے سلطان کے گھیرے میں آ گئیں۔

سلطان محمود نے اپنے پیغاموں کے ساتھ قاصد دوڑا دیئے۔ سورج اوپر اٹھ آیا تھا مگر گرد نے اس کی روشنی مدھم کر رکھی تھی۔ اچانک زمین و آسمان کانپنے لگے۔ سلطان محمود نے دشمن کے دائیں اور بائیں پہلوؤں پر حملے کا حکم دے دیا تھا۔ دونوں پہلوؤں پر دونوں اطراف سے حملہ ہوا۔ ایک طرف ہاتھی اور رتھ تھے۔ قبائلیوں نے اپنے مخصوص انداز سے گھوڑے دوڑانے اور تیراندازی کی کوشش کی لیکن اتنے گھمسان کی جنگ میں انہیں اپنے پرائے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

قادر خان کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اُسے پہلوؤں سے کوئی پیغام نہیں مل رہا تھا۔ اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اُس کے پہلو کچلے اور ہاتھیوں تلے مسلے جا رہے ہیں۔

دائیں طرف ابومنصور کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس کی فوج پر ایک طرف سے مسعود نے حملہ کیا اور جب اس کی فوج اس طرف متوجہ ہوئی تو پیچھے سے چنگھاڑتے ہاتھیوں، رتھ سواروں اور پیادہ دستوں نے حملہ کر دیا۔ رتھ سواروں کی توجہ قبائلیوں پر تھی۔ جونہی کوئی قبائلی اپنے گھوڑے کو باہر نکالتا اور اپنے انداز سے لڑنے کی کوشش کرتا، دو رتھ سوار اس کے دائیں بائیں دوڑ پڑتے اور اسے برچھی یا تیر سے گرا لیتے۔

شام سے کچھ پہلے مسعود ایک بلند جگہ کھڑا لڑائی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عقب سے تین گھوڑے سرپٹ دوڑتے آ رہے تھے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ مسعود کے محافظوں نے گھوڑے اُن کی طرف دوڑا دیئے کیونکہ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا

تھا۔ وہ تینوں سواروں کو اپنے ساتھ مسعود کے سامنے لے آئے۔ ان میں ایک سوار سمن تاش تھی جس کے سر اور چہرے پر موٹا پردا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو مرد گھوڑ سوار تھے۔ سمن تاش کود کر گھوڑے سے اُتری اور دوڑتی مسعود کے پاس آئی۔

"بڑی مشکل سے تمہارا پتہ چلا ہے"۔۔۔ وہ ہانپتی ہوئی سانسوں سے بول رہی تھی "میرے ابا بھاگنے کی فکر میں ہیں لیکن ان کا ایک سالار انہیں جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ فوج کا قلب پیچھے لے گئے ہیں۔ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہیں شکست ہو چکی ہے۔ اُن کے پاس قادر خان کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ اُس نے غزنی کی طرف پیشقدمی روک دی ہے اور وہ اپنی فوج کو دائیں اور بائیں کمک کے طور پر تقسیم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ حوصلہ نہ ہارنا، سلطانی فوج کو ہم گھیرے میں لے رہے ہیں ۔۔۔ میں نے تمہارا سراغ کس طرح لگایا اور یہاں تک کس طرح پہنچی، یہ پھر کبھی بتاؤں گی۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ ہمارے قلب کو تم ذرا سی ہمت سے پکڑ سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسری طرف لڑائی کی صورتِ حال کیا ہے۔ میں اپنی فوج کی بات کر رہی ہوں"۔

مسعود سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میرا گھوڑا لاشوں کو روندتا آیا ہے۔ مرنے والوں میں غزنوی بھی ہیں، ترکستانی اور بخاری بھی مگر مر کر سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ وہ مسلمان تھے"۔ اُس نے چلا کر کہا۔۔۔ "اپنی قوم کا خون روکو مسعود! میں جو کہتی ہوں وہ کرو۔ قادر خان کی کمک آ گئی تو یہ قتل و غارت نہیں رُکے گی۔ اس سے پہلے ہمارے قلب کو مٹھی میں لے لو"۔

"تم ساتھ چلو گی؟"

"نہیں!"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میں جا رہی ہوں۔ تم آؤ"۔

وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور دو محافظوں کے ساتھ جو اُس کے زرخرید بنے ہوئے تھے، میدانِ جنگ کے گرد و غبار میں غائب ہو گئی۔ وہ مسعود کو بتا گئی تھی کہ ابھی

کا باپ کہاں ہے۔

قادر خان کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ وہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تو غان خان اور ابو منصور کو کمک بھیج رہا تھا۔ سلطان محمود کو اُس کے اس اقدام کا پتہ اُس وقت چلا جب رات گہری ہو رہی تھی۔ اس وقت حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان نے اپنے پلان میں ردّ و بدل کر لیا اور اُسی وقت مسعود اور دوسرے سالار کی طرف پیغام بھیج دیا کہ تازہ صورتِ حال کیا ہے۔

مسعود اپنی جگہ نہیں تھا۔ وہاں ایک نائب سالار نے پیغام وصول کیا۔ مسعود کم و بیش ایک سو منتخب سپاہیوں اور چھاپہ مار کمانداروں کو ساتھ لے کر ابو منصور کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کرنے چلا گیا تھا۔ یہ ایک شب خون تھا۔ ابو منصور حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔ اس کی فوج بُری طرح کچلی گئی تھی۔ سلطان محمود نے اُس پر حملہ ہی ایسے انداز سے کرایا تھا کہ وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی نشاندہی کے مطابق دریا کے کنارے چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اس کا ایک سالار، اس کی تین بیویاں، چند ایک محافظ اور چند قاصد تھے۔ وہاں اس پر حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔

مسعود دور کا چکر کاٹ کر وہاں تک پہنچا۔ اُسے دو تین مشعلیں جلتی نظر آئیں۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دیں اور انہیں پھیلا کر آگے بڑھا۔ ابو منصور کے صرف دو محافظ جاگ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ وہ گھوڑوں کی آوازیں سُن رہا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ وہی ہوں گے۔ اُس نے ایک مشعل اٹھائی اور اوپر کر کے دو مرتبہ دائیں بائیں ہلائی اور دو مرتبہ اوپر نیچے کی۔ مشعل رکھ کر وہ ایک خیمے کے قریب جا کھڑا ہوا اور منہ سے دھیمی سی آواز نکالی۔ خیمے میں سمن تاش سوئی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اُٹھ کر باہر آ گئی اور محافظ سے کہا کہ تم آگے چلے جاؤ۔

چونکہ راہنمائی موجود تھی اس لیے شب خون میں کوئی دشواری اور کوئی خطرہ نہ تھا۔ ابو منصور اور سالار اپنے اپنے خیموں میں سوئے ہوئے تھے۔ ان تک زخمیوں کی

کرب ناک آوازیں نہیں پہنچ رہی تھیں، نہ وہاں تک خون اور لاشوں کی بو پہنچ رہی تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ وہاں تک کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا مگر ایمان فروش باپ کی دین دار بیٹی ایک بہت بڑا خطرہ بن کر اُس کے ساتھ موجود تھی۔

مسعود نے خیمہ گاہ میں داخل ہو کر ایک مشعل اٹھائی اور ابو منصور کے خیمے میں جا کر اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو مسعود کو دیکھ کر پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ باہر مسعود کے آدمیوں نے محافظوں کو جگا کر الگ کھڑا کر لیا اور سالار کو بھی پکڑ لیا تھا۔ ابو منصور نے مسعود سے کہا کہ وہ شکست تسلیم کرتا ہے لیکن اُس کی بیٹی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ مسعود نے اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

نصف شب کا عمل ہو گا۔ سلطان محمود ابھی ابھی میدانِ جنگ کا چکر لگا کر آیا تھا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ مسعود ابو منصور کو پکڑ لایا ہے۔ سلطان دوڑتا باہر آیا۔ اُس کے لیے یہ خبر معمولی نہیں تھی۔ ابو منصور کے ساتھ سمن تاش بھی تھی۔ انہیں سلطان اپنے خیمے میں لے گیا۔

"کیا سلطان میری دوستی قبول کر لیں گے؟" — ابو منصور نے پوچھا۔

"میں نے دوستی کا ہی پیغام بھیجا تھا" — سلطان محمود نے کہا — "مگر تم نے میرے بیٹے کو قتل کرانے کی کوشش کی ..... کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟ تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ تمہاری دوستی میں خلوص ہے؟ تمہارے پاس ہے کیا؟ تمہاری حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ تم میرے قیدی ہو"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — ابو منصور نے کہا — "میرے پاس کچھ نہیں رہا پھر بھی آپ کی دوستی چاہتا ہوں۔ میں آپ کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا مگر ....."

اور اُس نے اقبالِ جرم کے انداز سے بتا دیا کہ وہ مجبور ہو کر اپنی فوج لے آیا ہے۔

سمن تاش کھڑی سن رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر سلطان کے سامنے دو زانو ہو گئی اور سلطان کا ہاتھ چوم کر کہا — "کیا آپ کے دل میں میرے لیے کچھ جگہ ہے؟" — اُس نے مسعود کی طرف دیکھا اور سلطان محمود سے کہا — "میں یہ دوستی پکی کر سکتی ہوں"۔

سلطان محمود اشارہ سمجھ گیا۔ ابو منصور نے کہا ”ہاں سلطان! میرے پاس یہی کچھ رہ گیا ہے ... ایک بیٹی .... اس نے مجھے آپ کے خلاف لڑنے سے روکا تھا۔ اسے اپنی بیٹی بنالیں۔“

سلطان محمود نے اُسی وقت یہ پیشکش قبول کر لی اور مسعود کی رضامندی سے سمن تاش کو اُس کی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ لڑائی اور شادی ۱۰۲۰ء میں ہوئی تھی۔

دوسرے دن کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ ابو منصور نے اپنی فوج کو لڑائی سے الگ ہو جانے کا حکم بھیج دیا۔ سلطان محمود نے اُسے قیدی سے مہمان بنالیا تھا۔ قادر خان اور تو غان خان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ڈیڑھ دو سال بعد ان دونوں نے بھی سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

دیوتا نے پنڈت کو نگل لیا

بھارت میں کالنجر، قنوج اور گوالیار ایک مثلث کی صورت میں واقع ہیں۔ اس مثلث میں سے ہندوؤں کے دو مقدس دریا، جمنا اور گنگا گذرتے ہیں۔ کئی اور ندی نالے بھی جسم کی رگوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں اس علاقے میں گھنے جنگلات تھے۔ ٹیلے، ٹیکریاں اور پہاڑیاں بھی تھیں۔ یہ تینوں مقامات ایک دوسرے سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل دور ہیں۔ اُس دور میں جب غزنی کا بُت شکن ہندوستان پر دہشت بن کے چھا گیا تھا، یہ بڑی مشہور راجدھانیاں تھیں۔ قنوج کے متعلق سنایا جا چکا ہے کہ بلند شہر، متھرا، منج اور چھوٹے بڑے کئی ایک قلعوں کی فتح کے بعد محمود غزنوی نے قنوج کو تہ تیغ کر لیا تھا اور قنوج کا مہاراجہ راجیا پال جس کا بڑا شہرہ تھا، محاصرے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

کالنجر کے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ پہلے بھی کشمیر کے حملے کی کہانی میں یہ نام پڑھ چکے ہیں۔ وہ دراصل کالانجر ہے جو آج کوٹلی کہلاتا ہے۔ اب جس جگہ کا ذکر ہو رہا ہے یہ کالنجر ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخری دنوں میں قنوج کا مہاراجہ راجیا پال سلطان محمود غزنوی کے مقابلے سے پہلے ہی منہ موڑ گیا تھا تو وہ کالنجر، قنوج اور گوالیار کی مثلث سے نکل گیا تھا۔ راجیا پال نے اپنا تمام تر خزانہ شہر سے دور ایک ایسی پہاڑی اور جنگلاتی جگہ چھپا دیا تھا جہاں انسانوں کا گذر کم ہی ہوتا تھا۔ اس کا رازدان صرف ایک

پنڈت تھا اور بعد میں محمود غزنوی کا ایک جاسوس اس خزانے کے راز سے واقف ہوا تھا۔ اُس نے قنوج کی فتح کے وقت اس پنڈت کو پکڑوا دیا تھا مگر پنڈت نے سلطان کو بتایا تھا کہ وہ اُسے خزانے کی جگہ لے جا سکتا ہے لیکن وہاں خزانہ نہیں ہو گا۔ وہ راجیا پال اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

"وہ گیا کہاں ہے؟" سلطان محمود نے اُس سے پوچھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی اُس کے ساتھ چلا جاتا"۔ پنڈت نے جواب دیا تھا — "آپ کا قیدی نہ ہوتا"

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم واحد آدمی تھے جو مہاراجہ کے خزانے کے راز سے واقف تھے" — سلطان کے ایک سالار نے اُس سے پوچھا — "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ تمہیں بتائے بغیر چلا گیا ہو؟"

"خزانے سے جسے پیار ہو وہ انسانوں کے پیار سے محروم ہو جاتا ہے" — پنڈت نے کہا — "جو مہاراجہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے مندروں کو توہین اور تباہی و بربادی کے لیے چھوڑ گیا ہے، اُس کے لیے مندروں کا ایک پجاری کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اُس کے خزانوں کے ساتھ دلچسپی ہوتی تو تمام تر خزانہ میری تحویل میں رہا ہے۔ میں اسے غائب کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی خاطر آپ کا ایک آدمی سانپوں سے مروایا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو وہ جگہ دکھا دوں گا۔ مندروں میں جو کچھ ہے وہ آپ کے حوالے کیا جا چکا ہے۔"

"کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟"

"نہیں" — پنڈت نے کہا تھا — "جس طرح آپ کے آدمی میرے دیوتاؤں کو مٹی اور پتھر کے بت سمجھ کر توڑ رہے ہیں اسی طرح میرے جسم کے بھی ٹکڑے کر دیں۔ اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا احترام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا مذہب بھی یہی کہتا ہے"

"میں نے تمہارے مذہب کے پیشواؤں کو اپنے قدموں میں سر رگڑتے دیکھا ہے"

— سلطان محمود نے پُرجوش آواز اور دادِ تحسین کے لہجے میں کہا — "مگر تم میں جو جرأت ہے میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ غدار کسی بھی قوم کا اور کسی بھی مذہب کا ہو وہ قابلِ نفرت ہے.... کہو پنڈت! کیا چاہتے ہو؟"

"اگر مجھ پر کرم کرنا چاہتے ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں"۔ پنڈت نے کہا — "میں اپنی آنکھوں اپنے مذہب کی توہین نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنے آپ کو گنگا ماتا کے حوالے کر دوں گا یا جنگل میں نکل جاؤں گا اور باقی عمر وہیں گزار دوں گا۔"

"جاؤ پنڈت!" — سلطان محمود نے کہا — "چلتے ہوئے قنوج کے دروازے کھلے ہیں چلے جاؤ۔ اگر اپنے مہاراجہ سے کہیں ملاقات ہو جائے تو اُسے کہنا کہ جنگجو بادشاہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا کرتے۔"

پنڈت سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

وہ ۲۰ دسمبر ۱۰۱۸ء کا دن تھا جب سلطان محمود غزنوی نے قنوج کا محاصرہ کیا تھا۔ کوئی بھی نہ بتا سکا کہ مہاراجہ کب قنوج سے نکل گیا تھا۔ اُس کے تعاقب کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج میں اپنے ایک سالار ابوالقدر سلجوقی کو چھوڑ گیا۔

پنڈت جو سلطان محمود کو یہ کہہ کر گیا کہ وہ گنگا میں ڈوب مرے گا یا باقی عمر جنگل میں گزار دے گا، گھوڑے پر سوار قنوج سے دور نکل گیا تھا۔ اُس نے اور دور جا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا گہرا تو تھا مگر خاموش تھا۔ وہ موسم سیلاب اور طغیانی کا نہیں تھا۔ گھوڑا اُسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا لیکن پنڈت نے اپنے آپ کو گنگا ماتا کے حوالے نہ کیا اور گھوڑا اُسے پار لے گیا۔ آگے گھنا جنگل تھا۔ پنڈت نے گھوڑے کو آرام دیا اور اُسے چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل گھنا بھی تھا، کم گھنا بھی اور کہیں کہیں درخت تھے ہی نہیں۔ راستے میں دو تین ندیاں بھی آئیں۔ چٹانوں کی بھول بھلیاں بھی آئیں۔ سورج غروب ہوا۔ رات اندھیری ہوتی چلی گئی۔ اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ آخر وہ

رک گیا۔ علاقہ زیادہ دشوار گزار ہوگیا تھا۔ اُس نے گھوڑے سے اُتر کر اندھیرے میں گھاس پھونس اور خشک ٹہنیاں اکٹھی کرکے انہیں آگ لگا دی۔ سردی تھی اور درندوں کا خطرہ بھی تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد خشک جھاڑیاں اور ٹہنیاں اور گھاس پھونس جلاتے رات گزاری۔ صبح وہ پھر گھوڑے پر سوار ہُوا اور روانہ ہوگیا۔
اب وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ بیلیں زمین پر پھیل کر درختوں پر چڑھی ہُوئی تھیں۔ کھڈ بھی تھے اور درخت اتنے زیادہ کہ ان کے جھکے ہوئے ٹہنوں کے نیچے سے گزرنا محال تھا۔

اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ کچھ دور گیا تو جنگل کم گھنا ہوگیا۔ آگے دو پہاڑیوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ بکھرے بکھرے درخت اور اونچی گھاس تھی۔ وہ چلتا گیا اور دونوں پہاڑیوں کے درمیان گیا تو اُسے ایک پہاڑی میں سے راستہ نظر آگیا۔ یہاں سے پہاڑی دو حصّوں میں کٹی ہُوئی تھی۔ وہ اس تنگ راستے میں سے گزر گیا۔ آگے ایک اور پہاڑی آگئی جو کہیں سے دیوار کی طرح عمودی تھی اور کہیں سے اوپر جا کر آگے کو جھکی ہُوئی تھی۔

اس وادی میں کچھ دُور اُسے خیمے دکھائی دیئے۔ ان سے ہٹ کر دو خیمے خوشنما کپڑے کے تھے۔ ان سے ذرا پرے گھوڑے اور خچر بندھے ہُوئے تھے۔ پنڈت نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا۔ چند ایک آدمی ہاتھوں میں تیر و کمان اور برچھیاں اٹھائے سامنے آگئے۔
"پنڈت جی مہاراج ہیں" — کسی نے بلند آواز سے کہا۔
قنوج کا مہاراجہ راجیا پال خیمے سے باہر آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کی رانی اور اُس کا بیٹا لکھمن پال بھی آن کھڑا ہُوا۔ یہ تھی وہ جگہ جہاں مہاراجہ راجیا پال نے قنوج سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی۔ اس کی رانی اور بیٹے لکھمن پال کے علاوہ تین ناچنے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ کم و بیش پچاس وفادار سپاہی تھے جو مہاراجہ کے محافظ تھے۔ چند ایک ملازم بھی تھے۔ پنڈت کو یہ جگہ معلوم تھی، ورنہ وہ اس جگہ تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔

پنڈت گھوڑے سے اُترا تو راجیا پال نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑا اور اپنے خیمے میں لے گیا۔ رانی اور اُس کے بیٹے لکھمن پال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر اُداسی اور پریشانی تھی۔ وہ اپنے خیمے میں چلے گئے۔

"کیا آپ مجھ سے یہ پوچھنے کی جرأت کریں گے کہ آپ کی راجدھانی کس حال میں ہے؟" — پنڈت نے مہاراجہ قنوج سے پوچھا — "کیا آپ میں سننے کی ہمت ہے کہ مسلمانوں نے قنوج میں مندروں کو کس طرح اجاڑا ہے؟"
مہاراجہ راجیا پال نے اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جو خشمگیں تھیں۔ ان میں شکست اور بے بسی کا تاثر نہیں تھا۔
"میں جب وہاں سے رخصت ہُوا اُس وقت قنوج جل رہا تھا" —
پنڈت نے کہا — "مندروں میں مسلمان سپاہی ہری کرشن مہاراج کے بُت گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور انہیں توڑا جا رہا تھا۔ آپ کے محل میں ...."
"آپ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں لائے" — مہاراجہ راجیا پال نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — "اس سلسلے میں آپ کے ساتھ بہت باتیں ہو چکی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ غزنی کا سلطان محمود لڑنے میں بہت ماہر ہے۔ میں جانتا تھا کہ قنوج میں جب اُس کے مقابلے میں لڑنے والا کوئی نہیں ہوگا اور میں بھی اُسے نہیں ملوں گا تو وہ بھڑک اُٹھے گا اور وہ اپنا غصہ قنوج کے در و دیوار پر ٹھنڈا کرے گا۔ وہ آسان فتح سے خوش ہونے والا نہیں۔ میں نے قنوج کو، اپنے محل کو اور مندروں کو کسی خاص مقصد کے لیے قربان کیا ہے۔"
"مگر آپ نے اپنا خزانہ قربان نہیں کیا" — پنڈت نے کہا۔
"پنڈت جی مہاراج!" — راجیا پال نے کہا — "آپ کے دماغ کی خرابی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ آپ ہر بات میں مذہب کو سامنے لے آتے ہیں۔ میں جانتا ہُوں آپ کہیں گے کہ مجھے خزانے کے ساتھ پیار ہے .... ان باتوں

کو ذرا ذہن سے اتارو مہاراج! مجھے یہ بتاؤ کہ میں جس مقصد کے لیے آپ کو وہاں چھوڑ آیا تھا وہ پورا ہوا یا نہیں؟

"نہیں" — پنڈت نے جواب دیا — "آپ میرے ساتھ بارہ آدمی چھوڑ آئے تھے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ درندے ہیں کسی سے نہیں ڈرتے اور انہیں بھگوان نے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں عقل اتنی زیادہ ہے کہ بڑا کامیاب فریب دیتے ہیں اور قتل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ان سے سلطان محمود کو قتل کرانا ہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو اُس کے بڑے بڑے سالاروں کو قتل کر دیں۔ آپ نے مجھ پر چھوڑا تھا کہ ان کے ہاتھوں اور کس کس کو قتل کرانا ہے۔"

"میں یہ سننے کے لیے بیتاب ہوں کہ آپ نے کس کس کو قتل کرایا ہے" — مہاراجہ راجیا پال نے پوچھا۔

"کسی ایک کو بھی نہیں" — پنڈت نے کہا — "میں نے آپ کے ان بارہ دلیر درندوں کو جو آپ کہتے تھے کہ موت سے نہیں ڈرتے، غریب مزدوروں کے لباس میں اپنے ساتھ رکھا مگر مسلمان فوج شہر میں داخل ہوئی تو لوٹ مار شروع ہو گئی اور مکان جلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ بارہ میں سے دس غائب ہو گئے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنا کام کرنے گئے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد میں نے باقی دو کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا تو پتہ چلا کہ وہ بھی لوٹ مار میں شامل ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض شہر سے چلے گئے ہیں۔ میں نے باقی دو سے پوچھا کہ وہ کسی کو قتل کر سکیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مہاراجہ خود تو خزانہ لے کر بھاگ گیا ہے، ہم کس کے لیے کسی کی جان لیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالیں؟ .... اور وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔"

مہاراجہ قنوج نے سر جھکا لیا۔

"مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "وہ نمک حرام نہیں تھے لیکن وہی وہاں نہ تھا جس کا انہوں نے نمک کھایا تھا تو انہوں نے اتنا بڑا خطرہ مول لینا بیکار سمجھا .... اور مہاراج! کسی بادشاہ کو قتل کر کے آپ اُس کی فوج کو شکست نہیں دے

سکتے، اور یہ عزت مند جنگجوؤں کا شیوہ بھی نہیں۔ میں اب بھی آپ سے کہتا ہوں کہ اپنی جس فوج کو آپ نے قنوج سے باری چلے جانے کا حکم دیا تھا، اُسے تیار کریں۔ باری کو اپنی راجدھانی بنائیں اور سلطان محمود کو یہاں سے نکالیں۔ اُس کی فوج تھوڑی رہ گئی ہے۔ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر، گوالیار کا راجہ ارجن اور کالنجر کا راجہ گنڈا آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ مسلمانوں کو آپ کچل سکتے ہیں۔ آپ کی گدی کو لوگ مقدّس سمجھتے ہیں۔"

"سب سے پہلے خزانہ وہاں سے نکالنا ہے" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں ساری عمر یہاں چھپ کر تو نہیں گزار سکتا۔"

ایک دن اور ایک رات کی مسافت کے بعد قافلہ اُس جگہ پہنچا جہاں پنڈت نے مہاراجہ قنوج کا خزانہ چھپایا تھا۔ یہ ایک پہاڑی تھی جس میں اوپر سے نیچے تک شگاف تھا جو اندر کو چلا گیا تھا۔ اس کی شکل کنوئیں جیسی تھی جس کی دیوار ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اوپر کے درختوں نے جھک کر اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ کمل بلوط کے ساتھ بھی درخت تھے اور دیوار میں بھی تھے جو جھک کر زمین کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ اس کنواں نما میں پانی کھڑا تھا جو دراصل دلدل تھی۔ اس کے کناروں اور عمودی چٹان کے درمیان تنگ سا راستہ تھا۔ سامنے والی دیوار جیسی چٹان کے دامن کے ساتھ مٹی اور پتھروں کی ٹیکری تھی۔ ٹیکری اور چٹان کے دامن کے درمیان ایک دہانہ تھا جو جھاڑی نما درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک غار کا دہانہ تھا۔ غار وسیع تھا۔ اس کے ایک طرف ایک سرنگ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سرنگ ایک اور غار میں چلی جاتی تھی۔ وہاں قنوج کا خزانہ پڑا تھا مگر جہاں سرنگ ختم ہوتی تھی وہاں ایک گہرا گڑھا کھود دیا گیا تھا۔ اس میں سانپ پھینک دیئے گئے تھے۔ گڑھے کے اوپر سرکنڈے ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی تاکہ کوئی آدمی خزانے کا سراغ پا لے اور وہ اندر جائے تو سرکنڈوں پر پاؤں رکھتے

ہی گڑھے میں جا پڑے جہاں زہریلے سانپ چھوڑ دیئے گئے تھے۔

اب جو قافلہ اس جگہ آیا، اس میں مہاراجہ قنوج تھا اور پنڈت بھی۔ بہت سے خچر اور گھوڑے تھے اور ان کے ساتھ دس بارہ ملازم تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قنوج کے محاصرے سے پہلے پنڈت چند آدمیوں کو اس حالت میں یہاں لایا تھا کہ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ایک رسّی پکڑے ہوئے آئے تھے۔ رسّی کا اگلا سرا پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خزانے کے کچھ بکس رکھنے آئے تھے۔ اس جگہ کو ملازموں سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔

اب مہاراجہ اور پنڈت خزانہ نکالنے کے لیے آئے تو کسی بھی ملازم کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ انہیں سرنگ میں داخل کرنے سے پہلے اُس گہرے گڑھے پر جس میں زہریلے سانپ چھوڑے ہوئے تھے، تختے رکھ دیئے گئے۔ پنڈت ان سے گزر کر اندرونی غار میں چلا گیا اور ملازموں کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ وہ بکس باہر لا کر خچروں اور گھوڑوں پر لادنے لگے۔ یہ ایک ریاست کا خزانہ تھا جو مہاراجہ راجیا پال کے آباؤ اجداد سے جمع تھا اور بڑھتا ہی رہا تھا۔ منوں کے حساب سے سونا تھا، چاندی تھی، ہیرے جواہرات اور نقدی تھی۔ اسے باہر لانے کے لیے ملازموں کو کئی بار اندر جانا پڑا۔

جب آخری بکس بھی باہر آ گیا اور تمام بکس گھوڑوں اور خچروں پر لاد دیئے گئے تو پنڈت تمام آدمیوں کو غار میں لے گیا اور خود باہر آ گیا۔ وہ ابھی سرنگ ہی میں تھا۔ سانپوں والے گڑھے پر تین تختے رکھے گئے تھے۔ اُس نے بڑی تیزی سے تینوں تختے کھینچ لیے اور انہیں گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

"چلو مہاراج!" پنڈت نے مہاراجہ راجیا پال سے کہا۔

"وہ سب کہاں ہیں؟" — راجیا پال نے پوچھا۔

"وہ اب کبھی باہر نہیں آ سکیں گے" — پنڈت نے جواب دیا — "انہیں اندر بھیج کر تختے کھینچ لایا ہوں۔ نکلنے والے آگے بڑھیں گے تو اُس گڑھے میں گریں گے جو میں نے زہریلے سانپوں سے بھر رکھا ہے۔ ایک دو گریں گے تو باقی آگے

نہیں آئیں گے۔ بھوکے پیاسے اندر ہی مر جائیں گے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں زیادہ انعام دے دیا جائے اور ان کی مرتے وقت کی بددعائیں نہ لی جائیں؟"

"مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "جس طرح آپ نے اس خزانے کی خاطر اپنا مذہب، اپنا وقار اور اپنی قوم کو قربان کر دیا ہے اسی طرح ہر انسان اتنے زیادہ خزانے کی خاطر آپ کو بھی، آپ کی رانی اور بیٹے کو قتل کرنے کی سوچے گا۔ اتنے بڑے خزانے میں سے کوئی انسان تھوڑا سا نہیں لینا چاہتا۔ آپ نے اپنی رعایا کے ساتھ کونسی نیکی کی ہے؟ .... انسان جب تخت پر بیٹھتا اور سر پر تاج رکھتا ہے تو اُس کی نظریں رعایا سے ہٹ جاتی اور خزانے پر جم جاتی ہیں۔ وہ انسان سمجھتا نہیں، سوچتا نہیں کہ خزانے اور حکومت کا پیار اُسے اس حال تک پہنچا دیتا ہے جس میں آج آپ ہیں۔ آپ ڈرے ہوئے گیدڑ کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں۔ اپنی رعایا کو جو آپ کی ہم مذہب ہے آپ نے اپنے دشمن کے حوالے کر دیا ہے۔"

"پنڈت جی مہاراج! آپ مجھے بار بار شرمسار نہ کریں" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "میں کچھ کر کے دکھاؤں گا۔"

"میں اسی لیے آپ کے ساتھ ہوں کہ آپ کچھ کر کے دکھائیں" — پنڈت نے کہا — "آپ بھول گئے ہیں کہ قنوج کی گدی ہندو جاتی کی بہادری کی، علم و ہنر کی اور ہندوستان کے وقار کی علامت ہے۔ تمام راجے مہاراجے آپ کو اپنا سردار مانتے تھے۔ اب بھی مانتے ہیں۔ بس آپ کو اس جنگل سے نکالوں گا.... چلئے۔ یہاں رکنا بہت خطرناک ہے۔"

وہ چل پڑے۔ غار کے اندر سے آوازیں آ رہی تھیں جن آدمیوں کو اندر بند کر آئے تھے وہ پنڈت کو پکار رہے تھے۔ پنڈت اور راجیا پال دو گھوڑوں اور خچروں کو ایک دوسرے کے پیچھے باندھے دُور ہی دُور ہٹتے جا رہے تھے۔ آگے

ایسا جنگل اور ایسا دشوار گزار علاقہ تھا جہاں درندے اور جنگلی جانور ہو سکتے تھے، کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔

"پنڈت جی!" — راجیا پال نے کہا — "آپ کی وفاداری نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ میں آپ کو اتنا انعام دینا چاہتا ہوں جتنا آج تک کسی نے مجھ سے وصول نہیں کیا۔ اپنے منہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں؟"

"ایک انعام ہے جو آج تک کوئی مہاراجہ کسی وفادار کو نہیں دے سکا" — پنڈت نے کہا — "آپ دے سکتے ہیں۔"

"مانگو مہاراج! کہو کیا دوں؟"

"غزنی کے سلطان کا سر" — پنڈت نے کہا۔

مہاراجہ راجیا پال کی ہنسی نکل گئی۔

"یہ سر جسم سے الگ ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان کو آئے دن کے حملوں سے نجات مل سکتی ہے، بلکہ اسلام کا پھیلاؤ ہمیشہ کے لیے رک سکتا ہے" — پنڈت نے کہا — "یہ دھرتی ہمیشہ کے لیے پاک ہو سکتی ہے مگر مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی مسلمانوں کے خلاف لڑتی رہیں گی، کشت و خون ہوتا رہے گا لیکن اسلام اس ملک سے نہیں نکلے گا۔ ہمارے بعد آنے والوں میں عقل ہوئی تو وہ لڑنے مرنے کی بجائے مسلمانوں کو ختم کرنے کے کچھ اور طریقے اختیار کریں گے۔ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی دھرتی ماتا سے نکال نہ سکیں تو یہی کافی ہوگا کہ ہم اسلام اور اس مذہب کے پیروکاروں کے خلاف اتنی نفرت پیدا کر دیں کہ کوئی ہندو اسلام قبول کرنا تو در کنار، مسلمان کے قریب سے گزرنے سے بھی سمجھے کہ ناپاک ہو گیا ہے۔"

"مہاراج!" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "مجھے اپنے مذہب سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ ہر ہر مہادیو اور ہری کرشن نے ہماری کیا مدد کی ہے؟ آپ ہمیں ہمیشہ دیوتاؤں کے قہر سے ڈراتے ہیں۔ کیا ان کے پاس صرف قہر ہے کرم نہیں؟ ہر بار اور ہر جگہ فتح مسلمانوں کی ہی کیوں ہوتی ہے؟ آپ کے مہادیو کا قہر مسلمانوں

پر کیوں نہیں گرتا؟"

"یہ دیوتاؤں کے بھید ہیں" — پنڈت نے کہا — "جب انسان دیوتاؤں کا حکم نہیں مانتا تو وہ اُس کے دماغ میں خلل ڈال دیتے ہیں، پھر وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسی آپ کر رہے ہیں۔"

گھوڑے چلے جا رہے تھے۔ دور بھیڑیوں کی چیخ و پکار اور لکڑ بگوں کی قہقہہ نما آوازیں اور کبھی کبھی کسی شیر کی دھاڑ سنائی دیتی تھی۔ گھوڑے دشوار گزار علاقے سے گزر رہے تھے۔

"میں نے مندروں کو ہیروں اور جواہرات سے سجایا ہے" — راجیا پال کہتا جا رہا تھا — "میں نے پنڈتوں، رشیوں اور سادھوؤں کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کے مندر کو اور اس میں رکھے ہوئے پتھر کے دیوتاؤں کو میں نے عطر سے نہلایا ہے..... میرا تخت کہاں ہے؟ میرا تاج کہاں ہے؟ قنوج کی وہ گدی کہاں ہے جس کے گن سارا ہندوستان گاتا تھا؟ مجھے کیا سوجھی کہ میں مسلمانوں کی فوج کے آنے سے پہلے ہی بھاگ اٹھا؟ مجھے کس نے اشارہ دیا تھا؟"

"خزانے کے پیار نے" — پنڈت نے کہا — "آپ خود دل چھوڑ بیٹھے۔"

سوال کا جواب نہیں دے سکتے..... میں خود اپنے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پنڈت جی مہاراج! آپ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکے کہ مذہب کیا ہے۔ میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ کسی نگری کا راجہ مندر میں چلا جائے تو رعایا اُسے اچھا سمجھنے لگتی ہے۔ آج تک یہی سمجھا ہوں کہ رعایا کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیا جا سکتا ہے، اپنے دل میں مذہب کی محبت ہو یا نہ ہو۔ قنوج کی گدی کی سارا ہندوستان صرف اس لیے پوجا کرتا ہے کہ میرے باپ دادا آپ کے بتوں کو عطر سے نہلاتے رہے ہیں۔ میں نے اس رسم کو جاری رکھا لیکن میرے دل میں اپنے مذہب کی محبت کبھی بھی پیدا نہ ہو سکی۔"

"آپ گمراہ ہو گئے ہیں مہاراج!"

"ہاں!" — راجیا پال نے کہا — "میں گمراہ ہو گیا ہوں۔ کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں نے متھرا میں ہری کرشن کے قدموں میں بیٹھ کر کہا تھا کہ میرے سامنے

دیویوں دیوتاؤں کی بات نہ کرو! اتحاد پیدا کرو اور مل کر محمود کا مقابلہ کرو مگر ایسا نہ ہُوا۔ سب نے شکست کھائی۔ میں نے سنا ہے کہ لاہور کے مہاراجوں نے انسانی جانوں کی قربانیاں بھی دی تھیں۔ نوجوان لڑکیوں کو قتل کر کے اُن کے خون سے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے تھے مگر انہیں شکست ہوئی۔

"میں آپ کو اپنے مذہب کا کرشمہ دکھاؤں گا" — پنڈت نے کہا۔

"میں نے کرشمے دیکھ لیے ہیں" — راجیا پال نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ مسلمانوں میں وہ کونسی طاقت ہے کہ اتنی دُور سے آتے ہیں۔ ان کی فوج تھوڑی ہوتی ہے۔ ان کو رسد نہیں مل سکتی مگر وہ ہمیں شکست دے جاتے ہیں .... آپ مجھے جواب نہیں دے سکتے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار ایک مسلمان جاسوس کو پکڑ لائے تھے۔ آپ بھی موجود تھے۔ ہم اُس سے پوچھتے تھے کہ اُس کے اور ساتھی کہاں کہاں ہیں اور یہ بھی کہ محمود کا اب ارادہ کیا ہے آپ کو یاد ہو گا کہ اُس نے کیا جواب دیا تھا"

"ہاں ہاں، یاد ہے" — پنڈت نے کہا — "اُس نے کہا تھا کہ میرے جسم کے ٹکڑے کر دو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا"

"اور اُس نے کچھ نہیں بتایا تھا" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "میں نے اُسے سونے کے ٹکڑے دکھائے تھے۔ وہ نہیں مانا تھا۔ میں نے راج محل کی سب سے زیادہ خوبصورت رقاصہ اُس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ ہنس پڑا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ میرے ایمان کو تم خرید نہیں سکتے۔ پھر آپ ایک پٹاری لے آئے تھے جس میں بڑا ہی زہریلا سانپ تھا۔ آپ نے اُسے کہا تھا کہ آپ اُسے اس سانپ کے ساتھ کال کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔ وہ اس سے بھی نہیں ڈرا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ایمان کو سانپ نہیں ڈس سکتا"۔

"ہاں مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "مجھے یاد ہے۔ ہم نے اُسے تنگ سی کوٹھڑی میں بند کر کے اس میں سانپ چھوڑ دیا تھا مگر یہ آدمی سانپ کے زہر سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا، اُس نے راز کی کوئی بات نہیں بتائی تھی"

"یہ ہے مسلمانوں کی قوت!" — مہاراجہ نے کہا — "یہ ایمان کیا ہے؟"

"اسے ہم دھرم کہتے ہیں" — پنڈت نے کہا — "یہ ہم میں بھی پیدا ہو سکتی ہے"

"باتیں۔ باتیں کھوکھلی اور بے جان باتیں" — مہاراجہ نے آہ لے کر کہا جیسے اُسے پنڈت کی باتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو — "آپ کو مذہب سے ہٹ کر کوئی بات کرنی نہیں آتی یا آپ کو سانپوں کے ساتھ دلچسپی ہے۔ آپ سانپ پکڑنا اور پالنا جانتے ہیں"۔

جب یہ خزانہ اپنے پہلے ڈھکے چھپے ٹھکانے پر پہنچا تھا اُس وقت سلطان محمود بڑی احتیاط سے کنوج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کا اصل اور بڑا ہی خونریز مقابلہ قنوج میں ہو گا۔ کوئی جاسوس اُسے یہ نہیں بتا سکا تھا کہ قنوج میں مقابلہ ہو گا ہی نہیں اور وہاں مہاراجہ برائے نام فوج چھوڑ کر اور اُس کے سالاروں کے خفیہ قتل کا انتظام کر کے غائب ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی ایک قسط میں سنایا جا چکا ہے کہ غزنی کے ایک جاسوس کی اسی پنڈت کے ساتھ اسی خزانے والے غار میں ملاقات ہو گئی تھی اور پنڈت نے یہ جان کر کہ یہ غزنی کا جاسوس ہے، اُسے یہ غلط اطلاع دے کر گمراہ کیا تھا کہ قنوج میں کئی فوجیں جمع ہیں جو غزنی کی فوج کو کچل کر رکھ دیں گی۔

جاسوس ضلع بردک نے اسی اطلاع کو مستند سمجھ کر سلطان محمود کو چوکنا کر دیا تھا۔ سلطان محتاط ہو کر اور قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھتا رہا اور مہاراجہ راجیا پال قنوج سے نکل گیا۔ پنڈت دراصل وقت چاہتا تھا کہ وہ راجیا پال کو جم کر مقابلہ کرنے کے لیے روک لے لیکن راجیا پال منہ موڑ گیا۔ اگر سلطان محمود اپنی مخصوص رفتار سے پیشقدمی کرتا جسے صحیح معنوں میں برق رفتار پیشقدمی کہتے ہیں اور جس کے لیے غزنی کی فوج شہرت یافتہ تھی تو وہ راجیا پال کے فرار سے پہلے قنوج پہنچ جاتا مگر پنڈت کا دھوکہ کامیاب رہا۔

راجیا پال اور پنڈت نے خزانہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ وہاں ایک قدرتی غار تھا جسے انہوں نے اور زیادہ لمبا کر لیا تھا۔ رات کو جب اتنے زیادہ جس

واں پہنچے تو محافظوں میں سے صرف چار پانچ کو اس اعتماد میں لیا گیا کہ اُن سے
بکس اترواکر غار میں رکھوائے جائیں۔

اس سے اگلی رات وہاں جشن منایا گیا۔ شراب کا ذخیرہ ساتھ تھا۔ ناچنے
اور گانے والیاں بھی تھیں۔ ان کے سازندے بھی تھے۔ رات کو مشعلیں جلا
کر جنگل میں منگل بنا دیا گیا۔ مہاراجہ نے اپنے محافظوں کو خوب عیش کرائی اور انہیں
نقد انعام بھی دیئے۔ اب اُس کی زندگی اور سلامتی کا دارومدار انہی چند
ایک محافظوں پر تھا۔ انہیں وہ بہت بڑی قیمت دے کر بھی خوش رکھنے کی
کوشش کر رہا تھا۔

اس جشن میں دو افراد نہیں تھے۔ ایک تو پنڈت تھا اور دوسرے
اُس کی رانی۔ مہاراجہ راجیپال دونوں کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔
پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ اُس نے چھوٹے چھوٹے دو بُت
اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عبادت کے بعد وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا
کہ رانی خیمے میں آئی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔ راجیپال کو اس کے ساتھ اتنی سی
دلچسپی رہ گئی تھی کہ وہ اُس کے جوان اور اپنے جانشین بیٹے کی ماں تھی۔ وہ پنڈت
کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا آپ نے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مہاراج کیا کر رہے ہیں اور ان
کے ارادے کیا ہیں؟" ۔۔۔ پنڈت نے رانی سے پوچھا ۔۔۔ "کیا یہ موقع خوشیاں
منانے اور شراب پینے کا ہے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکی" ۔۔۔ رانی نے جواب دیا ۔۔۔ "میری نگاہیں اب اپنے
بیٹے پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں باری ہے
جسے ہم قنوج کی طرح اپنی راجدھانی بنا سکتے ہیں۔ قنوج ہمیں واپس نہیں مل
سکتا... میرا خیال ہے کہ مہاراج پاگل ہو چکے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات
پوچھتی ہوں تو مجھے یوں ٹال دیتے ہیں جیسے راج کے ساتھ میرا کوئی تعلق
ہی نہ ہو... کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟ کوئی ٹونہ، کوئی جادو کر دکھائیں۔ آپ

کے ہاتھ میں بہت کچھ ہے۔"

"میں یہی سوچ رہا ہوں" ۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "مہاراج کے دماغ پر
قابو پانے کی کوشش کروں گا .... میرا حساب بتا رہا ہے کہ ایک انسان کی
قربانی دینی پڑے گی۔ ایک لڑکی کا خون بہانا پڑے گا۔"

"لڑکی کہاں سے آئے گی؟"

"میں نے دیکھ لی ہے" ۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "وہ ناچنے والی جو سب
سے چھوٹی ہے... نندیا!"

"کریں" ۔۔۔ رانی نے کہا ۔۔۔ "آپ جب چاہیں اُسے قربانی کے لیے لے
سکتے ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور نوجوان بھی ہے۔ قربانی ایسی ہی لڑکی
کی ہونی چاہیے۔"

باری دریائے گنگا سے دُور ایک قصبہ تھا جو قنوج سے تین دنوں کی
مسافت پر تھا۔ یہ قنوج کی ریاست میں تھا۔ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ
مہاراجہ راجیپال نے باری کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا جہاں اُس نے اپنے
بیٹے لکھمن پال کو بھیج دیا تھا۔ اُس نے باری کو قنوج کے پیمانے کا شہر بنانے
کے لیے تعمیر شروع کرا دی تھی۔ اُس نے اپنی فوج قنوج کے محاصرے سے پہلے
ہی باری بھیج دی تھی لیکن جنگل میں وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا کرے۔ سلطان محمود
اُس پر آسیب کی طرح غالب آ گیا تھا۔ ایک مورخ سبطاکوزی نے یہاں تک
لکھا ہے کہ مہاراجہ راجیپال در پردہ اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جنگل کی ایک رات تھی۔ مہاراجہ کو یہاں آئے ڈیڑھ دو مہینے گزر چکے
تھے۔ پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ گھٹاؤں کی گرج سنائی دی
اور ہوا تیز ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بجلی چمکی اور بڑی زور کا دھماکہ ہوا۔ اس
کے بعد بجلی بار بار چمکنے اور کڑکنے لگی۔ جنگل دودھ کی مانند سفید روشنی سے روشن
ہو جاتا تھا۔ اتنی زور کا مینہ برسنے لگا جیسے ژالہ باری ہو رہی ہو۔ اُس

وقت مہاراجہ راجپاپال اپنے خیمے میں نہیں بلکہ اُس غار میں تھا جس میں اُس نے ایک اور غار کھدوا کر خزانہ چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے خیمے کو جانے لگا تو بجلی اور بارش نے اُسے روک لیا۔

یہ ایک طوفانی بارش تھی۔ آسمان پھٹا جا رہا تھا۔ بجلی اتنی زور سے کڑکتی اور چمکتی تھی کہ دل دہل جاتے تھے۔ غار میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ باہر گھوڑے ڈر کر ہنہنا رہے تھے۔ پنڈت غار کے منہ میں نمودار ہوا اور اندر چلا گیا۔ اُس نے مہاراجہ کو بتایا کہ وہ اُس کے خیمے میں گیا تھا۔ وہ اُسے نہ ملا تو ادھر آ گیا۔ اُسے مہاراجہ کے متعلق فکر پیدا ہو گیا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی۔

ڈیڑھ ایک گھنٹے کے بعد باہر شور و غل بپا ہو گیا۔ گھوڑے بڑی زور سے ہنہنانے لگے۔ باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بارش کے شور کے ساتھ ایک اور شور سنائی دینے لگا اور اس کے ساتھ یہ گھبرائی ہوئی آوازیں — ”پانی آ گیا.... سیلاب آ گیا.... خیمے اکھاڑ دو۔“

مہاراجہ اور پنڈت نے غار کے دہانے میں سے دیکھا۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی تو انہیں سیلابی پانی غراتا دکھائی دیتا اور لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے۔ کھیمن پال دوڑتا غار میں آ گیا۔ یہ جگہ دو پہاڑیوں کے درمیان تھی۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے اوپر کے علاقے کا برساتی سیلاب گزرتا ہے۔ اب یہ سیلاب چڑھ رہا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ بجلی پہلے کی طرح کڑک رہی تھی اور اس کے ساتھ سیلاب غراتا ہوا گزر رہا تھا اور چڑھ بھی رہا تھا۔ مہاراجہ کے آدمی بلند جگہوں پر جا رہے تھے۔

پانی غار میں بھی آنے لگا۔ غار ذرا اونچا تھا اس لیے اندر تھوڑا پانی آ رہا تھا۔

”مہاراج!“ — پنڈت نے راجپاپال سے کہا — ”یہ ہر ہر مہادیو کا قہر ہے۔ سر جھکا لیں۔ معافی مانگیں۔ توبہ کریں۔ کیا آپ نے ایسی بارش کبھی دیکھی ہے؟“

مہاراجہ نے قہقہہ لگایا جیسے اُس کا دماغی توازن صحیح نہ رہا ہو۔ بولا —

”اب طوفان میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ اب بجلیاں مجھے نہیں ڈرا سکتیں... لے جاؤ میرا خزانہ۔“

پنڈت نے بارش اور سیلاب کے شور سے بلند آواز میں کہا۔ ”مہاراج! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ باہر شیطان چیخ رہے ہیں۔ اس قہر کو سمجھیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ کریں۔ ہاتھ جوڑیں۔ میں جو پڑھتا ہوں وہ آپ بھی پڑھتے جائیں۔“

مہاراجہ ایک بار پھر ہنسا۔ کھیمن پال جو جوان راجکمار اور جنگجو تھا، چہرے پر خوف کے آثار لیے اور ہاتھ جوڑے ہوئے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی — ”وہ دیکھو۔“

مہاراجہ اور پنڈت نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ ایک اژدہا جس کا سر انسان کے سر جتنا بڑا تھا، غار میں داخل ہو رہا تھا۔ کھیمن پال کے پاس تلوار تھی جو اُس نے نکال لی۔ اژدہا آہستہ آہستہ رینگتا آ رہا تھا۔ شاید سیلاب میں کہیں سے بہتا آیا تھا۔ ایسے اژدہا دلدل یا پانی میں رہتے ہیں۔ وہاں خوراک نہ ملے تو خشکی پر آ جاتے ہیں۔ یہ سالم انسان یا جانور کو نگل لیتے اور دو دو تین تین مہینے سوئے رہتے ہیں۔ ان کی لمبائی چھ سے بارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ بعض اژدہا اس سے بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔

یہ جو غار میں داخل ہو رہا تھا، نو دس فٹ لمبا تھا۔ کھیمن پال نے تلوار نکالی تو پنڈت نے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مہاراجہ اُٹھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُٹھائی اور آگے کر دی۔ اژدہا ابھی پورا غار میں نہیں آیا تھا۔ پنڈت کو معلوم تھا کہ اژدہا زہریلے نہیں ہوا کرتے نہ یہ ڈستے ہیں، بلکہ یہ شکار کو نگلا کرتے ہیں۔

”پنڈت جی مہاراج!“ — مہاراجہ راجپاپال نے کہا — ”آپ کو سانپوں کو پکڑنے اور قبضے میں رکھنے کی مہارت ہے۔ کیا آپ اس پر بھی قابو پا سکتے ہیں؟“

پنڈت نے نظریں اژدہا پر جمائے رکھیں اور مشعل کا شعلہ اُس کے اور

اپنے درمیان کیسے رکھا۔ اُس نے کہا "اگر یہ دھرتی کا اژدہا ہوا تو میں اسے قابو میں لے لوں گا لیکن مہاراج! یہ دیوتا ہے" — پنڈت نے انہیں کچھ بتا کر کہا "یہ پڑھتے رہیں۔ ہری کرشن آپ سے کوئی بہت بڑا کام کرانا چاہتے ہیں۔"

مہاراجہ اور اُس کے بیٹے لچھمن پال نے وہی پڑھنا شروع کر دیا جو پنڈت نے بتایا تھا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈہ پکڑے ہوئے شعلہ آگے کر رکھا تھا اس لیے اژدہا جو بہت آہستہ آہستہ اندر آ رہا تھا کُنڈلی مارنے لگا اور رُک کر اکٹھا ہو گیا۔ وہ سر کو اٹھاتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ پنڈت نے لچھمن پال سے کہا کہ اندر کے غار میں رسّہ ہو گا وہ لے آؤ۔

لچھمن پال نے تلاش کر کے رسّے کا ایک لمبا ٹکڑا پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت نے مشعل لچھمن پال کو دے کر اُسے کہا کہ اژدہا کے آگے کیے رکھے۔ اُس نے رسّے کا پھندا بنا لیا۔ اژدہا اپنی آنکھوں کے آگے شعلے کی وجہ سے کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے ایک بار سر اُٹھایا تو پنڈت نے پھندا پھینکا جو اُس کے سر سے سرک کر گردن پر چلا گیا۔ پنڈت نے رسّہ کھینچا تو اژدھا کا منہ کھُل گیا اور اُس کا اتنا لمبا جسم تڑپنے لگا۔ پنڈت اُچھل کر اُس پر بیٹھ گیا اور رسّہ اس کے گرد اس طرح لپیٹ کر کس دیا کہ وہ بے بس ہو گیا۔

بارش کا زور گھٹنے لگا تھا۔ پنڈت نے مہاراجہ راجیا پال کو اژدہا سے بہت ڈرایا۔ مہاراجہ پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ اب غار میں ہی آرام سے سو جائے۔

دوسرے دن مہاراجہ کی آنکھ اُس وقت کھُلی جب سورج بہت اُوپر آ گیا تھا۔ اُس نے غار سے دیکھا۔ وہاں نہ پنڈت تھا نہ اژدھا، لچھمن پال بھی نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا۔ باہر کی دنیا بدلی ہوئی تھی۔ سیلاب گزر گیا تھا۔ خیمے کھڑے کئے

جا رہے تھے۔ مہاراجہ نے کسی سے کہا کہ پنڈت کو بلا لائے۔

پنڈت آیا تو مہاراجہ نے اُس سے پوچھا "رات اژدہا کو مار دیا گیا تھا؟"

"وہ اژدہا نہیں دیوتا تھا" — پنڈت نے کہا "وہ آپ کو وہی بات کہنے آیا تھا جو میں ایک عرصے سے آپ کو کہہ رہا ہوں۔ میں بھی اسے اژدہا ہی سمجھا تھا۔ کوئی انسان اتنے بڑے اژدہا پر قابو نہیں پا سکتا۔ مجھے اشارہ ملا تو میں نے اسے رسّے سے قابو کر لیا۔ آپ سو گئے پھر راتکمار چلا گیا تو اژدہا نے مجھے اپنا آپ دکھایا۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اُس نے کہا کہ مندروں کی تباہی اور ہماری توہین کا انتقام لو۔ ہماری روحوں کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ ہم جب آتے ہیں تو بجلیاں چمک چمک کر ہمارا راستہ روشن کرتی ہیں اور بارش ہمارا راستہ دھو ڈالتی ہے۔ ہم اپنی بجلیاں اِن پر بھی گرا سکتے ہیں جنہوں نے ہماری روحوں کو تکلیف دی ہے لیکن ہم انہیں باز آ جانے کا موقع دے رہے ہیں ... دیوتا نے مجھے کہا کہ اپنے راجہ سے کہو کہ اپنی راجدھانی میں مسلمانوں کی اذانیں بند کر دو۔ یہ آوازیں ہمیں چین نہیں لینے دیتیں۔"

"دیوتا کہاں چلے گئے ہیں؟" — مہاراجہ قنوج نے پوچھا "کہاں گئے ہیں؟"

"جہاں سے آئے تھے" — پنڈت نے کہا "میں نے ان کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگی ہے۔ آپ کی طرف سے بھی ہاتھ جوڑے تھے مگر وہ سخت ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ ان کی بجلیاں ان پہاڑوں کو جڑوں سے اکھاڑنے آئی تھیں۔ ہم سب کو جلا کر بھسم کرنے آئی تھیں۔ دیوتا کہتے تھے کہ مہاراجہ کا خزانہ دفن کر دیں گے .... میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ایک نرتکی (رقاصہ) کی قربانی دو۔ ان کے اشارے پر میں نے رقاصہ کا انتخاب کر لیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"نندیا۔"

"نہیں" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا "پنڈت جی مہاراج! میں نندیا کی

قربانی نہیں دوں گا"۔

"آپ غزنی کے سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔۔۔ رانی نے خشمگیں لہجے میں کہا۔۔۔ "کیا آپ دیوتاؤں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ .... شندیا کی قربانی دی جائے گی"۔

"تم چپ رہو"۔۔۔ مہاراجہ نے گرج کر کہا۔

"پتی دیوتا نہیں ہو سکتا"۔۔۔ رانی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔۔۔ "دیوتا پتی ہو سکتا ہے۔ مجھے دیوتاؤں کا حکم ماننا ہے، آپ کا نہیں"۔

"پتا مہاراج!"۔۔۔ راجیپال کے بیٹے نے جو قریب ہی کھڑا تھا، کہا۔۔۔ "مجھے تلوار کا دھنی آپ ہی نے بنایا تھا۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ ایک بیٹے کی تلوار اپنے باپ کا سر تن سے جدا کر دے۔ کوئی سپوت اپنا وطن اور اپنا مذہب اپنے باپ پر قربان نہیں کر سکتا۔ پنڈت جی مہاراج جو کہتے ہیں وہی ہوگا..... پتا مہاراج! مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اپنا دھرم چھوڑ نہیں دیا لیکن آپ نے غزنی کے سلطان کو اپنے دماغ پر اور اپنے دل پر سوار کر لیا ہے"۔

مہاراجہ راجیپال نے جب اپنی رانی اور اپنے بیٹے کا رویہ دیکھا تو وہ دب گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے پنڈت سے یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہ کی کہ دیوتاؤں نے صرف اسی کو تباہ کرنے کا تہیہ کیوں کر رکھا ہے۔ متھرا قنوج سے زیادہ مقدس جگہ تھی۔ وہاں کرشن مہاراج نے جنم لیا تھا۔ تھانیسر کا مندر بھی ہندوؤں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ وہاں گھنٹیوں، سنکھوں اور بھجنوں کی بجائے اذانیں گونج رہی ہیں۔ دیوتاؤں نے وہاں کے راجوں مہاراجوں کو اژدہا بن کر نہیں ڈرایا تھا۔

مہاراجہ نے دیکھا کہ اس کی رانی اور اس کے بیٹے پر دیوتاؤں کا خوف طاری ہو گیا ہے تو وہ کچھ کہے بغیر اس غار میں چلا گیا جس میں اس نے خزانہ رکھوایا تھا۔

"یہ ہے ہندوؤں کا مذہب"۔۔۔ قنوج کے بڑے مندر کے سامنے ایک

آواز گرج رہی تھی۔

یہ آواز اس خطیب کی تھی جو غزنی سے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا تھا۔ غزنی کی فوج کے ساتھ چند ایک امام بھی ہوا کرتے تھے۔ جتنی فوج ایک جگہ اکٹھی ہو وہ نماز باجماعت پڑھا کرتی تھی۔ فرصت کے وقت امام اپنے اپنے دستوں کا ایمان اور حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے وعظ سنایا کرتے تھے۔

غزنی کا خطیب قنوج کے بڑے مندر کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ اس کے ارد گرد ٹوٹے ہوئے بتوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے غزنی کی فوج کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے قنوج کے جنگی قیدی کھڑے تھے۔

"یہ ہے ہندوؤں کا مذہب"۔۔۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔۔۔ "دیکھ لو ان کے 'خداؤں' کے ٹکڑے تمہارے قدموں میں پڑے ہیں۔ خدا ایک ہے۔ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تم یہاں کوئی ملک فتح کرنے کے لیے اور یہاں لوٹ مار کرنے کے لیے نہیں آئے۔ تم یہاں ایک باطل مذہب کی بیخ کنی کے لیے آئے ہو۔ تم سوال پوچھنا چاہو گے کہ ہم نے ہندوستان کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سرزمینِ عرب کا ایک مجاہد محمد بن قاسم ایک مسلمان لڑکی کی پکار پر یہاں آیا تھا۔ اس نے یہاں ایک بڑے جابر اور ظالم راجہ کو شکست دی لیکن یہ نوجوان قہر اور دہشت بن کر نہیں آیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کی تلوار چٹانوں کو کاٹ سکتی ہے اور مسلمان کا حسنِ سلوک پتھر کو موم کر سکتا ہے.....

"محمد بن قاسم نے یہاں کے پتھروں کو موم کر دیا اور یہاں کے بت اپنے آپ ٹوٹنے لگے۔ ہندو جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ شمال مغربی ہندوستان اللہ اور رسول ﷺ کے نور سے منور ہو گیا اور یہ مقدس روشنی سارے ہندوستان میں پھیلنے لگی مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مجاہد کو مجرم بنا دیا گیا۔ محمد بن قاسم ایک ناہنجار خلیفہ کے قہر کا نشانہ بن گیا۔ ہندوستان سے وہ گیا تو ہندوؤں کے باطل مذہب نے پھر سر اٹھایا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسجدیں مندر بنتی چلی گئیں اور ہندو نے ریاکاری اور دہشت گردی سے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا.....

"غزنی کے مجاہدو! تم صرف غزنی کے پرچم کے نہیں اسلام کے علمبردار ہو۔ یہ خطہ جو دارالاسلام بن گیا تھا بُت خانہ بن گیا۔ حق پر باطل غالب آنے لگا۔ اس باطل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ قوم جو ہندو کہلاتی ہے، سانپوں کی نسل سے ہے۔ اس کی خصلتیں زہریلے سانپوں سے ملتی ہیں اور یہ قوم سانپوں کی پجاری ہے۔ اس کے ہاں خدائے وحدہٗ لاشریک کا کوئی تصور نہیں جس دریائے گنگا اور جمنا کو تم نے روندا ہے اور اسے بارہا عبور کیا ہے، انہیں بھی ہندو اپنے دیوتا کہتے ہیں۔ ان دریاؤں کے غلیظ پانی کو مقدس سمجھتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ اس میں نہا کر کہتے ہیں کہ گناہ دُھل گئے ہیں۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی ہے تو اسے دیوتاؤں کا قہر کہتے ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ اژدہا کو دیکھ لیں تو اسے دیوتا کہتے اور اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ درندے معصوم بچوں اور نوجوان لڑکیوں کی قربانی دیتے اور ان کے خون سے ان بُتوں کے پاؤں دھوتے ہیں۔ کیا انسانی عقل اس درندگی کو نیکی کہہ سکتی ہے؟ اسے تم عبادت کہہ سکتے ہو؟ ....

"اسلام کے پاسبانو! تم یہاں پنڈتوں کی اس ریاکاری کا قلع قمع کرنے آئے ہو۔ اگر تم نے اس مذہب کو جڑوں سے نہ اکھاڑ پھینکا تو یہ زمین ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے خون کی پیاسی رہے گی۔ یہ قوم جو چند ایک توہمات کو اور اپنے بے بنیاد عقیدوں اور رسموں کو مذہب کہتی ہے، مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہے گی۔ یہ کوئی مذہب نہیں۔ ان لوگوں کے پنڈتوں نے ان پر خوف طاری کر کے اپنی فریب کاری کو مذہب کا نام دے رکھا ہے۔ اگر ان کا مذہب سچا ہے تو ان کے ان خداؤں سے جو تمہارے قدموں میں پڑے ہیں، کہو کہ ہم سے اپنی توہین کا انتقام لیں۔ رات جو گزر گئی ہے بجلی کے دھماکوں سے کانپ رہی تھی کیا تم اطمینان کی نیند نہیں سوئے رہے؟ کیا گذشتہ رات کی طوفانی بارش نے تمہیں ذرا سا بھی پریشان کیا تھا؟ ... نہیں بجلیاں اور طوفان کسی مسلمان کو نہیں ڈرا سکے۔ مگر تم رات کو ہندوؤں کو دیکھتے۔ وہ ساری رات ہاتھ جوڑ کر، خوف سے

کانپتے ہری رام ہری کرشن کا ورد کرتے رہے تھے .... حق و صداقت اور ایمان تمہاری قوت ہے۔ اس کے سامنے کوئی قلعہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تمہارے خون کے جو قطرے اس زمین پر گریں گے وہ گُل و لالہ کی صورت میں کھلیں گے اور یہ زمین اللہ کے نُور سے گلرنگ ہو جائے گی۔"

قنوج کی فتح کا دھماکہ ڈیڑھ سو میل دُور کالنجر میں اور اتنی ہی دور گوالیار میں بھی سنائی دیا۔ قنوج سے بھاگے ہوئے کچھ لوگ کالنجر جا پہنچے اور وہاں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں کا مہاراجہ لاپتہ ہے۔ کالنجر کا راجہ گنڈہ ایک مدت سے یہی ایک خبر سن رہا تھا کہ غزنی کے مسلمانوں نے حملہ کیا ہے اور فلاں راجہ بھاگ گیا ہے یا اُس نے ہتھیار ڈال کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ غزنی کا باجگزار ہو گیا ہے۔ راجہ گنڈہ سلطان محمود کی پیشقدمی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اب سلطان اُس کے دروازے پر آن پہنچا تھا۔ ڈیڑھ سو میل کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ راجہ گنڈہ نے اُسی وقت گوالیار کو روانگی کا حکم دے دیا۔

وہ جب گوالیار پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ راجہ ارجن کو قنوج کے سقوط کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ پریشان بھی تھا اور بھڑکا ہوا بھی مگر وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مہاراجہ قنوج بھاگ گیا ہے، حالانکہ بتلانے والوں نے یہی بتایا تھا کہ جب قنوج کا محاصرہ ہوا تو قلعے میں فوج بہت تھوڑی تھی اور مہاراجے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ کوئی مقابلہ بھی نہ ہوا۔ مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور شہر اور مندروں کی تباہی شروع ہو گئی۔

کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں نے مل کر مشترکہ منصوبہ بنایا کہ سلطان محمود پر جاسوسوں کے ذریعے نظر رکھی جائے کہ وہ آگے بڑھتا ہے یا قنوج میں رہتا ہے یا واپس چلا جاتا ہے۔ اگر وہ قنوج میں رُکتا ہے تو اُس پر وہیں حملہ کیا جائے اور اس حملے میں لاہور کے راجہ بھیم پال نڈر کی فوج کو بھی شامل کیا جائے۔

مہاراجہ کالنجر ابھی گوالیار میں ہی تھا کہ قنوج کے راج دربار کا ایک اعلیٰ رتبے کا آدمی کالنجر کے راستے گوالیار پہنچا۔ کالنجر میں اُسے بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ گنڈہ گوالیار میں ہے۔ اس آدمی نے دونوں مہاراجوں کو بتایا کہ مہاراجہ قنوج محاصرے سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ غزنی کا سلطان محمود آیا تو اُس نے خزانہ کھلوایا۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ مہاراجہ کے گھر کے ہیرے جواہرات اور زیورات وغیرہ بھی غائب تھے۔ قلعے میں فوج بھی پوری نہیں تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہاراجہ راجیا پال دشمن کو دیکھے بغیر غائب ہو گیا تھا۔" مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔ "اور وہ فوج کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔"

"کیا ہندو جاتی اس کا یہ گناہ معاف کر دے گی؟" — راجہ ارجن نے غضبناک آواز میں کہا۔ "کیا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ گیا کہاں ہے؟"

"یہ معلوم نہیں ہو سکا۔" اس آدمی نے جواب دیا۔ "اور دوسری خبر یہ ہے کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے۔"

"اور اُس کی فوج؟"

"کچھ ساتھ لے گیا ہے، کچھ قنوج میں چھوڑ گیا ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ مہاراجہ راجیا پال نے سلطان محمود کے ساتھ کوئی خفیہ معاہدہ کر لیا ہو؟" — راجہ ارجن نے پوچھا۔ "اور سلطان کو خوش کرنے کے لیے اپنی فوج جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے، ضرورت کے وقت سلطان کو دے دے؟"

"ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔" مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔ "راجیا پال کو ہم سارے ہندوستان کی عزت کا رکھوالا سمجھتے تھے مگر وہ بزدل نکلا۔ متھرا، مہابن، بلند شہر اور برنی کی فوجیں ختم ہو چکی ہیں۔ لاہور کے راجہ بھیم پال نڈر پر نظر اٹھتی ہے مگر وہ غزنی والوں کا باجگزار ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔"

"مگر ہم یہاں بیٹھے تماشہ تو نہیں دیکھ سکتے۔" — راجہ ارجن نے کہا۔ "اپنے دیس اور اپنے مذہب کی خاطر ہمیں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا ہو گا۔ مسلمانوں کو ہم اتنی آسانی سے ہندوستان کی حکمرانی نہیں لینے دیں گے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کا مطلب یہ ہو گا کہ صرف ہمیں ہی نہیں، ہمارے مذہب کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔"

مؤرخین نے جن میں گردیزی، ابن الاثیر، سمتھ اور فرشتہ قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں نے سلطان محمود کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور ان کے درمیان طے پایا کہ معلوم کیا جائے کہ مہاراجہ قنوج کہاں ہے اور راجہ بھیم پال نڈر کے ہاں ایلچی بھیجا جائے کہ وہ سلطان محمود کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو جائے تاکہ اُسے فیصلہ کن شکست دی جا سکے۔

سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج کا قلعہ اپنے ایک سالار ابوالقدر کے حوالے کر گیا تھا۔ غزنی کی تاریخ میں دو سالاروں کو زیادہ شہرت ملی ہے۔ ایک ابوعبداللہ بن محمد الطائی تھا اور دوسرا ارسلان جاذب۔ ابوالقدر کا ذکر بہت کم آیا ہے لیکن قنوج میں اُس نے ایسے دفاعی انتظامات کئے اور انتظامیہ کا ایسا ڈھانچہ بنایا کہ قنوج کو اس نے محفوظ کر دیا تھا۔

مہاراجہ قنوج کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اُسے پنڈت نے ازدہا سے ڈرا دیا تھا اور اُس پر اس لیے بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ اُس کی پسندیدہ رقاصہ کو انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اُس کا بیٹا لکھمن پال اُس کے پاس غار میں جا بیٹھا اور کہنے لگا کہ اُسے باری کو راجدھانی بنانے کی اجازت دی جائے۔ وہاں وہ تیاری کر کے سلطان محمود کو قنوج سے نکالے گا اور شکست کا انتقام لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ لاہور، کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لے گا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ سلطان محمود تمہیں نئی راجدھانی آباد کرنے دے گا؟" — راجیا پال نے کہا۔ "اُس کے جاسوس دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اُسے جونہی پتہ چلا کہ ہم باری میں اپنی فوج تیار کر رہے ہیں، وہ ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔"

"تو کیا ہم جنگلوں میں چھپے رہیں گے؟" — لچھمن پال نے پوچھا۔

"میں نے ایک محفوظ طریقہ سوچا ہے" — راجیا پال نے کہا۔ "میں قنوج سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اُسے اس پر راضی کر لوں گا کہ مجھ سے تاوان لے لے اور میں اس کا باجگزار بھی رہوں گا اور وہ مجھے باری کو راجدھانی بنانے اور فوج تیار کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اس کے ساتھ معاہدہ کروں گا کہ اس کے خلاف کبھی نہیں لڑوں گا اور اسے بوقتِ ضرورت فوج بھی دونگا۔"

"نہیں" — لچھمن پال نے کہا — "آپ کا جانا ٹھیک نہیں۔ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ سلطان محمود آپ سے خزانہ مانگے گا۔ اگر آپ نہیں دیں گے تو آپ کو قتل کرا دے گا.... اگر ایسا نہ ہوا تو بھی میں آپ کو نہیں جانے دوں گا کیونکہ ہم میں سے کسی کو آپ پر بھروسہ نہیں۔ آپ کے دماغ پر غزنی کا سلطان اتنا زیادہ سوار ہو گیا ہے کہ آپ اپنے مذہب سے کلی منحرف ہو گئے ہیں۔"

"تو کیا میں تم سب کا قیدی ہو گیا ہوں؟" — مہاراجہ نے پوچھا۔

"پنڈت جی مہاراج کہتے ہیں کہ آپ پر کسی شیطانی روح کا سایہ پڑ گیا ہے" — اُس کے بیٹے لچھمن پال نے کہا — "یہ سایہ لڑکی کی جان کی قربانی سے ہٹ جائے گا۔ پنڈت جی مہاراج کہتے ہیں کہ بھگوان جب کسی پر قہر برسانے پر آتے ہیں تو اُسے سب سے پہلے اپنے مذہب سے گمراہ کرتے ہیں۔"

"مذہب.... مذہب.... مذہب" — راجیا پال نے طنزیہ کہا۔ "میں مذہب سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں کسی کا قیدی نہیں۔ تم جاؤ۔ باری چلے جاؤ۔ راجدھانی آباد کرو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ میں تمہاری حفاظت کے لیے جو بہتر سمجھوں گا کروں گا۔"

پنڈت نے اپنا خیمہ اب دُور نصب کرایا تھا۔ مہاراجہ کی طرح اس کا خیمہ تین خیموں پر مشتمل تھا۔ ایک کو اُس نے عبادت گاہ بنا رکھا تھا۔ اس کے خیمے میں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے جب رقاصہ سندیا کو اپنے ہاں بلایا تو وہ حیران

ہوئی کہ پنڈت نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ وہ کسی رقاصہ کے ساتھ بات تک نہیں کیا کرتا تھا۔ سندیا اُس کے خیمے میں چلی گئی۔

"سندیا!" — پنڈت نے کہا۔ "تم پاپ کی ٹھیکری پھرتی گھومتی ہو۔ تم مر جاؤ گی تو لومڑی یا گیدڑی کے روپ میں دوسرا جنم لو گی۔ تمہارا وہ جنم دکھوں سے بھرا ہو گا۔ تمہاری روح بھٹکتی اور روتی رہے گی۔ تم پہلے جنم کو یاد کر کر کے بہت اذیت اٹھاؤ گی، لیکن ہر ہر پہلو تم پر معلوم نہیں کیوں مہربان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اپنی بیٹی بنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ دیوتا کی خواہش حکم ہوتا ہے سندیا! تم اس جیون کو نہیں چھوڑنا چاہو گی لیکن تم خوش ہو جاؤ کہ تم آکاش کی رانی ہو گی۔"

"وہ کس طرح مہاراج؟"

"ہم تمہیں دیوتا کے قدموں میں قربان کر رہے ہیں" — پنڈت نے کہا — "چاند کی بارھویں رات دیوتا تمہیں لینے آئیں گے۔ تمہارا خون اس زمین پر بہہ جائے گا کیونکہ یہ خون پاک نہیں۔"

"میں سمجھ گئی ہوں مہاراج!" — سندیا نے گھبرا کر کہا۔ "آپ میری گردن کاٹ دیں گے.... نہیں مہاراج! میں یہ موت نہیں مرنا چاہتی۔"

"تمہیں مرنا ہو گا سندیا!" — پنڈت نے کہا — "اپنے مذہب اور اپنے مہاراجہ کی خاطر تمہیں جان دینی ہو گی۔"

نوجوان رقاصہ نے بھاگ جانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پنڈت نے اُسے تسلی دلاسہ دیا اور کہا — "تم دیوتاؤں کی خواہش کو ٹھکراؤ گی تو تمہارا یہ حسین چہرہ جھریوں سے بھر جائے گا۔ آنکھیں سفید ہو جائیں گی اور کمر جھک جائے گی۔ تم مہاراجہ کے قابل نہیں رہو گی۔ وہ تمہیں جنگل میں چھوڑ آئیں گے.... دیوتا آ گئے ہیں۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔"

وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا جو خیمہ ہی تھا۔ اُس نے ایک جگہ خشک گھاس ڈال رکھی تھی۔ لکڑی سے گھاس ہٹائی تو ایک گڑھا نظر آیا۔ پنڈت

نے نندیا کو آگے کر کے گڑھا دکھایا۔ اس میں ایک اژدہا کُنڈلی مارے ہوئے تھا۔ اس پر ترسہ لیٹا ہُوا تھا۔ نندیا کی دبی دبی سی چیخ نکل گئی۔

"یہ ہیں دیوتا جو ہمارے مہمان ہیں۔"

"کیا آپ مجھے اس گڑھے میں پھینک دیں گے؟" — نندیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

پنڈت نے ایک پھول رقاصہ کی ناک سے لگا دیا اور کہا کہ اسے سونگھو۔ یہ مہا دیو کا تحفہ ہے۔ رقاصہ نے پھول سونگھا اور اُس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ ذرا سی دیر بعد وہ ڈولنے لگی۔ پنڈت نے اُسے تھام لیا اور دوسرے خیمے میں جا کر لٹا دیا، پھر اُس نے جا کر اژدہا پر گھاس بکھیر کر اُسے چھپا دیا۔

دو تین راتیں گذر گئیں۔ رات کے اندھیرے میں کوئی آدمی سایہ بن کر بے پاؤں خیموں کے ساتھ ساتھ چلتا اور رُکتا تھا۔ ایک رات وہ پنڈت کے خیمے کے ساتھ جا کھڑا ہُوا اور بیٹھ کر کان خیمے کے ساتھ لگا دیئے۔ وہ خیمے کے اردگرد رینگتا رہا اور رینگتا ہوا پرے چلا گیا۔ اگلی رات وہ مہاراجہ کے خیموں کے قریب چلا گیا۔ للکار سنائی دی — "کون ہے" — یہ سایہ سا وہیں سے غائب ہوگیا۔ اندھیرے میں سنسناتا ہُوا ایک تیر آیا جو اُس کے قریب سے گذر کر زمین میں جا لگا۔ وہ چوپایوں کی طرح جھاڑیوں میں چلا گیا جہاں سے گیدڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ محافظوں نے کہا — "گیدڑ ہے" — انہوں نے تلاش ترک کر دی۔

چند روز بعد مہاراجہ راجیا پال نے دو آدمی بلائے۔ دونوں اعلیٰ حکام تھے اور اُس کے معتمد۔ انہوں نے ہر حال میں مہاراجہ کا ساتھ دیا تھا۔ اب بھی انہوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ ہر مصیبت میں اور اُس کے ہر فیصلے میں اُس کا ساتھ دیں گے۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ قنوج جا کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا مستقبل نہیں بنا سکتا۔ مہاراجہ جنگ اور بن کر باری کو آباد کرنا چاہتا تھا لیکن پنڈت، اس کی رانی

اور اس کا بیٹا اس فیصلے کے سخت خلاف تھے۔

مہاراجہ نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر بالکل معمولی سے کپڑے پہن لیے۔ ایسا ہی لباس اپنے دونوں ساتھیوں کو پہنایا۔ سر اور چہرے پر گرد ڈال لی۔ وہ تینوں جب یہ بھیس بدل رہے تھے، اُس وقت پنڈت اُس کے خیمے میں آیا لیکن اُسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ اُس نے تینوں کو بھیس بدلتے دیکھا تو اُسے شک ہُوا۔ وہ وہیں سے واپس چلا گیا۔ مہاراجہ کا خیمہ سب سے الگ تھلگ اور دُور ہٹا ہُوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔

وہ تینوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دوسری طرف جدھر ویرانہ تھا، نکل گئے۔ قنوج کی طرف جانے کے لیے جنگل میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جو چٹانوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ وہاں گھنے پودے اور درخت تھے۔ تینوں سوار ایک چٹان کی اوٹ میں جا کر خیمہ گاہ سے اوجھل ہوگئے اور اطمینان سے چلنے لگے۔ وہ جب دو چٹانوں کے درمیان سے گذر رہے تھے تو مہاراجہ کا گھوڑا جو آگے جا رہا تھا، رُک گیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا کہ گھوڑے نے سانپ دیکھ لیا ہے۔ اتنے میں دوسرے دو گھوڑے بھی رُک کر کانپنے لگے۔ گھوڑا اگر سانپ کو دیکھ لے تو بے لگام ہو کر بھاگ اٹھتا ہے یا ایک جگہ رُک کر کانپنے لگتا ہے۔

جھاڑیوں میں سے ایک گرجدار اور بھاری سی آواز سنائی دی — "واپس جاؤ۔ دل کے ارادے دل میں مار دو۔ واپس جاؤ۔ جہاں جا رہے ہو وہاں ذلت کی موت ہے" — یہ آواز رُک رُک کر آتی تھی اور اس کے ساتھ دھیمی سی آواز میں گھنٹیاں بجتی تھیں۔ ان کے بجنے کا خاص انداز تھا جس سے ہر ہندو واقف تھا۔ ایسی گھنٹیاں مندروں میں بجا کرتی ہیں۔

"یہ آواز کسی انسان کی معلوم نہیں ہوتی" — مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا۔

اچانک ایک گھنے پودے میں سے ایک اژدہا کا سر نکل آیا۔ اژدہا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔ تینوں گھوڑے بدکے اور پیچھے کو بھاگ اٹھنے کی بجائے

دائیں بائیں ہو کر سرپٹ دوڑ پڑے اور بکھر گئے۔ گھوڑے بے لگام ہو گئے تھے۔ تینوں ماہر سوار تھے۔ انہوں نے دماغ حاضر رکھے اور گھوڑوں کو تھک جانے تک دوڑنے دیا۔

اُن کے چلے جانے کے بعد اژدہا ایک اور جھاڑی میں چلا گیا۔ ایک گڑھے میں سے جس پر ہری جھاڑیاں اور گھاس تھی، پنڈت نے سر نکالا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ اوپر آ گیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مارا جیسے اُسے تینوں سوار نکل جانے کا افسوس ہوا ہو۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور وہیں کھڑا رہا۔

کہیں سے ایک آدمی اُس کے سامنے آ گیا۔ پنڈت اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر محافظ تھا۔ اُس نے نیام سے تلوار نکال لی اور بولا۔ "نندیا کہاں ہے؟"

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" پنڈت نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "چلے جاؤ یہاں سے ورنہ مہاراجہ سے کہہ کر قتل کرا دوں گا۔"

"تمہاری اور مہاراجہ کی جانیں ہمارے قبضے میں ہیں۔" محافظ نے کہا۔ "میں پوچھتا ہوں تم نے نندیا کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ ... میں اس کی قربانی نہیں دینے دوں گا۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے پنڈت!"

پنڈت اُسے دیوتاؤں کے قہر سے ڈرانے لگا۔ قریب کی ایک گھنی جھاڑی سے جو پنڈت کے پیچھے تھی۔ اژدہا نے سر نکالا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ ادھیڑ عمر محافظ نے دیکھا مگر پنڈت کو خبردار نہ کیا۔ اژدہا نے جھپٹ کر پنڈت کی ران منہ میں لے لی۔ پنڈت نے چیخ ماری۔ اژدہا نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اژدہا مگرمچھ کی طرح شکار کو چباتا نہیں سالم نگلتا ہے اور اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ پنڈت نے چیخ چیخ کر محافظ سے کہا "اسے کاٹ دو۔ اسے تلوار سے کاٹ دو۔"

"یہ تمہارا دیوتا ہے پنڈت جی مہاراج!" محافظ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں نندیا کب سے تمہاری قید میں ہے۔ میں مہاراجہ کا وفادار ہوں، تمہارا نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے تمہارا دیوتا ہمارے مہاراجہ کو روک نہیں سکا۔"

"مجھے اس سے چھڑاؤ.... آگے آؤ۔" پنڈت چلّا رہا تھا۔

"نندیا کہاں ہے؟"

"بتا دوں گا۔" پنڈت نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "اسے کاٹ دو۔"

"نندیا کہاں ہے؟" محافظ نے کہا۔ "وہ تمہارے لیے ناچنے والی ایک بے معنی لڑکی ہے لیکن میں اسے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔ وہ یتیم لڑکی ہے جسے میرے ماں باپ نے پالا پوسا اور مہاراجہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ مجھے اس بچی کے ساتھ اتنا پیار تھا کہ میں اس کی خاطر مہاراجہ کے پاس آ گیا۔ میں نے مہاراجہ کو تیر اندازی اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے تو اس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں مہاراجہ کا کم اور نندیا کا محافظ زیادہ ہوں۔"

"میرے خیمے سے دو سو قدم پورب کی طرف چلے جانا۔" پنڈت نے کہا۔ "وہاں دو ٹیلوں کے درمیان جاؤ گے تو دائیں ٹیلے میں ایک شگاف دیکھو گے۔ اس میں چلے جانا۔ آگے گف ہے۔ بہت بچی ہوئی جگہ ہے۔ تم بھی وہیں رہنا چاہو گے۔ تمہیں نندیا وہیں ملے گی ... آگے آؤ بدبخت! مجھے اس سے چھڑاؤ۔"

"تم اپنی ریاکاری کا شکار ہو رہے ہو۔" محافظ نے کہا۔ "تمہاری اپنی فریب کاریاں تمہیں نگل رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اژدہا ہے دیوتا نہیں ہے۔" محافظ نے قہقہہ لگایا اور تلوار نیام میں ڈال کر وہاں سے اُس سمت دوڑ پڑا جو اُسے پنڈت نے بتائی تھی۔

اژدہا نے پنڈت کو زمین پر بار بار پٹخا اور اس کی ران چھوڑ کر اس کا سر اپنے منہ میں لے لیا۔ پنڈت بے ہوش ہو چکا تھا۔ اژدہا اُسے اچھال اچھال کر

نگلنے لگا۔

ادھر عمر محافظ نے گھوڑا کہیں دور کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس جگہ پہنچا جو اُسے پنڈت نے بتائی تھی۔ نشانیاں بڑی صاف تھیں۔ وہ ٹیلے کے شگاف میں داخل ہو گیا۔ آگے خاصی کھلی گُف تھی جس کے فرش پر مخمل جیسا کپڑا بچھا تھا۔ کچھ مورتیاں رکھی تھیں اور لوبان سلگ رہا تھا۔ نوجوان رقاصہ نے محافظ کو یوں دیکھا جیسے اُسے پہچانتی ہی نہ ہو۔ محافظ پرانی عمر کا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُسے شک ہوا کہ سندیا کسی دوائی کے اثر میں ہے ورنہ یہاں سے اکیلی کہیں نکل جاتی۔ محافظ نے سندیا کو بلایا تو وہ مسکرائی۔

محافظ نے وقت ضائع نہ کیا۔ وہ تنومند آدمی تھا۔ اُس نے سندیا کو اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور باہر لے جا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ خود بھی سوار ہوا اور جنگل کو نکل گیا۔

مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا لچھمن پال اپنے باپ کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ پنڈت کے خیمے میں گیا۔ پنڈت وہاں نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پنڈت نے سندیا کو کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہاں گیا تو وہاں سندیا نہیں تھی۔ واپس خیمہ گاہ میں آیا تو ایک ملازم نے اُسے بتایا کہ پنڈت کو اُس نے فلاں طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑی گٹھڑی کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ لچھمن پال اُدھر گیا۔ اُسے گٹھڑی گھسیٹنے کے نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ نشان اُسے وہاں تک لے گئے جہاں اژدہا پنڈت کو آدھے سے زیادہ نگل چکا تھا۔ پنڈت کی ٹانگیں اژدہا کے منہ سے باہر تھیں۔

لچھمن پال نے تلوار نکالی اور اژدہا کو دو حصوں میں کاٹ دیا مگر پنڈت جس شکنجے میں آ چکا تھا اس سے نہ نکل سکا۔ وہ بے حس ہو چکا تھا۔ کبھی کا مر گیا تھا۔ لچھمن پال نے دیکھا کہ وہاں ایک موٹا کپڑا پڑا تھا اور ایک رسّہ بھی تھا۔ اُس نے رسّے کا یہ ٹکڑا پہچان لیا۔ جس رات اژدہا غار میں آیا تھا، لچھمن پال وہیں تھا۔ رسّے کا یہ ٹکڑا اُسی نے پنڈت کو دیا تھا۔ اُس نے اژدہا کو بھی پہچان لیا لیکن سمجھ نہ سکا کہ یہ قصّہ کیا ہے اور کیا ہوا ہے۔

مہاراجہ راجیا پال بہت دور جا کر اپنے ساتھیوں سے ملا۔ اُن کے گھوڑے بے لگام اور سرپٹ دوڑ دوڑ کر شل ہو گئے تھے۔ اس سے سواروں کو یہ فائدہ پہنچا کہ پورے دن کی مسافت آدھے دن میں طے ہو گئی۔ وہ قنوج کی طرف صحیح سمت پر جا رہے تھے۔

محافظ دن بھر سندیا کو لیے لیے پھرتا اور اُسے دوائی کے اثر سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام کے بعد سندیا اپنے آپ میں آنے لگی اور اُس نے اس طرح باتیں کیں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ پنڈت نے کسی دوائی کے ذریعے اس کے دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ اُسے اتنا ہی اچھی طرح یاد تھا کہ پنڈت نے اُسے کہا تھا کہ وہ دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے اُس کی جان کی قربانی دے گا۔ باقی سب باتوں کو وہ خواب کی باتیں سمجھتی تھی۔

"پنڈت خود دیوتا کا نوالہ بن گیا ہے" ـــــ محافظ نے اُسے بتایا ـــــ "اُس نے ایک اژدہا پکڑ رکھا تھا۔ اُس سے وہ مہاراجہ کا راستہ روکنا چاہتا تھا مگر اژدہا نے اُسی کو کھا لیا۔"

"مہاراجہ کہاں ہیں؟"

"قنوج گئے ہیں" ـــــ محافظ نے جواب دیا "مسلمانوں سے صلح کریں گے۔"

"مسلمانوں سے صلح کرنے گئے ہیں؟" ـــــ سندیا نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں!" ـــــ محافظ نے جواب دیا ـــــ "ان کی سلامتی اسی میں ہے۔ میری طرح وہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ پنڈتوں کا یہ مذہب اُن کا اپنا فریب ہے اور میدانِ جنگ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مہاراجہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے مندروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے تو ہمارے دیوتاؤں نے اُن کا کیا بگاڑ لیا ہے؟"

"تم بھی اپنے مذہب کے خلاف ہو گئے ہو؟" ـــــ سندیا نے پوچھا۔

"ہمارا مذہب کیا ہے سندیا؟" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "راجوں مہاراجوں

کو خوش کرنا اور اُن کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دینا ہمارا مذہب ہے ۔۔۔ مگر یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں ۔ ہمیں اب یہ سوچنا ہے کہ جائیں کہاں ۔۔۔ کالنجر قریب ہے ۔ ڈیڑھ دن کا سفر رہ گیا ہے ۔ وہاں کے دربار میں تمہیں اور اپنے آپ کو پیش کروں گا ۔ کسی نے قبول کر لیا تو وہیں رہیں گے ۔ نہیں تو کہیں اور چلے چلیں گے ۔"

انہوں نے وہ رات سفر میں گذاری ۔ اگلی صبح وہ کالنجر کے قریب پہنچ گئے تھے ۔ اور اُسی صبح مہاراجہ راجیا پال قنوج میں داخل ہُوا ۔ اُس کے دو نو ساتھی ساتھ تھے ۔ تینوں کے حلیے عام سی قسم کے مسافروں جیسے تھے ۔ مہاراجہ نے اپنی راجدھانی دیکھی تو اسے دھچکہ سا لگا ۔ شہر اُجڑا اُجڑا تھا اور بعض مکان جلے ہوئے تھے ۔ مہاراجہ آگے بڑھتا گیا اور بڑے مندر کے سامنے گھوڑے سے اُترا ۔ کسی نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا ۔ وہ مندر کے چبوترے پر چڑھ گیا ۔ مندر خاموش تھا ۔ وہاں بدبُو سی تھی ۔ یہاں تو خوشبو ہُوا کرتی تھی ۔ اندر گیا تو مندر ویران تھا ۔ نہ کوئی بُت نہ مُورتی ۔ یہ تو اُجڑی ہوئی سرائے لگتی تھی ۔ وہ اندرونی کمروں میں گیا ۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکتا" ۔۔۔ اُس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ۔ "میں کچھ نہیں جانتا ۔ کیا یہ دیوتاؤں کا قہر ہے کہ ہم اجڑے ہمارا شہر اُجڑا ؟ ۔۔۔ کیا یہ میرا جرم ہے ؟ ۔۔۔ میں نہیں جانتا کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے ۔ یہاں تو بھجنوں میں دیوتاؤں کے ساتھ میرا نام بھی لیا جاتا تھا ۔"

"سچا وہ خدا ہے جو بھجنوں اور گھنٹیوں سے بے نیاز ہے" ۔۔۔ اُس کے عقب سے آواز آئی ۔

مہاراجہ نے گھوم کے دیکھا ۔ ایک آدمی اُس کی زبان بول رہا تھا ۔ "کیا قنوج کا مہاراجہ اپنے جاہ و جلال کے اور اپنے باطل مذہب کے کھنڈرات دیکھ رہا ہے ؟ ۔۔۔ کیا مہاراجہ عبرت حاصل کرنے آیا ہے ؟"

"اوہ ، تم ؟ سنگرام ؟" ۔۔۔ مہاراجہ نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے پوچھا

۔ "تم یہیں ہو ؟ کیا کر رہے ہو ؟"

"جو لوگ بہروپ میں آئے ہیں انہیں اصل روپ میں لانے کا کام کرتا ہوں" ۔۔۔ سنگرام نے کہا ۔ "میں اب سنگرام نہیں عثمان ہوں ۔ مسلمان ہو گیا ہوں ۔ آپ مجھے غدّار کہہ سکتے ہیں مگر مہاراجہ خود ہی قوم سے غدّاری کر جائے تو ۔۔۔"

"میں کسی کو غدار کہنے نہیں آیا" ۔۔۔ مہاراجہ نے کہا ۔ "غزنی کے سلطان سے ملنے آیا ہوں ۔"

"سلطان غزنی جا چکا ہے" ۔۔۔ عثمان نے کہا ۔ "یہاں سالار ابوالقدر سلجوقی ہے ۔"

"اُس کے پاس لے چلو ۔"

سالار ابوالقدر سلجوقی کو جب بتایا گیا کہ یہ شخص مہاراجہ قنوج ہے تو اُس نے یقین نہ کیا ۔ اُسے یقین دلایا گیا تو اُس نے پوچھا کہ مہاراجہ کیوں آیا ہے ؟

"سلطان کی اطاعت قبول کرنے آیا ہوں" ۔۔۔ مہاراجہ نے کہا ۔ "آپ چاہیں تو مجھے قید کر لیں ، چاہیں تو قتل کر دیں ۔"

"میں ایک مہاراجہ کو اس حلیے میں نہیں دیکھ سکتا" ۔ ابوالقدر سلجوقی نے کہا ۔ "اگر آپ کے کپڑے خون آلودہ ہوتے تو میں اور زیادہ خوش ہوتا کہ آپ اپنے ملک کے لیے لڑے ہیں مگر آپ میرے پاس آ گئے ہیں ۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں" ۔۔۔ ابوالقدر نے حکم دیا ۔ "مہاراجہ کو غزنی کے اُمراء کا لباس پہنا کر لایا جائے اور ان کے ساتھیوں کو عزت سے رکھا جائے ۔"

کچھ دیر بعد مہاراجہ نہا دھو کر نہایت اچھی پوشاک میں ابوالقدر کے سامنے آیا ۔ ابوالقدر نے اُس سے پوچھا کہ اس کے پاس ہے کیا جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھتا اور اطاعت قبول کرے گا ؟

"آپ کو یہاں خزانہ خالی ملا ہو گا" ۔۔۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا ۔ "وہ تمام

خزانہ میرے پاس ہے۔ میرے پاس باری نام کی اور جگہ ہے اور وہاں کچھ فوج بھی ہے۔ اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ باری میں مجھے اپنی ریاست قائم کرنے دیں گے تو میں تاوان بھی ادا کردوں گا اور باج بھی اور میں دوستی کا معاہدہ بھی کردوں گا۔"

"آپ بھاگے کیوں تھے؟" ــــ ابوالقدر نے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا" ــ مہاراجہ نے کہا ــ "کیونکہ یہ خوشامد ہوگی۔ میں نے اپنے دیوتاؤں کی بھی کبھی خوشامد نہیں کی۔"

"کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟"

"میں مذہب کے نام سے بیزار ہوں" ــ مہاراجہ نے جواب دیا ــ "میں آپ کے سلوک سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ کسی دن میرا دل مجھے کہے گا کہ اسلام قبول کرلو، لیکن ابھی آپ میری درخواست پر غور کریں۔"

"میں سلطانِ غزنی کے نام پر آپ کی درخواست قبول کرتا ہوں" ــــ ابوالقدر نے کہا ــ "آپ اپنی نئی ریاست قائم کرلیں۔ میرے کچھ عسکری حکام باری جا کر جائزہ لیں گے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ تحریری معاہدہ ابھی ہو جائے گا۔ تاوان اور باج سلطانِ غزنی مقرر کریں گے۔ قاصد آج ہی روانہ ہو جائے گا۔"

اُدھر سندیا اپنے محافظ کے ساتھ کالنجر پہنچ گئی۔ محافظ نے مہاراجہ کالنجر کو یہ خبر سنائی کہ مہاراجہ راجیا پال غزنی کی اطاعت قبول کرنے کے لیے قنوج چلا گیا ہے۔ مہاراجہ کالنجر گنڈہ تڑپ اٹھا۔ اُس نے اُسی وقت راجہ ارجن (گوالیار) کے نام پیغام لکھوا کر بھیج دیا جس میں لکھا کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ راجیا پال کے قتل کا انتظام کیا جائے اور راجہ بھیم پال نڈر سے مل کر سلطان محمود کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جائے۔

غزنی کی آبرو

۴۰۹ ہجری

(۱۰۱۹-۲۰ عیسوی) کے حج میں چند مہینے باقی تھے۔ حج کو جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے۔ ہر علاقے کے سینکڑوں لوگ اکٹھے ہو جاتے اور گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر اور پیدل قافلے کی صورت میں حج کو چلا کرتے تھے۔ ان قافلوں میں تاجر بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ بعض مسافر اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ رکھتے تھے۔ قافلہ جتنا چھوٹا ہوتا تھا، اس پر ڈاکوؤں کے حملے کا اتنا ہی زیادہ خطرہ ہوتا تھا، اس لیے قافلے بہت بڑے ہوتے تھے۔ جوں جوں قافلے بڑھتے جاتے تھے ان میں مسافر شامل ہوتے جاتے تھے۔

اس کے مطابق ڈاکوؤں نے بھی اپنے گروہوں کی نفری بڑھا لی تھی۔ آگے چل کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں صلیبیوں نے اپنے فوجی دستوں سے حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے بہت سے مؤرخوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ حماد بن علی نام کا ایک عرب سلطان محمود غزنوی کے دور کا طاقتور رہزن تھا۔ اس نے عرب ممالک کے پسماندہ قبائل میں سے اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا جو قافلوں کو لوٹتا تھا۔ اس کا یہ گروہ ایک فوج بنتا جا رہا تھا۔ وہ عرب ملکوں میں حاجیوں کے قافلوں کو روکتا اور مال و دولت اور نوجوان لڑکیاں اڑا لے جاتا تھا۔ دو تین قافلے غزنی کے بھی لوٹے گئے تھے۔ محمود غزنوی کو اطلاع ملی تھی لیکن اُسے

ہندوستان کی جنگیں اور اپنے ہاں کی خانہ جنگی مہلت نہیں دیتی تھی کہ ڈاکوؤں کے انسداد کے لیے کچھ کرتا۔ اس کے علاوہ غزنی کے قافلے عرب کے دور دراز علاقوں میں لوٹے گئے تھے جو سلطان محمود کی دسترس سے باہر تھے۔

فرشتہ نے اُس دور کی تحریروں کی شہادت پر لکھا ہے کہ سلطان محمود کے دور میں القادر باللہ عباسی خلیفہ تھا اور خلافت کی گدی بغداد میں تھی۔ خلافت اب اقتدار کی گدی بن کر رہ گئی تھی۔ القادر باللہ ایک علاقے کا حکمران بھی تھا جس کے دفاع اور توسیع کے لیے وہ کوشاں رہتا تھا۔ اس کی یہ کوششیں درپردہ ہوتی تھیں۔ اقتدار پرستی اور شہنشاہیت کے لیے جھوٹ اور فریب ضروری ہوتا ہے، چنانچہ خلیفہ بعض سازشوں کا خالق تھا۔ سلطان محمود کے ساتھ بھی اُس کی ایک ٹکر ہو چکی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ خلیفہ القادر باللہ کو معلوم تھا کہ عرب کے بعض قبائل جو بدو کہلاتے ہیں، حماد بن علی کی قیادت میں قافلوں کو لوٹتے ہیں لیکن خلیفہ دانستہ نگاہیں پھیرے ہوئے تھا۔

انہی دنوں جب ہر علاقے میں حاجیوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، بغداد میں حماد بن علی خلیفہ کے ایک سالار کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بڑی حسین لڑکیاں تھیں جو کچھ دیر وہاں خاموش بیٹھی رہیں۔ سالار انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ ان لڑکیوں کے علاوہ حماد بن علی کچھ اور تحفے بھی لایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکیاں اور تحفے کسی اور کمرے میں چلے گئے۔ سالار اور حماد اکیلے رہ گئے۔

"خلیفہ کے مزاج کیسے ہیں؟" — حماد نے پوچھا۔ "حج کا موسم آ رہا ہے۔"

"خلیفہ کے مزاج پہلے کی طرح میرے ہی ہاتھ میں ہیں" — سالار نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا حج سے پہلے تم آؤ گے۔ ہمارا حصہ ہمیں مل جائے۔ خلیفہ کی پرواہ نہ کرو۔ اُسے خلافت کی گدی سے پیار ہے اور اُسے ایسے مشیروں اور درباریوں کی ضرورت ہے جو اسے یقین دلاتے رہیں کہ وہ ساری دنیا کا بادشاہ ہے اور اُس کی رعایا اُس سے بہت خوش ہے۔ یہ کام ہم

کر رہے ہیں۔ اس کی نظر میں تم بہت بڑے تاجر ہو جس کی تجارت غزنی سے ہندوستان اور مصر تک پھیلی ہوئی ہے۔"

"اب میں اپنی تجارت غزنی تک پھیلانا چاہتا ہوں" — حماد بن علی نے کہا۔ "وہاں سے مجھے خبر ملی ہے کہ سینکڑوں آدمیوں کا قافلہ حج کے لیے آ رہا ہے۔ اس کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس قافلے میں ہندوستان کی دولت آ رہی ہے..... کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کا سلطان محمود ہندوستان کے خزانے خالی کر لایا ہے؟"

"اُس کے تحفے خلیفہ کے پاس بھی پہنچ چکے ہیں" — خلیفہ کے سالار نے جواب دیا۔ "یہ صحیح ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے اتنے زر و جواہرات اور درہم و دینار لایا ہے جو تمہارے اور میرے تصوروں میں بھی نہیں آ سکتے۔"

"اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اُس نے اپنی فوج کو مالِ غنیمت سے مالا مال کر دیا ہے" — حماد نے کہا۔ "ان فوجیوں کے لواحقین حج کے لیے آ رہے ہیں۔ ہندوستان کا قیمتی سامان ان کے ساتھ آ رہا ہے جو ہماری منڈیوں میں فروخت ہوگا۔ قافلے کے ساتھ غزنی کے وہ تاجر بھی آ رہے ہیں جنہوں نے سلطان کی فوج سے سامان خریدا ہے۔ ایسا قافلہ اس سے پہلے میرے ہاتھ کبھی نہیں آیا تھا۔ اب میری توجہ اسی قافلے پر مرکوز ہے۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے یقین دلائیں کہ میں اس قافلے پر ہاتھ ڈالوں تو خلیفہ میری گردن نہیں پکڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ خلیفہ سلطان محمود سے ڈرتا ہے۔"

"کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ خلیفہ تمہیں تاجر سمجھتا ہے؟" — سالار نے کہا۔ "کون جان سکے گا کہ غزنی کے قافلے کا تم نے صفایا کیا ہے؟..... ہاں، تمہیں ایک احتیاط کرنی پڑے گی۔ قافلہ بہت بڑا ہے اس لیے تمہارے ساتھ بہت سے آدمی ہو لے جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلطان محمود قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دے۔ وہ پکا مسلمان

ہے اور سنا ہے کہ وہ حج کے لیے جانے والوں اور حج سے واپس آنے والوں کا بہت احترام کرتا ہے اور انہیں ہر طرح کی سہولت دیتا ہے۔"

"اب تو میں بھی فوج اکٹھی کر سکتا ہوں"۔۔۔ حماد بن علی نے کہا ۔۔۔ "تمام قبیلے میرے زیر اثر ہیں۔ میں سات آٹھ سو لشکری بڑی آسانی سے لے آؤں گا۔ کیا آپ ان قبیلوں سے واقف نہیں؟ ۔۔۔۔ اور پھر میں آمنے سامنے آ کر للکار کر تھوڑے ہی لڑوں گا۔ میں گھات لگاؤں گا۔"

"کسی پہاڑی علاقے میں؟"۔۔۔ سالار نے جواب دیا۔

"نہیں۔ کید کے ریگستان میں"۔۔۔ حماد نے جواب دیا ۔۔۔ "آپ کیسے سالار ہیں؟ کیا آپ ریگستان کی گھات نہیں جانتے؟ جب قافلے پر اچانک حملہ ہوگا تو قافلے والے ادھر اُدھر بھاگیں گے۔ انہیں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ میں کید کے ریگستان سے واقف ہوں۔ ایک علاقہ ریتیلے ٹیلوں کا ہے۔ اس کی بھول بھلیوں سے صرف ہمارے قبیلے واقف ہیں۔ کوئی اجنبی ان میں پھنس جائے تو اُسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس [illegible] میں غزنی کی فوج بھی نہیں لڑ سکتی۔ میرے ساتھ جو قبائل ہیں وہ انسان نہیں جن ہیں ۔۔۔۔ آپ مجھے خلیفہ سے ملوا دیں۔ اس کی خدمت میں بھی کچھ پیش کروں گا۔"

خلیفہ القادر باللہ عباسی اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا اور اُس کا سالار جو اُس کا منظورِ نظر تھا اسے بتا رہا تھا کہ حماد بن علی اُس سے ملنے آیا ہے۔ وہ تحفے جو حماد لایا تھا، خلیفہ کے سامنے پڑے تھے۔ سالار نے حماد کی بہت تعریف کی اور خلیفہ کو بتایا کہ حماد بن علی بڑے کام کا آدمی ہے۔ وہ تمام سرکش قبائل کو آپ کی خلافت کا غلام بنا رہا ہے اور آپ کے لیے وہ ان قبائل میں سے فوج تیار کر رہا ہے۔ جب کبھی ہمیں ضرورت پڑی، یہ قبائل ہمارے دوش بدوش لڑیں گے۔"

"یہ قبائل سرکش اور خود سر ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ قافلوں کو لوٹتے ہیں اور

لڑکیاں بھی اٹھا لے جاتے جنہیں وہ بیچ ڈالتے ہیں۔"

"یہ اُن لوگوں کا بہتان ہے جو حماد کی مقبولیت اور طاقت سے خوفزدہ ہیں اور حسد کرتے ہیں"۔۔۔ سالار نے چاپلوسی کا کمال دکھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ہر وہ انسان جو لوگوں میں مقبول ہے وہ حاسدوں کے دل کا کانٹا سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے بھی دشمن ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ آپ کی رعایا آپ کا نام سن کر سجدہ ریز ہو جاتی ہے تو وہ جلتے اور کڑھتے ہیں۔ حماد بن علی نے تمام سرکش قبائل کو اپنا مرید بنا رکھا ہے اور خود آپ کا مرید ہے۔ وہ تمام قبائل کو آپ کا مرید بنا چکا ہے۔"

"امیر المومنین!"۔۔۔ ایک اور درباری حاکم جو سالار کا ہی آدمی تھا، بول پڑا ۔۔۔ "اس عمر میں بھی آپ کا چہرہ مبارک جوانی کے خون سے دمک رہا ہے۔ حماد بن علی آپ کے لیے جو تحفہ لایا ہے، وہ آپ رات کو اپنے حرم میں رکھ لیں گے۔"

"اور آپ اس تحفے کے قابل ہیں"۔۔۔ سالار نے کہا ۔۔۔ "آپ حماد کو شرف باریابی بخشیں۔ وہ باہر انتظار کر رہا ہے۔"

"اسے انتظار میں باہر کیوں کھڑا رکھا گیا ہے"۔۔۔ خلیفہ نے ساری دنیا کے بادشاہ کی طرح جلال سے لہجے میں کہا ۔۔۔ "ایسے آدمی کو ہم اپنے برابر بٹھائیں گے۔"

فوراً حماد بن علی کو حاضر کیا گیا۔ وہ وجیہہ عرب تھا۔ چہرہ لال اور آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں۔ ادھیڑ عمر تھا لیکن لگتا جوان تھا۔ اُس کے چہرے پر اُن عربوں کا جلال تھا جنہوں نے رومیوں اور زرتشتوں کو گھٹنوں بٹھا دیا اور اسلام کا پرچم سمندر پار یورپ میں جا گاڑا تھا۔ حماد کے بازو لمبے اور کندھے سیدھے اور گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جب اندر آیا تھا تو اُس کے قدموں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور وہ مردانہ وقار کا شاہکار تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک میں ہوس

کے چہرے کی دمک میں اور اُس کے ظاہری جاہ و جلال میں شائبہ تک نہ ملتا تھا کہ یہ شخص لٹیرا اور قاتل ہے۔

خلیفہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ حماد کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”آگے آؤ حماد بن علی! خدا کی قسم! ہمیں تمہارے چہرے پر لکھا نظر آتا ہے کہ تم قصرِ خلافت کے پاسبان ہو۔ لُوٹ مار کرنے والے وحشی قبائل کو لگام ڈال کر تم نے خلافت پر اور اسلام پر عظیم احسان کیا ہے۔“

”میں آپ کی رعایا ہوں یا امیرالمومنین!“ حماد نے کہا۔ ”رعایا میں کون ایسا فرد ہے جو آپ کی عبادت نہیں کرتا؟ آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ میں قصرِ خلافت کا پاسبان ہوں۔ میں اپنی جان اور صحرائی قبیلوں کی وفاداری پیش کرنے آیا ہوں۔“

خلیفہ نے حماد کو یوں اپنے برابر بٹھا لیا جیسے کسی نے سانپ اپنی آستین میں ڈال لیا ہو۔

یہ ۱۰۲۰-۱۰۱۹ء کا دَور تھا جب سپین اُندلس کہلاتا تھا اور وہاں اسلامی پرچم لہرا رہا تھا مگر سرنگوں ہوتا جا رہا تھا۔ قرطبہ سازشوں کا اور اقتدار پرست پہلوانوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ طارق بن زیاد کی ہڈیاں خاک ہو چکی تھیں اور اُس کی روح اُس اُندلس کے لیے تڑپ رہی تھی جسے فتح کرنے کے لیے اُس نے سمندر پار کر کے کشتیاں جلا ڈالی تھیں تاکہ واپسی کا تصوّر ہی مِٹ جائے۔ وہ اُندلس، وہ طارق بن زیاد کا اُندلس ویسے ہی چاپلوس مشیروں اور درباری خوشامدیوں کی بھینٹ چڑھ رہا تھا جیسے بغداد کے قصرِ خلافت میں بھی موجود تھے۔ اُن دنوں جب بغداد میں ایک لٹیرا اور صحرائی قزاق خلیفہ کے دربار میں ایک معزز تاجر کے بہروپ میں پیش کیا گیا تھا، سپین کے حکمران حیا کا بھتیجا اُس کے خلاف لڑ رہا تھا۔ یہ خانہ جنگی تھی۔ وہاں خلافت وجۂ پیکار بنی ہوئی تھی جو کوئی خلافت کی گدی پر بیٹھ جاتا وہ ہر اُس آدمی کو قتل کرانے کی درپردہ

کوشش کرتا تھا جس سے اُس کے اقتدار کو خطرہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے خلاف سازشیں ہوتی تھی۔

خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا ایک ٹولہ تھا جو ہر خلیفہ کی مدح سرائی کرتا اور اُس پر غالب آجاتا تھا۔ دشمن سلطنتِ اسلامیہ کی جڑوں میں اُتر کر اُسے چوہوں کی طرح کھا رہے تھے۔ غدّاروں کے وارے نیارے تھے۔ نا اہل اور بددیانت لوگ عہدے اور رُتبے حاصل کرنے لگے اور جو عہدوں اور رتبوں کے اہل تھے وہ مشتبہ، تخریب کار اور شر پسند کہلانے لگے۔ اہلِ قلم بھی اپنا ایمان اور صداقت نیلام کر بیٹھے اور اندلس میں اسلام کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

اِدھر خلافتِ بغداد بھی شخصی حکومت کی صُورت اختیار کر چکی تھی۔ وزیر اور مشیر مفاد پرستی کے شکار ہو گئے، اور صحرائی قزاق معززین میں شمار ہونے لگے تھے۔ حماد بن علی ایسے ہی افراد میں سے تھا۔ ایک سُلطان محمود غزنوی تھا جو اسلام کی مشعل اُٹھائے ہند کے بُت خانے میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اسی لیے وہ اقتدار کے بھوکے لوگوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

حماد بن علی کے ساتھ چار محافظ تھے جن میں ایک وجیہہ تُرک ارتگین تھا۔ وہ کوئی ایک سال پہلے حماد کے گروہ میں شامل ہُوا تھا اور حماد کا قابلِ اعتماد محافظ بن گیا تھا۔

جس طرح ہر اسلامی مملکت میں حج پہ جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، ایسا ایک قافلہ غزنی میں بھی تیار ہو رہا تھا۔ تیاری یہ تھی کہ قافلے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو جائیں تاکہ قزاقوں اور رہزنوں سے محفوظ رہیں۔ قافلے میں تاجر بھی شامل ہو رہے تھے۔ گرد و نواح کے لوگ بھی غزنی میں جمع ہو رہے تھے۔ اونٹوں گھوڑوں اور بیلوں کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بیل اور گھوڑا گاڑیاں تیار ہو رہی تھیں۔ یہ میلے کا

منظر تھا۔ اِس میلے میں حماد بن علی کے آدمی بھی گھوم پھر رہے تھے۔ وہ جائزہ لے رہے تھے کہ قافلے کے ساتھ کتنا مال جا رہا ہے اور جو لوگ ساتھ جا رہے ہیں وہ مزاحمت کے قابل ہیں یا نہیں۔

قافلے کو ڈیڑھ ایک ماہ بعد روانہ ہونا تھا۔ عرب کے صحرا میں کہیں ایک نخلستان تھا ___ وسیع اور سرسبز ___ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے۔ مشعلیں جل رہی تھیں۔ خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ خیموں سے ذرا پرے سو سو آدمی گول دائرے میں زمین پر بیٹھے تھے۔ ایک جگہ قالین بچھے تھے۔ ان پر حماد بن علی بیٹھا تھا۔ وہاں بھی مشعلیں اور قندیلیں جل رہی تھیں۔ گول دائرے میں ایک رقاصہ ناچ رہی تھی۔ تین چار خوبصورت اور جوان عورتیں حماد کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں کو شراب پیش کر رہی تھیں۔ ان کے کندھے، سینے اور نصف پیٹھیں ننگی تھیں۔ انہوں نے جو لمبے فراک پہن رکھے تھے ان پر ستارے سے چمک رہے تھے۔ ان عورتوں کی چال ایسی تھی جیسے ریت پر تیر رہی ہوں۔ مہمانوں کے آگے سالم بکرے روسٹ کر کے رکھے ہوئے تھے۔

رقاصہ کا رقص اور اس کے ساتھ صحرائی ساز وجد آفریں تھے۔ یہ الف لیلٰی کی ایک بڑی ہی حسین اور پُراسرار رات تھی۔ صحرا کا یہ حصہ عام گزرگاہ سے بہت دُور تھا۔ یہ حماد بن علی کی دنیا تھی اور اس دنیا میں جو ریت کے سمندر میں جزیرے کی مانند تھی، اسی کی بادشاہی تھی۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ عرب کے سرکش اور آزاد قبائل کے سردار اور سرکردہ لوگ تھے۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ یہ کسی قانون کے پابند نہیں اور ان کے دِلوں میں خدا کا خوف بھی نہیں۔ اس محفل میں اتنی حسین لڑکیاں کسی اور ہی جہان کی مخلوق لگتی تھیں۔

رات شراب اور عیاشی میں بہتی، ڈوبتی اور ابھر ابھر کر ڈوبتی گزر گئی۔ سورج ابھرا تو یہ لوگ سو گئے، اور جب سورج صحرا کو جھلساتا ہوا ڈوب گیا تو یہ پُراسرار لوگ

جاگ اُٹھے اور اُسی کھلی جگہ جا بیٹھے جہاں رات رقص اور شراب کی محفل جمی تھی مگر آج رات وہاں کوئی رقاصہ نہیں تھی۔ شراب پلانے والی عورتیں موجود تھیں۔

"میرے عزیز دوستو!" حماد بن علی نے سب سے مخاطب ہو کر کہا ___ "حاجیوں کے کئی قافلے چلنے والے ہیں اور مُلتان کے قافلے بھی پڑے ہوں گے مگر اب بہت بڑا شکار آ رہا ہے۔ یہ غزنی کا قافلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستان کا مالِ غنیمت آ رہا ہے۔ تم نے اس سے پہلے غزنی کے قافلے مارے ہیں مگر اتنا مال ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اب جو قافلہ آ رہا ہے وہ تمہیں برسوں کے لیے مالا مال کر دے گا مگر اس قافلے پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوگا۔ قافلے میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ سب مسلح ہوں گے اور ان میں فوجی بھی ہوں گے۔ اس قافلے پر چند ایک آدمیوں کا گروہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم سب کو مل کر ایک فوج کی طرح حملہ کرنا ہوگا ... کیا تم لوگ مجھے بتا سکتے ہو کہ ہر ایک کتنے آدمی اپنے ساتھ لا سکتا ہے؟"

"ایک ہزار" ___ ایک نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"چھ سَو" ___ ایک اور نے کہا۔

"چار سو"

ہر ایک نے بتایا کہ وہ کتنے آدمی لا سکتا ہے۔ یہ تعداد پانچ ہزار بن گئی۔

"یہ یاد رکھو کہ ہمیں پانچ ہزار قزّاق نہیں سپاہی درکار ہیں" ___ حماد بن علی نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہمیں ایسی ضرورت پیش نہ آئے لیکن ہمیں باقاعدہ لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ میں بغداد سے آ رہا ہوں۔ مجھے خلیفہ کے ایک سالار نے بتایا ہے کہ غزنی کا سلطان جس کا نام محمود ہے، حاجیوں کی بہت عزت کرتا ہے اور ان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اتنے بڑے قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھیج دے گا"

ہر سردار نے پُرجوش آواز میں حماد کو یقین دلایا کہ وہ اپنے ساتھ ایسے جنگجو لا رہا ہے جو غزنی کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔

"اگر تم واقعی سپاہی بن کر آؤ گے تو تمہیں ایک اور انعام ملے گا" ــــ حماد بن علی نے کہا۔ اُس کے پاس ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ یہ لڑکی ایک سال سے اُس کے پاس تھی۔ اُس نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہ غزنی کے حسن کا نمونہ ہے۔ غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں آرہی ہیں۔ پورے پورے کنبے آرہے ہیں۔ یہ ایسا انعام ہے جو تمہیں اور کہیں سے نہیں ملے گا۔"

لڑکی جو مسکرا رہی تھی، سنجیدہ ہوگئی اور اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ حماد بن علی سب کو بتانے لگا کہ قافلے پر کس مقام پر حملہ کرنا ہے۔ حماد کے پیچھے اس کا باڈی گارڈ ارتگین کھڑا تھا۔ وہاں محافظ کو ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ان قبائل کا بادشاہ تھا اور بادشاہ اپنے ساتھ محافظ رکھا کرتے تھے۔ جب حماد قبائل کے سرداروں سے مخاطب تھا، لڑکی نے نظر بچا کر ارتگین کی طرف دیکھا۔ ارتگین کا چہرہ بے تاثر تھا۔ لڑکی نے اُسے گھور کر دیکھا تو ارتگین کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے اُس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

قبائلی سرداروں نے غزنی کے قافلے پر حملے کا منصوبہ طے کرلیا اور انہوں نے کید کے ریگستان کو حملے کے لیے موزوں سمجھا۔

اُسی رات کا واقعہ ہے کہ حماد بن علی گہری نیند سو گیا تھا۔ دوسرے خیمے میں غزنی کی یہ لڑکی جس کا نام سبیلہ تھا، جاگ رہی تھی۔ اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ خیمہ گاہ پر موت کا سکوت طاری تھا۔ ان لوگوں کو کوئی غم نہیں تھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہیں پہرہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رہزنی اور قزاقی ان کا پیشہ تھا۔ وہ وحشی تھے۔ ان تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سبیلہ نے اُٹھ کر اپنے خیمے کا پردہ ذرا سا ہٹایا اور باہر دیکھا۔ باہر تاریکی تھی۔ وہ کسی کے انتظار میں تھی۔ وہ پھر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد پھر اٹھی اور خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اور اُس کی نظریں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے دو درختوں پر رک گئیں۔ ان کے پس منظر میں ستاروں بھرا آسمان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں

درختوں کے درمیان ایک انسانی سایہ آن رکا۔ کوئی آدمی وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔ سبیلہ نے ایک مردانہ چغہ اپنے اُوپر ڈالا اور خیمے میں سے نکل کر ننگے پاؤں کھجور کے اُن دو درختوں کی طرف چل پڑی۔

سایہ درختوں کے درمیان سے غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد دو سائے کھجوروں کے سیاہ ستونوں میں تحلیل ہوگئے۔ وہ ارتگین تھا۔ رات جب محفل برخاست ہوئی تھی تو سبیلہ نے موقع دیکھ کر ارتگین سے کہہ دیا تھا کہ رات وہ کھجور کے ان دو درختوں کے درمیان آجائے جو پانی کے کنارے الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ ارتگین اور سبیلہ کی آپس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ یوں چوری چھپے ملتے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیا کرتے تھے۔ دونوں کا ان قزاق قبائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ ان میں سے تھے۔ دونوں کو ایک قافلے سے اغوا کیا گیا تھا۔

سبیلہ غزنی کی فوج کے ایک شتر سوار کی بیٹی تھی۔ اُس کا باپ صرف شتر سوار ہی نہیں تھا، وہ سلطان محمود کا معتقد اور مرید تھا۔ وہ ہندوستان بھی اپنی فوج کے ساتھ گیا تھا۔ اپنے بچوں کو وہ سنایا کرتا تھا کہ اسلام ایک سچا اور عظیم مذہب ہے، جسے ساری دنیا میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ وہ انہیں اسلام کی عسکری کہانیاں بھی سنایا کرتا تھا۔ یہ کہانیاں سبیلہ کے خون میں شامل ہو گئی تھیں مگر وہ بارہ تیرہ سال کی تھی جب اُس کا باپ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ سبیلہ کی ماں نے اپنے خاوند کے ایک دوست کے ساتھ شادی کرلی۔ اُس کے پہلے بھی بچے تھے جن کے ساتھ اسے بہت پیار تھا۔ وہ انہی میں مگن رہا۔ سبیلہ اور اس کے چھوٹے دو بھائیوں کو وہ پیار اور شفقت نہ دے سکا۔

سبیلہ کی عمر سولہ سترہ سال ہوئی تو سوتیلے باپ نے اُسے خاصی بڑی عمر کے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس آدمی کی پہلے بھی دو بیویاں تھیں۔ سبیلہ کے سوتیلے باپ نے دراصل اس آدمی سے نقد رقم وصول کی تھی۔ سبیلہ کا خاوند رہنے والا دولتمند کوئی تھا۔ وہ شراب بھی پیتا تھا۔ ارتگین اس آدمی کا خاص ملازم تھا۔ وہ چونکہ

شہسوار تھا، تیرانداز اور تیغ زن بھی تھا اس لیے آقا نے اُسے اپنا محافظ بھی بنا رکھا تھا۔ ارتگین ترک غلام تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن غلامی میں گزرا تھا۔ وہ جب جوانی میں داخل ہُوا تو اُس کا قدبت اور چہرے کا حسن نکھر آیا۔ اُس کے سابقہ مالک نے اُس کی وجاہت سے متاثر ہو کر اسے گھوڑسواری، تیراندازی اور تیغ زنی سکھا کر اپنا محافظ بنالیا تھا۔ اُس دور میں اپنے ساتھ ایک محافظ رکھنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

اس آقا کی موت کے بعد اسے ایک اور ایسے ہی دولتمند نے خرید لیا۔ اس آقا نے چند برسوں بعد ایک تاجر کی بیٹی کے ساتھ شادی کی اور اس کے عوض ارتگین اسے تحفے کے طور پر دے دیا۔ آخر میں وہ اس آدمی کے ہاتھ فروخت ہُوا جس کے ساتھ سبیلہ کی شادی ہوئی تھی۔ سبیلہ کا ارتگین کے ساتھ اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ اس کے خاوند کا محافظ اور خاص ملازم تھا۔

ایک سال قبل سبیلہ کا خاوند ایک قافلے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ قافلے والوں نے مقابلہ کیا مگر انہوں نے ہتھیار ڈالنے میں دیر نہ کی۔ ارتگین ابھی تک مقابلے میں ڈٹا ہُوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر اور گھوم پھر کر لڑتا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اعلان کیا کہ اس شخص کو زندہ پکڑو۔

قافلے والے دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ارتگین اکیلا لڑ رہا تھا۔ آخر ڈاکوؤں نے اس کے گھوڑے کو زخمی کر کے ارتگین کو گرا لیا اور اسے پکڑ لیا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ قافلے کا تمام تر مال لگا اور دو بڑے قیمتی انسان۔ ایک ارتگین تھا اور دوسری سبیلہ۔ سبیلہ کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ عورت تھی۔ روتی ہُوئی ڈاکوؤں کے ساتھ چل پڑی، البتہ ارتگین کو ساتھ لے جانا مشکل ہو گیا۔ وہ ڈاکوؤں کو للکارتا تھا کہ دو دو آدمی باری باری اس کے مقابلے میں آئیں مگر اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ سبیلہ کا خاوند مارا گیا تھا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد ارتگین اور سبیلہ کو کسی جگہ حماد بن علی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکوؤں کا یہ گروہ اُسی کا تھا۔ سبیلہ پر تو خاموشی طاری تھی، ارتگین حماد کو بھی للکار رہا تھا۔ حماد چرب زبان تھا۔ اُس نے ارتگین کو موم کر لیا اور جب ارتگین نے اُسے بتایا کہ وہ غلاموں کے خاندان کا فرد ہے اور تین آقاؤں کا محافظ رہا ہے تو حماد نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"یہاں تم کسی کے غلام نہیں ہو"۔ حماد بن علی نے کہا۔ "یہاں تم بادشاہ ہو، سلطان ہو۔ تمہاری وجاہت دیکھ کر اور یہ سُن کر کہ تم میرے اتنے زیادہ آدمیوں کے ہاتھ نہیں آتے تھے، میں نے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تمہاری قدر میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا"۔

"کیا تم مجھے اپنے جیسا ڈاکو بنانا چاہتے ہو؟"۔۔۔ ارتگین نے خشمگیں لہجے میں پوچھا۔

"تو کیا تم غلام رہنا چاہتے ہو؟"۔۔۔ حماد نے کہا۔ "کیا تم آزادی کی زندگی پسند نہیں کرو گے؟"

حماد نے اُسے قائل کر لیا کہ وہ اُس کے ساتھ رہے۔ حماد کو جب پتہ چلا کہ وہ اس لڑکی سبیلہ کے خاوند کا محافظ تھا جسے اُس کا گروہ اغوا کر لایا تھا تو اُس نے سبیلہ سے کہا۔ "اگر تم یہاں ملکہ بن کے رہنا چاہتی ہو تو اپنے خاوند کے محافظ سے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ رہے، ورنہ تم دونوں کا انجام بہت بُرا ہو گا"۔

سبیلہ نے ارتگین کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ اُس کی خاطر اُس کے ساتھ رہے۔ سبیلہ نے اُسے بتلایا کہ حماد نے اُسے کیا دھمکی دی ہے۔ ارتگین حماد کا قائل ہو ہی چکا تھا، سبیلہ کے مظلوم آنسوؤں نے اُس سے فیصلہ کروالیا کہ وہ حماد کے ساتھ رہے گا۔ حماد نے اُسے بہترین گھوڑا دیا اور اُسے اپنا ذاتی محافظ بنالیا اور سبیلہ حماد کی داشتہ بن گئی۔ دونوں ایک سال کے عرصے میں اس ماحول میں گھل مل گئے تھے۔ ارتگین رہزنی کی وارداتوں میں شریک ہُوا تھا۔ وہ چونکہ حماد کا محافظ تھا

اس لیے وہ قزاقی میں کم ہی شامل ہوتا تھا۔ بدّوؤں کے یہ قبائل اتنے سرکش تھے کہ اپنے اپنے سردار کے سوا کسی اور کا حکم نہیں مانتے تھے حماد بن علی کو سب نے صرف اس لیے اپنا بے تاج بادشاہ تسلیم کرلیا تھا کہ اُس نے خلیفۂ بغداد کو اور ہر اُس حاکم کو جو حماد کو گرفتار کرسکتا تھا، اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا خلیفہ کو تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ حماد رہزن اور قزاق ہے۔

اس ایک سال کے دوران ارتگین اور سبیلہ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ارتگین اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے یہی لگاؤ تھا کہ دونوں اغوا ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں نے اس زندگی کو پسند کرلیا ہے۔ سبیلہ کو حماد نے ملکہ بنا دیا تھا اور ارتگین کے ساتھ حماد کا یہ وعدہ پورا ہوگیا تھا کہ وہ یہاں غلام نہیں آزاد ہوگا۔ بدّو اُس کا احترام کرتے تھے۔

اُس رات جب سبیلہ ارتگین سے ملنے گئی تو یہ پہلی خفیہ ملاقات تھی۔ ارتگین حیران تھا کہ سبیلہ نے اُسے یوں چوری چھپے کیوں بلایا ہے۔ کیا وہ اپنے آقا کے ساتھ بے وفائی کرنا چاہتی ہے؟ کیا اُس نے درپردہ تعلقات کے لیے ارتگین کو منتخب کیا ہے؟

"کیوں سبیلہ!" — ارتگین نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا — "ایسی کیا بات ہے کہ تم نے مجھے دن کے وقت اپنے خیمے میں بلانے کی بجائے رات کے اس وقت یہاں بلایا ہے؟"

"میں نے تمہیں اپنے مرے ہوئے خلاوند کا غلام سمجھ کر نہیں بلایا" — سبیلہ نے کہا — "اپنے آپ کو نہ میرا غلام سمجھو نہ حماد بن علی کا... میں تمہارے سینے میں ایک انسان کو بیدار کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا انسان جو کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خدا کا اور اپنے مذہب کا اور اپنے وطن کا غلام ہوتا ہے۔"

"کیسی باتیں کررہی ہو سبیلہ!" — ارتگین نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "معلوم ہوتا ہے تم خواب دیکھ رہی ہو۔ نیند میں بول رہی ہو۔"

"یہی بتانے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ میں جاگ اٹھی ہوں" — سبیلہ نے کہا — "وہ سبیلہ جاگ اٹھی ہے جو غزنی کی فوج کے ایک شتر سوار کی بیٹی تھی۔ یہ بیٹی اُس روز مرگئی تھی جس روز اُس کی ماں نے اپنے مجاہد خاوند کی موت کے بعد ایک ایسے آدمی کے ساتھ شادی کرلی تھی جو مجاہد نہیں تھا۔ پھر یہ بیٹی بک گئی — تمہارے آقا کے ہاتھ — میں نے اس بیٹی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔"

"عورت اور غلام کی لوحِ تقدیر پر یہی لکھا ہوتا ہے" — ارتگین نے کہا — "تم نے بھی اپنی قسمت دیکھ لی ہے۔ میں نے بھی اپنی تقدیر کا لکھا دیکھ لیا ہے لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ میں غلام پیدا ہوا تھا۔ قبیلے کے ساتھ خانہ بدوشی میں پل کر جوان ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بکتا رہا۔ میں نے صرف ایک بار سُنا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا غلام بنائے۔ میں ہنس پڑا تھا کیونکہ انسانوں کو غلام رکھنے والے مسلمان ہی تھے۔"

"وہ گناہگار تھے" — سبیلہ نے کہا — "اسلام کی نگاہ میں کسی کو غلام رکھنا گناہ ہے۔ میری شادی تمہارے آقا سے ہوئی تو یہ بھی گناہ تھا۔ یہ شادی نہیں تھی، یہ سودا ہوا تھا۔ مجھے بیچا گیا تھا۔ میں شروع کے چند دن اُداس رہی پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ یہ تو عورت کی قسمت ہی ایسی لکھی گئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو مار لیا اور میں خوش رہنے لگی۔ تم نے مجھے ہنستے بھی دیکھا تھا مگر یہ میرا جسم تھا جو زیور اور ریشمی کپڑوں سے سجا ہوا تھا، اور یہ میرا حسن تھا جس نے مجھے فروخت کرایا تھا۔ میری روح روتی تھی۔"

"تمہاری شادی کسی تم جیسے جوان اور خوبرو مرد کے ساتھ ہونی چاہیے تھی" — ارتگین نے کہا۔

"میں اپنی شادی کا رونا نہیں رو رہی" — سبیلہ نے کہا — "جب میرا باپ زندہ تھا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شادی ہوگی۔ باپ نے میرے ذہن میں یہ ڈال دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور کفر کو جان اور مال کی قربانی دے کر ختم کرنا میرا فرض ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہندوستان کے بُت خانے

مجھے للکار رہے ہیں۔ میرا باپ دو مرتبہ ہندوستان گیا تھا۔ وہ کفرستان کے قلعوں کی تسخیر میں شریک تھا۔ اُس نے دیوتاؤں کے بُت ٹوٹتے دیکھے تھے۔ اُس نے بُت خانوں میں اذانیں سنی تھیں۔ میرا باپ اُن مجاہدینِ اسلام میں سے تھا جن کی عمر میدانِ جہاد میں گزر جاتی ہے۔۔۔ میری رگوں میں اس باپ کا خون ہے۔"

"سبیلہ!" ـــ ارتگین نے کہا۔ "کیا تم بھول گئی ہو کہ ہم دونوں کہاں بیٹھے ہیں؟ کسی نے دیکھ لیا تو حماد ہم دونوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر صحرا میں پھینک دے گا۔ صحرا کی موت کو تصوّر میں لاسکتی ہو؟..... مجھے جلدی جلدی بتاؤ کہ آج رات تم اپنے ماضی کو کیوں یاد کر رہی ہو۔ اگر تم نے اپنا من مار لیا تھا تو اسے زندہ کیوں کر رہی ہو! یہ زنجیریں ٹوٹ نہیں سکتیں جن میں تم اب جکڑی گئی ہو۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔"

"ہاں ارتگین!" ـــ سبیلہ نے کہا۔ "میں یہاں خوش تھی۔ اگر انسان صرف گوشت اور ہڈیوں کا مجسّمہ ہے تو میں یہاں بہت خوش تھی مگر رات میرا مجسّمہ مر گیا ہے اور روح زندہ ہو گئی ہے۔ قزاق کی داشتہ مر گئی ہے اور مجاہد کی بیٹی زندہ ہو گئی ہے..... اب میں تمہیں بیدار کرنے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا میں تمہیں یہاں سے بھگا لے جاؤں؟" ـــ ارتگین نے پوچھا ـــ "بڑا مشکل کام ہے۔"

"نہیں" ـــ سبیلہ نے کہا۔ "میں یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ تم بھاگ جاؤ..... سنو ارتگین! جب تم میرے خاوند کے محافظ اور غلام تھے تو میرا تمہارے ساتھ کیا سلوک تھا۔ تمہیں یاد ہے ایک بار میرا خاوند تمہیں کہیں بھیج رہا تھا اور تم بیمار تھے مگر میرا خاوند کہہ رہا تھا کہ تم خواہ راستے میں مر جاؤ، تمہیں جانا پڑے گا۔ اُس وقت میں نے تمہیں بچایا تھا۔ میں خاوند سے لڑ پڑی تھی کہ وہ تمہیں اس حالت میں اتنے لمبے سفر پر بھیج رہا تھا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے تمہیں رکوا لیا تھا اور میں طبیب کو تمہارے علاج

کے لیے لائی تھی۔ تم نہیں جانتے کہ اپنے خاوند سے مجھے کیسی کیسی بیہودہ باتیں سننا پڑی تھیں۔"

"مجھے یاد ہے سبیلہ" ـــ ارتگین نے کہا ـــ "آقا نے مجھے بھی بہت کچھ کہا تھا اور اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ تمہاری اور سبیلہ کی ایک دوسرے میں یہ دلچسپی فوراً ختم ہو جانی چاہیئے، ورنہ تم جانتے ہو کہ غلاموں کی سزا کیا ہے..... میں ان قزاقوں کے ساتھ خوش ہوں سبیلہ! یہاں مجھے کوئی غلام نہیں کہتا۔ اگر تم کسی تکلیف میں ہو تو تم نے میرے ساتھ جو نیکیاں کی ہیں، ان کا صلہ دینے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

سبیلہ کچھ دیر چپ چاپ رہی اور ارتگین کو دیکھتی رہی۔ صحرا کی وہ رات بھی چپ چاپ تھی۔ خیمہ گاہ میں جیسے لاشیں پڑی تھیں۔ صحرائی لومڑیاں بھی سو گئی تھیں مگر سبیلہ کے سینے سے بگولے اُٹھ رہے تھے۔

"کہو سبیلہ!" ـــ ارتگین نے کہا۔ "چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اپنے غلام کو آزما لو۔"

"سوچ رہی ہوں کہ تم میری بات سمجھ بھی سکو گے یا نہیں" ـــ سبیلہ نے آہ لے کر کہا ـــ "کہہ دیتی ہوں۔ سن لو..... مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیئے۔ کوئی صلہ نہیں چاہیئے۔ تم نے حماد بن علی کی باتیں غور سے سنی تھیں جو وہ بدوؤں کے سرداروں سے کہہ رہا تھا! وہ غزنی کے حاجیوں کے قافلے کو لوٹنا چاہتا ہے۔"

"کیا تم اسے روک سکتی ہو؟" ـــ ارتگین نے کہا۔ "کیا تم نے ابھی تک غزنی کو دل سے اُتارا نہیں؟"

"اُتار دیا تھا" ـــ سبیلہ نے کہا ـــ "لیکن غزنی کی آبرو میرے خون میں موجود ہے۔ حماد جب غزنی کا قافلہ لوٹنے کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا مگر جب اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ غزنی کے حُسن کا نمونہ ہے اور یہ

تمہارا انعام ہوگا اور غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں ہوں گی تو
میرا جسم کانپ اٹھا جیسے ہوا کا بڑا ہی سرد جھونکا آیا ہو یا زمین ہل گئی ہو میرا
مجاہد باپ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اُس کی وہ باتیں مجھے سنائی دینے
لگیں جو وہ بارہ تیرہ برس کی عمر تک مجھے سناتا رہا تھا۔ میں عورت تھی۔ حماد کی زبان
کا تیر میرے دل میں اُتر گیا۔ میں اس پر جوابی حملہ نہ کر سکی۔"

"تم نے شاید اسی بات سے خفا ہو کر میری طرف دیکھا تھا" —— ارتگین
نے پوچھا۔

"ہاں!" —— سبیلہ نے کہا —— "میرے سینے میں انتقام کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا
اور اُس وقت خدا کے بعد صرف تم تھے جس کی طرف میں دیکھ سکتی تھی مگر تمہارا
چہرہ بتا رہا تھا کہ تم نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ میں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا
کہ تمہیں تنہائی میں بلاؤں گی اور تمہارے دل میں بھی اُس بیٹی کی آبرو کا احساس
بیدار کروں گی جس نے تمہیں جنم دیا تھا ... میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میں بے بس
اور مجبور ہوں اور قزاق قبیلوں کے اس بادشاہ کا میں کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی میں
نے یہ چوٹ برداشت کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا مگر حماد کے خیمے میں جا کر اس
نے مجھے بدمست اور مخمور نگاہوں سے دیکھا اور جب میں لے اس کے جسم
کی تپش محسوس کی تو میرے سینے کے شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔"

ارتگین خاموش تھا جیسے وہ کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔

"سن رہے ہو ارتگین؟"

"سن رہا ہوں" —— ارتگین نے کہا —— "تمہارے انتقام کے شعلے
بے بس اور مجبور ہیں۔"

"حماد نے کہا "سبیلہ! سنا ہے غزنی کا سلطان محمود اپنے آپ کو
بت شکن کہلاتا ہے" —— اُس نے قہقہہ لگا کر کہا —— "محمود مجھ جیسا لٹیرا ہے۔
ڈاکہ زن ہے۔ میں کسی روز اس بت شکن کا بت توڑ دوں گا" —— یہ سن کر
میرا خون کھول اُٹھا۔ وہ جب گہری نیند سو گیا تو میں نے اُس کا خنجر نکال لیا۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے شمع کی روشنی میں اندازہ کر لیا کہ اس
شخص کا دل کہاں ہے۔ میں اسے ایک ہی وار میں ٹھنڈا کر دینا چاہتی تھی۔
پھر میرے ہاتھ ساکن ہو گئے۔ مجھے اطمینان ہونے لگا کہ میں غزنی کی توہین
کا اور غزنی کے سلطان کی توہین کا انتقام لے رہی ہوں۔ میرا ہاتھ اُوپر
اٹھا اور ایسے لگا کہ کسی غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو....

مجھے آواز سی سنائی دی —— 'اس آدمی کو قتل کر کے نہ تم زندہ رہ سکتی
ہو نہ ان بدؤوں سے غزنی کے قافلے میں آنے والی بیٹیوں کو بچا سکتی ہو۔
صبح یہ وحشی اور درندے اپنے بادشاہ کے خون کا جو انتقام تم سے لیں گے
اسے تصور میں لاؤ' —— میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے سوچا۔ بہت سوچا۔ میں کوئی جرم
نہیں کر رہی تھی اس لیے عقل میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے
تمہیں بلا رکھا ہے۔ تم سے بات کر کے کچھ کروں گی .... ارتگین! غزنی کی بیٹیاں
قزاقوں کی داشتائیں نہیں بنیں گی۔ سلطان محمود قزاق اور لٹیرا نہیں۔ میں ان بیٹیوں
کی آبرو بچانے کے لیے کفارہ ادا کروں گی۔"

"کیا حماد بن علی کو میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتی ہو؟"

"نہیں" —— سبیلہ نے جواب دیا —— "اس ایک آدمی کے قتل سے کچھ حاصل
نہ ہوگا۔ یہ مر گیا تو بھی یہ لوگ غزنی کے قافلے کو لوٹ لیں گے۔ میں نے یہ سوچا
ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ میں یہیں رہوں گی اگر میں بھی تمہارے ساتھ نکل بھاگی تو یہ لوگ ہمارا
پیچھا کریں گے۔ تم مرد ہو گھوڑا تیز دوڑا سکتے ہو سفر کی سختیاں برداشت کر سکتے ہو میں شاید
نہ کر سکوں میں تمہارے لیے بوجھ نہ بن جاؤں۔ رفتار سست ہوئی تو ہم پکڑے بھی جائیں گے۔"

"یہ لوگ میرا بھی پیچھا کر سکتے ہیں" —— ارتگین نے کہا —— "انہیں یہ خطرہ ہوگا
کہ میں غزنی جا کر اطلاع دے دوں گا کہ راستے میں قافلے پر حملہ ہوگا اور سلطان
محمود قافلے کے ساتھ فوج کے ایک دو دستے بھیج دے گا۔"

"اس کے باوجود تم چلے جاؤ" —— سبیلہ نے کہا —— "ہمیں خطرہ تو مول لینا
ہی ہوگا .... تم ڈر رہے ہو۔ تمہارا ڈر بجا ہے۔ تمہاری کوئی بیٹی نہیں۔ تمہاری

کوئی بہن نہیں۔ میں تمہاری بہن ہوتی تو تم میری عزت پر مر مٹتے۔ ارتگین! غزنی کی مٹی تمہاری بیٹی ہے۔ تمہاری بہن اور تمہاری ماں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس مٹی نے تمہیں کچھ نہیں دیا۔ تمہیں وہاں غلام سمجھا گیا۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ جس ملک کے حکمران اپنی رعایا کو بھوکا اور ننگا رکھتے ہیں اور اُسے ان حقوق سے محروم رکھتے ہیں جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں تو ان انسانوں کے دلوں سے اپنے وطن اور اپنے مذہب کی محبت نکل جاتی ہے۔ وہاں بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے.....

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم سلطان محمود کے پاس پہنچ گئے اور اُسے یہ بتایا کہ تم غلام تھے تو وہ تمہیں گلے لگا لے گا"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔۔۔"پھر تم غلام نہیں رہو گے۔ تم سلطان کی نگاہ میں اور خدا کی نگاہ میں بھی قابلِ احترام انسان بن جاؤ گے۔ اپنے آپ میں غیرت بیدار کرو ارتگین! اپنے وطن اور اپنے مذہب کی بیٹیاں وطن کی آبرو ہوتی ہیں۔ وہ قومیں ذلیل و خوار ہوتی ہیں جو اپنی بیٹیوں کی ناموس کو فراموش کر دیتی ہیں"۔

"میں تمہاری ایک بات بھی نہیں سمجھ سکا سبیلہ!"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔۔۔ "میرے دل میں کسی نے وطن کی محبت پیدا ہی نہیں کی۔ مجھے نوکری کرنی ہے۔ اسی لیے ایک قزاق کے پاس بھی مطمئن ہوں لیکن تم جو کہو گی کروں گا۔ تم مظلوم ہو پھر بھی تمہارا ایمان محفوظ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تمہاری نیکیوں کا صلہ ضرور دوں گا۔ کہو، مجھے کیا کرنا ہے"۔

"یہاں سے [illegible] طرح نکلو کہ کسی کو پتہ نہ چلے"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔۔۔"تم راستے سے واقف ہو۔ [illegible] دنوں میں غزنی پہنچ جاؤ گے۔ اگر غزنی کے حاجیوں کا قافلہ وہاں سے چل پڑا ہو تو اُسے روک لینا اور میر کارواں کو بتا دینا کہ راستے میں کیا خطرہ ہے۔ اُسے کہنا کہ تم فوج کا انتظام کرنے جا رہے ہو۔ اگر قافلہ ابھی وہیں ہو تو سلطان محمود کے پاس چلے جانا اور اُسے بتانا کہ قافلے پر پانچ ہزار بدو حملہ کریں گے۔ سلطان سے یہ ضرور کہہ دینا کہ قوم کی ایک بیٹی نے پیغام بھیجا ہے کہ حجاز کے قافلے

نہیں رک سکتے، قزاقوں کو روکا جا سکتا ہے۔ فوج کو ساتھ بھیجنا ورنہ غزنی کی بیٹیاں بابل اور بغداد کے بازاروں میں بک جائیں گی۔ سلطان سے کہنا کہ قافلے سے ایک بھی بیٹی اغوا ہو گئی تو خدا سلطان کو کبھی نہیں بخشے گا"۔

"میں کہہ دوں گا"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔۔۔"میں کہہ دوں گا۔ دعا کرو کہ میں زندہ وہاں پہنچ جاؤں، مگر تم یہاں سے نہیں نکلو گی! ..... میں تمہیں اس درندے کے پاس چھوڑ کر کس طرح جا سکوں گا؟"

"تم چلے جاؤ ارتگین! تم چلے جاؤ"۔۔۔ سبیلہ نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا۔۔۔"اگر زندہ رہی تو باقی عمر تمہاری غلام رہوں گی۔ میرے جسم اور میری روح کے مالک صرف تم ہو گے، پھر تم نہیں میں غلام ہوں گی۔ تم غزنی پہنچ جاؤ گے۔ تم کوئی گناہ نہیں کر رہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کو کسی طرح میرے تعاقب سے روک سکتی ہو؟"

"کوشش کروں گی"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔۔۔"میں نے ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ تمہیں اپنا آقا یاد ہے نا جو میرا خاوند تھا۔ اس کی بیویوں کو تم بھی جانتے تھے اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ میرے خاوند کی محل جیسی حویلی میں کیسی کیسی سازشیں ہوتی تھیں۔ جہاں دولت اور عورت ہو، وہاں سے خلوص اور شرافت رخصت ہو جاتی ہے۔ میں شیطان کی اس دنیا کا ایک حصہ بنی رہی ہوں۔ میں ہر شیطانی کام کر سکتی ہوں ..... تم یہاں کے ایک سردار کوکیل کو جانتے ہو گے جس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہزار [illegible] اپنے ساتھ لائے گا۔ مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں حماد سے ہٹ کر اُس کے ساتھ چلی چلوں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں حماد کی بیوی نہیں پھر بھی اُسے دھوکہ نہیں دوں گی۔ اُس نے مجھے لالچ دیئے تھے اور پھر دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے اغوا کر لے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اگر حماد کو بتا دیا تو وہ مجھے قتل کرا دے گا..... میں شاید اس سے انتقام لوں۔ تم یہاں کی باتیں چھوڑو ارتگین! اٹھو۔ تم کب یہاں سے نکلو گے؟"

"ابھی"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔۔۔"اب مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔ تم چلی جاؤ۔"

رات کا آخری پہر گذر رہا ہے"۔۔۔ سبیلہ نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا پھر چُوما اور وہاں سے اپنے خیمے میں آگئی۔

خیمہ گاہ میں وہی سکوت تھا جو پہلے تھا۔ ان لوگوں کو جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ارتگین ان کے بے تاج بادشاہ کا خاص محافظ تھا۔ اُسے خیمہ گاہ میں گھومنے پھرنے، کوئی گھوڑا یا اونٹ کھولتے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جس خیمے میں کھانے پینے کا سامان پڑا تھا وہاں سے کچھ اٹھاتے بھی اسے کوئی ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ سبیلہ اپنے خیمے میں پہنچ گئی ہوگی، وہ اپنے خیمے میں گیا۔ برچھی، تلوار، کمان اور ترکش اٹھائی، کچھ کپڑے لیے۔ سفری تھیلے اٹھائے اور رسد والے خیمے میں چلا گیا۔ وہاں سے پانی کے مشکیزے اور کھانے کا سامان اُٹھایا اور ایک اونٹ جا کھولا۔ سامان اس کے ساتھ باندھا اور اس پر سوار ہو کر اُسے اٹھایا۔

سبیلہ اپنے خیمے میں پردہ ذرا ہٹا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے خیمے سیاہ ڈھیروں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے خیموں سے دور ایک اونٹ کا ہیولہ اس طرح نظر آیا جیسے اونٹ افق کی لکیر پر چلا جا رہا ہو۔ سبیلہ کے ہونٹوں سے دعا سرگوشیاں بن کے نکلنے لگی اور اونٹ کا ہیولہ چھوٹا ہوتا گیا، دور ہٹتا گیا پھر وہ اُس کے آنسوؤں کی دھند میں چھپ گیا۔۔۔ سبیلہ بستر پر جا گری اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اُس کی جب آنکھ کھلی، آدھا دن گزر گیا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُسے رات کی بات یاد آئی تو اُسے خوف سا محسوس ہُوا جیسے ارتگین اُسے دھوکہ دے کر حماد کو بتا دے گا۔ وہ خیمے سے نکلی۔ ارتگین کے خیمے کا پردہ اٹھایا، وہ وہاں نہیں تھا۔ اُس کے ہتھیار اور اُس کے کپڑے بھی وہاں نہیں تھے۔ سبیلہ ارتگین کے خیمے سے نکل رہی تھی تو حماد اپنے خیمے سے باہر آیا۔ اُس نے سبیلہ کو اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ ارتگین کے خیمے میں کیا لینے گئی تھی۔

سبیلہ نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر پیدا کر کے کہا۔"میں ارتگین کو دیکھنے گئی تھی کہ وہ وہاں ہے یا نہیں .... مجھے ڈر ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ قتل ہو چکا ہے"۔

"قتل؟"۔۔۔ حماد بن علی نے پوچھا۔"تمہارا دماغ ٹھکانے معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں کون کسی کو قتل کر سکتا ہے؟"

"گوگیل"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔"گوگیل نے ارتگین کو غائب کر دیا ہے۔ اب میری باری ہے۔ میں نے آپ کو پہلے نہیں بتایا تھا۔ آپ جب مجھے یہاں لائے تھے تو گوگیل نے مجھے لالچ اور دھمکیاں دے کر منوانے کی کوشش کی تھی کہ میں آپ سے بھاگ کر اُس کے پاس چلی جاؤں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میں اپنے آقا کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔ گذشتہ رات میں آپ کے ساتھ آپ کے خیمے میں گئی تھی۔ آپ سو گئے تو میں وہاں سے نکل کر اپنے خیمے میں جانے کی بجائے ٹہلتے ٹہلتے پانی تک چلی گئی۔ گوگیل شاید میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس آگیا اور مجھے ورغلانے لگا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے مجھ پر دست درازی کی۔ میں اپنے آپ کو اکیلی سمجھ رہی تھی لیکن اچانک ارتگین آگیا۔ وہ مجھے بتائے بغیر میری حفاظت کے لیے مجھ سے کچھ دور موجود رہا۔

"گوگیل نے اُسے آپ کا غلام سمجھ کر گالیاں دیں اور وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ارتگین نے اُسے بڑی دلیری سے کہا کہ وہ اپنے آقا کی عزت پر جان قربان کر دے گا۔ گوگیل نے اُسے کہا کہ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ جاؤ۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے آقا کے خیمے میں سونا .... وہ چلا گیا۔ ارتگین مجھے میرے خیمے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ گوگیل درندہ ہے۔ اُس نے رات کو ارتگین کو غائب کروا دیا ہے"۔

حماد بن علی غصے سے پھنکارنے لگے اور اُس نے ... کو ...

"میں جانتا ہوں کہ تم قبیلے کے سردار ہو"۔ حماد بن علی نے گوگیل سے کہا۔ "لیکن تم بھول گئے ہو کہ میں کون ہوں ... میں تمہیں بخش دوں گا۔ میرا آدمی مجھے واپس کر دو"۔

"کون سا آدمی؟" ۔ گوگیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارتگین" ۔ حماد نے کہا۔ "میرا محافظ جو گذشتہ رات تمہارے اور سبیلہ کے درمیان آگیا تھا"۔

گوگیل حیران و پریشان ہو گیا۔ سبیلہ نے حماد سے کہا کہ یہ شخص اپنا جرم چھپانے کے لیے انجان بن رہا ہے۔

"گوگیل!" حماد بن علی نے اُسے کہا۔ "کیا تم ایک غلام اور ایک داشتہ کی خاطر مجھ سے دشمنی مول لے رہے ہو؟ اس وقت ہمیں اتحاد اور اتفاق کی ضرورت ہے۔ ہمیں تمہیں اس جیسی دس لڑکیاں لا دوں گا مگر تم نے میری داشتہ پر دست درازی کر کے میرے محافظ کو غائب کر دیا ہے۔ کیا تم قبیلے کے سردار رہو گے؟ کیا تم مجھ سے ٹکر لے کر سردار رہ سکو گے؟ زندہ رہ سکو گے؟"

بات بڑھ گئی۔ چونکہ گوگیل نے ارتگین کو غائب نہیں کیا تھا اس لیے وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ حماد نے تمام سرداروں کو اکٹھا کر لیا اور سبیلہ سے کہا کہ وہ سب کو سنائے کہ گوگیل نے کیا کیا ہے۔ سبیلہ نے وہی بات سنا دی جو وہ حماد کو سنا چکی تھی۔ گوگیل غصے سے اُٹھا اور یہ کہہ کر چل پڑا۔ "میرا اور میرے قبیلے کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔

اُس نے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ حماد نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی کی کمان لی اور اُس کی ترکش سے تیر نکال کر کمان میں ڈالا۔ دوسرے لمحے تیر گوگیل کی پیٹھ میں اُترا ہوا تھا اور وہ ریت پر تڑپ رہا تھا۔ اسی روز حماد نے ایک خاص تقریب منعقد کر کے گوگیل کے قبیلے کا ایک اور سردار مقرر کر دیا۔ اس نے سب سے کہا کہ میں جانتا تھا کہ مجھے میرا محافظ واپس نہیں ملے گا۔ گوگیل نے اسے یقیناً قتل کروا کے اس کی لاش کہیں دبا دی ہے۔۔

اُس وقت تک ارتگین بہت دور نکل گیا تھا۔ صبح طلوع ہونے تک وہ اونٹ کو دوڑا تا رہا تھا۔ سورج اُبھرا تو اُس نے اونٹ کی رفتار کم کر دی۔ اُس نے گھوم گھوم کے دیکھا۔ اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔

حماد بن علی نے قبائلی سرداروں کو آخری ہدایات دیں اور انہیں کید کے صحرا کے قریب ایک جگہ بتا کر کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو وہاں جمع کریں۔ اسی روز سب اپنے اپنے قبیلوں کو روانہ ہو گئے اور حماد بھی وہاں سے چلا گیا۔ وہ جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو اُس کا ایک اور جاسوس غزنی سے آیا جس نے اُسے بتایا کہ غزنی کے قافلے کی نفری اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس میں مالدار تاجروں کی خاصی تعداد ہے۔ اُس نے حماد کو یہ بھی بتایا کہ راستے میں لوگ اس قافلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ قافلہ اور زیادہ بڑا ہو جائے گا۔ اس جاسوس کو کوئی ایسے آثار نہیں ملے تھے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا کوئی انتظام ہو گا یا نہیں۔

"میں حجاز تک فوج کا دستہ کیسے بھیج سکتا ہوں"۔ غزنی میں سلطان محمود غزنوی قافلے کے ایک وفد سے کہہ رہا تھا۔ "قوم کے ہر فرد کو سپاہی ہونا چاہیئے"۔

قافلے کا ایک وفد (محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق) سلطان محمود کے پاس یہ درخواست لے کر گیا تھا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے ساتھ خواتین اور بچے بھی ہیں اور تاجروں کا قیمتی مال بھی ساتھ جا رہا ہے اس لیے قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ ساتھ ہونا چاہیئے۔

"میں بے خبر نہیں کہ حاجیوں کے قافلے رہزنوں اور قزاقوں کے ہاتھوں لُٹتے رہتے ہیں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں حج پر جانے والوں کو ہر سہولت اور مدد دیا کرتا ہوں مگر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ میں مکہ معظمہ تک فوج قافلے کے ساتھ بھیجوں۔ اتنے بڑے قافلے میں بے شمار آدمی ایسے ہوں گے جو لڑ سکتے ہیں اور شہسوار بھی ہیں۔ قافلے میں سپاہی بھی حج کو جا رہے ہیں۔ آپ لوگ پوری طرح مسلح ہو کر جائیں۔ تیر و کمان ساتھ رکھیں۔ مجھے اتنے

بڑے قافلے پر حملے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ قافلے وہ لٹتے ہیں جن میں مسافر بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ لوگ بے خوف ہو کر جائیں۔"

جب وفد چلا گیا تو سلطان محمود نے اپنے مشیروں اور سالاروں کی ایک محفل میں کہا — "میں نے ان لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ یہ فریضۂ حج ادا کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کی درخواست مان لینی چاہیئے تھی لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں فوج کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ سرحدوں پر ہر وقت خطرہ موجود رہتا ہے۔ ابھی دو تین دن گزرے ہندوستان سے تشویشناک خبریں آئی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قنوج کا مہاراجہ راجیا پال جو وہاں سے بھاگ گیا تھا، ہمارے قلعہ دار کے پاس گیا اور اُس نے ہماری شرائط تسلیم کرنے کا معاہدہ کیا اور قنوج سے کچھ دور اپنی نئی راجدھانی بنانے کی اجازت مانگی ہے۔ میں اُس سے تاوان اور باج وصول کروں گا اور اُسے نئی راجدھانی بنانے کی اجازت دے دوں گا مگر وہاں کے تین مہاراجے، کالنجر، گوالیار اور لاہور، مہاراجہ راجیا پال کے دشمن بن گئے ہیں۔ قنوج سے پیغام آیا ہے کہ یہ مہاراجے مہاراجہ قنوج کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہوں نے ہمیں فیصلہ کن شکست دینے کے لیے متحدہ محاذ بنا لیا ہے۔ معلوم نہیں کب ہمیں ہندوستان کو کوچ کرنا پڑے۔"

قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ سلطان محمود کے پاس جو وفد گیا تھا اس کے ارکان نے قافلے کے تمام مسافروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ مسلح ہو کر چلیں۔ ہتھیار اکٹھے کرنے کے لیے قافلے کی روانگی ایک دو دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اور اُس وقت سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ ارتگین نام کا ایک آدمی بڑی بُری حالت میں آیا ہے۔ کہتا ہے بہت دُور سے آیا ہوں اور یہ

بھی کہتا ہے کہ حاجیوں کے قافلے کو روک کے رکھو۔ سلطان محمود حاجیوں کے نام پر ضروری کام بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اُس نے ارتگین کو فوراً بلا لیا۔ وہ تو زندہ لاش بن چکا تھا۔ منہ کھلا ہوا اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے سہارا دے کر بٹھایا گیا۔ مشروب پلائے گئے، کچھ کھلایا گیا تو وہ ہوش میں آنے لگا۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں تیز تیز ٹہلنے لگا۔

"سلطانِ غزنی و خراسان سے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں" — ارتگین نے کہا — "ایک مہینہ ہو گیا ہے، میں پاؤں پر نہیں چلا۔ پہلے اونٹ پر سوار رہا اور جب پہاڑی علاقہ آیا تو ایک سوار سے گھوڑا چھین کر اونٹ اُسے دے دیا۔ راستے میں دو اور سواروں سے گھوڑے چھینے اور تھکن اور بھوک سے ادھ مُوئے گھوڑے اُن کے پاس چھوڑے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر کھاتا پیتا رہا اور کسی گھوڑے کو رُکنے نہ چلنے دیا ورنہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت ایک ماہ میں طے نہ ہوتی۔"

"وہ بات کیا ہے جو تمہیں اس حال میں میرے پاس لائی ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"اگر آپ حجاز کے قافلے کے ساتھ فوج کے دو دستے نہیں بھیج سکتے تو قافلے کو غزنی سے باہر نہ نکلنے دینا" — ارتگین نے کہا — "کیدسے کے صحرا میں قافلے کو لُوٹنے کے لیے قزاقوں کا وہ گروہ بلکہ وہ فوج خیمہ زن ہے جسے خلیفۂ بغداد کی پشت پناہی حاصل ہے۔"

"خلیفۂ بغداد کی پشت پناہی؟"

"اگر سلطانِ غزنی کو ایک غلام کی بات پسند نہیں آئی تو غلام جان بخشی چاہتا ہے" — ارتگین نے کہا — "اگر خلیفہ کی پشت پناہی نہیں تو اس کے سالاروں اور حاکموں کی مدد حاصل ہو گی۔ اگر یہ بھی نہیں تو اسے جھوٹ نہ سمجھنا کہ تمام بدو قبیلے ایک شخص حماد علی کی قیادت میں غزنی کے قافلے

کو کید کے صحرا میں اُس جگہ جہاں ٹیلے زیادہ ہیں، لُوٹ لیں گے اور لڑکیوں کو اٹھا لے جائیں گے۔ حماد بن علی بغداد گیا تھا۔ میں چونکہ اس کے ساتھ تھا اس لیے میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے خلیفہ کے ایک سالار اور دو بڑے حاکموں سے ملا تھا، پھر وہ اسے خلیفہ کے پاس لے گئے تھے۔"

ارتگین نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ حماد بن علی نے کس طرح اور کہاں بدو قبائل کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور قافلے پر حملے کا منصوبہ طے کیا ہے۔ قزاقوں کی تعداد پانچ ہزار ہو گی۔

"پانچ ہزار" ــ سلطان محمود حیرت زدہ ہو گیا۔

"اتنی زیادہ تعداد کی وجہ یہ ہے کہ حماد بن علی کے جاسوسوں نے جو یہاں آ کر قافلے کی تیاری دیکھ گئے ہیں، وہاں جا کر بتایا ہے کہ قافلے میں ہندوستان سے آیا ہوا مال جا رہا ہے اور قافلے میں زیادہ تر لوگ فوجی ہیں یا لڑنے والے ہیں" ــ ارتگین نے کہا۔ "قافلے کی نفری ڈیڑھ ہزار بتائی گئی ہے۔"

"قافلے میں کوئی فوجی نہیں ہے" ــ سلطان محمود نے کہا۔ "اگر فوجیوں کو حج کی فرصت ہوتی تو سب سے پہلے میں جاتا۔" وہ گہری سوچ میں کھو گیا اور بولا "میں حجاز کے قافلے کو نہیں روک سکتا۔ اگر میں خود حج پر جا نہیں سکتا تو جانے والوں کے جان و مال کی حفاظت میرے فرائض میں ہے۔ میں حاجیوں کی سلامتی کی خاطر سلطنتِ غزنی کی سلامتی خطرے میں ڈال سکتا ہوں" ــ وہ بولتے بولتے رُک گیا اور اس نے ارتگین کو بڑی غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم ہو کون اور تم جو قزاقوں کے سرغنہ کے خاص آدمی ہو، دل میں ہمارے قافلے کی ہمدردی کس طرح لے کر آئے ہو؟ کیا تم اللہ کے اس سپاہی کو دھوکہ دے سکو گے جس کے نام سے ہندوستان کے دیوتاؤں کے بُت کانپ جاتے ہیں؟"

"غزنی کی ایک بیٹی جو بہت بڑے دھوکے کا شکار ہے، غزنی کی بیٹیوں کے لیے کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے" ــ ارتگین نے کہا۔ "وہ آبرو باختہ غزنی کی آبرو کو بچانے کے لیے اپنے سلطان کو پکار رہی ہے۔ میں ایک غلام ہوں، ابنِ غلام ہوں، ترک ہوں لیکن جسم غزنی کی مٹی میں لیا ہے۔ اس لڑکی نے جس کا نام سبیلہ ہے اور جس کا باپ آپ کی فوج میں شتر سوار تھا اور شہید ہو گیا ہے، مجھ جیسے غلام کے دل میں غزنی کی مٹی کی عظمت پیدا کر دی ہے۔ اگر سلطانِ عالی مقام کا دل بہت مضبوط ہے تو سنیں۔"

ارتگین نے اپنا ماضی اور پھر سبیلہ کی زندگی کی کہانی سلطان محمود کو سنا دی اور اسے تفصیل سے سنایا کہ سبیلہ نے اسے کس طرح غزنی آنے کے لیے تیار کیا تھا۔ سلطان محمود کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"جس قوم کی بیٹیاں اس مجبوری کی حالت میں بھی اپنے ایمان اور کردار کو مرنے نہ دیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا" ــ سلطان محمود نے کہا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے حاکموں وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم اپنی اُبھرتی ہوئی نسل کو گناہوں میں ڈبو دو لیکن روایات جو خون میں شامل ہو گئی ہیں وہ ایک نہ ایک دن رنگ لائیں گی.... اور تم" ــ سلطان نے ارتگین کی طرف ہاتھ کر کے کہا۔ "تم غلام نہیں ہو۔ آگے آؤ" وہ آگے آیا تو سلطان نے اُسے گلے لگا لیا اور بولا۔ "ہم سب غلام ہیں.... اللہ کے رسولؐ کے غلام اور یہی مسلمان کی عظمت ہے" ــ سلطان نے پرجوش آواز میں کہا ــ "قافلہ جائے گا اور اس کے ساتھ فوج بھی جائے گی۔ غزنی کی سرحدوں پر ہمارا خدا نظر رکھے گا۔"

یہ تو جذبات کی بات تھی کہ سلطان محمود نے کہہ دیا کہ فوج جائے گی لیکن اس نے فوج کو کبھی جذباتی کیفیت میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس لیے دو سالاروں اور مشیروں کو بلایا۔ غزنی کی سرحدوں کی، اندرونی حالات

کی اور ہندوستان سے آنے والے پیغامات کی صورتِ حال پر بات چیت
کی اور جائزہ لیا کہ قزاقوں کی تعداد اگر پانچ ہزار ہے تو فوج کی کتنی نفری ساتھ
بھیجی جائے۔ سلطان محمود نے کہا کہ بدو گھوڑے اور اونٹ دوڑاتے ہوئے
لڑتے ہیں اور وہ بھاگنے کا راستہ بھی صاف رکھتے ہیں، اس لیے قافلے
کے ساتھ چھاپہ مار دستہ اور ایک دستہ تیر اندازوں کا بھیجا جائے۔

اُس وقت کی کسی بھی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ
جو دستے قافلے کے ساتھ بھیجے گئے ان کی قیادت کسی سالار کی بجائے
قاضی القضاۃ ابو محمد کو دی گئی۔ محمد قاسم فرشتہ نے مختلف مؤرخوں اور اپنی
تحقیق کے حوالوں سے یہ تین نام ۔۔۔ حماد بن علی، ارگیمین اور قاضی القضاۃ ابو محمد
۔۔۔ وثوق سے لکھے ہیں۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت آج کے چیف جسٹس کی ہوتی
تھی۔ مذہبی امور کے فیصلے بھی وہی کرتا تھا۔ اُس دور میں قاضی فنِ حرب
وضرب کی مہارت بھی رکھتے تھے۔

فرشتہ لکھتا ہے "سلطان محمود نے قاضی القضاۃ ابو محمد کو خاصی فوج
دے کر قافلے کے ساتھ بھیجا۔ سلطان محمود نے ابو محمد کو تیس ہزار درہم اس
مقصد کے لیے دیے کہ لڑائی کی بجائے یہ رقم قزاقوں کو دے کر اُن سے
معاہدہ کر لیا جائے کہ قافلے کو خیریت سے جانے دیں۔۔۔ سلطان کا یہ انتظام
دیکھ کر قافلے میں کئی ہزار لوگ شامل ہو گئے۔"

اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ قافلے کو الوداع کہنے کے لیے سلطان محمود خود
گھوڑے پر سوار دُور تک ساتھ گیا۔ وہ قافلہ کئی میل لمبا تھا۔ سلطان اِدھر
اُدھر گھوڑا دوڑاتا اور مسکراتے ہوئے سب کو ہاتھ ہلاتا اور
خیریت سے واپس آنے کی دعائیں دیتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک بلند جگہ جا کھڑا
ہوا اور اُس وقت وہاں سے اُترا جب قافلے کا آخری مسافر اُس کے
سامنے سے گزر گیا۔ وہ بہت دیر تک جاتے ہوئے قافلے کو دیکھتا رہا۔
آخر اُس کی آہ نکل گئی اور اُس نے کہا "خوش نصیب ہیں جو حجاز کو جا رہے

ہیں۔۔۔۔ اللہ ان کا محافظ ہو۔"
ارگیمین قاضی القضاۃ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔

کیدسے کے صحرا میں ایک وسیع خطہ ایسا تھا جہاں صحرائی ٹیلے دیواروں
اور عمارتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان میں بعض ٹیلے ستونوں کی شکل کے تھے
اور بعض ڈراؤنے ڈراؤنے سے۔ ان میں سے راستہ گزرتا تھا۔ یہ جگہ بہت
ہی خطرناک تھی۔ بھول بھلیاں تھیں۔

اس سے ذرا پرے حماد بن علی نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ یہ کم و بیش چار
ہزار بدوؤں کی خیمہ گاہ تھی۔ وہ غزنی کے قافلے کو لوٹنے کے لیے آگئے
تھے۔ وہ لڑاکے تھے، شہسوار تھے اور نڈر تھے۔ ان کا کوئی مذہب نہیں
تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کو ہی قابلِ عبادت سمجھتے تھے اور ان سے
بڑا سرداروں کے سردار کو سمجھتے تھے جو اُس وقت حماد بن علی تھا۔ ان کا
عقیدہ تھا کہ سرداروں کے سردار پر نہ تیر اثر کرتا ہے نہ کوئی اور ہتھیار۔
قزاقی کو وہ جائز پیشہ سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں یہ کوئی مذموم حرکت
نہیں تھی۔

حماد بن علی کے ساتھ سبیلہ بھی تھی۔ وہ بظاہر خوش تھی لیکن اندر سے
کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ وہ قافلے کے انتظار میں بے تاب تھی ۔۔۔ اور
اُس وقت تو وہ اندر سے کانپنے لگی جب رات کے وقت ایک بدو نے
آکر حماد کو بتایا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے فوج بھی آ رہی
ہے۔ بدو نے یہ بھی بتایا کہ قافلہ کوئی ایک کوس دُور پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔

حماد بن علی اس خطے کو جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا، اپنی زمین
سمجھتا تھا جیسے وہاں ہوائیں بھی اسی کے حکم سے چلتی ہوں۔ اُس نے دیکھ بھال
کا کوئی انتظام نہ کیا۔ قاضی القضاۃ نے رات کو ہی کمانڈروں سے
صلاح مشورہ کر کے ٹیلوں کے علاقے میں موزوں بلندیوں پر تیر انداز

بٹھا دیئے اور حماد کی خیمہ گاہ کا جائزہ بھی لے لیا لیکن اُس نے سلطان محمود کی ہدایات کے مطابق حملے میں پہل کرنے کی بجائے دوستانہ معاہدہ بہتر سمجھا۔ رات بھر فوج بیدار رہی۔

اُدھر بدو قبائل حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ صبح طلوع ہوئی تو غزنی کی فوج کے دو آدمی حماد بن علی کے پاس گئے اور اُسے قاضی القضاۃ کا پیغام دیا کہ تم لوگ قافلے کو گذرنے دو۔ اس کے عوض تمہیں پانچ ہزار درہم ادا کئے جائیں گے۔

حماد بھڑک اُٹھا اور غصے سے تھوک اُڑاتے ہوئے بولا۔ "پانچ ہزار درہم .... پانچ ہزار درہم سے تم میرے پاؤں کی خاک بھی نہیں خرید سکتے۔ تم میری توہین کرنے آئے ہو۔ میں بھکاری نہیں"۔ اُس نے بدوؤں کے خیموں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اپنے قاضی سے جا کر کہو کہ میری طاقت دیکھے۔ کیا میں انہیں ایک ایک درہم دے کر واپس لے جاؤں؟ تمہارے قافلے کی ساری دولت میری ہے۔ تمام مال و دولت اور میری پسند کی تمام جوان عورتیں میرے حوالے کر دو اور قافلہ خیریت سے گذر جائے"۔

"حماد بن علی!" ایک پیغامبر نے کہا۔ "طاقت پر اتنا غرور نہ کر۔ فرعون نہ بن۔ ہم درخواست لے کر نہیں آئے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئے ہیں۔ قافلہ مال و دولت اور خواتین سمیت یہاں سے خیریت سے گزرے گا لیکن یہ ریت تیرے قزاقوں کے لہو سے لال ہو جائے گی"۔

"چلے جاؤ یہاں سے" — حماد نے گرج کر کہا۔ "میں اپنے خیمے میں آئے ہوئے مہمان کو قتل نہیں کیا کرتا۔ جاؤ"۔

پیغامبر واپس آ رہے تھے تو انہیں ارتگین مل گیا۔ اُس نے پوچھا کہ حماد نے کیا جواب دیا ہے۔ اُسے جب بتایا گیا تو وہ ہنس پڑا اور تیر و کمان کندھے سے لٹکائے ایک بلندی پر کھڑا رہا۔

قاضی القضاۃ کو سلطان محمود نے تیس ہزار درہم دیئے تھے لیکن اُس نے یہ رقم ضائع کرنی مناسب نہ سمجھی۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے کہ اتنا بڑا قزاق پانچ ہزار درہم کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھے گا، یہی پیشکش کی جو دراصل چیلنج تھا کہ حماد آؤ اور قافلے پر حملہ کرو۔ قاضی القضاۃ ابو محمد نے اپنی پیشکش کا جواب سنا تو اس نے فوج کو موزوں مقامات پر کر دیا۔ فوج کی نفری تھوڑی تھی۔

حماد بن علی نے غصے کی حالت میں بدوؤں کو اکٹھا کیا اور ٹیلوں کے باہر باہر سے انہیں پیشقدمی کر کے قافلے پر حملے کا حکم دیا۔ قافلہ ٹیلوں کے باہر تھا۔ حماد گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ ایک علمدار تھا۔ علم سیاہ رنگ کا تھا۔ ساتھ دو محافظ تھے۔ اُدھر قافلے میں لڑنے والے کچھ لوگ تھے۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ عورتیں ہاتھ بلند کر کے دعائیں مانگنے لگیں۔ بدوؤں کے کالے اور کرخت چہرے بڑے ڈراؤنے تھے — اور فوج ایک ٹیلے پر سمٹ کر کھڑی تھی۔

ارتگین بلندی سے اُتر کر ٹیلوں کے اندر چلا گیا اور ٹیلوں کی اوٹ میں اُس طرف نکل گیا جدھر سے بدوؤں کی فوج جا رہی تھی — ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کی چال میں تیزی تھی۔ ارتگین چھپ کر دیکھتا رہا — پھر اسے حماد بن علی نظر آیا۔ وہ بہت دور نہیں تھا۔ ارتگین نے اپنی کمان میں تیر ڈالا اور حماد کے چہرے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر حماد کی کنپٹی میں اُتر گیا۔ وہ تیورا کر گھوڑے سے گرا۔ اُس کے محافظ ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے کہ ایک تیر علمبردار کی گردن میں دائیں سے لگا اور بائیں کو نکل گیا۔ یہ تیر بھی ارتگین کا تھا۔ پرچم گر پڑا۔

ارتگین دوڑ کر ٹیلے پر چڑھا اور بڑی ہی بلند آواز سے چلانے لگا — "خدا کی قسم، میں نے حماد بن علی کو مار ڈالا ہے .... غزنی کی آبرو کی قسم، بدوؤں کا پرچم گر پڑا ہے"۔

اپنے سرداروں کے سردار کو اور اپنے عَلَم کو گرتا دیکھ کر قبا ئلیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ تب قاضی القضاۃ ابومحمد نے فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ ارتگین نے اُسے پہلے بتا دیا تھا کہ وہ حماد کو پہچانتا ہے اور وہ سب سے پہلے اسے مارنے کی کوشش کرے گا۔ ابومحمد نے اسے کہا تھا کہ اگر وہ اسے حملے سے پہلے مارلے تو للکار کر آواز دے۔ خدا نے ان کا یہ منصوبہ کامیاب کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ بدوؤں کا قتلِ عام تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو بچانے کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کوشش میں وہ ٹیلوں کے اندر آ گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ چھپ سکیں گے مگر ابومحمد نے وہاں پہلے ہی ٹیلوں پر تیرانداز بٹھا رکھے تھے۔ ان میں سے جو بدو باہر کو بھاگے انہیں تعاقب کر کے ختم کیا گیا۔

اس خاک و خون میں ٹیلوں کے اندر گھوڑوں کے شور اور زخمیوں کی چیخ و پکار میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی — "ارتگین.... ارتگین" یہ سبیلہ کی پکار تھی۔ اسے غزنی کا ایک سوار اٹھا کر گھوڑے پر نہ ڈال لیتا تو وہ گھوڑوں تلے روندی جاتی۔

دوپہر تک کیمہ کا معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ اس سے آگے قافلے کے ساتھ فوج کا چھوٹا سا ایک محافظ دستہ بھیجا گیا۔ قاضی القضاۃ باقی فوج کو واپس غزنی لے گیا۔ اس کے ساتھ بدوؤں کے بے شمار گھوڑے اور اونٹ تھے جن پر اُن کے خیمے اور دیگر سامان لدا ہُوا تھا۔

"ارتگین!" — ابومحمد نے راستے میں اسے کہا — "تم غلام نہیں ہو اور نہ سبیلہ اعرابی کی نہیں اسلام کی آبرو ہو۔ اسلام زندہ رہے گا۔"